

نومبر 2017

ماہنامہ
دیرین



سنگ

کریما داسٹر خان

چاندنگ روپہ اف پیلیکیشنز

دکن

رکن آل پاکستان نڈوز ہیچر سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نڈوز ہیچر ڈائریکٹرز

MEMBER
APNS
CPNE

باقی ————— محمود بابر فیصل
میکران ————— محمود ریاض
مدیرہ ————— نادرہ خاتون
مدیر اعلیٰ ————— عامر محمود
نائب مدیرہ ————— شجاع حمید
مدیرہ خصوصی ————— اصمت الصبوری
اشتمہارت ————— خالدہ جیلانی



11 اقبال آرزو

11 خالد انجم

محمد
نعت

انٹرویو

Pakistanipoint

21 اربس نجم

17 سہیل

26 امیر شہزاد

سید علی حسن سے ملاقات

آواز کی دنیا سے

میری بھی سنتے

مقابل ہے آئینہ

مسل ناول

166 مصباح علی تہ

58 ریحانہ آفتاب

204 حیرانوشین

ہجور شمیم

مجھے جینے کا حق دو

پائل چوڑی

ناولٹ

105 حیات بخاری

235 منعم ملک

بہار منتظر ہے

آواز دو

28 نگہت عبداللہ

254 آسیہ رزا

134 تنزیلیہ ریاض

ہوائیں رخ بدل گئیں

من مور کھ

رائنسرل

افسانے

47 یاسمین نشاط

160 زمیل سلیم

196 حنا بشری

99 شبینہ گل

پیوند زدہ

ایک پل

دل بے رحم

دس کالوٹ



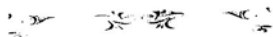
ذرا سا لٹریچر دیکھو

پاکستان (سالانہ) --- 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ --- 6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 7000 روپے

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے رچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارہ کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی نوعیت پر ڈراما، ٹیلی ویژن، فلم، اور دیگر ذریعہ سے اس کے استعمال سے پہلے بائیس برس سے زائد عرصے کی اجازت لینا ضروری ہے۔ یہ صورت دیگر ادارہ کاغذی کارخانہ کوئی کاغذ رکھتا ہے۔ اور سلسلہ وار قطع کے کسی بھی طرز کے استعمال سے پہلے بائیس برس سے زائد عرصے کی اجازت لینا ضروری ہے۔ یہ صورت دیگر ادارہ کاغذی کارخانہ کوئی کاغذ رکھتا ہے۔



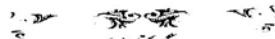
- | | | | | | |
|-----|---------------|----------------|-----|--------------|---------------------|
| 279 | ادارہ | موتی پختے ہیں | 272 | شعاع عمید | کرن کرن خوشبو، |
| 281 | ہو بیستہ شریف | مُسکراتی کرتیں | 275 | بشری محمود | یاد دل کے در کے سنے |
| 283 | مدیرہ کرن | ناع میے کر نام | 277 | شگفتہ سلیمان | مجھے شعر لپیٹ ہے |



نومبر 2017

جلد 40 نمبر 8

قیمت 60 روپے



خاک و کتابت کا پتہ

کرن

37 - اردو بازار لاہور

خط و کتابت کا پتہ: سونہر مارن، 37 - اردو بازار، لاہور

پبلشر آزر دیاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com



طلوع ہونے والا ہر نیا دن ہمارے لیے نئے نئے سبق اور تجربات لے کر آتا ہے اور ہر روز عذاب ہوتے والا سورج ہمارے حاسن میں یوں چھوڑ جاتا ہے۔ یہ یادیں کبھی ہونٹوں پہ مسکن بن کے چمکتی ہیں تو کبھی آنسوؤں کے لاکھوں میں بھڑکتی ہیں۔ دُنیا میں کوئی شخص ایسا نہ ہو گا جس کے پاس اچھی بُری یادوں کا خزانہ نہ ہو مگر ضروری نہیں کہ ہر شخص کسی یاد کا حصہ بھی ہو۔

اس ہزار سالہ قدیم دُنیا میں اُن گنت لوگ گم نامی کی زندگی گزار کے گم نامی کی موت مر گئے۔ مگر جو لوگ اپنی ذات کو یوں پشت ڈال کر خود کو انسانیت کی بھلائی کے لیے وقف کر دیتے ہیں، انسانوں کی فلاح کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیتے ہیں، وقت کے اندھیروں میں ایسے ہی لوگ یگنو بن کر نکلتے ہیں۔ جدوجہد، خلوص اور سچائی کی راہ پر چلنے والے یہ لوگ روشنی کا وہ مینار ہوتے ہیں جن سے اگلی نسلیں راہ پاتی ہیں۔ تاریخ کے اوراق ایسے ہی لوگوں کے نام سے روشن ہیں۔

نیا کا ناول۔ ہوائیں رُخ بدل گئیں،

نگہت عبد اللہ کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کا شمار قارئین کی پسندیدہ مصنفین میں ہوتا ہے وہ متعدد ناول اداسانے لکھ چکی ہیں۔ کرن میں ان کا ناول ”مجھے روٹنے نہ دینا“ شائع ہو کر پسندیدگی کی سند حاصل کر چکا ہے۔ اس ماہ سے ان کا نیا ناول شروع کیا جا رہا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ان کی یہ تحریر پچھلی تمام تحریروں سے بڑھ کر ثابت ہوگی۔

آہِ ارومی انشا،

انشاجی کے چھوٹے صاحبزادے اس طوفانی کواو دارع کہہ گئے۔

إِنَّا لِلّٰہِ وَإِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ ؕ

یہ طے ہے کہ جو اس دُنیا میں آئیے ہیں اُن کے لیے اسے ایک روز جانا ہے۔ اس کے باوجود دل اس حقیقت کو تسلیم نہیں کر پا رہا کہ ارومی انشا ہمارے درمیان نہیں رہے۔ انہیں غم اور دل غم سے چور ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کو بہشت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے فرائزے۔

ان کی اہلیہ اور دیگر متعلقین کو صبر جمیل سے نوازے۔ آمین۔

قارئین سے دُعا ہے مغفرت کی درخواست ہے۔

اس شامے میں،

، فنکار ”سید علی حسن“ سے شاہین رشید کی ملاقات، ، آواز کی دُنیا سے ”اس ماہ مہمان ہیں“ اس رات کاویں انجم،

، اداکارہ ”سوریا مشال“ کہتی ہیں ”میری بھی سہنے“، ، اس ماہ ”اشاعر“ کے مقابل ہے آئینہ،

، ”راپنزل“، تشریلہ ریاض کے سلسلہ وار ناول کی آخری قسط، ، ہوائیں رُخ بدل گئیں، نگہت عبد اللہ کے سلسلہ وار ناول کی پہلی قسط،

، ”من مود کوئی بات نہ مانا“، آسمان کا سلسلہ وار ناول، ، ریحانہ آفتاب کا مکمل ناول ”مجھے جیتے کا حق دو“،

، ”محبوبہ شمس“، مصباح علی سید کا مکمل ناول، ، ”میری پائل جوڑی کھٹکے“، حیرانوشین کا ناول،

، حیا بخاری کا ناول ”بہار منتظر ہے“، ، ”آواز دو“، شمع ملک کا ناول،

، یاسمین نشاط، شبیہ گل، خبابہ بشری اور مرزا سلیم کے افسانے اور مستقل سلسلے،

مفت،

”کرن کا دسترخوان“، کرن کے ہر شمارے کے ساتھ علیحدہ سے مفت حاصل کریں۔

بَارِ تَعَالٰی

سُورَةُ

سُورَةُ

سُورَةُ

میرا رب سب کا ہی حاجت روا ہے
وہ مانگو جو بھی جائز مدعا ہے

سراپا مغفرت ہے ذات اس کی
خطا پوشی تو اس کی اک ادا ہے

فنا ہوتی رہی ہر شے جہاں کی
فقط اللہ ہی بس باقی رہا ہے

نہ کوئی اس کا ثانی ہے جہاں میں
ہر اک شے میں وہی جلوہ نما ہے

ہے اس کے حُسن کی رعنائی ہر سو
وہی از ابتدا تا انتہا ہے

ہر اک نعمت ملی اقبال کو بھی
یہ سب اس کا کرم اس کی عطا ہے

اقبال آرزو

ذکر سرکار ہوتا رہا دیر تک
یاد میں ان کی روتا رہا دیر تک

ان کی چشم کرم مہرباں ہو گئی
نعت سرکار لکھتا رہا دیر تک

یاد میں ان کی آنسو نکلے رہے
داغ دل کے میں دھوتا رہا دیر تک

روضہ پاک سے ہم خوش بھرے تو پھر
ہجر کانٹے چھوٹتا رہا دیر تک

ذکر میں مست بہ خود ہوا جس گھڑی
خوشبوؤں سے مہکتا رہا دیر تک

جہنچے انجم جہاں محفل نعت میں
کیف و مستی کا چرچا رہا دیر تک

غالد انجم

سید علی حسن سے ملاقات

شاہن رشید



”اس چاند پہ داغ نہیں“ آن ایر ہے۔“
☆ ”گڈ..... کچھ اپنے بارے میں، کچھ اپنی
فیلی کے بارے میں بتائیے؟“
(۰) ”جی میرا پورا نام سید علی حسن ہے اور سب
مجھے علی ہی پلاتے ہیں۔ تاریخ پیدائش 11 اپریل ہے
اور ماس کمیونیکیشن میں، میں نے ماسٹر کیا ہوا ہے اور
فیلی میں والدین ہیں اور ایک بھائی اور ایک بہن ہے
اور زیادہ تر کینیڈا اور امریکہ میں رہتے ہیں، کیونکہ وہ
وہاں کے شہری ہیں تو آنا جانا لگا رہتا ہے اور میں بھی
آتا جاتا رہتا ہوں۔“

☆ ”11 اپریل آپ کی تاریخ پیدائش ہے۔
شکر کریں کہ فرسٹ اپریل نہیں تھی..... اور آپ
مستقل کینیڈا ایامریکہ میں کیوں نہیں رہتے۔“

ایک وقت تھا جب کسی سیریل کی تیاری سے
پہلے ”ہیرو“ ”ہیروئن“ کی تلاش شروع ہو جاتی تھی
اور جب تک ہیرو، ہیروئن کا انتخاب ہو نہیں جاتا تھا
سیریل نہیں ہوتا تھا۔ مگر اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ اب تو
ماشاء اللہ اتنا ٹیلنٹ آگیا ہے کہ کسی کی خوشامد یا
تلاش کی ضرورت ہی نہیں رہی..... علی حسن بھی ایک
ایسے ہی ”ہیرو“ ہیں جنہیں آپ آج کل ڈرامہ
سیریل ”اس چاند پہ داغ نہیں“ میں دیکھ رہے ہیں۔
☆ جی کیا حال ہیں ”علی حسن“؟

(۰) ”جی اللہ کا شکر ہے۔“

☆ کیا مصروفیات ہیں آج کل؟

(۰) ”ہم“ اور ”جیو“ کے دو پروجیکٹ ہیں جن
پر کام ہو رہا ہے اور ایک نئی چینل ”اے پلس“ سے

نہیں کہ پروڈکشن آپ کا ذریعہ آمدنی بھی ہوتا ہے..... اداکاری بھی ہے، مگر بہتر پروڈکشن ہے..... تو ان شاء اللہ پروڈکشن تو ساتھ ساتھ چلتی ہی رہے گی، لازمی۔“

☆ ”نام کیا ہے اور آپ کی پروڈکشن ہاؤس سے کیا کچھ نہیں پیش کیا جا چکا ہے؟“
(*) ”ایک تو سیریل ”وفانہ آشنا“ ہے اور ایک سیریل ”پھر کھونہ جائیں ہم“ سیریز ”گفتی گریں اب

(*) ہنستے ہوئے ”واقعی شکر ہے کہ فرسٹ اپریل نہیں تھی۔ ایک کے ساتھ ایک اور لگ گیا..... اور جہاں تک امریکہ یا کینیڈا میں رہنے کی بات ہے تو میرے یہاں اپنا پروڈکشن ہاؤس ہے اور کافی کام کر چکا ہوں اور شادی ابھی نہیں ہوئی۔“

☆ ”اچھا گڈ..... تو پہلے اداکاری میں آئے یا پہلے اپنا پروڈکشن ہاؤس بنایا؟“
(*) ”پہلے تو میں نے اپنا ماسٹر مکمل کیا، پھر



باقی ہیں، اس کے علاوہ نیلی فلمز کافی کی ہیں۔ تو جناب اپنے پروڈکشن ہاؤس سے کافی کام کر چکے ہیں۔ ہم، اور سیریل زیادہ کیے ہیں۔ ہم نے اور ہمارے پروڈکشن ہاؤس کا نام Aim Productions ہے۔
☆ ”اپنی تعلیم کی وجہ سے آپ اس فیلڈ میں آئے؟“

(*) ”تعلیم تو خیر تھی ہی لیکن شوق بھی اکثر سر اٹھارتا تا کہ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہے..... تو جیسا کہ میں نے کہا جراثیم تو تھے ہی، تو پروڈکشن کی تو اپنے آپ سے کہا کہ اداکاری تو میں بھی کر سکتا ہوں..... تو بس گھس گئے اس فیلڈ میں..... اور کچھ نہ کچھ کر ہی رہے

تھوڑے عرصے کے بعد ہی مجھے ”نیوزون“ سے آفر ہو گئی، تو تھوڑا عرصہ وہاں کام کیا۔ دل نہیں لگا، پھر ”جیو“ سے آفر آنے کی..... پھر پروڈکشن کا کچھ پلان ہوا کہ چلو پروڈکشن کرتے ہیں..... تو پھر پروڈکشن شروع ہو گئی۔ تھوڑی بہت اداکاری بھی کی..... دوستوں نے تعریف کی اور کہا کہ اسے مستقبل بنیادوں پہ کرو تو اس طرح مستقل بنیادوں پر اداکاری کی طرف آ گئے۔“

☆ ”مشکل کیا لگا اداکاری یا پروڈکشن؟“
(*) ”سچ بتاؤ کہ پروڈکشن بہت مشکل کام ہے۔ بہ نسبت اداکاری کے۔ لیکن اس سے بھی انکار

بات ہے۔ دوسرے ممالک کو دیکھو تو اتنا رشک آتا ہے۔ اب تو پڑوسی ملک نے اور خاص طور پر دینی نے بہت ترقی کر لی ہے اور بنگلہ دیش جو کل تک ہمارا تھا، اس نے بھی خاصی ترقی کر لی ہے، تو بس دل کڑھتا ہے اور کچھ کر بھی نہیں سکتے۔“

☆ ”جب فیس بک، انٹرنیٹ اور اسی طرح کی چیزیں نہیں تھیں تو لوگ مطالعہ بہت کرتے تھے۔ آپ کو کچھ عادت ہے؟“

(۰) ”سچ بتاؤ کہ مجھے مطالعہ کا شوق پہلے بھی نہیں تھا اور اب انٹرنیٹ کے بعد تو بالکل بھی نہیں رہا۔ حالانکہ میں ایسے سبجیکٹ کا طالب علم تھا جس میں مطالعہ بہت ضروری ہوتا ہے۔ مگر مجھے تو دلچسپی ہی نہیں۔ میں ”کتابی کیرا“ کبھی بھی نہیں تھا۔ اب تو جو معلومات لیتی ہوتی ہے وہ گوگل یا انٹرنیٹ سے لے لیتے ہیں۔“

☆ ”آپ لڑکوں کی طرح لڑکیاں بھی اس فیلڈ میں بہت آ رہی ہیں۔ لڑکیوں کے لیے آپ کا مشاہدہ کیا کہتا ہے؟“

(۰) ”میں دیکھتا ہوں کہ اب خاندانی ویلیوز ختم ہوتی جا رہی ہیں۔ خاص طور پر لڑکیوں میں۔ البتہ جو تھوڑی بڑی عمر کی خواتین ہیں، وہ اب بھی اپنی خاندانی ویلیوز کی بہت قدر کرتی ہیں اور خیال بھی رکھتی ہیں۔ شاید بیک لڑکیاں اپنی عمر کے تقاضوں کے حساب سے میچور نہیں ہوتیں اور آہستہ آہستہ میچور ہوتی ہیں۔ پھر کچھ گھر کی تربیت کا بھی نتیجہ ہوتا ہے اور اس سلسلے میں، میں اپنی مثال آپ کو دینا چاہوں گا کہ دیگر لڑکوں کی طرح مجھ میں کوئی بری عادت نہیں ہے۔ جیسے کہ لڑکوں کو سگریٹ نوشی کی عادت ہوتی ہے، مگر مجھ میں نہیں ہے اور میرے دوست یار بہت حیران ہوتے ہیں۔ نہ پان چھالیہ کی عادت ہے اور اس میں گھر کا ماحول اور اچھی تربیت کا ہاتھ ہوتا ہے۔“

☆ ”گھر کی تربیت کی بات کر رہے ہیں تو

ہیں اور میرا ایک ڈراما سیریل چلا تھا۔ ”آگ“ کے نام سے ”جیو“ یہ..... اس نے مجھے شہرت دی اور اس کے بعد مجھے مزید آفرز آئیں۔ اس کے بعد جتنے بھی ڈرامے ہوئے جیسے ”میری سہیلی میری بھابھی“ ”بندھن“ ”کہاں تم چلے گئے“ سب ہی پسند کیے گئے۔“

☆ ”پہلا پہل آپ نیوز میں گئے۔ پھر نیوز چھوڑ کیوں دی؟ حالانکہ اس میں بہت اسکوپ ہے؟“

(۰) ”میری پہلی کمائی نیوز ایجنٹر والی تھی اور ٹھیک ٹھاک تھی اور آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں کہ ”نیوز“ میں بڑا اسکوپ ہے اور ”ٹی وی ون نیوز“ والے تو مجھے چھوڑ ہی نہیں رہے تھے۔ کیونکہ میرا لاسٹ سسٹم بھی اسی چینل سے ہوا تھا، تو وہ تو چاہتے ہی نہیں تھے کہ میں ان کو چھوڑ دوں..... مگر پتا نہیں کیوں مجھے اس کام میں یکسانیت لگ رہی تھی کہ بس روز تیار ہو کے جاؤ اور خبریں پڑھ لو..... مجھے اطمینان نہیں ہو یا رہا تھا اور میں سوچتا تھا کہ یہ میرا فیوچر نہیں ہے..... مجھے کچھ اور کرنا ہے۔“

☆ ”گھر والوں کی کیا خواہش تھی۔“

(۰) ”چونکہ اس فیلڈ میں سوائے میرے کوئی تھا نہیں تو گھر والوں نے بھی اس کو سیریس نہیں لیا اور نہ ہی کبھی حوصلہ افزائی کی، نہ ہی کوئی خاص حوصلہ شکنی۔ مگر اب اللہ کا شکر ہے کہ سب کچھ سیٹ ہے اور مجھے یاد ہے کہ بچپن میں پڑھائی بہت زور دیا جاتا تھا تو اس وقت تھوڑا غصہ آتا تھا۔ مگر اب جب اس پڑھائی کی وجہ سے قابل بن گئے ہیں تو سوچتے ہیں کہ اگر گھر والے سختی نہ کرتے تو ہم آج یہاں نہ ہوتے۔“

☆ ”ملک سے باہر جانے کا اتفاق تو آپ کو ہوتا ہی رہتا ہے۔ واپس آ کر کیا لگتا ہے اپنا ملک؟“

(۰) ”اپنے ملک جیسا کوئی ملک ہے ہی نہیں..... بس ہمارے ملک کے حکمران اچھے ہو جائیں اور ملک کے ساتھ مخلص ہو جائیں تو کیا ہی

لوگوں کے لیے والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ خود
دلہن ڈھونڈیں، تو.....؟“

(۰) ”تو جناب والدین کی پسند سے ہی کروں گا
کوئی مجھے پسند آگئی تو بتا دوں گا، مگر فورس نہیں کروں
گا۔“

☆ ”بہ حیثیت ایک آرٹسٹ کے آج کل کے
ڈراموں کو کیسا دیکھتے ہیں؟“

(۰) ”بہ حیثیت ایک آرٹسٹ کے میں برائی تو
کر نہیں سکتا، اچھا بھی ہو رہا ہے۔ کچھ بہت اچھا نہیں
بھی ہو رہا۔ بس ایک بات کہنا چاہوں گا کہ
Content کی کمی ہے۔ سیریل کا تو
Content تو پھر بھی اچھا ہوتا ہے اور بعض اوقات
تو بہت اچھا ہوتا ہے، مگر سوپ کا نہیں۔ شروع کی
اقساط پھر بھی اچھی ہوتی ہیں، مگر پھر وہ لمبا ہی چلا جا رہا
ہوتا ہے۔“

☆ ”کوک اسٹوڈیو انجوائے کرتے ہیں؟ ویسے
کیسا لگتا ہے آپ کو؟“

(۰) ”بس ٹھیک لگتا ہے۔ کوئی کوئی سیزن اچھا
ہوتا ہے اور سیزن میں سب گانے اچھے بھی نہیں
ہوتے ہیں۔“

☆ ”پرانا سوال ہے۔ کردار۔ نسا کرنا چاہتے
ہیں؟“

(۰) ”کچھ بہت ہی مختلف قسم کا رول کرنا چاہتا
ہوں۔ عام رول تو کرتا ہی رہتا ہوں۔ دیکھیں کہ اب
میری خواہش کے مطابق مجھے کب لینی اچھا کردار ملتا
ہے اور مجھے رومانٹک رول بہت پسند ہیں، وہ بھی
کرنا چاہوں گا..... اور ”سیری“ سنا میری بھابھی“
میں بھی میرا رول بہت اچھا تھا اور اس رول میں رویا
بھی بہت ہوں۔ تو مجھے عموماً سوپ کے روپ اتنے
اچھے نہیں لگتے، مگر اس سوپ کا اسکرپٹ اچھا تھا۔
اسے بہت اچھا لکھا تھا ”شیر نشاٹ“ نے۔“

☆ ”فلم کی پیش کش ہو، تب رول کے لیے کیا
ڈیمانڈ ہوگی آپ کی؟“



(۰) ”یہ بی جو ڈراموں کے لیے کہ کوئی بہت
ہی اچھا، مختلف اور رومانٹک رول ہو۔ لوگ یاد رکھیں،
تعریف کریں..... یہ نہیں کہ دو چار گانے گائے، ہیرو
بنے رہے اور کیا کرایا کچھ بھی نہیں۔ ہلکے پھلکے لائٹ
کردار بھی کرنا چاہوں گا۔“

☆ ”آپ ہوں، دیگر فن کار ہوں کردار کو اپنے
اوپر طاری کر کے کرتے ہیں۔ کیا کردار آپ کی
شخصیت کے قریب بھی ہوتے ہیں۔ مطلب عکس ہوتا
ہے شخصیت کا؟“

(۰) ”زندگی اتنی ڈراما نہیں ہے، جتنا کہ دکھایا
جاتا ہے۔ مگر پھر تھوڑا بہت عکس ضرور ہوتا ہے۔
ڈرامے میں چونکہ مکراری شروع ہو جاتی ہے۔ مگر
تھوڑی حقیقت ضرور ہوتی ہے۔“

☆ ”گھر سے نکلتے وقت ٹپ ٹاپ سے نکلتے
ہیں یا بس جیسے ہیں، ویسے ہی نکل جاتے ہیں؟“

(۰) ”پہلے تو ایسا ہی ہوتا تھا کہ جن کپڑوں میں
گھر میں ہیں، نکل جاتے تھے کہ ہمیں کس نے دیکھنا

ریس والی ماڈلنگ نہیں کی اور نہ ہی ابھی تک قلم کی ہے۔ مگر ان شاء اللہ اپنے سارے شوق پورے کروں گا۔“

☆ ”علی کہا بات ہے کہ آج کل سارے ہی بیک لڑکوں نے ہلکی ہلکی ڈاڑھی رکھی ہوئی ہوتی ہے۔ جبکہ لڑکے تو ہمیشہ ہیرو ٹائپ نظر آنے کی خواہش رکھتے ہیں؟“

(۰) ”اصل مسئلہ یہ ہے کہ اگر ہم ڈاڑھی نہ رکھیں تو ہم اسکرین پر بہت کم عمر نظر آئیں اور کم عمر ہیرو کو پھر اپنی جگہ بنانے میں مشکل ہوتی ہے۔ اس لیے تھوڑا سا لک چنچ کرنا پڑتا ہے۔ لڑکیوں کے لیے تو یہ سہولت ہے کہ وہ میک اپ سے اپنا لک آسانی سے تبدیل کر لیتی ہیں، مگر ہمیں لڑکوں کو مشکل ہوتی ہے۔“

☆ ”گلٹیو رول کیسے آپ نے؟“
(۰) ”شروع میں تو ملے ہی گلٹیو رول..... تو میں تو ایک طرح کے رول کر کے بہت تنگ آ گیا تھا۔“
”آگ“ میں گلٹیو رول کیا تو پھر مسلسل گلٹیو رول ہی ملنے لگے تو میں نے سوچا کہ یہ تو چھاپ لگ جائے گی، چنانچہ جب گلٹیو رول کی آفر ہوئی تو میں نے انکار کر دیا۔ پھر مجھے ”تیری سہیلی میری بھابھی“ میں مجھے پوزٹیو رول ملا۔“

☆ ”اور کچھ کہنا چاہیں گے؟“
(۰) ”نہیں جی..... بہت شکریہ آپ نے سب کچھ ہی پوچھ لیا ہے.....“
اور اس کے ساتھ ہی ہم نے سید علی حسن سے اجازت چاہی۔

☆☆

ہے، مگر اب ایسا نہیں ہے، اب معلوم ہے کہ ہمیں دیکھنے والے بہت لوگ ہیں تو پھر زرا ٹائپ ٹاپ سے ہی لکھتا ہوں۔“

☆ ”اب تو زندگی بھی بہت سن لگتی ہوئی؟“
(۰) ”ہاں جی..... بہت سین لگتی ہے، بشرطیکہ کہ چیک باقاعدگی سے ملتے ہیں۔“ قہقہہ.....
☆ ”اس فیلڈ میں پیسا زیادہ ہے یا محنت؟“
(۰) ”دونوں..... مگر محنت زیادہ ہے۔ کیونکہ جب تک آپ اچھا رزلٹ نہیں دیں گے، آپ کو اچھا پیسا بھی نہیں ملے گا۔“

☆ ”کسی کام کرنے کو دل نہ چاہ رہا ہو تو؟“
(۰) ”تو پھر جھوٹ کا سہارا لیتا ہوں کہ یار مصروف تھا۔ مطلب سو بہانے کر کے ٹال دیتا ہوں، مگر اسے انکار بالکل بھی نہیں کرتا۔“

☆ ”ڈھیر سارا پیسا ہاتھ آ جائے تو کس طرح استعمال کریں گے۔“
(۰) ”مجھے گھومنے پھرتے کا، بڑ بولنگ کرنے کا بے حد شوق ہے، تو ہاتھ آئے پیسے کو انجوائے کروں گا اور خوب گھوموں گا، مزرے کروں گا۔“
☆ ”اپنی کوئی ایسی خوبی جس سے خوف آتا ہو؟“

(۰) ”جی بالکل ہے۔ میری Six سنس بہت تیز ہے جو الہام ہوتا ہے وہ ہو جاتا ہے اور یہ ہمارے لیے بہت نقصان دہ بھی ہوتا ہے کہ اگر ہمیں پہلے سے کچھ برا پتا چل جائے تو زندگی تکلیف دہ ہو جاتی ہے۔“

☆ ”اپنا آپ کب اچھا لگتا ہے؟“
(۰) ”جب میں شیشے میں اپنے آپ کو دیکھتا ہوں، تو بے ساختہ اللہ کی تعریف کرنے کو دل چاہتا ہے کہ کیا خوب صورت نوجوان بنایا ہے۔“
☆ ”ماڈلنگ کی آپ نے؟“
(۰) ”جی..... جی کرشل ماڈلنگ کی ہے۔ مگر

میری بھی سینے

سونیا مشال

شاہین رشید



☆: پورا نام میرا؟

(:۔ سونیا مشال۔

☆: میں پیار سے پکاری جاتی ہوں؟

(:۔ سونا۔

☆: میری ڈیٹ آف برتھ..... اور سال؟

(:۔ 3 نومبر 1991 اور میں ”قطر“ میں پیدا

ہوئی تھی۔

☆: قد / ستارہ؟

(:۔ 5 فٹ 9 انچ۔ خاصی لمبی ہوں ماشاء اللہ

اور ستارہ اسکار پیو ہے۔

☆: میرے بہن بھائی؟

(:۔ ماشاء اللہ تین بھائی ہیں اور تین بھائیوں

کی اکلوتی بہن ہوں اور چھوٹی ہوں۔

☆: میری تعلیم؟

(:۔ گریجویٹ ہوں فائن آرٹ میں۔

☆: شادی؟

(:۔ اسے پرسل سوال سمجھتی ہوں۔

☆: مجھے شہرت کی بلند یوں پر پہنچایا؟

(:۔ سوپ ”میکے کو دے دو سنگل“ بہت

مقبول ہوا تھا۔

☆: ٹیلنٹ سے جگہ بنی یا سفارش سے؟

(:۔ 100 فیصد ٹیلنٹ سے۔

☆: مارٹنک پرسن ہوں یا ناٹ؟

(:۔ میں تقریباً مارٹنک پرسن ہوں۔ خاص طور

پر جب شوٹ پہ جانا ہوں۔ اور ناٹ پرسن تو بالکل

چھٹی نہیں ہوں۔ بس جیسے ہی تھکی ہاری آتی ہوں۔

بستر پر ہوتی ہوں۔ بس۔

☆: زندگی تب بری لگتی ہے؟

(:۔ جب کوئی کرائس آ جائے۔ کوئی کام نہ

ہو رہا ہو۔ یا کام میں رکاوٹ ہو رہی ہو۔ بہت سی

وجوہات ہو سکتی ہیں۔

☆: آنکینہ کہتا ہے؟

(:۔ تم بہت پیاری ہو۔ مگر وقت ایک سا نہیں

رہتا اور ہم بڑے ہو گئے۔

☆: گھر میں کوئی خوشی کی خبر سنو لوں تو؟

(:۔ سارا گھر سر پر اٹھالیتی ہوں (مخاورغا) بلکہ

آسمان سر پر اٹھالیتی ہوں۔ جو کہ پہلے ہی ہمارے سر

پر ہوتا ہے۔



☆: ”Shay ہوں؟“

(: ”بہت زیادہ Shy ہوں۔ اپنی بات کو صحیح طرح بتانے میں پانی۔“

☆: ”سیاست میں میری سوچ؟“

(: ”ہم سب کو ایک ہونا چاہیے۔ ایک قوم۔ اتحاد۔ ایک دوسرے پر کچڑا چھلنا اچھا نہیں لگتا۔“

☆: ”موبائل پر الرٹ رہتی ہوں؟“

(: ”کہ ایسا نہ ہو کہ اماں کے ایس ایم ایس آئے ہوں اور مجھے جواب دینے میں دیر ہو جائے۔ مجھے معلوم ہے کہ دیر ہوگئی تو بہت ڈانٹ پڑے گی۔“

☆: ”میری عجیب عادت؟“

(: ”مجھے جب بہت بھوک لگتی ہے تو میرا دل چاہتا ہے کہ سب کچھ جلدی میرے آگے آجائے اور جب سب کچھ میرے آگے آجاتا ہے تو میری بھوک مرجاتی ہے۔ ہے نا عجیب عادت۔“

☆: ”مرد حضرات اور لڑکوں کے بارے میں

میری رائے؟“

(: ”میری زندگی میں ”مرد“ کی صورت میں

میرے والد آئے اور ”لڑکوں“ کی صورت میں

میرے بھائی آئے۔ اس لیے مجھے اچھے لگتے ہیں۔

دیگر کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔“

☆: ”مرد کب اپنے آپ کو ”ان سیکور“ فیمل

کرتے ہیں؟“

(: ”میرے خیال میں جب ان کی زندگی میں

آئی ہوئی عورت گھر سے نکل کر باہر جاب کرتی ہے۔“

☆: ”سینما ہاؤس میں پہلی فلم کون سی دیکھی

تھی؟“

(: ”کون سی فلم دیکھی تھی یہ تو یاد نہیں۔ البتہ پہلی

فلم میں نے قطر میں دیکھی تھی۔“

☆: ”فقیر سامنے آجائے تو؟“

☆: ”تو بحث نہیں کرتی۔ آرام سے بیگ سے نکال کر 50 روپے دے دیتی ہوں۔“

☆: ”میرے خیال میں؟“

☆: ”ہمیں کچھ سیکھنے کے لیے تجربات بھی کرنے چاہیں اور دوسروں کے تجربات سے بھی فائدہ اٹھانے چاہئیں۔ تب ہی شخصیت میں پرفیکشن آتی ہے۔“

☆: ”عموماً لوگ جب مل کر بیٹھتے ہیں تو؟“

☆: ”تو یہی تبصرے ہوتے ہیں کہ فلاں کو دیکھو کتنی ترقی کر گیا ہے۔ ہم تو وہیں کے وہیں ہیں۔ مطلب عموماً لوگوں کا تبصرہ دوسروں کے بارے میں ہی ہوتا ہے۔ اور یہ بات مجھے پسند نہیں۔ محفل میں

انسان کو اپنی ہی باتیں کرنی چاہیں۔“

☆: ”میرا دل دکھتا ہے جب؟“

☆: ”جب میں امیر اور غریب میں بہت فرق دیکھتی ہوں۔ خاص طور پر لوگوں کے رویے بہت دکھ دیتے ہیں۔“

☆: ”شاپنگ میں کیا بات ناقابل برداشت لگتی ہے؟“

☆: ”مہنگائی۔ اب ہمارے ملک میں بہت مہنگائی ہو گئی ہے۔ ہر چیز کے لیے کئی بار سوچنا پڑتا ہے۔“

☆: ”انسان کا اصل روپ دیکھنا ہوتا؟“

☆: ”تو اسے غصے میں دیکھیں۔ وہ تمام باتیں وہ تمام نفرتیں جو اس کے دل میں ہوتی ہیں باہر آ جاتی ہیں۔ پھر انسان کو پہچاننے میں دیر نہیں لگتی۔ اور بعض لوگ غصے میں بھی ایسی بات نہیں کرتے کہ دل

دکھے۔ وہ ان کا روپ ہوتا ہے۔ کہ ان کے دل میں ہمارے لیے کچھ نرم گوشہ ہے۔“

☆: ”اگر آپ میرے بیگ کی تلاشی لیں تو؟“

☆: ”تو اس میں سے بہت سی چیزیں نکلیں گی جیسے والٹ ہے، پرفیوم ہے، میک اپ کی ضروری چیزیں ہیں۔ اور میری ضرورت کی ہر چیز نکلے گی۔“

☆: ”کہاں جا کے پرسکون ہو جاتی ہوں؟“

☆: ”جب اپنے گھر آتی ہوں۔ لگتا ہے کہ جیسے گوشہ عافیت میں آ گئی ہوں۔“

☆: ”میں جھوٹ بولتی ہوں؟“

☆: ”فقط یہ۔“ سچ میں جھوٹ بولا نہیں جاتا۔ سر نیچا کر کے اور آنکھیں بند کر کے بھی بولوں تو پکڑی جاتی ہوں۔ مہارت نہیں ہے اس کام میں۔“

☆: ”اپنے آپ میں کیا بدلنا چاہتی ہوں؟“

☆: ”میں تھوڑی پراعتماد ہونا چاہتی ہوں تھوڑی کمی ہے مجھ میں خود اعتمادی کی۔ بولتی بھی کم ہو۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ مغرور ہوں۔“

☆: ”بچپن میں جمع کرتی تھی؟“

☆: ”گڑیاں..... ٹیڈی بیئر..... اس قسم کے کھلونے اور ایک ٹیڈی بیئر اور ایک گڑیا تو ابھی بھی میرے پاس محفوظ ہے۔“

☆: ”غصہ کس پر اتراتی ہوں؟“

☆: ”کھانے پر۔ کھانا پینا چھوڑ دیتی ہوں۔ اور ایسا میں نے کئی بار کیا ہے۔“

☆: ”کب الفاظ کا ذخیرہ منہ سے نکلنا شروع ہو جاتا ہے؟“

☆: ”فقط یہ..... کیا خوب سوال ہے..... غصے میں۔ بولے چلے جاتی ہوں۔ بولے چلے جاتی ہوں۔“

☆: ”کھانے کے ساتھ کیا کھانے کی شوقین



ہوں؟

(:-) پودینے کی چٹنی..... بہت مزے کی ہوتی ہے۔

☆:- کبھی گہری نیند سے اٹھ جاؤں تو؟

(:-) تو پورا دن سر میں درد رہتا ہے۔

☆:- مجھ میں یہ صفت ہے کہ؟

(:-) کہ میں پاکستانی اور غیر ملکی کھانے بہت اچھے پکا لیتی ہوں۔

☆:- میں ڈرتی ہوں؟

(:-) اپنے پیاز کے غصے سے۔

☆:- برا وقت جو گزارا؟

(:-) صرف میں نے ہی نہیں، ہم پوری فیملی نے برا وقت گزارا، جب ہم قطر سے پاکستان شفٹ ہوئے تھے۔

☆:- مجھے اچھا لگتا ہے۔

(:-) فارغ اوقات میں ڈرائیونگ کرنا، میوزک سننا، مووی دیکھنا اور کسی اچھی سی کتاب کا مطالعہ کرنا۔

☆:- بہترین وقت وہ ہوتا ہے جب؟

(:-) جب انسان کے خواب پورے ہو رہے ہوں اور وہ مزید خوابوں کو پورا کرنے کے لیے جدوجہد کر رہا ہو۔

☆:- کھانا کھانے کے لیے اوپشن؟

(:-) میرا پہلا اوپشن تو یہی ہوتا ہے کہ اگر میں کم میں ہوں تو اپنے بیڈ پر ہی کھانا کھاؤں..... اس سے اچھی جگہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔

☆:- میری خواہش ہے اس فیلڈ میں کہ:-

(:-) کہ میں ”ہابی ووڈ“ کے فنکاروں سے ملوں اور اپنے ملک کے سینئر لوگوں سے ملوں۔

☆:- گھر سے نکلنے وقت ساتھ لے کر چلتی ہوں؟

(:-) اپنا بیگ، والٹ اور پیڈ فون اور موبائل۔

☆:- برے وقت کا ساٹھی کون ہوتے ہیں؟

(:-) پرانے لوگ..... عموماً اپنے تو ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔

☆:- میں محتاط رہتی ہوں؟

(:-) کسی کو اپنا فون نمبر دینے اور گھر کا ایڈریس دینے میں محتاط رہتی ہوں۔

☆:- کہاں خرچ کرنے میں مزا آتا ہے؟

(:-) اپنے والدین کے لیے اور اپنے بھائیوں کے لیے خرچ کر کے مزا آتا ہے۔

☆:- تحفہ دیتے وقت خیال رکھتی ہوں کہ؟

(:-) ایسا تحفہ دوں جو اس کے استعمال میں بھی آئے۔

☆:- بچت کرتی ہوں؟

(:-) کوشش کرتی ہوں۔ عموماً فضول خرچی نہیں کرتی، کیونکہ پیسہ بہت مشکل سے ملتا ہے..... بہت محنت کے بعد۔

☆:- کس شہر کے پکوان مزے دار ہوتے ہیں؟

(:-) ہر شہر کی کوئی نہ کوئی ڈش خاص ہوتی ہے..... مگر لاہور شہر کا ہر کھانا مزے دار ہوتا ہے۔

☆:- آج کل میرا ”آن ایر“ ڈرامہ؟

(:-) ”فیصلہ“ میرا کردار بہت اچھا ہے۔

☆:- مجھے فویا ہے؟

(:-) کیڑے مکوڑوں سے بہت ڈرتی ہوں۔

☆:- کیڑے مکوڑوں سے بہت ڈرتی ہوں۔

☆:- دل بچ بولتا ہے یا دماغ؟

(:-) بولتا ہے تو دونوں ہی سچ ہیں، مگر مجھے دماغ کی باتیں زیادہ صحیح لگتی ہیں۔

☆:- اپنی ایک اچھی عادت؟

(:-) محفل میں کسی کی برائیاں نہیں کرتی، چغلیاں نہیں کھاتی۔ کسی کا برا نہیں چاہتی۔

☆:- خوش محسوس کرتی ہوں؟

(:-) صبح کی تازہ ہوا میں۔

☆:- ذائقہ کس کے ہاتھ میں ہوتا ہے، مرد یا عورت؟

(:-) گھر اور ملک میں عورت کے ہاتھ میں اور ملک سے باہر مرد کے ہاتھ میں ذائقہ ہوتا ہے۔

☆☆

ایم اولیس انجم

شاہین رشید

☆ ”کیسے ہیں آپ؟“
(۰) ”اللہ کا رحم ہے۔“

☆ ”یہ ایم اولیس سے کیا مراد ہے۔ یعنی پورا نام کیا ہے، اور کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟“
(۰) ”جنتاب میرا پورا نام شیخ محمد اولیس انجم ہے۔ البتہ اکثر دوست احباب میں ”شیخو“ کے نام سے جانا جاتا ہوں۔ والد صاحب سرکاری ادارے سے ریٹائرمنٹ کے بعد آرام فرما رہے ہیں، جبکہ والدہ صاحبہ جو کہ تدریس کے شعبے سے وابستہ ہیں۔ امور خانہ داری میں بھی ماہر ہیں۔ بہن، بھائیوں میں میرا نمبر تیسرا ہے۔ مجھ سے بڑا دو بہنیں ہیں اور ایک

گزرے زمانے میں انسان کی تنہائی کے دو ہی ساتھی ہوتے تھے۔ ایک کتابیں اور دوسرا ریڈیو..... کتابوں کا ساتھ تو انسان نے چھوڑ دیا کہ انٹرنیٹ کے ذریعے ان کی تسکین ہو جاتی ہے، لیکن ریڈیو کا ساتھ نہیں چھوڑا کہ جب کچھ نہیں ہوتا، تب ریڈیو ہوتا ہے۔ اور گاؤں اور چھوٹے شہروں کے لوگ جو موبائل کا استعمال نہیں جانتے، وہ ریڈیو سے اپنا دل بہلاتے ہیں اور ان کا دل بہلاتے ہیں ”آر بے“ جو اپنی باتوں اور خوب صورت میوزک سے لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیتے ہیں..... ہمارے آج کے مہمان ”ایم اولیس انجم“ ہیں۔



دی کا تعلق ہے تو موقع ملا تو ضرور اپنے فن کو مناؤں گا۔ اگرچہ میری فیملی میں کوئی بھی اس فیلڈ سے وابستہ نہیں ہے، مگر فیملی کی سپورٹ ہمیشہ میرے ساتھ رہی، الحمد للہ۔“

☆ ”آپ نے کہا کہ تقریباً آٹھ سال سے ریڈیو سے وابستہ ہیں تو پہلے کس ایف ایم میں تھے؟ عام ایف ایم اور ایف ایم 101 میں کیا فرق ہے؟“ (۰) ”میرے ریڈیو کیریئر کا آغاز بھی ریڈیو پاکستان اور PBC ایف ایم 101 سے ہوا۔ اس سے قبل موبائل ریڈیو شوز کیا کرتا تھا۔ ریڈیو پاکستان ہماری ثقافت اور قومی ورثے کی حفاظت کا علمبردار ہے اور یہ ہی انفرادیت اس کو دیگر چینل سے منفرد کرتی ہے۔“

☆ ”اپنے پروگراموں کے بارے میں بتائیے اور فارمیٹ کیا ہوتا ہے، ان کا؟“ (۰) ”میری الحال تو جتنے میں دو پروگرام ہیں۔

بروز پیر شام 7 بجے سے 9 بجے تک ہوتا ہے، جس میں ہم اپنے سامعین سے ”انوکھا سوال“ کرتے ہیں۔ دوسرا پروگرام بروز جمعہ شب 10 سے 12 استاد محترم ربیعان اسلامی کے ہمراہ ”ٹھنڈی جگت“ شو کرتے ہیں، جس میں اپنے سامعین کے چہروں پہ مسکراہٹیں نکھرتے ہیں اور میوزک کی سلیکشن خود کی پسند کی ہے جو کہ شو کے فارمیٹ کے مطابق ہی ہوتی ہے۔“

☆ ”ریڈیو ایک باورفل میڈیم ہے، اس کے ذریعے ہم اپنے ملک میں کیا پیج لاسکتے ہیں؟“

(۰) ”ریڈیو ہمیشہ سے ہی باورفل میڈیا رہا ہے۔ الحمد للہ اعلان آزادی ہو یا پھر عوام کے تعاون کی اپیل، ریڈیو کا کردار ہمیشہ منفرد رہا ہے۔ ریڈیو تو ایک ایسا میڈیم ہے کہ جہاں فی وی نہیں، وہاں ریڈیو کی فریکوئنسی پہنچ جاتی ہے۔ اس کی مثال یوں لیجیے کہ ”سیاچن کی سنگلاخ چٹانوں میں ریڈیو پاکستان کی آواز پہنچ رہی ہوتی ہے اور لوگ حالات حاضر سے بھی باخبر رہتے ہیں اور دلفریب میوزک کو بھی



چھوٹا بھائی سے تعلیمی سفر یوں تو کبھی ختم نہیں ہوتا، مگر پھر بھی ”ماس کمیونیکیشن میں ماسٹرز کی تعلیم، اختتامی مراحل میں ہے۔ ویسے تو لاہور میرا آبائی شہر ہے مگر چونکہ کراچی میں میری پیدائش اور زندگی کا سفر گزرا ہے تو کراچی سے بہتر کوئی شہر نہیں لگتا اور اب رہ گیا شادی کا سوال تو (قبضہ) شادی کا سوال کیوں پوچھا جاتا ہے، ہر خور و نو جوان نے کیا ان کی ہنسی ہلکتی زندگی پسند نہیں اور ہاں میری تاریخ پیدائش 18 اپریل ہے۔“

☆ ”ریڈیو سے وابستگی کب سے ہے اور ریڈیو ہی کیوں؟ فیملی میں کوئی اور بھی اس فیلڈ میں ہے؟“ (۰) ”آواز کی دنیا یعنی ریڈیو کی دنیا سے تعلق تقریباً آٹھ سال سے ہے۔ البتہ ریڈیو پاکستان کے ایف ایم سے تعلق کو الحمد للہ 4 سال ہو گئے ہیں۔ آواز کی دنیا ایک منفرد دنیا ہے۔ آپ اپنی آواز کا بہتر استعمال کر کے خود کو منوا سکتے ہیں۔ ریڈیو کا شوق بچپن سے رہا اور آج جب ان شخصیات کے ساتھ پروگرام کرنے کا موقع ملتا ہے جنہیں ہم کبھی ریڈیو پہ سنا کرتے تھے تو بہت خوشی ہوتی ہے اور جہاں تک فی

انجوائے کرتے ہیں اور معاشرے کے مسائل کو زیر بحث لا کر بہت کچھ پیچیدہ کیا جاسکتا ہے۔“

☆ ”ریڈیو اور ٹی وی کا موازنہ کیا جاسکتا ہے؟“
(۰) ”ریڈیو اور ٹی وی کا موازنہ کچھ ناموافق ہی لگتا ہے۔ ریڈیو نے تو بہت مشہور فن کاروں کو جنم دیا ہے اور ریڈیو ان کی پہچان بنا ہے۔ بہر حال ہر تخلیق کی اپنی ایک افادیت ہے۔ ٹی وی کی اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔“

☆ ”جن سے میں نے آپ کا نمبر لیا، انہوں نے آپ کی تعریف کی، کیونکہ ظاہر ہے کہ آپ اچھا پروگرام کرتے ہیں۔ یہ بتائیے کہ گیمرا ہو یا مائیک ایک بے جان چیز ہے، تو ایک بے جان چیز کے سامنے پروگرام کرنا، بات کرنا، کیسا لگتا ہے؟“
(۰) ”جنہوں نے میری تعریف کی، یہ ان کا حسن سماعت ہے۔ استادوں سے سیکھا ہے ان کی تربیت ہے کہ اچھے طریقے سے پروگرام کر لیتا ہوں اور جناب بڑا مشکل ہوتا ہے ایک کمرے میں بیٹھ کر خود سے باتیں کرنا اور مجھے یاد ہے کہ جب پہلی بار مائیکروفون کا سامنا ہوا تو کم و بیش 45 منٹ کا پروگرام کپکپاتے ہوئے ہی کیا اور الحمد للہ پھر جو خوف دور ہوا تو اب تک سلسلہ جاری ہے۔“

☆ ”پروگرام کے لیے تیاری کرتے ہیں۔ یا فی البدیہہ بولتے ہیں، اور کبھی ایسا ہوا کہ ایک دم موضوع پیچیدہ کرنا پڑ گیا ہو؟“

(۰) ”پروگرام کی تیاری کرنا تو بہت ضروری ہے۔ چاہے آپ صرف میوزک کا پروگرام کریں یا معلوماتی پروگرام..... مطالعہ کا ہونا بہت ضروری ہے اور آپ نے پوچھا کبھی موضوع پیچیدہ کرنا پڑا، تو مجھے یاد ہے کہ جس روز عبدالستار ایدھی صاحب کا انتقال

ہوا اس شب موضوع کچھ اور تھا اور اس خبر کے بعد ہم نے فوراً اپنا موضوع تبدیل کیا۔ تو ایسے موقع آجائیں خدا نا خواستہ تو پھر موضوع کا رخ موڑنا پڑتا

ہے اور یہ آپ کی مہارت پر ہوتا ہے کہ آپ کس طرح موضوع کا رخ بدلتے ہیں اور کس طرح مطلقہ شخصیت کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں، تو اس کے لیے کوئی بھی آرہے ہو اس میں تاج کا ہونا بہت ضروری ہے اور تاج مطالعہ سے ہی آتی ہے۔“

☆ ”لائو کالز میں کبھی ایسا ہوا کہ آپ کو شرمندگی ہوئی ہو یا سننے والے کو شرمندگی ہوئی ہو؟“
(۰) ”ایسا کبھی نہیں ہوا الحمد للہ..... کیونکہ

ریڈیو پاکستان سے تعلق ہے اور یہ ایک ایسا ادارہ ہے جہاں ہندیب، تمیز اور تمدن سکھایا جاتا ہے اور ہمارے سامعین بھی اس چیز کا بہت خیال رکھتے ہیں، تو الحمد للہ ایسا کوئی اتفاق نہیں ہوا اور لائو کالز لینے کا سلسلہ جاری رہتا ہے، ہمارا جو رات کا پروگرام ہوتا ہے اس میں ہم گفتگو ہی سامعین سے کرتے ہیں، تو کوئی قابل ذکر واقعہ نہیں ہوا۔“

☆ ”آپ نے بتایا تھا کہ آپ باہر سے آئے ہوئے ڈراموں میں ڈبنگ بھی کرتے ہیں، تو کیا یہ



(۰) ”فارغ اوقات میں موسیقی سن لیتا ہوں،

یا پھر مودی دیکھ لیتا ہوں اور اکثر اوقات ناؤں بھی پڑھ لیتا ہوں۔ جدید دور نے کام آسان کر دیا ہے۔ موبائل میں E Books کی صورت میں ذخیرہ موجود ہے۔“

☆ ”سوال تو لڑکیوں والا ہے، مگر اب نو جوان لڑکے بھی اس فیلڈ میں آ رہے ہیں، تو کچھ کھانے پکانے سے بھی آپ کو شغف ہے؟“

(۰) ”امور خانہ داری کا آپ نے پوچھا، تو بس یہ سمجھ لیجیے کہ اپنے کھانے کا انتظام بخوبی کر لیتا ہوں اور چکن بریانی جی بہت اچھی بنا لیتا ہوں اور کچھ اور بھی۔“

☆ ”چلیں جی، آنے والی کو بھی آسانی ہو جائے گی؟“

(۰) ”قبہ“ ”ارے بھی کیا میں آپ کو ہنسا کھلتا کسی کو پسند نہیں، یا اچھا نہیں لگتا، جوشادی کے لیے کہا جاتا ہے۔“

☆ ”ہم تو آپ کی نیگم کی سہولت کے لیے بات کر رہے تھے اور ویسے بھی آپ لاہور کے ہیں تو؟“

(۰) ”جی..... بالکل لاہوریے ہیں اور لاہوریوں کو کھانے پینے کا بہت شوق ہوتا ہے، تو جناب کھانے کے معاملے میں تو ہم سے آگے کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ اچھا کھانا ہو، خواہ کہیں بھی ہو، گھر میں تو کھاتے ہی رہتے ہیں، باہر اچھا کھانا ہو تو چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔“

☆ ”چھٹی کا دن کہاں گزارتے ہیں آپ؟“

(۰) ”چھٹی کا دن ایک ہی ہوتا ہے یا پھر کبھی کبھی دو چھٹیاں بھی مل جاتی ہیں تو پھر دل چاہتا ہے کہ گھر میں رہ کر آرام کیا جائے، تو میں ٹھونسنے پھرنے سے زیادہ آرام کو ترجیح دیتا ہوں۔“

☆ ”ایف ایم 101 میں کن سے آپ نے بہت سیکھا؟“

مشکل کام ہے اور اس میں پسپا ملتا ہے؟“

(۰) ”ڈنگ بھی آواز کی دنیا کا ایک شعبہ ہے اور اس میں کام کر رہا ہوں اور الحمد للہ کہ جو بھی کام اس میں لوگوں نے پسند کیا، جہاں تک پیسے کا تعلق ہے تو یہ شعبہ بھی روزگار کا ایک ذریعہ ہے اور بہت سارے لوگوں کا روزگار اس سے وابستہ ہے، خواہ وہ صداکار ہوں یا پھر ٹیکنیکل اسٹاف ہو اور جس جگہ سے روزگار وابستہ ہو وہاں مشکل یا آسانی نہیں دیکھی جاتی۔ بس کام دیکھا جاتا ہے اور جہاں تک دستاویزی فلموں کی بات ہے تو اس میں بھی کام چلنا رہتا ہے اور سننے والے پسند کرتے ہیں اور جہاں تک دیکھنے والوں کی بات ہے تو یقیناً لوگ ان ڈراموں کو پسند کرتے ہیں، تب ہی یہ چل بھی رہے ہیں اور انڈسٹری بھی چل رہی ہے اور ڈنگ ایک طرح سے ”آواز“ کا ایک موڈی فائن فارم ہے۔ بہت ساری ایسی آوازیں آپ کو سننے میں ملتی رہیں جن کو آپ اکثر اوقات پہچان بھی نہیں پاتے۔“

☆ ”کیمرے کے آگے آ کر کام کرنے کو دل نہیں چاہتا کیا۔ یا اس فیلڈ میں آپ زیادہ ایزی فیل کرتے ہیں؟“

(۰) ”ہر انسان کا دل چاہتا ہے کہ وہ بہتر سے بہتر کی طرف جائے اور کیمرے کے پیچھے رہ کر تو ہم کام کر ہی رہے ہیں اور کیمرے کے آگے یہ حیثیت مہمان کے جانے کا اتفاق کافی بار ہوا ہے اور ان شاء اللہ اگر موقع ملا تو کیمرے کے سامنے بھی اپنے فن کو خوب آزمائیں گے۔ کیمرے کے سامنے والے اداکار کہلاتے ہیں اور مائیک والے صداکار..... تعلق دونوں کا ہی فن سے ہوتا ہے..... تو ان شاء اللہ کبھی زندگی میں موقع ملا تو کیمرے کے سامنے آ کر بھی اپنے فن کا مظاہرہ کریں گے۔“

☆ ”اور کیا مشاغل ہیں آپ کے، فارغ اوقات میں کیا کرتے ہیں؟“

ہماری چھوٹی سی خوشی ان کے چہروں پر ان کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دیتی ہے اور سننے والے اس پروگرام کو پسند بھی بہت کرتے ہیں۔ ریحان اسدی اور میں مل کر یہ پروگرام کرتے ہیں اور اکثر لوگ کہتے ہیں کہ یہ تو بہت ہی ٹھنڈی جگت شو ہے۔ یہ پروگرام ہر جمعہ کو رات 10 سے 12 بجے تک پیش کیا جاتا ہے۔

☆ اور اس کے ساتھ ہی ہم نے آخری سوال کیا کہ ”آپ اپنے سامعین سے کچھ کہنا چاہیں گے؟“

(۰) ”جو سامعین ہمیں پسند کرتے ہیں۔ سنتے ہیں اور اپنا فیڈ بیک دیتے ہیں، ان سے شکریے کے ساتھ گزارش ہے کہ ہمیں سنتے رہیں اور ریڈیو سے وابستہ تمام لوگوں سے محبت کرتے رہیں اور یہ آپ کا پیار اور آپ کی چاہت ہی ہے کہ ہم آپ کے لیے مزید اچھے سے اچھا پروگرام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔۔۔۔۔ اگر ہمارے سے کوئی غلطی ہوگئی ہو کوئی کوتاہی ہوگئی ہو تو ہمیں ضرور بتائیے۔ ہم اپنی اصلاح کریں گے۔۔۔۔۔ لوگ تنقید برائے تنقید کریں تو غلطیوں کی اصلاح کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔

اور جلتے جلتے شیخ محمد اولیس نے بتایا کہ وہ سالگرہ منانے کے شوقین تو نہیں ہیں، مگر اگر موقع مل جائے تو پھر قریبی رشتے داروں اور دوستوں کے ساتھ سیلیبریٹ کر لیتے ہیں اور دوست بھی بہت اچھے ہیں وہ بھی میری سالگرہ سیلیبریٹ کرتے ہیں۔۔۔۔۔ مگر باقاعدہ کوئی تیار نہیں ہوتی اور خوشیاں بہت کم ہیں انسان کی زندگی میں اس لیے جب بھی موقع ملے خوشیاں ضرور سیلیبریٹ کر دیں۔۔۔۔۔ اور اولیس نے یہ بھی بتایا کہ وہ گھر میں اپنی والدہ اور بڑی بہن کے بہت قریب ہیں اور اپنی زندگی کے زیادہ تر مسائل ان ہی دو سے ڈسکس کرتا ہوں اور ان سے مشورے بھی ضرور لیتا ہوں۔“

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے شیخ محمد اولیس سے شکریہ کے ساتھ اجازت چاہی۔

☆☆

(۰) ”جی۔۔۔۔۔ جی۔۔۔۔۔ میں خود بھی چاہتا ہوں کہ اپنے استادوں کا نام ضرور لوں، جنہوں نے میری تربیت کی اور جن سے میں نے بہت کچھ سیکھا، ان میں محترمہ ”ربیعہ اکرم“ صاحبہ ”محترمہ میمونہ صاحبہ“ محترمہ ”عظمیٰ بلوچ صاحبہ“۔۔۔۔۔ ”مرزا ہمایوں“ ”جناب ریحان اسدی“ ”جناب عاصم بشیر صاحب“ ”جناب احتشام الحق صاحب“ اور دیگر۔۔۔۔۔ جن کا میں ہر لمحہ مشکور رہتا ہوں کہ انہوں نے مجھے بہت سکھایا ان کی تربیت سے ہی آج میں مکمل ہوں۔

☆ ”شہری علاقوں کے اور دینی علاقوں کے سامعین میں کیا فرق ہے آپ کے خیال میں؟“

(۰) ”شہری علاقوں کے سامعین اور دیہی علاقوں کے سامعین میں فرق کرنا آج کے دور میں ایک مشکل کام ہے۔

☆ ”پروگرام کے دوران کوئی ایسا واقعہ پیش آیا کہ جو یادگار رہ گیا ہو؟ کوئی غلطی؟“

(۰) ”ایسے تو بہت سے واقعات اور اتفاقات ہوتے رہتے ہیں اور جہاں تک غلطیوں کی بات ہے تو اگر بیان کرنے بیٹھیں تو ایک لمبی فہرست ہو جائے گی اور میرے لیے یادگار واقعہ تو یہ ہی ہوتا ہے کہ جب آپ کوئی اچھا پروگرام کریں اور آپ کے استاد آپ کو فون کر کے آپ کی تعریف کریں تو اس سے زیادہ ان کی کوئی بات نہیں ہوتی۔۔۔۔۔ پروگرام کے اختتام پر آپ کے استاد حوصلہ افزائی کریں اور آپ کی انتظامیہ آپ کو سپورٹ کرے تو اس سے زیادہ اچھی بات کیا ہو سکتی ہے اور سامعین بھی اگر حوصلہ افزائی کریں تو بہت خوشی ہوتی ہے۔“

☆ ”آپ کا ایک پروگرام ہوتا ہے ”ٹھنڈی جگت شو“ اس کے بارے میں کچھ بتائیں؟“

(۰) ”اس پروگرام میں لمبی مذاق اور کچھ اس طرح کی گفتگو کی جاتی ہے کہ سننے والے بہت انجوائے کرتے ہیں۔۔۔۔۔ تو کوئی پریشان ہے یا اداس ہے تو

اُشاخیر

ادارہ

س:- ”اصلی نام کیا ہے، گھر والے پیار سے کیا کہتے ہیں؟“

ج:- ”نام تو میرا سحر خیر ہے لیکن مجھے اُشا کہلوانا پسند ہے، گھر والے اُشا ہی کہتے ہیں۔“

س:- ”آئینہ آپ سے کیا کہتا ہے؟“

ج:- ”آئینہ تو مجھ سے کچھ نہیں کہتا، البتہ میرا اپنا عکس مجھ سے بہت کچھ کہتا ہے بلکہ سوال پوچھتا ہے۔ کون ہو؟ کیا ہو؟ کیوں ہو؟ بلا ارادہ ہی میں خود کو خود ہی کھونچنے نکل پڑتی ہوں۔“

س:- ”حسین صورتیں دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟“

ج:- ”وہ ہی جو خود کو دیکھ کر آتا ہے۔“

س:- ”اگر آپ کے پرس کی تلاشی لی جائے تو؟“

ج:- ”تو اس میں سے قلیل سی رقم، سادہ سا موبائل فون، سونف ساری اور ایک عدد انگٹھی (آرٹیفیشل) کے علاوہ کسی کو کچھ نہیں ملے گا۔“

س:- ”بھوتوں سے ڈرتی ہیں؟“

ج:- ”کیوں؟ کیا میں انسان نہیں ہوں۔“

س:- ”مہمان کیسے اچھے لگتے ہیں؟“

ج:- ”مہمان کیسے بھی ہوں، مجھے کمپنی دینے والی، کوئی میرے جیسی دوشیزہ اگر ان کے ساتھ نہ ہوتی تو ایسے مہمان مجھے ذرا کم ہی اچھے لگتے ہیں۔“

س:- ”کھانے میں کیا پسند ہے؟“

ج:- ”آلو گوشت، گوہی گوشت، پالک گوشت، کرلیے گوشت، گوشت ہی گوشت۔“

س:- ”اگر آپ کو حکومت مل جائے تو کیا کریں گی؟“

ج:- ”پہلے اپنے آپ کو بدلنے کی (سدھارنے کی) کوشش کروں گی، اگر اس میں کامیاب ہو گئی تو سب سے پہلے بجلی و گیس کے بحران پر قابو پانے کی کوشش کروں گی۔“

س:- ”پسندیدہ شاعر؟“

ج:- ”شاعری سے بالکل بھی لگاؤ نہیں۔ ہاں اگر پر سنالٹی کی بات کروں تو علامہ اقبال میرے پسندیدہ ہیں۔“

س:- ”مزا جاکڑا کا ہیں؟“

ج:- ”جی ہاں جناب، صحیح پہچانا اک ذرا سی چنگاری پوری عمارت کو جلا کر بھسم کر دینے کے لیے کافی ہے۔“

س:- ”کس مزاج کے لوگ پسند ہیں؟“

ج:- ”بذلہ سنج، باتونی، جن کے ساتھ وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہو۔“

س:- ”اگر لوڈ شیدنگ نہ ہوتی تو؟“

ج:- ”تو پھر یقیناً پاکستان پر میری حکومت ہوتی۔“

س:- ”اللہ کو یاد کرنے کا بہترین وقت؟“

ج:- ”رات کا وقت، جب اندھیرے میں قبر یاد آتی ہے تو موت کا خوف اللہ سے قریب کر دیتا ہے۔“

س:- ”آپ کفایت شعار ہیں یا فضول خرچ۔“

ج:۔ کفایت شعار (مگر میری بہن مجھے کنجوس کہتی ہے)۔

س:۔ ”کیا نام شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے؟“

ج:۔ جی ہاں، بالکل۔ اسی لیے تو روزانہ صبح جلدی جاگتی ہوں۔“

س:۔ ”وہ کون سے کام ہیں جن کو کرتے ہوئے سوچ آتی ہے۔ دنیا کیا کہے گی؟“

ج:۔ ”خاندان بھر کے لوگ اس موذی مرض میں مبتلا ہیں۔ مگر میں جو بھی کرتی ہوں، ڈنگے کی چوٹ پر کرتی ہوں، کسی سے بھی نہیں ڈرتی۔“

س:۔ ”آپ سنسان راستے سے گزر رہی ہوں اور کتنا پیچھے لگ جائے تو؟“

ج:۔ ”ابھی! سنسان کیوں؟ کبھی آپ ہماری گلی کا چکر لگا کر دیکھیے ایک نہ شد، چار چار شد آپ کو لڑھکتے ہوئے نظر آئیں گے، مگر بے چاروں نے بھی پیچھا نہ کیا، ہم نے تو بت ہی نہ آنے دی۔“

س:۔ ”آپ کی نظر میں محبت؟“

ج:۔ ”محبت زندگی ہے اور محبت کے بنا زندگی گزارنا ایسے ہے جیسے روح کے بنا جسم۔“

س:۔ ”کن لوگوں کی احسان مند ہیں؟“

ج:۔ ”گھروالوں کی بخلص دوستوں کی۔“

س:۔ ”اپنی تعریف سن کر خوش ہوتی ہے کیا؟“

ج:۔ ”ہواؤں میں اڑنے لگ جاتی ہوں، دل

جھوم جھوم جاتا ہے۔ مگر جس بندے / بندی نے تعریف کی، اس پر کچھ بھی ظاہر نہیں کرتی ہوں۔“

س:۔ ”ڈرامے دیکھتی ہیں؟“

ج:۔ ”جی، بالکل بھی نہیں۔“

س:۔ ”اگر دوست ناراض ہو جائے تو کیسے مناتی ہیں؟“

ج:۔ ”ضرورت سے زیادہ انا پرست ہوں، اگر سامنے والا جھک گیا تو ٹھیک ورنہ جائے بھاڑ میں۔ ہاں، اپنی غلطی پر معافی مانگ لیتی ہوں۔“

س:۔ ”حقیقی خوشی کس وقت حاصل ہوتی ہے؟“

ج:۔ ”ڈھک کے شکنجے میں جکڑے کسی انسان کو جب آپ کی وجہ سے سکھ فراہم ہونے لگے تو اس فعل کے بدلے میں جو خوشی ملتی ہے، میری نظر میں حقیقی خوشی اسی کو کہتے ہیں۔“

س:۔ ”زندگی سے کیا سبق سیکھا؟“

ج:۔ ”مسلل ملنے والی کامیابیوں نے مغرور بنا دیا تھا پھر جب پاؤں کے نیچے سے زمین نکلی تب میں نے سیکھا کہ وقت بھی ایک سانپیں رہتا، شکر ہے میرے رب کا، جس نے مجھے سنہلنے کا موقع دیا۔“

س:۔ ”ستاروں پر یقین رکھتی ہیں؟“

ج:۔ ”بالکل بھی نہیں۔“

س:۔ ”کوئی آخری بات؟“

ج:۔

حالات کے قدموں میں بلند رہیں گے
ٹوٹے جو ستارہ تو زمین پر نہیں گرتا
گرتے ہیں سمندر میں بڑے شوق سے دریا
لیکن کبھی دریا میں سمندر نہیں گرتا
س:۔ ”کوئی ایسی بات جو ہمیشہ ذہن میں رہتی ہو؟“

ج:۔ ”کچھ خاص نہیں، بس ہر وقت گھریلو امور کی انجام دہی سر پر سوار رہتی ہے۔“



پولیس رینج بلیکس

وہ ڈسٹنگ کرنے کے ساتھ بڑے سر میں گنگنا بھی رہی تھی کہ دے پاؤں اندر آتے ہوئے حمزہ جو ہاؤ کی آواز کے ساتھ اسے ڈرانا چاہتا تھا اس کی گنگنا ہٹ سن کرو ہیں رک گیا۔ گیت کے بول واضح نہیں تھے لیکن لے دل کے تاروں کو چھیڑ رہی تھی۔ وہ بہت انہماک سے اسے دیکھنے لگا۔ جس کی لمبی چوٹی اس کی حرکت کے ساتھ جھول رہی تھی۔ پھر وہ پلٹتے ہی اسے دیکھ کر چیخ نما آواز کے ساتھ بولی تھی۔

”تم.....“ حمزہ نے بے اختیار اپنا ہاتھ سینے پر رکھ لیا تو وہ اس کے پیچھے دیکھ کر پوچھنے لگی۔ ”تم کیسے آئے.....؟“

”کیسے آئے مطلب؟“ حمزہ نے اس کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے پوچھا تو وہ جھنجھلا کر بولی۔

”مطلب گیٹ کس نے کھولا۔“

”کسی نے نہیں میرا مطلب ہے کھلا تھا اس لیے میں سیدھا اندر چلا آیا۔ ویسے کوئی اور بھی آ سکتا تھا۔“

دوسری بات حمزہ نے اسے ڈرانے کے لیے کی تھی اور وہ ڈر بھی گئی۔

”ہاں میں پتا نہیں کیسے گیٹ بند کرنا بھول گئی۔ حالانکہ امی جاتے ہوئے مسلسل یہی کہتی رہتی ہیں گیٹ بند کر لو۔“

”چلو شکر کرو ابھی تمہاری بچت ہو گئی کسی اور نے آ کر تمہارا گلا نہیں دبا دیا۔“ حمزہ کہتے ہوئے اطمینان





سے بیٹھ گیا تو قدرے پریشان ہو کر وہ بے ساختہ بولی تھی۔

”اُمی آجائیں گی۔“

”پھر.....!“ حمزہ سمجھ کر بھی سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا تو وہ جزبہ ہو کر بات بدل گئی۔

”بیلا اور چچی جان کیسی ہیں؟“

”ٹھیک.....“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اس سے پہلے کہ تائی جان آجائیں مجھے چلنا چاہیے۔“

”جائے۔“ وہ اسی قدر کہہ سکی۔

”تھیں رہنے دو۔“ حمزہ نے ناظم دیکھا پھر اسے دیکھ کر کہنے لگا۔ ”مجھے ایک جگہ انٹرویو کے لیے جانا ہے۔“

دعا کرتا۔

”میں تو بہت دعا کرتی ہوں۔ پتا نہیں اللہ میاں میری دعائیں کیوں نہیں سنتا۔“ وہ آزر دگی میں گھرنے

لگی تھی۔

”سنتا ہے۔ اللہ سب کی سنتا ہے۔ بس ہر کام کے لیے اس نے وقت مقرر کر رکھا ہے۔“ حمزہ نے کہہ کر

مہری سانس پھینچی پھر قصداً مسکرایا تھا۔

”تم بیٹھو پس بس دمونت میں جائے لے کر آتی ہوں۔“ وہ فوراً متحرک ہو گئی۔

”نہیں شیرینہ چائے پھر سکی۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔“

”پھر آؤ گے ناں؟“

”کیوں نہیں ضرور آؤں گا۔ تائی جان دھکے دے کر نکالیں گی تب بھی آنا نہیں چھوڑوں گا۔“ حمزہ نے

بظاہر ہلکے ہلکے انداز میں کہا پھر بھی وہ ہرٹ ہوئی تھی۔

”تھیں پتا تو ہے امی.....“

”پتا ہے وہ مجھے پسند نہیں کرتیں۔“ وہ فوراً بولا تھا۔

”لیکن ابو تمہیں بہت چاہتے ہیں۔“ وہ بھی فوراً بولی تھی۔

”تایا جان کی چاہت ہی تو مجھے ثابت قدم رکھے ہوئے ہے۔ اور سنو تم بھی ڈگمگامت۔ خزینہ کی شادی

ہر جائے پھر میں بھی دیر نہیں کروں گا۔ سن رہی ہوں ناں۔“ اس نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا پھر اسے

چھوڑنے گیٹ تک آئی اور اب وہ گیٹ بند کرنا نہیں بھولی تھی پھر واپس آندرا آتے ہوئے اس نے ابھی اندرونی

دروازہ پار کیا تھا کہ ڈور بیل بجنے لگی۔

”اب کون آ گیا۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے واپس پلٹی اور گیٹ کھولا تو آگے حمیدہ بیگم کو دیکھ کر خائف ہو گئی تھی۔

”حمزہ آیا تھا؟“ حمیدہ بیگم نے اندر آتے ہوئے کڑے تیوروں سے پوچھا تو وہ مضطرب بھی جھوٹ نہیں بول

سکتی تھی کیونکہ سمجھ گئی تھی کہ حمیدہ بیگم نے حمزہ کو یہاں سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا ہوگا۔

”میں کیا پوچھ رہی ہوں حمزہ آیا تھا؟“ حمیدہ بیگم کی آواز مزید تیز ہوئی۔

”جی امی۔“

”کیوں؟“ حمیدہ بیگم نے اب تکی بھی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”ابو کے پاس آیا تھا امی اور جب دیکھا کہ ابو نہیں ہیں تو فوراً ہی چلا گیا۔“ اس نے جھنجھلا کر کہا۔

”تو اندر بلانے کی کیا ضرورت تھی۔ گیٹ پر ہی بتا دیتیں کہ تمہارا باپ گھر پر نہیں ہے۔“ حمیدہ بیگم ہنوز

انداز میں کہہ کر پھر اپنے آپ بولے لگیں۔
 ”آیا ہو گا پیسے مانگنے۔ بھیک منگوں کو اور کوئی کام ہی نہیں ہے۔ سویرے سویرے منہ اٹھا کر چلا آتا ہے۔“
 ”یا اللہ“ وہ حمیدہ بیگم کو بولتے چھوڑ کر وہاں سے ہٹ گئی تھی۔

☆☆☆

حیدر علی اور احمد علی دو بھائی تھے۔ ماں باپ کا سایہ اس وقت ان کے سر سے اٹھ گیا تھا جب ابھی دونوں زیر تعلیم تھے۔ یوں فطری طور پر دونوں بھائی ایک دوسرے سے بہت اچھے ہو گئے۔ محنت مزدوری کے ساتھ تعلیم بھی جاری رکھی اور گو کہ کسی اعلا مقام پر تو نہیں پہنچ سکے لیکن اس قابل ہو گئے کہ گھر بسا سکیں۔ حیدر علی بڑے تھے۔ ان کی طبیعت میں بردباری اور نرمی تھی۔ چھوٹے بھائی احمد علی کے لیے وہ مشفق باپ کی طرح تھے تو احمد علی بھی ان کا اسی طرح احترام کرتے تھے۔

بہر حال حیدر علی نے شادی کی تو قسمت سے بیوی بالکل ان کے مزاج کے برعکس ملی۔ وہ جتنے نرم خوتے تھے۔ حمیدہ اسی قدر تیز طرار اور کسی حد تک بد زبان بھی۔ حیدر علی کم پر راضی ہونے والے اور حمیدہ زیادہ پر بھی نالاں۔ فطرتاً ہی عورت تھی گو کہ شوہر کے ساتھ دیور احمد علی بھی اپنی ساری کمائی اس کے ہاتھ پر رکھتے تھے پھر بھی وہ تنگی کا رونا روتی رہتی تھی۔ شادی کے سال بھر بعد اس نے پہلی بیٹی سیدہ کو جنم دیا اس کے بعد تقریباً پانچ سال وہ اولاد زینہ کی خواہش میں دنیا جہان کے ٹوٹے ٹوٹے آزمائی رہی اس دوران احمد علی کی شادی ہو گئی۔

حمیدہ کے برعکس احمد علی کی اولاد حمزہ کی صورت اس کی گود بھری تو حمیدہ جو پہلے ہی اس سے خار کھاتی تھی مزید جل جھن گئی اور بیٹے کی آرزو میں اب ڈاکٹروں کے پاس بھاگنے لگی۔ لیکن قدرت کو جانے کیا منظور تھا کہ حمیدہ نے نصیب میں اولاد زینہ لکھی ہی نہیں تھی۔ سیدہ کی پیدائش کے چھ سال بعد خزینہ اور اس کے دو سال بعد شہرینہ پیدا ہوئی۔ شہرینہ کے بعد فاخرہ نے بھی ایک بیٹی کو جنم دیا۔

یوں حیدر علی کی تین بیٹیاں اور احمد علی کے دو بیٹے حمزہ اور بیلا تھے۔ تقریباً دس بارہ سال حیدر علی اور احمد علی ہال بچوں کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہے پھر حمیدہ بیگم نے جگہ کی تنگی کا رونا رونا کر الگ گھر کا مطالبہ کر دیا۔ حیدر علی اس بات کے حق میں نہیں تھے لیکن پھر انہیں یہ ہی بہتر لگا کیونکہ چھوٹے بھائی بھاج کے ساتھ اپنی بیوی کا ناز یا رویہ انہیں بھی بہت کھلتا تھا گو کہ بھائی بھاج نے بھی ان سے شکایت نہیں کی تھی لیکن کب تک اور یوں اس سے پہلے کہ بھائی یا بھاج کا ضبط جواب دے جاتا انہوں نے الگ ہو جانا ہی مناسب خیال کیا۔

شائع ہوئے ہیں

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

خوبصورت مردان

خوبصورت مہمانی

معبود جلد

آفت جہی

☆ تتلیاں، پھول اور خوشبو راحت جبین قیمت: 250 روپے
 ☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں فائزہ افتخار قیمت: 600 روپے
 ☆ محبت بیاں نہیں لبنی جدون قیمت: 250 روپے

نوائے کاہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

احمد علی اور فاخرہ بھی خاصے دل برداشتہ ہوئے لیکن حیدر علی نے انہیں سمجھالیا..... اور اس وقت جب الگ ہو رہے تھے احمد علی نے حمزہ کے لیے شہرینہ کو مانگا تھا۔ گو کہ ابھی بچے چھ آٹھ سال کے تھے پھر بھی حیدر علی نے اپنے بھائی کو مایوس نہیں کیا تھا۔ اس موقع پر حمیدہ نے خلاف عادت اور خلاف توقع کوئی واویلا نہیں مچایا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ الگ گھر کی ضد منوا چکی تھی۔ پھر اس کے خیال میں ابھی تو بچے چھوٹے تھے بعد کی وہ بعد میں نمٹ لے گی۔

بہر حال الگ ہو کر بھی حمیدہ کی اس گھر سے پر خاش قائم رہی جبکہ حیدر علی کبھی اس گھر سے غافل نہیں ہوئے۔ اور ان کی بیٹیاں بھی فاخرہ چچی کی دیوانی تھیں۔ بڑی سہینہ البتہ کبھی ماں کے کہنے میں آ جاتی تھی۔ یوں وقت کا پہرہ اپنی مخصوص رفتار سے چل رہا تھا کہ اچانک احمد علی دل کے دورے میں اللہ کو پیار سے گئے۔ اس وقت حمزہ نے انہی انٹر کیا تھا اور بیلا آٹھویں جماعت میں تھی۔ حقیقتاً فاخرہ کی دنیا اندھیرے ہوئی تھی۔ حیدر علی بھائی کی جواں مرگی پر ٹوٹ کر رہ گئے۔ لیکن پھر انہوں نے خود کو سنبھالا کیونکہ انہیں بھائی کے گھر کو بھی سپہا ر دینا تھا۔ حمزہ ان کے خاندان کا واحد چشم و چراغ تھا اور یہ صرف ان کے بھائی کی ہی نہیں ان کی بھی خواہش تھی کہ حمزہ بڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنے۔ گو کہ وہ خود خواہ دار ملازم تھے اپنا گھر مشکل سے چلاتے تھے پھر بھی جواں سے ہو سکتا تھا بھانج اور بچوں کے لیے کرتے تھے اور انہوں نے تو یہ بھی چاہا تھا کہ فاخرہ بچوں کے ساتھ ان کے گھر آ جائیں لیکن یہاں حمیدہ آڑے آ گئیں۔ پھر فاخرہ خود سمجھ دار تھی۔ اس نے مشین سنبھال لی حمزہ بھی ٹیوشن پڑھانے لگا۔ یوں گھر کی گاڑی سہولت سے تو نہیں لیکن چل پڑی تھی۔

بہر حال وقت خواہ کیسا بھی ہو گزر رہی جاتا ہے اور اپنے ساتھ جہاں بہت کچھ لے جاتا ہے وہاں دے بھی جاتا ہے اور حمزہ کے لیے یہ بھی بہت تھا کہ وقت نے اس کی اور شہرینہ کی محبت کا کچھ نہیں بگاڑا تھا بلکہ ہر گز رسا دن کے ساتھ اس میں اضافہ ہی ہوا تھا۔ جبکہ حمیدہ بیگم اب کھلم کھلا ہتی تھیں کہ وہ ہر گز بھی اپنی بیٹی اس گھر میں نہیں بیاہیں گی۔ جہاں دو وقت رونی مشکل سے ملتی ہو۔ حمزہ کا وہ نام نہیں لیتی تھیں لیکن حیدر علی نادان نہیں تھے سب سمجھتے تھے پھر بھی خاموش رہتے تھے۔ خاموش رہنا ان کی مجبوری تھی۔ وہ ایک تو بیگم کی زبان درازی جس سے سامنے کوئی نہیں ٹھہر سکتا تھا دوسرے حمزہ کی محنت دیکھتے ہوئے انہیں یقین تھا کہ وہ ضرور بڑا آدمی بنے گا۔ وہ اُم وقت کے انتظار میں تھے۔ اس کے بعد ان کے خیال میں حمیدہ کے پاس اعتراض کا کوئی جواز نہیں رہے گا۔ خود حمزہ کو دل سے چاہتے تھے اور انہیں اپنی زبان کا پاس بھی تھا۔

حمزہ نے ایم بی اے کر لیا تھا اور اب وہ ہر ویکسی پر اپلائی کر رہا تھا۔ آج بھی اس کا انٹرویو تھا۔

☆☆☆

اس کی نظریں بار بار کمپیوٹر اسکرین سے ہٹ کر گلاس وال سے ادھر تیمور غزنی پر پڑ رہی تھیں۔ جو بے الجھا ہوا پریشان اور مضطرب لگ رہا تھا۔ سکرپٹ کے ساتھ سکرپٹ سلگاتا بھی کوئی فائل اٹھا کر پختا اور پھر جیلا کچھ سمجھ میں نہیں آتا تو بالوں میں انگلیاں پھنسا کر سر کو جھٹکے دیتا۔ وہ اس کا اضطراب اپنے دل پر محسوس کرنے لگی تھی۔ اول روز ہی وہ اس سے متاثر ہوئی تھی۔ گو کہ خوابوں میں رہنے والی لڑکی نہیں تھی نہ ہی اس نے کوئی آئیڈیل بنایا تھا لیکن تیمور غزنی کو دیکھتے ہی وہ اسے آئیڈیل بنا کر لے لگتی تھی۔ اور پھر اسے پتا بھی نہیں چلا کہ اب اس کا تمنائی ہو بیٹھا جب اس پر ادراک ہوا تب پہلے حیران ہوئی پھر اپنے آپ پر ہنسی بھی کہ کہاں وہ، کہاں میں۔

تیمور غزنی اس فرم غزنی انٹر پرائز کا مالک تھا اور وہ اس کی فرم میں کام کرنے والی معمولی ورکر۔ پھر وہ آ خود کو سمجھاتی لیکن دل نادان کہاں سمجھتا ہے۔ مزید ترغیب دیتا ہے۔ ابھی اس کا دل چاہا اچانک پورے استحقاق

کے ساتھ اس کے سامنے جا کھڑی ہو اور اس سے پوچھتے کہ وہ کیوں اتنا الجھ رہا ہے۔ کیا بات اسے پریشان کر رہی ہے اور پھر ہل میں اس کی ساری الجھنیں ساری پریشانیاں سمیٹ لے۔ وہ شانت ہو جائے پھر بھلے سے وہ خود الجھتی رہے۔ عجیب خواہش تھی وہ خود پرنس بھی نہیں سکی تو ساتھ ہی نمرہ کو پکار لیا۔
”سنو.....“

”ہوں.....“ نمرہ نے مصروف انداز میں جواب دیا تھا۔
”تم نے نوٹ کیا کیا.....؟“ اس نے کہا تو اب نمرہ فائل چھوڑ کر اسے دیکھنے لگی۔
”کیا.....؟“

”باس بہت پریشان لگ رہے ہیں۔“ اس نے انگوٹھے سے تیور غزنی کی طرف اشارہ بھی کیا تو نمرہ نے ایک نظر گلاس والے ادھر ڈالی پھر بے نیازی سے بولی تھی۔
”کوئی بزنس پر اہم ہوگی۔“

”نہیں مجھے گھر کیل پو پریشانی لگ رہی ہے۔“ اس نے اتنے یقین سے کہا کہ نمرہ نے پہلے حیران ہو کر اسے الودیکھا پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہنے لگی۔

”تمہارا قیاس بالکل غلط ہے غزینہ۔ ان بڑے لوگوں کے گھروں میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ ان کی ڈکاساری پریشانیاں بزنس سے متعلق ہی ہوتی ہیں۔ سمجھ۔“

”تمہاری بات سمجھ گئی ہوں لیکن اتفاق نہیں کروں گی۔ کیونکہ بڑے لوگ میسے سے بے شک بڑے ہوں لیکن ہوتے تو بہر حال انسان ہی ہیں اور زیادہ تر دل کے دورے بھی بڑے ہی لوگوں کو پڑتے ہیں۔“ اس کی بات سن کر نمرہ ہنسنے لگی تھی۔
”ہنس کیوں رہی ہو.....؟“

”تم نے بات ہی ایسی کی ہے۔ خیر چھوڑو ہمیں کیا۔ باس پریشان ہیں تو ہوا کریں ہم کون سا سکھی ہیں۔“ نمرہ نے آخر میں سر جھکا تھا۔ جس کا مطلب تھا یہ موضوع ختم لیکن وہ پھر بھی باز نہیں آئی۔

”سنو باس میرڈ ہیں؟“ نمرہ جواب دینے کے بجائے تیور غزنی کو دیکھنے لگی جیسے اس کے چہرے پہ لکھا نظر آ جائے گا۔ پھر کندھے اچکا کر بولی تھی۔
”پتا نہیں۔“

”پتا کرو ناں۔“ وہ بے اختیار بولی تھی۔
”ہیں میں کیوں پتا کروں اور تمہیں کیا دلچسپی ہے۔ کہیں تم ان کے سنے تو نہیں دیکھنے لگی۔ چہ چہ باز آ جاؤ فسانوی ہیروئن۔“ نمرہ نے اسے اچھی خاصی سنا ڈالیں تو وہ دانت پیس کر بولی۔

”شٹ اپ۔ میں کوئی افسانوی ہیروئن نہیں ہوں۔“
”سننے کی کوشش تو کر رہی ہو۔“

”جی نہیں۔“ اس نے رخ موڑا تھا کہ اینٹرکام کی بزر پر فوراً ریسپورڈ اٹھا لیا۔

”یس سر!“ نمرہ بلا ارادہ اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ ریسپورڈ رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”باس نے بلایا ہے۔“ وہ نمرہ کی طرف دیکھے بغیر کہہ کر تیور غزنی کے روم میں آ گئی۔

”جی سر۔“ اسے ہمیشہ کی طرح اسے متوجہ کرنا پڑا تھا۔

”ہاں.....“ تیور غزنی نے چونک کر اسے دیکھا پھر اپنے سامنے رکھی فائل اٹھا کر اس کی طرف بڑھاتے

نالوئے بولا۔

”مس خنزیرہ یہ فائل دیکھ لیں اور جن پیپرز پر میں نے نشان لگائے ہیں وہ دبیر سے کہیں میل کر دے۔“
 ”جی سر.....“ وہ فائل لے کر جاتے جاتے اچانک اس کی طرف پلٹی تھی۔
 ”ایکسیکوزمی سر.....“ تیمور غزنی نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ ٹپٹا گئی۔
 ”سر وہ..... میں یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ آپ کا بیٹا پریشان لگ رہے ہیں۔ کیا آفس میں کوئی.....“
 ”نہیں.....“ تیمور غزنی نے ایک لفظ نہیں کہنے میں اس تمام عرصے میں پہلی بار بغور اسے دیکھا تھا اور اپنے ذہنی انتشار کے باعث بلا ارادہ ہی اس کی نظریں تھہر گئی تھیں کہ وہ کنفیوز ہو گئی۔
 ”میں جاؤں سر؟“ اس نے پوچھا اور جواب نہ پا کر جلدی سے اپنی سیٹ پر آ گئی۔ یہ دھیانی کی نگاہ بھی اس کی دھڑکنیں منتشر ہو گئی تھیں۔ اور گھر آنے تک تو وہ جانے کہاں سے کہاں پہنچی ہوئی تھی۔ بے حد ممکن لیکن آگے عالیہ خالہ اور شرجیل کو دیکھ کر وہ اچانک بد مزہ ہو گئی۔
 ”السلام علیکم خالہ آپ کب آئیں۔“ اخلاق تو نبھاتا ہی تھا وہ خالہ کے گلے لگ گئی اور دعائیں لے لگ ہوئی تو شہرینہ کہنے لگی۔

”شرجیل بھائی بھی آئے ہیں۔“

”ہاں کیسے ہو شرجیل.....“ اس کا انداز لیا دیا تھا پھر بھی وہ کھل کر مسکرایا۔

”بالکل ٹھیک.....“

”میں پیچ کر لوں۔“ وہ کہتے ہوئے اپنے کمرے میں آئی تو شرجیل بھی اس کے پیچھے آ گیا تھا۔

”کیا بات ہے اتنی اکھڑی اکھڑی کیوں رہتی ہو۔“ شرجیل کے شکوے پر اس نے بہت سادہ انداز میں

پوچھا تھا۔

”کس سے؟“

”میں کسی اور کی بات کیوں کروں گا۔“ شرجیل کہنے کے ساتھ جیر کھینچ کر بیٹھ بھی گیا۔

”پتا نہیں تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے میں نے تو ابھی کسی کے لیے کوئی خاص رویہ نہیں اپنایا ہمیشہ سے ایسی

ہوں میں۔“ اس نے سہولت سے کہہ کر الماری کھول لی۔

”ہاں بے نیازی تو شروع سے تم میں بھی اب بے مروت بھی ہو گئی ہو۔“ شرجیل نے کہا تو وہ الماری بند

کے اسے دیکھنے لگی۔

”غلط نہیں کہا میں نے.....“

”اچھا بس کرو میں کسی بحث کے موڈ میں نہیں ہوں۔“ وہ ٹوک کر پوچھنے لگی۔

”تم بتاؤ تمہاری جاب کیسی جا رہی ہے؟“

”بس گزارا ہے۔“

”تو کہیں اور پلائی کیوں نہیں کرتے۔“

”کیوں نہیں کرتا۔ مسلسل کر رہا ہوں لیکن تمہیں پتا ہے سورس کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔“ اس کی مایوسی پر

شکستگی سے کہنے لگی۔

”ہاں بہت مشکل ہے۔ لیکن شرجی کچھ تو کرنا پڑے گا۔ تم پر تو ذمہ داریاں بھی ہیں۔ سعد یہ آپا کے سر

والے کب تک انتظار کریں گے۔“

”اللہ مالک ہے۔“ وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تو اسے اچانک احساس ہوا تھا۔

”ارے خالہ بھی کیا سوچتی ہوں گی کہ میں کہاں غائب ہو گئی تم چلو میں بس دو منٹ میں چھینچ کر کے آتی ہوں

”ہاں جلدی آتا ہم زیادہ دیر نہیں رکھیں گے۔“ وہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا تو اس نے بھی واش روم کا رخ کیا تھا۔

☆☆☆

حزہ گھر میں داخل ہوتے ہی اماں اماں پکارنے لگا لیکن جب فاخرہ کو جانماز پر بیٹھ دیکھا تو ایک دم خاموش ہو گیا۔ پھر بے آواز قدموں سے چلتے ہوئے جانماز کے قریب کھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا۔ جب فاخرہ نے سلام پھیر کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو وہ بے اختیار بول پڑا۔

”آپ کی دعائیں رنگ لے آئیں اماں مجھے ایک اچھی فرم میں جاب مل گئی ہے۔“
”اللہ تیرا شکر ہے۔“ فاخرہ سجدے میں گر گئیں اور کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ سجدہ کتنا طویل ہوگا اس لیے خاموشی سے وہاں سے اٹھ کر برآمدے میں آیا تو بچن سے آئی بیلا اسے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”کیوں چلا رہے تھے بھائی۔ اماں نماز پڑھ رہی ہیں۔“
”ہاں اور اب شکرانے کے لفعل پڑھیں گی۔“ وہ کہتے ہوئے وہیں تخت پر نیم دراز ہو گیا۔
”کیا مطلب.....؟“

”مطلب اماں کی دعاؤں سے مجھے جاب مل گئی ہے۔“ اس نے بتایا تو بیلا ایک دم خوش ہو گئی۔
”سچ، لیکن بھائی دعائیں صرف اماں نے تو نہیں کیں۔“

”ہتا ہے تم نے بھی کی ہیں۔“ وہ بیلا کا اشارہ سمجھ کر اندر ہی اندر محظوظ ہو کر بولا تھا۔
”میں اپنی بات تو نہیں کر رہی۔“

”پھر.....؟“ وہ مزید انجان بنا تو بیلا زچ ہو گئی۔

”اللہ بھائی کیسے انجان بن رہے ہیں ٹھیک سے میں بھی شہرینہ کو یہ خوش خبری سنانے نہیں جاؤں گی۔“
”اچھا جاؤ کھانا کلا بھوک لگ رہی ہے۔ اماں کو بھی بلاؤ باقی نفلیں بعد میں پڑھ لیں گی۔“ وہ کہتے ہوئے اٹھ کر واش بیسن پر جا کھڑا ہوا۔ منہ ہاتھ دھو کر پھر وہیں تخت پر بیٹھ گیا۔ جب تک بیلا نے کھانا لگا یا فاخرہ بھی آگئیں تو کھانے کے دوران وہ اپنی جاب کے بارے میں بتانے لگا۔ فاخرہ مسلسل شکر گرتی اور دعائیں دیتی رہیں۔
”اماں ساری دعائیں بھائی کے لیے میرے لیے کچھ نہیں۔“ آخر بیلا نے نوک دیا تو فاخرہ نے ایک دم اسے گلے لگایا۔

”کیوں نہیں تم پہلے ہو۔“

”بس اب خوش ہو جاؤ۔“ حمزہ نے کہا تو وہ کھلکھلا کر بولی۔

”میں پہلے بھی خوش تھی۔“ پھر حمزہ کو خوش کرنے کی غرض سے کہنے لگی۔ ”اماں شام میں تایا جان کی طرف چلیں گے مٹھائی لے کر۔“

”ہاں اماں! تایا جان کو تو فوراً بتانا چاہیے میری جاب کا۔ بے چارے بہت فکر کرتے ہیں۔“ حمزہ نے سنجیدگی سے اس کی تائیدی تو فاخرہ اپنی مجبوری ظاہر کرتے ہوئے کہنے لگیں۔

”بیٹا میں تو اتنی دور پیدل نہیں چل سکتی۔ تم دونوں چلے جانا اور اگر ابھی چاہو تو اسے تایا جان کو فون کر دو۔“
”فون نہیں اماں ہم جا کر خوش خبری سنائیں گے۔ اس بہانے شہرینہ اور خزینہ آپنی سے بھی مل لیں گے ناں۔“ بیلا کا اشتیاق دیکھتے ہوئے فاخرہ خاموش رہی تھیں۔

”ٹھیک ہے میں کچھ دیر سولوں۔“ وہ دسترخوان سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس کا ارادہ ایک آدھ گھنٹے کی نیند لینے کا تھا لیکن ایک بڑا مسئلہ حل ہو جانے کا اطمینان تھا جو وہ گہری نیند سو

گیا۔ شام سے کچھ پہلے بیلا نے اسے اٹھایا تو وہ یہی سمجھا کہ صبح ہو گئی ہے جب ہی ہڑ بڑا کراٹھ کھڑا ہوا۔
 ”ارے آج تو مجھے آفس جانا ہے۔“

”کیا مطلب آپ کی ٹائٹ ڈیوٹی ہے کیا۔“ بیلا نے سیدھے سادے انداز میں پوچھا تو وہ چونک کر دروازے سے باہر دیکھنے لگا جہاں شام اتر رہی تھی۔

”تایا جان کے ہاں جانا ہے بھائی۔“ بیلا زور دے کر بولی تھی۔

”ہاں چلو..... میں پانچ منٹ میں آتا ہوں۔“ اس نے بیلا کو کمرے سے باہر دھکیل دیا اور پھر بہت عجلت میں تیار ہو کر اسے ساتھ لے کر گھر سے نکلا تھا اور آج کا دن اس کے لیے بڑا مبارک تھا۔ قسمت ساتھ دے رہی تھی کہ اس کی خواہش کے عین مطابق گیٹ شہرینہ نے کھولا تھا۔

”میں یہ ہرگز نہیں کہوں گا کہ پکاش میں کچھ اور مانگ لیتا۔“ اس نے شہرینہ کو دیکھتے ہی خوش ہو کر کہا تو وہ اس کا مطلب سمجھ کر بے ساختہ مسکرائی تھی۔

”کیا مطلب ہے آپ کا۔“ بیلا نے بے دھیانی سے ٹوکا تھا۔

”کوئی مطلب نہیں۔ چلو تم اندر جاؤ۔“ وہ بیلا کو اندر دھکیل کر شہرینہ کی طرف متوجہ ہوا تو وہ جلدی سے بولی۔

”تم بھی چلو ناں۔“

”کہاں.....؟“ وہ شرارت سے مسکرایا۔

”اندر ابو کے پاس۔“

”چلتا ہوں پہلے تم سے تو مل لوں۔ پتا ہے تمام راستہ یہی دعا کرتا آیا ہوں کہ پہلے تم سے ملاقات ہو جائے اور اس سے پہلے کہ تائی جان تمہیں پکار لیں سن لو کہ میں کل سے آفس جوائن کر رہا ہوں۔“

”آفس.....“ وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”ہاں جاب مل گئی ہے مجھے ایک اچھی فرم میں۔“ اس نے بتایا تو وہ خوش ہو گئی۔

”جی.....“ تب ہی اندر سے حمیدہ بیگم نے پکارا تو وہ گھبرا کر بھاگ گئی۔ اور اس کا دل چاہا یہیں سے واپس لوٹ جائے لیکن ایک تو بیلا اندر بھی دوسرے تایا جان کی محبت میں کچھ چلا گیا تھا۔

”السلام علیکم تایا جان۔“

”جیتے رہو میاں خوش رہو۔ بڑے دنوں بعد آئے۔“ حیدر علی نے ہمیشہ کی طرح بہت محبت سے دعائیں دے کر کہا تو اس سے پہلے حمیدہ بیگم بول پڑیں۔

”لو ابھی پرسوں ہی تو آیا تھا۔“ اس سفید جھوٹ پر بیلا نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تھا کہ اس نے اشارے سے منع کر دیا اور حیدر علی کے پاس بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔

”بس تایا جان وقت ہی نہیں ملتا۔ آج اتفاق سے جلدی گھر آ گیا تو دیکھیں آپ کے پاس بھی آ گیا ہوں۔“

”اماں کیسی ہیں تمہاری؟“

”ٹھیک ہیں۔ سلام کہہ رہی تھیں آپ کو اور تائی جان آپ کو بھی۔“

”وعلیکم السلام، علیکم السلام۔“ حیدر علی نے دوسری بار غالباً بیگم کی طرف سے جواب دیا تھا پھر پوچھنے لگے۔

”کیا مصروفیت چل رہی ہے؟“

”بھائی کو جاب مل گئی ہے تایا جان۔“ اس سے پہلے بیلا بول پڑی۔

”اچھا بھئی بہت مبارک ہو۔ کہاں ملی جاب؟“

انہوں نے خوش ہو کر پوچھا تو وہ انہیں تفصیل بتانے کے ساتھ حمیدہ بیگم کے تاثرات دیکھنے لگا جو اس کے

لے خالصے مایوس کن تھے گویا انہیں کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ پھر جیسے ہی شہرینہ چائے لے کر آئی۔ وہ اٹھ کر چلی گئیں۔ اب چتا نہیں انہیں کوئی کام یاد آ گیا تھا یا ان کے لیے چائے آنے پر ناگواری کا اظہار تھا؟ اسے بہر حال بہت بر محسوس ہوا اور چائے پینے کو دل ہی نہیں چاہا بس تاتیا جان کی محبت تھی جو مجبور کر دیتی تھی۔ پھر زینہ بھی بن کر آگئی۔ اور وہ لڑکی اپنی باتوں سے ماحول کو خوشگوار بنا دیتی تھی۔ ابھی بھی اصرار کرنے لگی کہ وہ لوگ کھانا کھا کر جائیں لیکن وہ اماں کے اکیلے ہونے کا بہانہ کر کے اٹھ گیا تھا۔

”کتنی بد اخلاق ہیں تاتی جان اور بد ماغ بھی۔“ حسب سابق باہر آتے ہی بیلا بولنا شروع ہو گئی تھی۔
 ”ابھی تو تاتیا جان اتنے امیر کبیر نہیں ہیں اگر بنگلے گاڑی والے ہوتے تب تو تاتی جان باہر سے ہی لوٹا دیتیں۔ بس بھائی اب آپ کی چاب لگ گئی ہے ناں تو پہلی فرصت میں شہرینہ کو لانے کا سوچیں۔ وہ جب ہمارے گھر آ جائے گی تب میں بھی تاتی جان کے ساتھ ایسا ہی سلوک کروں گی۔“
 وہ خاموشی سے سنتا رہا تھا۔ نوکالوں نہیں کہ جانتا تھا جو کچھ وہ کہہ رہی ہے اس پر عمل کبھی نہیں کر سکے گی۔ اور وہ خود گو کہ اسے بھی تاتی جان کا رویہ خاصا گراں گزرتا تھا لیکن وہ ان کے بارے میں نہیں سوچتا تھا کہ وہ ایسی کیوں ہیں یا یہ کہ وہ صرف ان ہی کے ساتھ ایسا رویہ رکھتی ہیں یا دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی ایسی ہی ہیں وغیرہ وغیرہ۔
 اور نہ کبھی اس نے شہرینہ پر جتایا تھا۔ بھی وہ اپنے آپ ہی معافی مانگتی تو اسے بھی ٹوک دیتا تھا۔ کبھی ہنس کر کہتا کہ ”جب میں برا نہیں مانتا تو تم کیوں پریشان ہوتی ہو۔“
 ”کبھی برا مان بھی سکتے ہو.....“ شہرینہ ایسے کسی لمحے سے خائف تھی۔

”ہاں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں تم سے خفا ہوں گا کبھی نہیں۔ تم سے خفا ہونے کا تصور میرے لیے موت سے بڑھ کر ہے۔“ اس نے کہا تھا اور یہ بات اس نے شخص اس کا دل رکھنے کے لیے یونہی نہیں کہہ دی تھی وہ حقیقتاً اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا اور اس کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتا تھا۔ یعنی اسے بہتر زندگی دینے کے لیے۔

گو کہ شہرینہ کے ساتھ اس کی نسبت ابا کی زندگی میں طے ہوئی تھی اور اس وقت تاتی جان نے بھی اعتراض نہیں کیا تھا۔ ابھی بھی وہ اس رشتے کے خلاف اس کے سامنے تو کچھ نہیں بولتی تھیں پھر بھی وہ جلد سے جلد شادی کر لینا چاہتا تھا اور شادی کرنے کے لیے ظاہر ہے پہلے اسے اپنی پوزیشن مستحکم کرنی تھی۔ اس کوشش میں کب سے تو وہ خوار بنی ہو رہا تھا اور اب صبح جہاں اسے جانا تھا وہاں اس کے خیال میں وہ اپنی محنت سے جلد کوئی اچھی پوسٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

بریکا حسان نے بی بی اے کرتے ہی اپنے ڈیڑی کے ساتھ ان کا بزنس جو ان کر لیا تھا اور ایک سال میں ہی وہ بزنس کے اسرار و رموز سمجھ گئی تھی جب ہی ڈیڑی کی غیر موجودگی میں تمام معاملات بہت خوبی سے ہینڈل کر لیتی تھی۔ ڈیڑی کو کبھی اس پر پورا اعتماد تھا اکثر جب نو ریز پر جاتے تو انہیں یہاں کی فکر نہیں ہوتی تھی۔ حقیقتاً وہ ان کا بازو بن گئی تھی کہ انہیں اب بیٹے کی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی بلکہ اب تو یہ کہتے تھے کہ اگر بیٹا ہوتا تو وہ بھی اتنے لم وقت میں ان کا سہارا نہیں بن سکتا تھا۔

اور وہ سہارا بن تو گئی تھی لیکن بہر حال ایک لڑکی تھی۔ لاکھ بزنس و دین سب اپنے احساسات نہیں بدل سکتی تھی۔ اور اس نے ایسی کوئی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ کیونکہ خود سے آگاہ تھی۔ جانتی تھی کہ وہ جہاں کھڑی ہو جائے ساری خوب صورتیاں وہیں سمٹ آتی ہیں۔ اور یہ بات اسے مغرور کر دینے کے لیے کافی تھی اور صرف مغرور ہی نہیں خود غرض اور ضدی بھی تھی۔ جو چاہتی حاصل کر لینا چاہتی تھی۔

بہر حال وہ جس کلاس سے تعلق رکھتی تھی وہاں یہ خامیاں کسی کو نظر تو کیا آتیں محسوس بھی نہیں ہوتی تھیں۔ جب ہی ہر ایک بے اختیار اس کی طرف کھپا چلا آتا تھا اور وہ خود جسے دیکھ کر بے اختیار ہوتی تھی وہ جانے کون تھا جس پر اس کی نظریں ٹھہر گئی تھیں۔ مگر اس سے پہلے اس نے اسے بھی نہیں دیکھا تھا پھر بھی یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اسے برسوں سے جانتی ہو۔

”کون ہے؟“ اس کی بے پناہ وجاہت میں الجھتے ہوئے اس نے خود سے سوال کیا تھا کہ گلاس ڈورناک کر کے کھولتے ہوئے وہ پوچھنے لگا۔

”مے آئی کم ان میم (کیا میں اندر آ جاؤں میم.....!)“ ربیکا نے کوئی حرکت نہیں کی بس پلکوں کو ذرا سا گرایا تھا اور یوں محسوس کیا جیسے وہ کھپا چلا آیا ہو۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ وہ بہت اعتماد سے اندر آیا تھا اور ٹیبل پر فائل رکھی تھی کہ اس نے بیٹھنے کا اشارہ کر دیا۔

”تھینک یو.....“ وہ چیئر بھینچ کر بیٹھ گیا پھر اپنے سامنے فائل کھول کر کہنے لگا۔

”میم باس نے مجھے یہ کچھ کاٹریکٹ دیے تھے میں نے انہیں اچھی طرح دیکھ لیا ہے اور میرا خیال ہے کمپنی کے مفاد کو دیکھتے ہوئے ہی نہیں.....“

وہ ایک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔ دل نشیں لہجے میں بولتے ہوئے وہ اس کے اندر کی دنیا تو پیلا کر رہا تھا۔ وہ کیا کہہ رہا تھا یہ سننے کی اس نے کوشش ہی نہیں کی۔ وہ تو بس اس کے ہونٹوں کی حرکت دیکھ رہی تھی یا پھر ساحر آنکھوں پر کمان ابروؤں کا کبھی اٹھنا کبھی سمٹنا اور وہ تھا کہ اپنی کہے جا رہا تھا کہ اچانک اس کی غائب دماغی محسوس کر کے خاموش ہو گیا پھر قدرے رک کر پوچھنے لگا۔

”معاف کیجئے گا ایک بات پوچھوں؟“

”جی.....“ وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”آپ حسان صاحب کی جگہ.....“

”میں ان کی بیٹی ہوں۔ ربیکا..... ربیکا حسان۔ میں نے گزشتہ سال بی بی اے کیا تو اس کے بعد ڈیڈی مجھے باہر بھیجنا چاہتے تھے لیکن میں نہیں گئی۔ اور اس وقت سے ڈیڈی کے ساتھ لگ گئی۔ یہ اچھا ہوا کہ ان کی غیر موجودگی میں میں سارا کچھ سنبھال لیتی ہوں۔“

”وہ جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی اس شخص کو پہلی نظر میں ہی اپنا مان کر نہ صرف اپنے بارے میں سب بتا دینا چاہتی تھی بلکہ اس کے بارے میں بھی سب جان لینا چاہتی تھی۔“

”ٹھیک ہے میم آپ ہی یہ فائل دیکھ لیں۔“ وہ فائل اس کی طرف کھسکا کر اٹھ کھڑا ہوا تو اسے حیرت کا

شدید جھٹکا لگا تھا۔ یعنی کوئی ایسا بھی ہے جو اس پر کام کو فوقیت دے رہا تھا۔

”ہوں۔“ وہ فائل پر ہاتھ رکھ کر پوچھنے لگی۔ ”آپ کا نام؟“

”حمزہ..... حمزہ احمد علی۔“ وہ تار کر چند لمحے رکا کہ شاید کوئی اور سوال ہوگا لیکن اس نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا پھر اسے جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔

☆☆☆

اس نے شہرینہ کو لائٹ آف کرنے کا کہہ کر آنکھوں پر بازو رکھا تھا کہ حمیدہ بیگم آ گئیں۔

”خزینہ سو گئی کیا؟“

”نہیں کیا بات ہے۔“ وہ آنکھوں سے بازو ہٹا کر انہیں دیکھنے لگی۔

”وہ بس یہ کہہ رہی تھی کہ تمہاری خالہ کا فون آیا تھا بتا رہی تھیں شرجیل کی ترقی ہو گئی ہے۔ میں تو کہتی ہوں

بیٹا گھر کا لڑکا ہے۔ آنکھوں کے سامنے پلا بڑھا۔“

”ای.....“ اس نے ٹوک دیا۔ ”میں مانتی ہوں شرجیل اچھا لڑکا ہے لیکن مجھے اس سے شادی نہیں کرنی۔“
 ”خزی.....“ شہرینہ جو الماری میں سر دیے کچھ تلاش کرنے میں مصروف تھی فوراً الماری بند کر کے اس سے کہنے لگی۔ ”عالیہ خالہ اتنا چاہتی ہیں تمہیں اور پھر شرجیل بھائی کی بھی یہی مرضی ہے۔“
 ”تم چیپ رہو۔“ اس نے شہرینہ کو ڈانٹ دیا تو وہ برا سامنہ بنائی ہوئی چکر کاٹ کر اپنے بیڈ پر آ بیٹھی لیکن ساری توجہ پھر بھی ادھر ہی تھی۔

”پھر تم کیا چاہتی ہو؟“ حمیدہ بیگم نے اس سے پوچھا تو وہ جیسے تنگ بڑ کر بولی تھی۔
 ”میں کیا چاہتی ہوں اس بات کو چھوڑ دیں امی۔ جس مجھے ابھی شادی نہیں کرنی۔“
 ”بیٹا، شادی کی یہی عمر ہوئی ہے۔“ حمیدہ بیگم کا ایک اسی پر بس نہیں چلتا تھا۔ ”پھر تمہارے بعد شہرینہ بھی ہے۔ تمہاری ذمہ داری سے نکلوں تو اس کا سوچوں۔“

”آپ پہلے اس کا سوچ لیں۔ بلکہ سوچنا کیا ہے میں تو کہتی ہوں اس کی شادی کر دیں۔ حمزہ ماشاء اللہ روزگار سے لگ گیا ہے۔“ اس نے جتنے آرام سے کہا حمیدہ بیگم اسی قدر بھڑک اٹھی تھیں۔

”تمہارا دام خراب ہے۔ تم سے پہلے چھوٹی کی سہیلیے کر دوں۔ لوگوں کو کیا جواب دوں گی۔“
 ”لوگوں کی پروا آپ کو کب سے ہونے لگی۔“ اس نے حمیدہ بیگم کے بھڑکنے کا ٹٹس نہیں لیا۔
 ”کرنی پڑنی ہے لوگوں کی پروا یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے جب سب پوچھیں گے کہ بڑی کو چھوڑ کر چھوٹی کی شادی کیوں کی تو میں کیا جواب دوں گی۔“ حمیدہ بیگم نے کہا تو وہ زچ انداز میں کہنے لگی۔

”یہ سب پرانے زمانے کی باتیں ہیں امی۔ اب کوئی نہیں پوچھتا۔ کیونکہ ہر گھر میں یہی ہو رہا ہے۔ خیر اس بحث کو چھوڑیں میں نے کہہ دیا مجھے شرجیل سے شادی نہیں کرنی تو نہیں کرنی۔ آپ عالیہ خالہ کو صاف جواب دے دیں۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے پھر آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔ گویا بات ختم..... حمیدہ بیگم چند لمحے اسے دیکھتی رہیں اور اسے تو کچھ نہیں کہہ سکیں جاتے جاتے شہرینہ پر قہر آلود نظر ڈالتی گئی تھیں۔

”اف میں نے کیا کیا ہے۔“ شہرینہ بڑبڑاتی پھر چھلانگ مار کر خزینہ کے بیڈ پر آ گئی اور اس کے برابر لیٹتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”خزی تم ایسا کیوں کر رہی ہو؟“

”کیسا.....؟“ اس نے آنکھوں پر سے بازو ہٹانے کی زحمت نہیں کی تھی۔
 ”اوہ اوہ دھرتو دیکھو۔“ شہرینہ اس کا بازو ہٹانے لگی۔ ”شرجیل بھائی اتنے اچھے ہیں اور کیا تمہیں نہیں پتا کہ وہ تمہیں پسند کرتے ہیں۔“

”پتا ہے۔“ اس نے پہلے بے نیازی دکھائی پھر کہنے لگی۔ ”صرف شرجیل ہی نہیں اور بھی بہت سے لوگ مجھے پسند کرتے ہیں تو کیا میں سب سے شادی کر لوں نہیں شادی میں اس سے کروں گی جو مجھے پسند ہوگا۔“

”اس کا مطلب ہے تمہیں کوئی پسند ہے۔“ شہرینہ ایک دم اٹھ بیٹھی اور اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔
 ”ہوں۔“ اعتراف کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں سوچ اتر آئی تھی۔
 ”کون ہے۔“ شہرینہ نے شوق سے پوچھا تو وہ چونک کر بولی تھی۔

”ابھی یہ سب مت پوچھو۔“
 ”اچھا تو بتا دو کیا ہے؟“ شہرینہ اپنا اشتیاق دبائیں سکتی تھی۔
 ”بہت اچھا بہت نفیس جب بولتا ہے تو دل چاہتا ہے سہی خاموش نہ ہو اور اس کی آنکھیں اس کی آنکھوں

پرساگر کا گمان ہوتا ہے۔ کبھی پرسکون اور کبھی شور مچاتی ہوئی۔“ وہ بولتے ہوئے کھوگئی تھی۔
 ”پتا نہیں شہرہی میں کیوں اس کی تمنا کرنے لگی ہوں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں اس کے قابل نہیں
 ہوں۔ ٹڈل گلاس کی عام سی لڑکی ہوں میں اور وہ.....“
 ”وہ کیا بہت امیر ہے؟“ شہرینہ کی بے صبری نے سارا طلسم توڑ دیا۔ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ پھر اس
 کی بات کا جواب دینے کے بجائے جھنجھلا کر بولی تھی۔
 ”چلو جاؤ اپنی جگہ پر مجھے سونے دو۔“

”سو جانا یا! پہلے اس کا بابا یوڈیٹا تو بتاؤ۔“ شہرینہ اس کے ٹوکنے سے بد مزہ ہوئی تھی۔
 ”اس کا بابا یوڈیٹا یہ ہے کہ اگر میری قسمت میں شادی لکھی ہے تو اسی سے ہوگی ورنہ نہیں۔“ اس نے کہہ کر
 شہرینہ کو یوں دھکیلا کہ وہ گرتے گرتے پچی بھی پھر بھی اپنی جگہ پر لیٹنے ہوئے پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔
 ”نام کیا ہے اس کا؟“
 ”تیور..... تیور غزنی.....“ ہونٹوں نے اس نام کو کیا چھوا کہ وہ پلکیں موند کر اسی کے سنگ جانے کن
 راہوں پہ جا نکل تھی۔

☆☆☆

وہ کتنے دنوں سے محسوس کر رہا تھا کہ گلاس وال سے ادھر بیٹھی وہ لڑکی خزینہ حیدر علی کام کرتے کرتے
 اچانک اسے کھوجنے لگتی ہے۔ جانے یہ اس کا مشغلہ تھا یا وہ اسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتی تھی۔ جو بھی تھا وہ اگر
 پہنی انتشار کا شکار نہ ہوتا تو اور کچھ نہیں اندر ہی اندر محظوظ ضرور ہوتا اور پھر کسی بہانے اسے اس مشغلے سے باز رکھنے
 کی سعی بھی ضرور کرتا۔ لیکن وہ اپنے ہی کسی مسئلے میں نہ صرف الجھا ہوا بلکہ بے حد پریشان بھی تھا جب ہی کچھ اور
 سوچ ہی نہیں پاتا تھا۔ آئینہ معاملات بھی وہ زیادہ تر اپنے منہ پر لپکتے ہوئے کر دیتا تھا۔
 ابھی بھی وہ بے حد پڑ پڑ رہا تھا۔ مزید اس لڑکی کا بار بار نظریں اٹھا کر اسے دیکھنا پریشان کر رہا تھا۔ جبکہ وہ
 یکسوئی سے کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ ایک دو بار اس نے اپنی چیمڑ گھما کر ان نظروں سے اوجھل ہونا چاہا لیکن پھر ایک
 دم اٹھ کر آفس سے ہی نکل آیا۔ اس وقت دن کے گیارہ بجے تھے۔ چڑھتے سورج کی تپش میں وہ بے مقصد
 سڑکوں پر گڑی نہیں دوڑا سکتا تھا اس لیے سیدھا سونیا آبی کے گھر آ گیا۔
 ”خیریت تم اس وقت۔ مطلب آفس نہیں گئے؟“ سونیا نے اس کی بے وقت آمد پر ٹوکا تھا۔
 ”گیا تھا.....“ وہ صوفے پر ڈھس گیا۔

”پھر.....؟“

”پانی لائیں ٹھنڈا۔“ اس نے سونیا کو پھر نظر انداز کر دیا تو وہ اسے دیکھتے ہوئے فریج سے ٹھنڈی بوتل نکال
 لائی اور اسے تھما کر بولی۔
 ”تھمہو گلاس لاتی ہوں۔“

”بے نیے دیں۔“ اس نے بوتل کو منہ لگا کر بڑا سا گھونٹ لیا پھر صوفے کی بیک پر سر رکھ لیا تھا۔ سونیا چند
 لمحے اسے دیکھتی رہی پھر بیٹھتے ہوئے کہنے لگی۔

”دیکھو غزنی میں نے تمہارے مسئلے پر بہت سوچا ہے ہر پہلو سے اگر تم اپنی جگہ ٹھیک ہو تو غلط ماما اور بابا بھی
 نہیں ہیں۔“

”بس کریں آپ! میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔“ اس نے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں اپنی آنکھوں پر
 رکھ لیں۔

”پریشانی مسئلہ کا حل نہیں ہے۔“ سونیا زور دے کر بولی تھی۔
 ”پھر کیا کروں میں۔“ وہ جیسے عاجز ہوا تھا۔
 ”شادی.....“

”کیا.....!“ وہ ایک دم سیدھا ہو بیٹھا۔ ”جانتی ہیں آپ کیا کہہ رہی ہیں ماما اور بابا سن لیں تو.....“
 ”ایک منٹ۔“ وہ ٹوک کر کہنے لگی۔ ”ماما‘ بابا کو سنانے اور بتانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔“
 ”آپ کا مطلب ہے۔“

”ہاں خفیہ شادی کر لو۔“ وہ اسے بولنے ہی نہیں دے رہی تھی۔
 ”نو.....“ وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔ ”میں ایسا نہیں کر سکتا۔“
 ”کیوں نہیں کر سکتے۔ میں کوئی گناہ کرنے کو نہیں کہہ رہی۔ اگر تم آرام سے میری بات سنو تو میں تمہیں بتاؤں کہ تم.....“

”نہیں آپ! خدا کے لیے آپ مجھے مزید پریشان نہ کریں۔“ اس نے ہاتھ جوڑ دیے تو سونیا جھنجھ کر بولی۔
 ”پاکل ہمت بنو غرنی۔ ماما‘ بابا تو مجبور ہیں۔ تم مجبور نہیں ہو سکتے۔“
 ”میری مجبوری بھی وہی ہے جو ماما اور بابا کی۔“ اس نے کہہ کر پانی کی بوتل اٹھالی۔
 ”میں جانتی ہوں پھر بھی تمہیں یہ کرنا پڑے گا۔ نہیں تو پھر ماما کی بات مان لو۔“
 ”کیسے مان لوں۔ میرا دل نہیں مانتا۔“ اس کے ضدی انداز پر سونیا کٹھور پن سے بولی تھی۔
 ”تو پھر پریشان ہونا چھوڑ دو۔“

”مجھے کوئی برا علم نہیں ہے آپ!۔ مجھے پریشان کیا جاتا ہے۔ ماما‘ بابا‘ سارہ سب کی ایک ہی رٹ ہے۔
 آپ بتائیں میں کیا کروں۔“ وہ اونچا پورا امر درو دیے کو ہو گیا تھا۔
 ”میں پھر کہوں گی شادی۔“ سونیا نے کہہ کر یوں ہاتھ اٹھایا جیسے اسے بولنے سے روکا ہوا اور وہ ہونٹ بھینچ گیا۔
 ”سکون سے میری بات سنو غرنی۔ یہ بہت ضروری ہے۔ بابا لوگ کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی اور تم بھی سکون سے رہو گے۔ سمجھ رہے ہوں نا۔“
 ”نہیں.....“ وہ روٹھے لہجے میں بولا تھا۔

”ٹھیک ہے ابھی نہ سمجھو۔ لیکن میری بات کو سوچنا ضرور مجھے یقین ہے تم نہ صرف سمجھ لو گے بلکہ شادی بھی کر لو گے۔“ سونیا کہہ کر یوں مطمئن سے ہو گئی جیسے مسئلہ حل ہو گیا ہو۔
 ”آپ کا بھی جواب نہیں۔ ذرا یہ تو سوچیں اگر بابا کو پتا چل گیا تو.....“ اس نے اپنے تئیں سونیا کو اس وقت سے ڈرایا تھا، لیکن وہ تنگ کر کہنے لگی۔

”کیسے پتا چلے گا انہیں۔ تم بتاؤ گے۔ میں بتاؤں گی، نہیں ناں پھر.....؟“
 ”پھر یہ کہ ایسی باتیں چھٹی نہیں ہیں۔“

”نہ چھپیں۔ شادی گناہ نہیں ہے۔“ سونیا کا انداز ہنوز تھا۔
 ”اچھا چھوڑیں یہ بتائیں بچے اسکول سے کب آئیں گے؟“ اس نے اس موضوع سے ہٹنے کی غرض سے پوچھا تھا۔

”دوبجے۔ تمہارے لیے چائے بناؤں؟“ سونیا نے پتا کر پوچھا تو وہ اٹھتے ہوئے بولا۔
 ”نہیں۔ بچوں کے آنے تک میں ایک نیند لے لوں۔“
 ”ہاں ادھر میرے کمرے میں چلے جاؤ.....“ سونیا نے کہا تو وہ سر کھباتے ہوئے بولا۔

”آپ کے شوہر نامدار آگئے تو.....“

”وہ شام میں ہی آئیں گے۔ تمہاری طرح آوارہ گردی نہیں کرتے پھرتے۔“ سونیا کے جھنجھلا نے پر وہ ہنستے ہوئے اس کے کمرے کی طرف بڑھا تھا۔

☆☆☆

حمزہ کو اپنی جاب پر تین ہفتے ہو گئے تھے، وہ اگر مطمئن تھا تو اس کے پاس حسان صاحب اس سے خوش تھے۔ اس کی کارکردگی کو فراخ دلی سے سراہتے اور کسی کسی وقت اسے لگتا جیسے وہ اس پر کوئی اضافی ذمہ داری ڈال کر اس کی صلاحیت کو آڑنا چاہ رہے ہوں ایسے میں وہ بہت ہوشیار ہو جاتا تھا اور اب تک تو انہیں شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ یوں بھی اس کے اندر سیکھنے اور آگے بڑھنے کی لگن تھی۔ پھر ایمان داری اور وفاداری تو گویا اس کی مٹھی میں پڑی تھی۔ بہر حال وہ اپنے کام سے خوش تھا۔ اس کے اندر یہ خواہش نہیں تھی کہ وہ ایک دم سے سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر چلا جائے بلکہ وہی بات کہ جس کام کا جو وقت مقرر کیا گیا ہے وہ اپنے اسی وقت پر ہوتا ہے۔

پھر گھر کی گاڑی سہولت سے چل رہی تھی کوئی اتنے زیادہ افراد نہیں تھے جو اسے کہیں اور بھی ہاتھ پیر مارنے پڑتے جس سے وہ مین چکر بن کر رہ جاتا۔ بیلا کے بارے میں سوچتا ضرور تھا، لیکن پریشان نہیں تھا کیونکہ ابھی تو وہ انٹر میں پڑھ رہی تھی اور وہ اسے بی اے ضرور کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ یہ ابا کی خواہش تھی اس لیے اماں بھی کوئی جلدی نہیں بنی رہی تھیں۔ ورنہ اسے اپنی شادی سے پہلے بیلا کو رخصت کرنے کی فکر ہوتی اور اسے اپنی شادی کی جلدی بھی یوں تھی کہ ادھر حمیدہ بیگم کا کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ وہ اپنی بیٹیوں کے لیے بہت اونچے خواب دیکھنے لگی تھیں۔ جس سے وہ خائف ہو گیا تھا۔ گو کہ شہرینہ پر اسے پورا بھروسہ تھا، لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ اس گھر میں سب سے زیادہ حمیدہ بیگم کی چلتی ہے۔ ان کے سامنے تایا جان بھی خاموش ہو جاتے تھے۔

اس وقت وہ آفس جانے کے لیے نکلا تو اسٹاپ پر تایا جان کھڑے مل گئے۔ وہ انہیں اتنی جلدی دیکھ کر حیران ہوا کیونکہ وہ تو دس کے درمیان آفس جاتے تھے اور ابھی آٹھ بجنے میں کچھ منٹ باقی تھے۔

”خیریت تایا جان۔ آج آپ اتنی جلدی۔“ اس نے ان کے گلے لگتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں آج کل کچھ کام زیادہ ہے اس لیے جلدی نکلتا پڑتا ہے۔ تم سناؤ گھر میں سب خیریت ہے۔“

”جی اللہ کا شکر ہے۔ آپ آئے نہیں بہت دنوں سے۔“ وہ ٹھوہ نہیں کر رہا تھا بس یوں ہی بات سے بات نکلتی چلی گئی تو وقت کا تپا ہی نہیں چلا اور اس روز وہ پہلی بار پورا ایک گھنٹا لیٹ آفس پہنچا تھا۔ حسان صاحب آچکے تھے اور فوراً اس کی طبلی بھی ہو گئی۔

”آئی ایم سوری سر! میں آج بہت لیٹ ہو گیا۔“ اس نے ان کے ٹوکنے سے پہلے ہی معذرت کر لی پھر بھی وہ پوچھنے لگے۔

”کیوں؟ آئی مین کوئی برا بلغم تھی؟“

”نوسر۔ گھر سے تو میں ٹھیک وقت پر نکلا تھا، لیکن آگے بس.....“

”ہوں گونیس پر ابلم۔“ انہوں نے اس کی پوری بات نہیں سنی پرسوج انداز میں اسے دیکھ کر پوچھنے لگے۔

”تمہارے پاس بائیک نہیں ہے؟“

”نوسر۔“

”بائیک لے لو بہت ضروری ہے۔“ انہوں نے یوں کہا جیسے وہ ابھی جا کر بائیک خرید لے گا۔ اور وہ کیا کہتا خاموش ہی رہا تو وہ اسے اپنی سیٹ پر جانے کا اشارہ کرتے ہوئے بولے تھے۔

”نسیم صاحب سے بایک کی چابی لے لینا۔“

”تھینک یوسر.....“ وہ ان کے کمرے سے بہت خوش نکلا تھا۔ اور پھر اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھا ہی تھا کہ ربیکا آگئی۔ وہ اسے دیکھ کر دوبارہ کھڑا ہو گیا تو وہ ٹوک کر بولی۔
 ”پلیز حمزہ..... میں آپ سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ میرے لیے آپ ایسی زحمت نہ کیا کریں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔“

”سوری..... میں بھول گیا تھا۔“ وہ فوراً بیٹھ گیا، تو وہ انجان بن کر پوچھنے لگی۔
 ”زیر الوں کی فائل آپ کے پاس ہے؟“
 ”زیر کنسرکشن.....“ وہ ایک طرف رکھی فائلیں دیکھنے لگا، پھر اس کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ”نوس یہاں نہیں ہے۔“

”کہاں چلی گئی۔“ وہ وہیں سوچنے کھڑی ہو گئی۔

”میں نسیم صاحب سے معلوم کروں۔“ اس نے کہا تو وہ سر جھٹک کر بولی۔
 ”ان کے پاس نہیں ہے۔ میں معلوم کر چکی ہوں۔ خیر چھوڑیں یہ بتائیں آج آپ اتنی دیر سے کیوں آئے۔“
 ”بس ہو گئی دیر۔“ اس نے گول مول سا جواب دے کر ایک طرح سے اسے ٹالنا چاہا، وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ زیادہ دیر اس کے پاس کھڑی رہے، کیونکہ وہ محسوس کر چکا تھا کہ وہ کام کے لیے نہیں کام کے بہانے اس کے پاس آئی ہے اور مشکل یہ بھی کہ وہ اسے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر وہ حسان صاحب کی بیٹی کے بجائے محض اس کی کولیگ ہوتی تو وہ یقیناً اناروہ بدلتا لیتا، لیکن اب مجبور تھا۔ اس لیے اندر ہی اندر جربز ہوتا اور خود کو مصروف ظاہر کرنے کی کوشش کرتا۔ ابھی بھی اس نے یہی کیا تو ربیکا کچھ دیر خاموشی سے اس کی مصروفیت دیکھتی رہی۔ پھر جانے کے بجائے چیر بھیج کر بیٹھ گئی۔

”لیس میم.....“ حمزہ کو فوراً اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔

”مائی گاڈ..... آپ سیدھے سیدھے میرا نام نہیں لے سکتے۔ کوئی اتنا مشکل نام تو نہیں ہے میرا ربیکا..... چلیں آپ صرف رانی کہہ لیا کریں۔“ وہ اس کے مؤدبانہ انداز سے چڑھ گئی تھی۔
 ”ربیکا..... رانی..... لیکن.....“ وہ جانے کیا کہنے جا رہا تھا کہ ربیکا نے ہاتھ اٹھا دیا۔
 ”کوئی لیکن ویکن نہیں۔“

”اوکےے.....“ وہ میم کہتے کہتے رک گیا۔ پھر فوراً پوچھنے لگا۔ ”آپ کو کوئی اور کام ہے۔“
 ”نہیں.....“ وہ سختی سے کہہ کر ایک دم اٹھ کر چلی گئی تو وہ حیران سے زیادہ پریشان ہو گیا کہ اسے کیا بات بری لگ گئی ہے۔ کچھ دیر سوچتا رہا، پھر سر جھٹک کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا تھا۔

☆☆☆

چھٹی کا دن تھا۔ خزیہ حسب معمول اپنے ہفتے بھر کے کام نمٹانے میں لگی ہوئی تھی۔ جن میں سرفہرست کیڑوں کی دھلائی، پھر انہیں استری کر کے بیگر میں ڈالنا، اس کے بعد نہانے سے پہلے وہ اپنا فیشل خود ہی کیا کرتی تھی۔ جبکہ شہرینہ کھانے کے بعد فراغت سے بیٹھی اپنے موبائل پر حمزہ کے ساتھ چیٹنگ کر رہی تھی اور آج جانے حمزہ کو کیا ہوا تھا کہ مسلسل اسے اپنے گھر آنے پر اصرار کر رہا تھا۔ آخر میں ناراض ہو کر بھی بات نہ کرنے کی دھمکی دی تو اس نے ہامی بھری، لیکن پھر پریشان ہو گئی۔ کیونکہ حمیدہ بیگم کو حمزہ کا آنا ناگوار گزرتا تھا، اسے بھیجنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ حمزہ بھی اس کی مجبوری سمجھتا تھا، مگر بھی اس وقت کچھ سنے کو تیار نہیں تھا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو سیل

فون آف کر کے بیٹھ گئی۔ تب ہی خزینہ نہا کر نکلی اور اپنے کیلے بال تولیے سے خشک کر کے برش اٹھالیا۔
 ”خزنی..... وہ ایک دم اٹھ کر خزینہ کے پاس آ گئی۔ چچی جان کے ہاں چلیں۔“
 ”خیریت.....“ خزینہ اپنے ہی لسی خیال میں تھی۔

”چلو نا، اتنے دن بلکہ مہینے ہو گئے ہیں چچی جان سے ملے ہوئے۔“ اس نے منت سے کہا تو خزینہ اپنے بال سمیٹتے ہوئے بولی۔

”ہاں دل تو میرا بھی بہت چاہتا ہے ان سے ملنے کو، لیکن نام ہی نہیں ملتا۔“
 ابھی تو فارغ ہونا، پلیز خزنی مجھے تو امی جانے نہیں دیتیں۔ ابھی کسی اور بہانے سے چلتے ہیں۔“
 ”کسی اور بہانے سے کیوں۔ میں کہتی ہوں امی سے کہ ہم چچی جان سے ملنے جا رہے ہیں۔“ خزینہ گویا جانے کو تیار ہو گئی تھی۔

”ٹھیک ہے، تم امی کو بتاؤ، میں جب تک چہنچ کر لوں۔“ وہ خوش ہو گئی۔ جلدی سے اپنا سوٹ نکال کر واش روم کی طرف بڑھی تھی کہ حمیدہ بیگم پکارتے ہوئے آئیں۔
 ”شہرینہ.....“

”جی امی.....“ وہ رک کر انہیں دیکھنے لگی۔

”سینہ آرہی ہے۔ رات کے کھانے پر کچھ اچھا انتظام کر لو۔“ حمیدہ بیگم نے کہا، بلکہ آرڈر جاری کیا تو وہ انتہائی مسکینی سے خزینہ کو دیکھنے لگی۔

”کب تک آ میں گئی سینہ آ؟“ خزینہ نے پوچھا۔
 ”ایک دو گھنٹے میں آ جائے گی۔“ حمیدہ بیگم نے بتایا تو خزینہ بے نیازی سے بولی تھی۔
 ”ٹھیک ہے اتنی دیر میں ہم بھی آ جائیں گی۔“

”کیا مطلب..... تم کہاں جا رہی ہو؟“ حمیدہ بیگم نے فوراً ٹوکا۔

”یہیں قریبی مارکیٹ۔ مجھے کچھ ضروری چیزیں لینی ہیں۔“ خزینہ نے اس وقت کسی بحث سے بچنے کی خاطر جھوٹ بولا تھا۔ پھر فوراً شہرینہ سے مخاطب ہوئی۔ ”جلدی کرو شہرینہ۔ آ پا کے آنے سے پہلے ہم آ جائیں پھر ساتھ کھانا بتالیں گے۔“

”ہاں دیکھو۔ درمت کرنا۔“ حمیدہ بیگم جہاں دیکھتی تھیں کہ ان کی نہیں چلے گی، وہاں سے ہٹ جاتی تھیں۔ اور تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ دونوں فارغہ چچی سے یوں لپٹی تھیں، جیسے مدتوں بعد پھڑے ملے ہوں۔
 ”یاد آئی میری۔“ فارغہ نہال ہوئی جا رہی تھیں۔

”ارے چچی جان آپ ہر دم یاد رہتی ہیں۔ بس آفس کی وجہ سے کہیں آنا جانا نہیں ہو پاتا۔ آپ بھی تو نہیں آتیں۔“ خزینہ توجہ پیش کرتے ہوئے شہوہ بھی کر گئی۔
 ”آؤں گی آؤں گی۔ اب بیٹھو تو.....“ فارغہ نے پٹنگ کی چادر ٹھیک کرتے ہوئے کہا تو وہ بیلا کو دیکھنے لگی، جو شہرینہ کے گلے کی اس کے کان میں جانے کیا کہہ رہی تھی۔

”یہ کیا راز و نیاز ہو رہے ہیں۔“ اس نے ٹوکا تو بیلا فوراً شہرینہ کو چھوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔

”سچ آبی مجھے اتنی خوشی ہو رہی ہے۔“

”صرف خوش ہوئی رہو گی یا کچھ ٹھنڈا ونڈا بھی پلاؤ گی انہیں۔ اتنی سڑی گرمی میں آرہی ہیں۔“ حمزہ نے کمرے میں آتے ہوئے بیلا کی بات سن کر کہا۔

”میں ابھی لائی فوراً آپ لوگ بیٹھیں۔“ بیلا عجلت میں بھاگ گئی تو وہ شہرینہ کو دیکھ کر شرارت سے مسکرایا۔ جواباً وہ بے نیازی دکھانے لگی تھی۔

”ارے ہاں حمزہ۔“ خزینہ ایک دم خیال آنے پر کہنے لگی۔ ”مبارک ہو، تم نے بائیک لی ہے۔“

”لی نہیں ملی ہے۔“ حمزہ نے چیخ کر بیٹھنے ہوئے کہا تو شہرینہ بے ساختہ بولی تھی۔
”کہناں سے؟“

”اے ہی راستے میں پڑی مل گئی۔“ وہ اسے دیکھ کر ہنسنے لگا۔ تو وہ روٹھ کر منہ پھیر گئی۔
”پاگل ہے یہ تو..... تم بتاؤ حمزہ کہ منی کی طرف سے ملی ہے۔“ خزینہ نے پوچھا تو وہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”ہاں.....“

”اس کا مطلب ہے پروموشن ہو گئی ہے تمہاری۔“

”پروموشن بھی ہو جائے گی۔ ابھی تو صرف تین مہینے ہوئے ہیں۔ تم سناؤ تمہاری جاب کیسی جا رہی ہے۔“
”تھک ہے۔“ خزینہ نے لاپرواہی سے کندھے اچکائے تب ہی بیلا اسکو اٹش لے کر آگئی اور سب کو گلاس تھما کر کہنے لگی۔

”جانے کی جلدی مت کیجیے گا خزی آپنی اور یہ بتائیں رات کے کھانے میں کیا کھائیں گی۔ میں وہی بنا دوں گی۔“

”ارے نہیں..... کھانے کا تکلف مت کرنا۔“ خزینہ نے ابھی اسی قدر کہا تھا کہ فاخرہ بول پڑیں۔
”کیوں بیٹا۔ اتنے عرصے بعد آئی ہو، کھانا کھا کر جانا۔ اپنا ہی گھر ہے چچی جان، پھر آ جاؤں گی۔ اصل میں آج سینہ آ پا رہی ہیں اور ہمیں جا کر ان کے لیے کھانے کا انتظام کرنا ہے۔“ خزینہ کی بات سن کر وہ شہرینہ کو دیکھنے لگا شاکی انداز تھا۔ لیکن وہ کیا کر سکتی تھی۔ اس کی ناراضی کے خیال سے آتو گئی تھی، لیکن زیادہ دیر رک نہیں سکتی تھی۔ اس لیے اسکو اٹش کا گلاس خالی کرتے ہی بولی تھی۔

”چلو خزینہ..... سینہ آ پا کے آنے سے پہلے ہم گھر پہنچ جائیں۔“

”ہاں..... ورنہ امی تو امی..... وہ بھی اتنی باتیں سناؤ ایس گی۔“ خزینہ گلاس رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ہاں میں..... یہ کیا آتا ہوا۔“ فاخرہ کو ان کے جلدی جانے کا افسوس رہا تھا۔

”پھر آ میں گے، چچی جان فرصت سے آ میں گے۔“

”میں تو نہیں آؤں گی۔“ شہرینہ نے حمزہ کا پھولا منہ دیکھ کر دھیمی آواز میں صرف اسے سنانے کو کہا اور تیزی سے باہر نکلی تھی۔ حمزہ چاہنے کے باوجود اس کے پیچھے نہیں لپک سکا۔

☆☆☆

باقی آئندہ ان شاء اللہ۔

یاسمین نشاط

پیر ویدار



میلچہ کو جو بھی دیکھتا، دیکھتا رہ جاتا، گلابی مکھڑا، سرمئی نشلی آنکھیں۔ اس پر گلاب پر پڑتے ڈمھلے، حسن رب نے دیا، نزاکت اس نے سیکھی۔ اوپر سے ہر وقت تک سک سے تیار، بولتی تو گویا پھول جھڑتے، ہنستی تو سارے میں رونق پھیل جاتی۔

مندى، چوڑیاں، خوشبو گویا اس کی ذات کا حصہ تھیں، گورے گورے ہاتھوں پر مندئی یوں کھلتی، بیسے عشق ہو۔ کوئی کتاب جس پر مندئی کارنگ یوں کھلے، اس کامیاں بہت پار کرتا ہے، کوئی کتاب، ساس جان چھڑکتی ہے۔ وہ ساری باتیں سنتی کھکھلاتی رہتی۔ ہر وقت یوں تیار پھرا کرتی جیسے کہیں جارہی ہو اور جو کوئی پوچھ لیتا تو ترستہ جواب آتا۔

”خوابوں کے دس جارہی ہوں۔“ بے فکری، بے نیازی، اس کی ذات میں یوں رہتے تھے گویا وہ کسی سلطنت کی شہزادی تھی۔ شہزادی تو رفاقت نے اسے بنا کر ہی رکھا تھا۔

چار بھائیوں کی اکلوتی بہن، سب اس کے ناز و نخرے اٹھاتے نہ تھکتے، اماں نے تو حقیقتاً ”سوچ رکھا تھا۔ ان کی شہزادی کو بیاہنے کوئی شہزادہ ہی آئے گا اور اس شہزادے کے انتظار میں وہ بڑے دنوں سے گن گن کر گھڑیاں گزار رہی تھیں۔

میلچہ کی ہم عمر لڑکیاں اگرچہ اس کی سہیلیاں تھیں، لیکن اندر ہی اندر اس سے جلتی بھی تھیں، اس کی خوب صورتی، رکھ رکھاؤ کے طعنے ”فردا“ ”فردا“ ہر لڑکی کو اس کی ماں سے گاہے بگاہے سننے کو ملتے رہتے تھے اور اس کا دل وہ اس کے لیے دل میں کینہ رکھ کر لے لیا کرتی تھیں اور وقتاً فوقتاً ”باتوں باتوں میں شوگر کوئڈ گولیاں وہ میلچہ کو کھلاتی رہتی تھیں۔ لیکن میلچہ دل کی صاف تھی، ہنس کر ٹال دیا کرتی۔



اس روز وہ نما کر نکلی تو اماں کو گھر کی چیزیں غفلت میں سیٹ کرتے پایا۔ ”یا اللہ خیر“ اس نے الماری میں رکھا کلون اسپرے کیا۔ چہرے پر کریم لگائی۔ آئینے میں

مندى لگے ہاتھ دکھ رہے تھے۔ رات جو اس نے حمیرا سے مندئی کا نیا ڈیزائن بنوایا تھا اس کا رنگ زیادہ نہیں چڑھا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی، ”آج ایک کوٹ اور مندئی کا لگوالے۔“ تاکہ مندئی کا گہرا رنگ چمک اٹھے۔

”میلچہ۔۔۔“ اماں اندر داخل ہوئی تھیں۔ ان کے پکارنے کے اشارے سے وہ سمجھ گئی کہ اگلی بات کیا ہے۔ وہ مڑ کر استقبالی نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔ وہ اس وقت ایک آنکھ میں کاجل لگا چکی تھی، دوسری میں لگانا باقی تھا۔

”شکرون خالہ آئی ہیں۔ دوپٹا اوڑھ کر آتا۔“ اماں نے کہا۔ وہ اثبات میں سر ہلاتی دوبارہ آئینے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اسے آئینہ دیکھنا بہت اچھا لگتا تھا، کبھی نہیں ہوا تھا کہ آئینے نے اسے برا کہا ہو۔ وہ گھوم گھوم آگے پیچھے، ہر زاویے سے آئینے میں خود کو دیکھتی اور آئینہ ہر بار اس کی تعریف میں زمین آسمان کے فلاہے ملا تا۔

”ارے ہاں نا، وہ تعریف کی مستحق ہے۔“ وہ خود گلایا کرتی۔

تیار تو وہ تھی ہی، ٹیلیے بالوں کو پشت پر یوں ہی کھلا چھوڑ کر اس نے سر پر ریڈ شیفون کا دوپٹا سلیقے سے بچھایا اور خود کو سراہتی اس چھوٹے سے کمرے میں آگئی، جسے وہ بیٹھک اور لوگ ڈرائنگ روم کہا کرتے تھے۔ اماں شکرون کے ساتھ ایک اور خاتون اور لڑکی بھی موجود تھیں۔ وہ سلام کر کے اماں کے ساتھ ہی صوفے پر ٹپک گئی۔ خاتون کی ناقدانہ نظریں اب اس کا طواف کر رہی تھیں اور لڑکی بھی اپنی چیل جیسی نگاہیں اس پر گاڑے بیٹھی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی اماں نے آنکھ سے اٹھ جانے کا اشارہ کر دیا۔ وہ معذرت کرتی باہر آگئی۔

”توبہ۔ ایسے دیکھتی ہیں جیسے انہیں بہو نہیں قربانی کا بکرا خریدنا ہو۔“ باہر آتے ساتھ ہی اس نے گویا کھل کر سانس لیتے ہوئے سوچا تھا۔ یہ اسے دیکھنے آنے والی کوئی چوتھی فیملی تھی۔ اسے ستر ہواں کیا کا رفاقت کی تو مانو نیندیں حرام ہو گئیں۔ مزید یہ کہ اس نے ایف

ماہنامہ کرن 49 نومبر 2017

منتظر تھی۔

”تم پر یہ نوم کون سا لگاتی ہو؟“ سوال آیا۔

”ہائیں۔“ اس نے جھٹ سے سراٹھایا۔

”جینٹس پر یہ نوم لگاتی ہوں۔“ آہستہ سے کہہ کر

اس نے قدرے توقف کیا، پھر بولی۔ ”اماں کہتی ہیں

عورتوں کو خوشبو لگا کر ہر بار نہیں لگنا چاہیے، مرد متوجہ

ہوتے ہیں تو گناہ ملتا ہے۔ میں نے جینٹس لگانا شروع

کر دیا۔ تاکہ مرد متوجہ نہ ہوں۔“ معصومیت بھرا

جواب دیا۔ حاشر کا دل چاہا اس لالچ پر دل کھول کر

قتقہ لگائے، لیکن ضبط کر گیا۔ (اماں کی پٹھانی پولی ٹن

ٹن بجنے لگی تھی۔)

”تو لگاؤ ہی مت۔“ وہ کہہ کر لیٹ گیا۔ اب یہ لگاؤ

مت والا فرمان ناقابل ہضم تھا۔ اس کا تو سنگھار پر یہ نوم

لگائے بغیر پورا ہی نہ ہوا تھا۔ اس ایک رات میں ہی وہ

جان گئی تھی، شہزادے کے سبک رہنے کے لیے اسے

بہت کچھ چھوڑنا پڑے گا اور وہ ذہن میں حساب لگاتی پھر

ری تھی کہ کیا کیادہ آسانی سے چھوڑ سکے گی۔

☆☆☆

شام کو ولیمہ تھا اور ولیمہ کے بعد اسے اماں ساتھ

لے جانے کا ارادہ رکھتی تھیں مکلاوہ، چوٹھی کی

رسم حاشر میاں نے بڑے پیار سے سمجھایا۔

”اتنے سال اماں باوا کے ہاں رہ کر جی نہیں بھرا

تمہارا، بس رہنے دو۔ میں کیسے سوؤں گا تمہارے

بغیر؟“ (اللہ رہے۔)

”ہائیں۔۔۔ جیسے رات کو سوئے یا پھر اب تک کی

پچھلی ساری راتیں۔“ وہ سوچ کر رہ گئی۔ وہ سمجھ گئی

اس محل میں رہنے کے جو شرائط و قواعد لاکوہوں گے

اسے نبھانے پڑیں گے۔ اس نے سہولت سے اماں کو

منع کر دیا اور وعدہ کیا مہمانوں کے جاتے ہی وہ رہنے

آئے گی۔ اماں با آسانی مان گئیں۔ کوئی بد مزگی نہیں

ہوئی۔ ولیمہ کے اگلے روز وہ لوگ تین دن کے ہئی

مون پر مری چلے گئے۔ ان تین دنوں میں بھی نہ وہ حاشر

سے بے تکلف ہو سکی نہ وہ اس سے خوش اسے اس کا

بھی ملحقہ اسٹور روم میں رکھ آئی۔ اس وقت اسے

ایک ڈائجسٹ یا کتاب کی کمی شدت سے محسوس

ہو رہی تھی۔ کاش دوسری ضروری اشیاء کے ساتھ وہ

یہ بھی رکھ لاتی۔ حاشر میاں تو دل برداشتہ ہو کر موبائل

پر بڑی ہو چکے تھے۔ میچ نے بھی لمبی تان لی۔ یوں یہ

خوب صورت وقت دو اتار پرست اور خود پسند لوگوں کی

فطرت کی نذر ہو گیا۔

☆☆☆

اگلے دن حاشر میاں کے اٹھنے سے قبل ہی وہ چڑی

کا گونا گونا ہلکا پھلکا سوٹ پہنے باہر صحن میں موجود اس کی

بھتیجیوں، بھانجیوں کے ساتھ گپ شپ لگاتے موجود

تھی۔ ساس، سرسرمال کہ کیسی کھل مل جانے والی ہو

لی۔ نندیں خوش کہ دلہن خوب صورت ہے، مگر

خرے والی نہیں۔

حاشر میاں نے کھلی کھڑکی سے آدھا گھنٹا تو یہ منظر

ملاحظہ کیا، پھر برداشت ختم ہو گئی اور لگے آوازیں

دینے۔ ”میچ۔۔۔ میچ۔۔۔ ملی۔“ ”کوئی ایک منٹ لگاؤ میچ

سے ملی ہو گئی۔

میچ فرماں برداری کے تمام ریکارڈ توڑتی رو رہی

تھی۔ حاشر نے ناقدانہ جائزہ لیا۔ آج اس کا چہرہ میک

اپ سے مبرا تھا۔ ریڈ گرین چڑی کا گولے والا سوٹ۔

یہ اس کی عزیز از جان سہیلی نمروہ نے اپنے ہاتھوں سے

تیار کیا تھا۔ اس کے گورے پاؤں کو لمبا پوری چپل میں

مقید تھے اور اس میں کوئی شک نہیں تھا، بہت خوب

صورت لگ رہے تھے۔

”آپ نے بلایا تھا؟“ جب حاشر نے نظروں سے

تولنے والا کام جاری رکھا تو میچ نے پوچھ لیا۔

”ہاں۔۔۔ وہ۔“ حاشر ایک لمحے کو ٹکڑیا۔

”میں نے تمہیں کچھ سمجھانا تھا، میچو۔“ سامنے

اشارہ کیا۔ وہ سنگل صوفے پر ٹک گئی، یوں کہ اس کے

ہندی لگے دونوں ہاتھ گود میں دھرے تھے۔ سر جھکا

ہوا اور دوپٹے سے مزین۔ دائیں پاؤں کا انگوٹھا مضطرب

انداز میں ہلاتی وہ جی جان سے شاہی فرماں سننے کے لیے

کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس کا دوشا اوڑھنا، اپنے آپ کو سمیٹ کر چلنا۔ تیار تو وہ پہلے بھی تک سب سے رہتی ہی تھی، لیکن حاشرمیاں کو اس کی تیاری میں پینڈو لچ نظر آتا۔

”دوشا سر پر مت لو۔ مائی کی لک سے جان چھڑاؤ۔ اور یہ دھیلے دھالے کام والے کپڑے، اف تو یہ، ہلکے رنگ پہنا کرو۔ بلکہ اگر جینز اور ٹائٹس پر ٹاپ پہن لیا کرو تو اچھی خاصی لگو۔“ شہزادے کے خیالات کچھ زیادہ ہی آزادانہ تھے۔ جینز اور ٹاپ کا سن کر ہی وہ لرز گئی۔ کہیں وہ سچ میں پکڑ کر پھنسا ہی نہ دے۔ اماں نے یہ تو دیکھا لڑکا شہزادہ ہے، یہ نہ سوچا اس شہزادے کی شہزادی سے وہ نباہ کر بھی پائے گی یا نہیں۔ وہ عام سی محلوں میں رہنے والی لڑکی اور وہ پوش اریا کا ماڈرن لڑکا۔ گویا اس لباس میں اس کی دونوں مندریں بھی کم و بیش لبوس ہی نظر آتیں۔ لیکن میسرے کے لیے یہ سب ناقابل قبول تھا۔

حاشرے کے مسلسل ٹوکنے پر دوشا تو سر سے کندھوں پر آگیا، لیکن وہ جینز اور ٹاپ پہننے کی ہمت نہ کر سکی۔ وہ اکثر جب اسے لے کر باہر نکلتا تو سارا راستہ اس کا موازنہ گزرنے والی لڑکیوں سے کرتا رہتا۔ اس دن بنا بتائے اسے سلون لے گیا اور ہینو اسٹانڈسٹ فائزہ سے اس کا جدید ہینو کٹ بنوایا۔ میسرے کی شکل میں نئے ہینو اسٹائل سے واضح چیخ آیا۔ اسے اپنا چہرہ اچھا لگ رہا تھا۔ حاشرے جان گیا، وہ خوش ہے، ساتھ ہی اسے جینز پہننے والا پچھر پھر سے پلا دیا۔ اس نے خاموشی سے اس کی بات سنی اور دوسرے کان سے اڑادی۔

وہ بیوی کام والے کپڑے پہننا چھوڑ چکی تھی۔ جیولری، میک اپ اور توہر ہاتھوں پر مندی لگانا بھی جس کا اسے سب سے زیادہ دکھ تھا، پچھر بھی وہ ایسا کوئی کام نہیں کرتا چاہتی تھی جس سے حاشرے کو دکھ ہو۔ لیکن اس سب کے باوجود حاشرے اس سے خوش نہیں تھا۔

بچے ہو گئے، وہ ان میں مصروف ہو گئی، ساس، مسر، شوہر، بچے، مندوں کا آنا جانا۔ مصروفیت میں ایسے گم ہوئی کہ اپنا سر لپا بھلا ہی دیا۔ وہ ہر وقت تک سب سے

تیار رہیں کہیں پیچھے ہی رہ گئی۔ ایک ماں، بسو، بھابھی ہی زندہ بچی۔ بچوں کی فرمائشیں، ساس، سرکار پر ہیزی کھانا، ہر ایک اینڈر دعوتیں، اس کے پاس وقت ہی نہ بچا کہ ایک گھڑی رگ کر آئینے میں اپنا سر لپا ہی دیکھ لیتی، ہمزرتے وقت نے اس کا فکرو بھی قدرے فرہی مائل کر دیا تھا اور اسے یاد تھا کہ حاشرے بہت شرموع میں اسے بتا دیا تھا اسے موٹی عورتیں قطعاً پسند نہیں تھیں۔ اس نے ویٹ کم کرنے کی قطعاً، کوئی کوشش نہ کی، وہ اپنی زندگی میں ممکن ہو گئی۔ مندی، کاجل، سرخی پاؤڈر، سب خواب و خیال ہو گیا۔ لیکن اس کی وجہ صرف اس کی مصروفیت نہیں تھی، بلکہ وجہ کوئی اور تھی، جو کوئی نہ جان پایا تھا۔



اسے اڑاتی اڑاتی خبریں ملا کرتی تھیں۔ شہزادہ حاشرے ہر روز نئی لڑکی کے ساتھ کسی نہ کسی ڈیٹ پوائنٹ پر پایا جاتا ہے۔ لیکن وہ انکور کرتی تھی۔ نہ بھی کرتی تو کیا کر سکتی تھی۔ اس کی وادی کہا کرتی تھیں۔ مرد کو تب تک راہ راست پر نہیں لایا جاسکتا، جب تک وہ خود نہ چاہے، رولو، منت کر لو، بچوں کے واسطے دے لو۔ وہ تب ہی سدھرے گا جب اس کا اپنا جی چاہے گا، مرد کسی تعلق، کسی رشتے کو پیر کی زنجیر نہیں کرتا اور میسرے نے زنجیر بننے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اپنے آپ کو بچوں میں گم کر لیا۔ حاشرے گھر آتا۔ اس کی طرف دیکھتا، اس کی شخصیت پر اعتراض کرتا اور لپٹ لپٹ کھول کر اپنی دنیا میں گم ہو جاتا۔

گزرتے سالوں میں حاشرے اور گھروالوں کے رویے نے اسے احساس دلایا تھا کہ شاید دنیا میں اس سے بڑھ کر بد صورت اور پھوڑ عورت کوئی نہیں، وہ کسی بھی بات پر کڑھتی نہیں تھی۔ کسی کے اعتراض کو وہ ختم کرنے کی کوشش ضرور کرتی تھی۔ لیکن اس نے جانا کوئی بھی اس سے خوش تھا نہیں۔

مندیں، ہمیشہ بڑی بھانج کے گیت گاتی نظر آتیں۔ وہ بھانج جو ہمیشہ ان کی آمد پر یا تو بازار نکل جایا کرتی یا پھر

بیاری کا بہانا بنا کر ہائے ہائے کا غغلہ مچائے رکھتی۔ سردی ہوتی یا گرمی چائے کا کپ اور پی ٹائم بسکٹ کا ہاف رول، پھر بھی وہ بہت اچھی بھابھی تھی۔ ساس بھی ہمہ وقت بڑی بہو کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتیں۔ حالانکہ کبھی جو ساس صاحبہ ادھر رہنے چلی جاتیں تو اپنے رویے سے اگلے ہی دن انہیں واپس جانے پر مجبور کر دیتی اور حاشر بھی تو ہر وقت ٹمٹ بھابھی سے متاثر ہی نظر آتا۔

”تم نے کبھی گلی بھابھی کو دیکھا ہے۔“ وہ اس کے حلیے پر ناقدانہ نظر ڈالتا۔ ”چار جوان بیٹوں کی ماں کہیں سے بھی لگتی ہیں اور ایک تم ہو۔“ تان ہمیشہ ایک نم ہو کر آ کر نوتی۔

”ہاں ایک میں ہوں۔“ وہ ٹوٹھ برش کرتے ہوئے آئینہ میں اپنی شکل دیکھتی تو اسے ”لیجھ“ یاد آ جاتی۔ نزا تو کب سے بھری لیجھ جو اماں کے گھر میں بل کر پانی نہ پیتی تھی اور اب یہاں کوئی اسے ایک گھونٹ پانی دیئے والا نہ تھا۔

اس روز نمہ آگئی۔ یہ ہی کوئی چھ سات سال بعد۔ سانولی سی نمہ کا رنگ روپ ہی اور ہو گیا تھا۔ چمکتا چہرہ ڈائی کیے بال، برانڈ کرتاؤز، سن گلاسز لگائے وہ کوئی اور ہی نمہ تھی۔ شادی نے تو اسے یکسر بدل ڈالا تھا۔ اس نے اپنی حیرت کا اظہار کیا تو وہ ہنس پڑی۔

”شادی کے بعد بدلنا پڑتا ہے اپنے آپ کو۔ ورنہ یہ جو شوہر حضرات ہیں، بے وفائی کرنے میں دیر نہیں لگاتے اور یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے، پلیر رنکٹ، اڑے بال، متوحش آنکھیں، یا اللہ! لیجھ یہ تم ہو۔“ اس نے اب غور کیا تھا اس کی حالت زار پر۔

”کیا ہوا، مجھے وہی تو ہوں۔“ وہ ہنس دی۔ کھیانی ہنسی۔

”نہیں۔۔۔ تم وہی نہیں ہو۔ یہ لسن، پاؤں کی مہک میں ڈوبی لڑکی لیجھ امتیاز تو نہیں۔ جہاں تک میں جانتی ہوں حاشر بھائی اچھی پوسٹ پر ہیں۔ تمہیں فٹائل رابلیم بھی کوئی نہیں۔ کیا تم باہر نہیں جاتی ہو حاشر بھائی کے ساتھ۔ ان کے لیے تمہارا حلیہ قابل قبول ہے؟

”ٹھیک تو ہے میرا حلیہ، گھر میں جوان ملازم ہیں، ڈرائیور تنگ اب میں غیر مردوں کے سامنے بناؤ سنگار کرتی اچھی لگوں گی، خواہ خواہ گناہ کماؤں، اور حاشر کو بھی مجھ سے کوئی مسئلہ نہیں۔ یہ تم بچ اچانک آگئی ہو، اس لیے تمہیں اس حلیے میں مل گئی۔ صبح سے الماریاں صاف کر رہی تھی۔ نہانے جانا تھا مجھے ابھی۔“

اپنے تئیں اس نے نمہ کو مطمئن کرنا چاہا تھا۔ لیکن وہ نمہ تھی، اس کی بہت گہری دوست، بنا لے اس کے دل کی باتیں جان لینے والی۔ اب کیسے مطمئن ہوتی۔ لیکن اس نے زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔ اگر وہ کسی بات کا پرہ رکھنا چاہتی ہے تو اسے کیا ضرورت، تھوڑی دیر بیٹھ، ادھر ادھر کی کپ شپ کر کے وہ واپس چلی گئی اور جاتے جاتے لیجھ کو اپنے گھر آنے کی تاکید کر گئی۔ اس نے وعدہ کر لیا۔ حالانکہ اسے امید نہیں تھی کہ حاشر اسے اس کی دوست کے گھر لے جائیں گے۔ ان کو اس پرانے محلے میں جاتے ہوئے اپنی ہتک محسوس ہوتی تھی۔ وہ اس پر بہت خرچ کرنا تھا۔ آؤنگک پر بھی لے جاتا۔ کسی نہ کسی ویک اینڈ پر وہ بچوں کو سینما دکھانے بھی لے جاتا۔ اس کے لیے شاپنگ بھی کرتا۔ لیکن جیسے ہی وہ اس کا لایا سوٹ، جوتی، کچھ بھی پسنتی، وہ برا سامنہ بنالیتا۔ گہرے رنگ تم پر سوٹ نہیں کرتے۔

وہ ہلکے رنگ پہننے لگی۔ اس کا حلیہ واقعی کام کرنے والیوں جیسا ہو گیا تھا۔ ہلکے رنگ، سیدھے بال، بنامیک اپ کے چہرہ ہاتھ پیر کسی بھی آرائش سے مستثنیٰ۔ ہر وقت بچوں میں حلیاتی لیجھ تو کہیں سے بھی لڑکی دھتی ہی نہ تھی۔



حاشر کی بروموشن ہوئی۔ اس نے اپنے سارے دوستوں کو دو فیملی ڈنر کے لیے انوائٹ کر لیا۔ انتظام باہر لان میں کیا گیا تھا۔ وہ خود بشیر کنگ کے ساتھ گئی رہی۔ شام تک سب کچھ تیار تھا۔ صاف ستھرا گھر، بچے، وہ اپنا

گھر یلو عورت ہونے پر۔ لیکن حاشر شرمندہ ہونے والے مردوں میں سے نہیں تھا۔ کمرے میں آتے ہی فرمان جاری ہونے لگا۔

”خوش ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے ان سب کو بتا رکھا ہے تم کس بیک گراؤنڈ سے تعلق رکھتی ہو، شرمنا، لجانا، خواہ خواہ مجھ جتنا تمہاری سمجھی میں ہے۔ انہوں نے دانستہ تمہارے ساتھ تمہاری فیورٹس ڈسکس کیے۔ ورنہ یہ تو ان کا مزاج ہی نہیں، محلے اور سوسائٹی کا فرق تو حلیمہ سے ہی نظر آ جاتا ہے۔ اب دیکھو تالیم لاکھ شارٹ شرٹ اور کپڑی پہن لو، تمہارے بولنے، کھانے پینے پر ہر چیز سے تمہارا محلہ نظر آتا ہے۔“

وہ کھلم کھلا بے عزتی کر رہا تھا۔ بلیچ صبر کے گھونٹ پی رہی تھی۔ اس کا دل شدت سے چاہا جواب دے۔ وہ محلے کی تھی تو اس کی تمام تر زیادتیوں کو مسہرہ ہی تھی۔ جس پر طبقے سے حاشر کا تعلق تھا۔ اس طبقے میں ایسی زیادتیاں برواشت کرنا عورت کو سکھایا نہیں جاتا تھا۔ اس طبقے کی عورت اگر مرد کے برابر کھڑی ہوتی ہے تو حقوق بھی برابری کے لیتی ہے۔ یہ جو دن رات بے عزتی کرنے کا پروگرام حاشر اور اس کی فیملی چلائے رکھتی تھی، کوئی اور مسہدہ کر تو دکھاتا۔

بلیچ نے سوچ لیا تھا جان لیا تھا۔ وہ اس گھر کے کبھی فرد کے لیے باعث خوشی نہیں وہ اپنے آپ کو جتنا مرضی آزار پہنچالے۔ لیکن اس سارے کے نتیجے میں اس نے ایک اور کام کیا۔ اپنے آپ کو بے حس کر لیا۔ کسی کے رویے پر دھی نہیں ہوتا۔ کوئی بولتا رہے، اسے کو سنوں سے نوازنا رہے۔ اس کے اٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے میں نقص نکالتا رہے۔ اس کی بلا سے وہ جس کس کی خاطر کتنا کتنا بدلتی اپنے آپ کو۔ سب کچھ تو بدل ڈالا تھا۔ اور کیا کرتی؟ مگر بھی نہیں سمجھتی تھی۔



حاشر کو وہ پہلی نظر میں اچھی لگی تھی۔ وہ اس روز اپنے دوست سے ملنے اس کے گھر گیا تھا۔ گلی سے

نیا ڈریس اٹھا کر واش روم کی طرف جا رہی تھی۔ جب حاشر کسی کام کی غرض سے اندر آیا۔ اس کو غور سے دیکھا وہ منتظر کھڑی ہو گئی، فرمان سننے کے لیے۔

”میرے سب دوستوں کی بیویاں ہائی سوسائٹی موو کرنے کے سارے مگر جانتی ہیں۔ فیشن سے لے کر۔ باسٹ تک، وہ ہر ٹائپ پر بلا ٹکنا گفتگو کر سکتی ہیں۔ تم جس ٹائپ پر گفتگو کر سکتی ہو؟“ وہ استنہز اسے پوچھ رہا تھا۔ ”نہیں، نہیں۔ بسن، پلانے، بچے، سبزی، گوشت کے علاوہ۔“ اس کے کچھ کہنے سے قبل ہی حاشر نے دوبارہ کہا۔ وہ ہمیشہ کی طرح خاموش رہی۔ وہ جواب دے سکتی تھی، لیکن دینا نہیں چاہتی تھی، ہمیشہ کمال کے ضبط کا مظاہرہ کرتی تھی۔

”نہیں۔ میرا مطلب ہے تم ان سب میں سروائیو کر سکو گی؟“ وہ پھر بولا۔

”آپ چاہتے ہیں کہ میں باہر نہ آؤں؟“ اس نے یازو پر ڈالے کپڑے بند پر رکھ دیے اور واپس مڑنے کو بھی کہ حاشر کی آواز کانوں میں بڑی۔

”اب اتنا ایٹنی ٹیوڈ کھانے کی ضرورت نہیں۔ بس جس چیز کے بارے میں نہ جانتی ہو، منہ نہ کھولنا۔ باقی سب جانتے ہی میں تم سوشل نہیں ہو، خالفتا“ گھر یلو ”عورت ہو“ حاشر نے عورت پر خاصا زور دیا۔

وہ لڑائی، جھگڑے، بحث سے دور بھاگتی تھی۔ خاموشی سے تیار ہونے چل دی۔ بڑے سالوں بعد وہ دل سے تیار ہوئی تھی۔ اور باہر آتے ہی وہ رونق محفل بن گئی تھی۔

”میں بھی کہوں حاشر نے اپنی بیوی کو اتنا چھپا کر کیوں رکھا ہے۔“ حاشر کے ایک دوست نے بے باک نظروں سے اسے تولتے ہوئے کہا۔ وہ گھبرائی نہیں۔ اس نے سب مہمانوں کو ذیل کیا۔ سب کے ساتھ باتیں کیں۔ سب اس کی صلاحیتوں کے معترف ہوئے اور حاشر کو بار بار احساس دلاتے رہے کہ اس کی بیوی بڑی گئی ہے۔ وہ بہت خوش قسمت ہے وغیرہ وغیرہ سپاہی حتم ہو گئی۔

کس نے اس کے کپڑوں پر نکتہ چینی کی نہ اس کے

تمہارے سر پر چڑھ کے ناچے گی۔ کچھ پہن لے، کچھ لگ رہی ہو۔ ابھی سراہنا مت، ورنہ پھٹ جائے گی، اپنے حسن سے تمہیں مغلوب کرے گی اور پھر تم پر حکومت کرے گی۔ تم کسی سے کم ہو۔“ ہاں کم تو وہ کسی سے بھی نہیں تھا۔ ہاں اگر اس کو اپنے سے کم تر لڑکی پسند آگئی تھی تو یہ اور بات تھی۔ اس نے اماں کی بات اچھی طرح باندھ کر واث میں رکھ لی۔ (لڑکی ہونی تو پلو سے باندھتی)

پہلی رات جب حاشر میاں نے دلہن کے مہندی رنگے ہاتھ دیکھے تو دل گویا بھاگ نکلنے کو بے تاب ہوا۔ ”مہندی کسی کے ہاتھ پر یوں بھی رچتی ہے۔“ وہ تو سوچتے ہی رہ گئے، لیکن اگلے ہی پل والٹ سے آواز آئی۔ آواز کیا رمانڈ۔ انہوں نے ہاتھ پکڑ کر راز دل کہنے کی حسرت کو دل ہی میں دبایا اور گئے گوہر افشاری کرنے۔ اس پر گہرے رنگ بہت اٹھتے تھے۔ اور ملے رنگوں میں اس کا رنگ روپ اور نکھرے لگتا۔ حاشر میاں کو ہر روپ بھاتا، مگر اماں کے گولڈن الفاظ، پھر رفتہ رفتہ وہ اماں کے ہی لفظوں کی چھاؤں میں بڑے رہنے کو ترجیح دینے لگے۔ وہ اچھی لگتی۔ بری لگتی، ہر وقت سانس کی طرح مین میکھ نکالنا، اعتراض کرنا فطرت بن گئی اور اس سارے میں حاشر نے دیکھا ہی نہیں کہ وہ جو زندگی سے بھرپور لڑکی تھی، کہیں چپکے سے مر گئی تھی اور شاید دفن بھی ہو گئی تھی۔ اس محل کے ایک کمرے میں۔



اماں نے اس کا سونا سونا روپ دیکھا تو پوچھ لیا۔ ”تو خوش نہیں ہے لیجئے؟“ وہ پنگی کا فیدر بنا رہی تھی۔ پلٹ کر ماں کو دیکھنے لگی۔

”ناخوش ہونے کی کون سی وجہ ہے۔ محل میں رہتی ہوں۔ نوکر، چاکر گاڑی، کسی چیز کی کمی نہیں۔ پھر میں ناخوش کیوں ہوں گی۔“ فیدر بنا چکی تھی۔ پنگی کے منہ میں دیا۔ باہر تینوں بچوں کے لڑنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ جا کر انہیں منع کرنا چاہتی تھی۔ لیکن نہیں

گزرتی لڑکیوں کے ٹولے میں وہ اسے سب سے منفرد ہی لگتی۔ اس نے ارسل سے پوچھا کہ وہ کون ہے، تو اس نے اس کا سارا شجرہ نسب بتا ڈالا اور اگلے چند دن میں ہی حاشر پر انکشاف ہوا وہ اس لڑکی جس کا نام ملیحہ امتیاز تھا، کی محبت میں پور پور ڈوب چکا ہے۔ اٹھتے بیٹھتے اس کے ذہن پر وہ ہنسی سوار رہنے لگی تھی۔ اس نے ارسل کے گھر کے بلا سبب چکر لگانے شروع کیے تو وہ بھی کھٹک کھٹک پوچھنے پر حاشر نے سب کہہ ڈالا۔

”شریف لڑکی ہے، شریف خاندان۔ اس طرح کی حرکتیں اسے بدنام کر ڈالیں گی۔ سیدھی طرح رشتہ بھیجو اور اسے اپنا لو اور اگر کوئی اور ارادہ ہے تو۔ پھر باز رہو۔ محلے کی لڑکیاں ہماری اپنی نہیں ہیں۔“

ارسل نے اسے سمجھا دیا اور وہ سمجھ بھی گیا۔ مگر وہی ای اے میں رہنے والی نئی بی امیر ہوئی اماں کو محلے کی لڑکی سے عشق کرنا کچھ بھایا نہیں۔ سب نے سمجھایا، لیکن حاشر کی سوئی اسی لڑکی پر انکلی رہی۔ بھوک ہڑتال کر ڈالی۔ اماں نے بالا ہی بالا اس لڑکی کی معلومات اکٹھی کیں اور پھر اماں شکورن جو کہ رشتے کروانی والی خالہ کے نام سے مشہور تھیں نے مہر لگادی کہ لڑکی اور اس کا خاندان انتہائی شریف ہے اور اتنے گئے گزرے بھی نہیں، ٹھیک ٹھاک آمدن اور ٹھیک ٹھاک رہن سہن ہے۔ اماں کے کچھ خدشات دور ہوئے، کچھ انہوں نے خود ہی نہیں کیے اور یوں اماں شکورن کی وساطت سے یہ رشتہ طے پا گیا۔

حاشر میاں بڑے خوش ہو گیا ہفت اقلیم ہاتھ آگئی ہو۔ اماں نے سمجھو تا تو کر لیا۔ لیکن بیٹے کو چند سنہری باتیں بھی اذہر کروادیں۔

”دیکھو بیٹا، تم نے جو چاہا، پایا، وہ لڑکی تمہاری ہو گئی، تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گی۔ حد سے زیادہ خوب صورت اور اوپر سے غریب محلے کی۔ بیشہ میری بات یاد رکھنا، کبھی اسے مت بتانا کہ تم اس سے محبت کرتے ہو۔ کبھی اسے اہمیت دے کر سر پر مت چڑھانا۔ وہ خوب صورت ہے بلا کی اور یہ بات وہ جانتی بھی ہے۔ لہذا اس کی تعریف مت کرنا۔ ورنہ

اٹھی۔

”تیری ساس کا سلوک تو تجھ سے اچھا ہے؟“ اب انہیں بے چینی تھی یا کوئی اور مسئلہ۔ وہ آئی بھی تو بہت دنوں بعد تھی۔ وہ سب کچھ جان لیتا چاہتی تھیں۔

”سب اچھے ہیں۔ اپنی اپنی زندگی میں مگن۔“ اب وہ پتلی کو تھک رہی تھی۔

”نہیں، میرا مطلب ہے۔ حاشرہ۔ تو بدل گئی ہے۔ ہار سنگار بیانی عورت کا زیور ہوتا ہے۔ یوں سر جھاڑ، منہ جھاڑ، دیکھ تو کتنی بوڑھی لگ رہی ہے تو اور نہیں تو کم از کم بالوں میں کڑی لگایا کر۔ کیسے بد رونق ہے ہو رہے ہیں۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک نہ زور، جھمک۔ کیا ہو گیا تجھے۔“ اماں پریشان تھیں، تشکر تھیں۔ لیجہ کا دل بھر آیا۔ اور آنکھیں بھی۔

”اماں۔ حاشرہ کو یہ سب پسند نہیں۔ سو میں نے چھوڑ دیا۔ اسے میرے اٹھے بیٹھے، کھانے پینے، چلنے پھرنے، پہننے اوڑھنے، سب میں اس غریب مٹکی کی پاس آتی ہے۔ اماں آپ نے اس محل میں مجھے بیاہتے ہوئے ایک بل بھی میرے بارے میں نہ سوچا۔ میں کیسے رہ پاؤں گی ان اونچی دیواروں کے اندر، جہاں سے مجھے یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں نظر ہی نہیں آتیں۔ آپ نے تو میرا بھلا ہی سوچا ہو گا نا۔ لیکن۔“ وہ بولتے بولتے چپ کر گئی۔ بچے اندر آ گئے تھے۔

وہ دو دن اماں کی طرف رہی۔ سارا محلہ بھری۔ پھوپھو سلامتے، آپا تمکین، زرمہنیہ باجی، فہت خالہ، اس کی نیچر جن سے وہ ٹیوشن پڑھنے جاتی تھی اور قرآن پاک بھی اور حاشرہ کے رشتے کی جماعتی بھی، ارسل (بیٹے) کے کہنے پر۔ رفعت آپا سے فرمائشی کھیر بنوائی اور جب انہوں نے اس کے ساتھ روپ کے بارے میں پوچھا تو اس نے نہ راز اگلا۔ جسے کوئی نہ جان پایا تھا۔

”مہندی، زیور، اچھے کپڑے، خوشبو، تیری پہچان تھے لیجہ؟“ انہوں نے گرم گرم کھیر پیالے میں ڈال کر اس کی طرف بڑھائی۔ اسے گرم کھیر پسند تھی۔ ٹھنڈی کھیر کھا نہیں سکتی تھی۔

”حاشرہ کو میرے مہندی لگے ہاتھ بہت اچھے لگے

تھے آہ۔ لیکن اس نے مجھے کہا اچھے بھلے ہاتھ گندے کر لیے۔ اس رات میں ہاتھوں سے مہندی کا رنگ تو نہ اتار پائی، مگر میرے دل سے مہندی اتر گئی۔ میں عاشق مکی مہندی کی۔ میں نے اپنا عشق چھوڑ دیا۔ اس مجازی خدا کے لیے جس کے سنگ مجھے زندگی گزارنے کا اذن دیا گیا تھا۔ اسے میرا دمکتا دلنا پسند نہیں آیا۔

میں نے وہ عارضی خوب صورتی بھی اپنے چہرے سے دھو ڈالی۔ میرے دکتے کپڑے اسے پسند نہیں آئے، میں نے وہ بھی بدل ڈالے۔ اس کی باتوں کا کیزا میری تھکی مٹی خوشیوں کو ہولے ہولے کھاتا رہا۔ وہ میری تعریف نہیں کرتا تھا، لیکن میرے سامنے آکر غیر عورتوں کی تعریفیں کرتا تھا۔ ان کی آنکھیں، ان کے بال، ان کے کپڑے، ان کا لائف اسٹائل، میں نے سب کچھ خاموشی سے سنا، برداشت کیا۔ لیکن اس روز جب میری دونوں منڈیں گھر آئی ہوئی تھیں اپنے شوہروں کے ساتھ۔ تو۔۔۔ میری۔۔۔ منہ کے شوہر نے کچن میں کھڑے ہو کر جو کچھ مجھے کہا میرا دل غمگین ہو گیا۔ اس نے مجھے کہا کہ حاشرہ کو تو میری قدر ہی نہیں۔ تم

اس قدر خوب صورت ہو اور وہ باہر کی عورتوں میں خوب صورتی ڈھونڈتا پھرتا ہے اور اس کی تعریف، اس کی نظریں مجھے سن کر گھٹیں خالہ۔ میں جہاں کی تہاں رہ گئی۔ بس میں نے اپنے سارے خواب لیٹے اور انہیں دل کے نہاں خانوں میں رکھ دیا۔ میں نے مہندی، کاجل، پرفیوم سب لگانا چھوڑ دیا۔ پتا ہے کیوں۔ کوئی مجھے دیکھے اور تعریف کرے اور میرا دل اپنے شوہر سے پھر جائے۔ اس لیے میں اس عیمر مرد کی اسپر ہو جاؤں۔ اپنے شوہر، اپنے بچوں سے بے وفائی کروں۔ اس لیے میں نے مانی کا چولا پہن لیا۔ ہار سنگار چھوڑ دیا۔ کوئی مجھ پر غلط نظر نہ ڈالے اس لیے میرا دل کسی کی تعریف پر نہ کھنچے اس لیے۔ مجھے نخر ہے، لوگ میرے حلیمے سے مجھے مانی (کام کرنے والے) سمجھتے ہیں۔ بری نظر نہیں ڈالتے۔ میں نے خود کو بچایا ہے۔ ورنہ یہ حسن اور اس کی آرائش مجھے لے ڈوبتی خالہ۔ تعریف جو مجھے میرے شوہر سے نہیں

اپنی بیٹیوں کے لیے سکھ بھی مانگ لیا کریں تو کوئی شہزادی پتھر کی نہ ہو۔ اور شہزادے بھی اگر ماؤں کے ناجائز مطالبات اپنے والٹ میں نہ ڈالے پھر تو خالی دامن کو تاسف سے نہ بھرتا رہے۔ اونچی فصیلوں کے پیچھے زندگی قلعاریاں مارے نہ کہ سنائے۔ وہ جانتی تھی حاشر سب جان گیا ہے۔ اپنے عمل پر شرمندہ بھی ہے اور آج وہ یقیناً ”معافی تلافی کرے گا“ اپنے رویوں پر۔ اماں کی تھما کی پولٹی نہیں دریا برد کر دے گا۔ اس کے لیے یہ وجود کو محبت کے دھاگے سے رگو کرنے کی کوشش بھی کرے گا۔

لیکن۔۔۔
روح میں کب پیوند لگتا ہے؟

لی، کہیں اور سے ملتی تو میرے لیے جنم کی آگ بن جاتی۔ میرے بے رنگ ہاتھ، سونی کلاسیاں، خالی آنکھیں، میرے لیے جنت ہیں۔ بس اتنا کہتا ہے کہ مائیں جب خوب صورت بیٹیوں کو جنم دیتی ہیں تو انہیں شہزادوں کی آس مت دلایا کریں۔ محلوں کے خواب مت دکھایا کریں کہ محلوں کے اونچی فصیلوں کے اس پار سب کچھ مرجایا کرتا ہے۔ نہ شہزادی پختی ہے، نہ خواب۔ وہ چپ ہوئی تو رفعت خالہ کو اس کے اندر کاسناٹا گونجتا محسوس ہوا۔

”لیکن حاشر نے تم سے محبت کی تھی۔ ارسل نے بتایا تھا مجھے۔“ رفعت خالہ نے کہا تو اس نے بھیگی پلکیں اٹھا کر لے کے مل انہیں دکھا۔

”یہ کیسی محبت تھی خالہ جس نے میرے اندر سے روح ہی کھینچ لی۔“ کھیر پالے میں جوں کی توں پڑی تھی۔ ٹھنڈی کھیر اسے پسند نہیں تھی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ جوتے کی نوک سے کچا فرش ادھیرے گئی۔

”میں نے خالہ آپ کے سامنے اپنی ذات کے بچے ادھیرے ہیں۔ کسی اور کو میرے چاک پیرا ہن کا پتانہ چلے۔ ورنہ میں لیر لیر ہو جاؤں گی۔“ خالہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ آنکھوں میں یقین دہانی تھی۔

وہ مڑی اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھی۔ مانوس جوتوں سے نظر اوپر اٹھی تو ابھی رہ گئی۔ حاشر اور ارسل کھڑے تھے اور جانے کب سے۔ آج وہ بے بھرم ہو گئی تھی اس شخص کے سامنے۔ جسے اس کی ماں نے اس کے لیے چنا تھا۔ اپنی شہزادی بیٹی کے لیے۔ جو اسے محل میں رکھتا اور شہزادیوں کی طرح عیش کرواتا۔ شہزادے نے اسے محل میں بھی رکھا تھا۔ عیش بھی کروائے تھے۔ لیکن اس کے روح کے اوپر پیر رکھ کر اس کا ایک ایک خواب کرجی کرجی کر کے شہزادے کی آنکھ میں ناسف تھا۔ دکھ تھا۔ شرمندگی تھی۔ اس نے اپنی دائیں جیب سے والٹ نکالا۔ کھولا۔ کچھ نامعلوم سا ڈھونڈا۔ (پیشانی عرق آلود ہو گئی تھی)۔ پھر واپس رکھ لیا۔

شہزادیوں کی مائیں محل اور عیش کے ساتھ ساتھ

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

300/-	راحت جبین	ساری بھول ہماری تھی
300/-	راحت جبین	اوپر پروا بھجن
350/-	حزولہ ریاض	ایک میں اور ایک تم
350/-	نسیم سحر قریشی	بڑا آدمی
300/-	صائمہ اکرم چوہدری	دیکھ زوہ محبت
350/-	میمنہ خورشیدی	نسی راستے کی تلاش میں
300/-	شرہ بخاری	ہستی کا آہنگ
300/-	سازہ رضا	دل موم کا دیا
300/-	نفیسہ سعید	ساڈا چڑیا دا چنبا
500/-	آمنہ ریاض	ستارہ شام
300/-	نمرہ احمد	مصنف
750/-	نوزیہ یاسمین	دست کوزہ گر
300/-	سمیرا امجد	محبت من محرم

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

محبوب کا حق دلو

کی تپش کا عکس اس کے وجود سے ظاہر ہو رہا تھا۔
تور یہ نظریں جمائے دفعتاً وہ چمکی تھی اور تور کے اندر
ہاتھ ڈال کر گرم گرم روٹیاں نکالنے لگی۔

”ہائے، اوئے..... جھلی ہوئی ہے۔ فی کملی۔“
عورتوں میں جیسے شہد کی مکھیوں کی طرح بھنبھناہٹ
شروع ہو گئی تھی۔ مگر وہ جیسے سماعت سے محروم ہو گئی
تھی۔ اک جنوں اک عالم خود فراموشی کی کیفیت تھی،
اسے جلتی پوروں کا بھی احساس نہیں تھا۔ نہ ہی حق دق
رہ جانے والی عورتوں کی باتوں اور نظروں کا احساس
تھا۔ تب ہی ساری روٹیاں نکال کر اس نے پرات
میں رکھیں اور تور سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کیا عشق میں ہے مرجانیاں..... ایسا رنگ تو
محبت میں ہی پڑھتا ہے۔“ پیچھے عورتیں حیرت سے
آنکھیں پھاڑے اس کی سرخ پوروں کو دیکھتے تبصرہ
کر رہی تھیں اور وہ پرات کمر سے نکائے گھر کو جاتے
راستے کی طرف قدم بڑھا چکی تھی۔

”یہ تم سے محبت کرنے کا صلہ ہی تو ہے کہ میں
ساری زندگی ظالم سماج سے تم سے محبت کے جرم میں
طعنے سنوں جبکہ کوکاٹنے درد کی اذیت سہوں۔ یہ اعزاز
تمہاری محبت نے ہی تو دان کیا ہے کہ میں تا عمر عشق
کی آگن میں سلگتی رہوں..... اور تم دور بیٹھ کر میری
بے بسی کا تماشا دیکھو..... مجھ پہ ہنسو..... میری محبت پہ
قہقہے لگاؤ۔ ہاں تم ایسا کر سکتے ہو..... کیونکہ تم مرد جو
ہو۔“

ننگے پاؤں اونچے نیچے راستوں پہ چلتے کوئی

تیری جدائی میں کچھ تو نہیں ہوا ہے
میرے قاتل بس کوئی اندر سے مر گیا
”تیری دوری، تیری کمی سے اک آگ لگی
ہوئی ہے دامن دل پہ، جس کا شعلہ دل کے کونے میں
سلگ رہا ہے۔ یہ آگ کب بجھے گی، یہ جلن کب ختم
ہوگی..... میں نہیں جانتی۔ تجھے کی بھی یا نہیں..... میرا
وجود خاستر ہو رہا ہے۔“

تور پوری شدت سے جل رہا تھا۔ یہ اک اوسط
درجے کا گاؤں تھا۔ جہاں ابھی گیس کی فراہمی عمل
میں نہیں آئی تھی۔ گاؤں کی عورتیں تور میں ہی روٹیاں
لگاتی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنے اپنے شب و روز
بھی سناتی جاتی تھیں۔ وہ بھی اس ماحول کا حصہ تھی،
مگر ہمیشہ کی طرح خاموش تھی۔ یہ خاموشی اس کی
ذات سے مقناطیس کی طرح چپک گئی تھی۔ اب تو
سب ہی اس کے ساکت لبوں کی عادی ہو چکی تھیں۔
وہ ہمیشہ آٹے کی پرات اٹھا کر آتی تھی۔ اپنی باری
آنے پہ خاموشی سے روٹیاں لگاتی اور اسی طرح
روٹیاں بن جانے پہ خاموشی سے چل دیتی تھی۔ اس
کے پیچھے کتنی چہ میگوئیاں ہوتی تھیں، اسے ان سے
کوئی سروکار نہ تھا۔

اس وقت بھی گاؤں کی عورتیں تور کے ارد گرد
اپنی اپنی پرات اٹھائے باتوں میں مصروف تھیں۔
بیک وقت دو عورتیں ہی روٹیاں لگا سکتی تھیں۔ ان
میں سے اک وہ بھی تھی۔ جو روٹیاں لگانے کے بعد
تور یہ خاموشی سے نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ دیکتے تور

لو کیلا پتھر پیروں تلے آیا تھا۔ جس کی چھن سے اس کے قدم ڈگمگائے تھے۔
 ”یہ قدم میں نے اسی وقت پہننے سے روک لیے ہوتے تو آج یہ نوکیلا پتھر راہ میں نہیں آتا۔ خود اذیتی سے سوچتے ہوئے اس نے پانی سے بھری آنکھوں کو صاف کیا کہ راستہ نظر آئے، مگر اگلے ہی بل پھر آنسوؤں نے اس کی راہیں دھندلی کر دی تھیں۔

☆☆☆

لگا کر عشق کی بازی سنا ہے دل دے بیٹھے ہو
 محبت مار ڈالے کی ابھی تم پھول جیسے ہو
 ”ساویہ پلیز، مجھ سے محبت کر لو۔“ وہ کلچ تیار کر کے اب سیلڈ کاٹ رہی تھی۔ جب اویز یوسف نے کچن میں قدم رکھا۔ اس کے حسین چہرے پہ پسینے کی چھوٹی چھوٹی پوندیں چمک رہی تھیں۔ کھری بالوں کی چند پریشان لٹیں بار بار چہرے پہ آ رہی تھیں، جنہیں وہ جھنجھلا کر ہاتھ کی پشت سے اوپر کرنے کی



ہر دوسرے تیسرے روز وہ سادیہ سحر کے روبرو آکھڑا ہوتا تھا۔ محبت سے لبریز نگاہوں سے اس بے مہر، سنگ دل کو کھتا رہتا تھا جو ہر بار سنگ باری کر کے اسے پلٹنے کا کہہ کر انجان بن جاتی تھی۔

”کیا ہو گیا ہے، کیوں اتنی گرمی میں مرچیں چبا رہے ہو۔“ سادیہ سحر کو اس کا غصہ بلا وجہ لگا۔ سلا دکت چکا تھا، جسے وہ باؤل میں سیٹ کرنے لگی۔ اویز یوسف نے اک نظر اسے دیکھا اور جیسے خود کو کول ڈاؤن کرنے لگا۔

”میرے بیسٹ فرینڈ کی بہن نے کال کر کے مجھ سے محبت کا اظہار کیا ہے۔“ اس نے جیسے بھرموں کی طرح جرم کا اعتراف کیا۔ سادیہ سحر اک دم سے پر جوش ہو گئی۔

”واؤ! ڈیٹس گریٹ نیوز کا انگریجیشن (یہ تو بہت اچھی خبر ہے..... مبارک ہو۔) یوسف نے کھا جانے والی نظروں سے اس کی خوشی کو ملاحظہ کیا اور جیسے اس کا ضبط چھلکنے لگا۔ اسے بازو سے پکڑ کر اک جھٹکے سے اپنی طرف کیا۔ سادیہ سحر اس غیر متوقع صورت حال کے لیے قطعی تیار نہ تھی۔ اسے اویز یوسف سے ایسے کسی عمل کی امید بھی نہ تھی۔ تب ہی وہ توازن نہ سنبھال سکی اور بے ساختہ اس کے شانوں پہ ہاتھ رکھ گئی۔ آنکھوں میں بے حد تحیر آ گیا تھا۔ اس کے دونوں شانوں کو سختی سے دبوچے وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑے کھڑا تھا۔ سادیہ سحر کا دھان پان جیسا وجود اس کے لمبے چوڑے وجود کے آگے جیسے چھپ سا گیا تھا۔ حواس قابو میں کرتے اس نے اس کے بازو اپنے شانوں پر سے ہٹانے کی سعی کی تھی۔ مگر اس کی آہنی پکڑ بے کراہ رہ گئی۔

”میں نے صرف تم سے محبت کی ہے اور مرتے دم تک تم سے ہی عشق کرتا رہوں گا۔ بھلے تم سے شادی نہیں ہوئی، مگر بیوی کا درجہ صرف تمہیں ہی دوں گا، کوئی اور اس مقام تک پہنچ بھی نہیں سکتی۔ آئی سمجھ! یہ بات اپنے ننھے سے دماغ میں بٹھالو۔“ سختی سے کہے لفظوں کی شدت اس کی اگلیوں کی پوروں کی صورت اس کے شانوں پہ جیسے گڑی گئی تھی۔

نا کام سعی کر رہی تھی۔ اویز یوسف کے اچانک بولنے پہ وہ اک دم چونک گئی تھی۔ کنگ بورڈ بکھیرے کاٹتے اس کے ہاتھ اک بل کو چٹکے تھے۔ مگر اگلے ہی بل لمبی سانس خارج کرتے اس نے اپنا کام جاری رکھا۔ اویز یوسف کے اصرار پہ انداز پہ اس نے نفی میں سر ہلاتے اسے دیکھا تھا۔

”محبت کرنے کی بات تم ایسے کرتے ہو جیسے لوگ لولی باپ کھانے کی بات کرتے ہوں۔“ اس کا انداز ہمیشہ کی طرح استہزائیہ ہو گیا۔

”تم کب مجھے سیریسٹی لولی۔“ وہ جیسے جھنجھلا گیا تھا۔ کوئی جنگ تھی جو اس کے اندر مسلسل جاری تھی اور وہ مزاحمت کرتے کرتے جیسے تھکنے لگا تھا۔ سادیہ سحر نے اس کے جھنجھلائے انداز پہ اسے بے ساختہ نظر اٹھا کر دیکھا تھا۔ لب بھنجے دیوار سے پشت ٹکا بے لوجیز وائٹ شرٹ میں ملبوس وہ بغور اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”آج پھر یہ دورہ کیوں پڑ گیا تمہیں؟“ اس کے سوال نے اویز یوسف کو مزید جھنجھلائے پہ مجبور کر دیا۔

”میری محبت وقتی ابال نہیں ہے، جسے تم دورے کا نام دو..... محبت نہیں کر سکتیں تو کم از کم جوتے مت مارا کرو۔“

اویز یوسف کو جیج غصہ آ گیا تھا اور آتا بھی کیوں نہ..... اکثر و بیشتر یہ موضوع ان کے زیر بحث رہتا تھا۔ وہ اصرار محبت کرتا اور وہ ہر بار اسے سخت ست سنا کر دامن بجا کر چل دیتی تھی۔ عرصہ سے یہ لک چھپ کا کھیل چل رہا تھا، جس پہ سادیہ سحر کو کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ مگر اویز یوسف کی قوت برداشت جیسے اب جواب دینے لگی تھی۔

محبت کا جواب محبت سے نہ ملنے اور نظر انداز ہونے پہ اویز یوسف کی پرسنائی جیسے شدت پسندی کی روش اختیار کرنے لگی تھی۔ غصہ، ضد اس کی شخصیت کا خاصا نہیں تھا، لیکن اب یہ دونوں عناصر جیسے اس کی شخصیت سے جدا نہیں ہو رہے تھے، تب ہی تو

بھوک اس بحث میں غارت ہو گئی تھی۔

☆☆☆

سادیہ سحر، نذیر احمد کی اکلوتی بیٹی تھی۔ نذیر احمد سے بڑی بہن، بیکیس تھیں جن کے تین بیٹے تھے۔ پھر نذیر احمد تھے اور پھر ان سے چھوٹے۔ مگر جب سادیہ سحر اس دنیا میں آئی تو پورے خاندان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ بیس سال بعد ان کے خاندان میں کسی لڑکی نے جنم لیا تھا۔ سادیہ سب کی آنکھ کا تارا تھی۔

نذیر اور صدف نے اسے پھیلی کا چھالہ بنا رکھا تھا۔ ہر کوئی ہی صدف کو مبارک باد دے رہا تھا۔ سادیہ سحر بھی پریوں جیسی حسین کہ نگاہ نہ بٹھرتی تھی۔ جو اک بار دیکھ لیتا نظر ہٹانا بھول جاتا۔ سب ہی خوش تھے۔ لیکن اگر کوئی ناخوش تھا تو وہ زکس تھیں۔ صدف کی دیو رانی..... نذیر احمد اور بیکی، دونوں بھائیوں میں مثالی محبت تھی۔ سال بھر کے وقفے سے دونوں بھائیوں کی شادی ہوئی تھی۔ زکس کی گود اللہ نے جلد ہری کر دی تھی۔ اس نے بیٹے کو جنم دیا تھا۔

اسفر کو دیکھ کر صدف کو اپنی خالی گود کا شدت سے احساس ہوتا تھا۔ اس کے بعد بھی زکس کئی بار اس عمل سے گزریں، مگر اللہ نے اس وجود کو دنیا میں آنے سے پہلے ہی اٹھالیا۔ قدرت کو بھی صدف پہ ترس آ گیا تھا۔ تب ہی شادی کے آٹھ سال بعد سادیہ سحر کی آمد کی نوید پہ وہ خوشی سے پاگل سی ہو گئیں۔ نذیر احمد بھی بہت خوش تھے۔ سادیہ سحر کو دیکھ کر ان کی خوشی دوچند ہو گئی تھی کہ انہوں نے صرف اولاد مانگی تھی اور رب کا نانت نے ان کی دلی خواہش سادیہ کے روپ میں پوری کر دی تھی۔ زکس پورے خاندان میں صدف کی واہ واہ دیکھ کر دل مسوس کے رہ گئی تھیں۔ کسی قدر رقابت کا احساس ہوا تھا۔ بیٹی پیدا کرنے کی آس میں انہوں نے ان گنت بار کوششیں کی تھیں۔ مگر ہر بار وجود ان کی کونکھ میں ہی دم توڑ دیتا تھا۔ اپنی گرتی صحت کے باعث انہوں نے اب جیسے اپنے ارماتوں پہ صبر کی چادر ڈال دی تھی، مگر سادیہ سحر کی آمد پہ ان کے ارماتوں کی چادر سرکنے لگی۔ انہوں

”کیا بد تمیزی ہے اویز، چھوڑو مجھے۔“ سادیہ سحر کو اس دیوانے کی آنکھوں سے جھانکتی دیوانگی سے خوف ریڑھ کی ہڈی میں اترتا محسوس ہوا۔ وہ پھڑ پھڑا کر رہ گئی۔ اس کے شانے سے خود کو چھڑانے کی کوششیں نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اویز یوسف کو جیسے اس کی مزاحمت پہ ترس آ گیا۔ اس کے شانے چھوڑ کر دو قدم پیچھے ہٹ کر وہ دوبارہ دیوار سے جا لگا۔ ”پھر کبھی ایسی فضول حرکت کی تو تنہا رامنہ توڑ دوں گی۔“ اپنے شانوں کو دباتی وہ درد سے جیسے دہری ہو گئی۔

”برداشت کی بھی اک حد ہوتی ہے۔ میں تمہیں کب سے کہہ رہی ہوں مجھے نہیں ہے تم سے محبت اور تم.....“ وہ اک حسیلی نظر اس پہ ڈال کر اک ٹاپے کو لب پہنچ کر رہ گئی۔ ”اچھی زبردستی ہے۔ روز منہ اٹھا کر آ جاتے ہو اور حکم صادر کرتے ہو کہ میں تم سے محبت کر لوں۔ اب تم سچے نہیں رہے۔ جو میں تمہاری حرکتوں کو بچکانا سمجھ کر نظر انداز کر دوں، ہر پہے پچیس سال کے ہو گئے ہو، بہتر ہوگا، اپنے اندر پھوڑنی لاؤ..... کان بوائے والی حرکتیں چھوڑ دو۔“ وہ کچھ زیادہ ہی چراغ پا ہو گئی تھی، اس کی جسارت پہ۔

”چار سالہ عمروں کے فرق کو بیچ میں لا کر خود کو قتل کل ظاہر کرنے کی کوشش مت کیا کرو میرے سامنے۔ کہاں سے بڑی لگتی ہو، بتاؤ۔“ وہ اچانک اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس کے لمبے چوڑے ہود کو گھورتے سادیہ سحر چند قدم پیچھے ہو گئی۔

”اپنی عملیت کی دھاک اپنے اسٹوڈنٹس پہ لیا کرو، مجھ پہ نہیں۔ باقی رہی محبت تو وہ تو میں تم سے روا کے ہی دم لوں گا۔ تم ہی ہوگی جو مجھ سے محبت روگی۔ میرے بنا اک پل نہ رہ سکو گی۔“ مضبوط ہاتھوں میں اپنی بات کہہ کر وہ رکا نہیں تھا۔ پنچن سے اور کمر سے نکلتا چلا گیا۔

”پاکل..... بے وقوف انسان۔“ سر جھٹک کر یہ نے اک بار پھر اپنے دیکھتے شانوں کو دونوں اداں سے دبایا اور بیچ کی طرف متوجہ ہوئی۔ ساری

نے پھر اس عمل سے گزرنے کی ٹھانی، مگر قدرت کو ابھی شاید منظور نہ تھا۔ تب ہی خوش خبری آنے میں تین سال لگ گئے۔ وہ بیٹی کے لیے وظیفہ کرنے لگیں۔ مگر جب ان کے پہلو میں اویز یوسف آیا تو ان کا دل بچھ سا گیا۔

اسفراب گیارہ سال کا ہو چکا تھا۔ ایسے میں دوسرے بیٹے کی آمد پہ انہیں خاص خوشی نہیں ہوئی تھی۔ صدف جب چار سالہ پریوں جیسی ساویہ سحر کی انگلی تھاے انہیں مبارک باد دے آئیں تو انہیں بیٹی نہ ہونے کا افسوس دو چند ہو گیا۔ لیکن بظاہر ان کا رویہ صدف اور ساویہ سے دکھاوے کی محبت کا ہی تھا۔ انہوں نے ساویہ کو لپٹا کے پیار بھی کیا اور کسی پہ دل موس کے بھی رہ گئیں۔ وہ تو ڈاکٹر نے انہیں منجوس خبر دی کہ اب وہ دوبارہ اس عمل سے نہیں گزر سکیں گی، ورنہ شاید وہ آخری دم تک کوشش کرتیں۔ ساویہ سحر کاٹ میں لیٹے اویز یوسف کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ کو اپنے چھوٹے سے ہاتھ میں لیے کر محبت سے کھلکھلا کر دیکھ رہی تھی۔ خوش ہو رہی تھی۔ اویز یوسف نے اس کی انگلی اپنی منہی میں بند کر لی تھی، جسے اس نے جھٹکے سے چھڑانے کی کوشش کی۔ انگلی تو نہیں چھٹی، مگر اویز یوسف منہ بسور کر لگے پھاڑ کر رونے لگا تھا۔ ساویہ سحر اک دم سے ڈر کر صدف اور نرگس کو دیکھنے لگی۔

”مما، چاچی یہ میری انگلی نہیں چھوڑ رہا۔“
ساویہ نے جیسے اس کی شکایت کی۔ دونوں ہی اس کے منہ بسورنے پہ مسکرا دیں۔

وقت بیت رہا تھا۔ نرگس نے خود کو سمجھایا تھا۔ مگر کبھی کبھی ہوک بھی اٹھتی تھی۔ صدف کو اللہ نے دوسری اولاد نہ دی۔ یہ اس نے بھی اللہ سے ضد کی۔ وہ ساویہ کو پا کر ہی شاد تھیں۔ اسفر نے اولیول کے بعد کینیڈا اپنے ماموں کے پاس شفٹ ہونے کی بات کی تو یوسف اور نرگس نے اس کا وہیں ایڈمیشن کروا دیا۔

ساویہ کالج میں آ گئی تھی۔ گزرتے وقت کے

ساتھ اس کے حسن میں بے پناہ اضافہ ہوا تھا۔ خاندان کے کئی لوگ تقاضا کرنے لگے تھے، مگر نذیر احمد نے سب کو منسوخ کر دیا کہ ابھی وہ پڑھ رہی تھی۔ وہ تھرڈ ایئر میں تھی۔ اس کے پاس محلے کے کافی بچے پڑھنے آتے تھے۔ ایسے میں اک دن نرگس اویز کے کان پکڑے اس کے پاس آئیں۔

”ساویہ میری چچی، ذرا اس نالائق کو بھی پڑھا دیا کرو۔ میٹرک کے پیپرز ہونے والے ہیں، مگر اسے پتہ تک بازی اور بائیک اڑانے سے فرصت نہیں۔“

ساویہ سحر نے مسکراتے ہوئے اویز یوسف کو دیکھا جو ماں سے اپنا کان چھڑا کر اسے سہلارا تھا۔ کتابوں کا اسٹالش بیک کندھے پہ ڈالے بے فکری سے چیونگم چہارہ تھا۔ بلیک جینز، لی ٹرٹ میں کھلندرا سا اویز یوسف بھرے بالوں کو ہاتھ سے سنوار رہا تھا۔ صدف چوکی پہ بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھیں۔ نرگس کی بات سن کر مسکرائیں لگیں۔

”نالائق تو نہ بولو نرگس! اتنا اچھا تو ہے میرا بچہ۔“ صدف کا کہنا تھا کہ بیک چوکی پہ بچ کے وہ اچھل کر صدف کے پہلو میں جا بیٹھا۔

”بس تائی جان، اک آپ ہی ہیں اس دنیا میں جو مجھ سے محبت کرتی ہیں۔“ مصنوعی ایکٹنگ کرتے اس نے صدف کے شانے پہ ٹھوڑی جمائی اور جھلی ہوئی گا جراثیم کرکڑنے لگا۔ صدف مسکرا دیں۔

”یہاں تائی جان سے جڑ کے بیٹھنے کے لیے نہیں لائی، اٹھو، جاؤ پڑھو جا کے ساویہ کے پاس۔“ نرگس نے بھی پلنگ پہ براجمان ہونے سے ٹھوڑے ہوئے کہا۔ وہ ان سنی کر گیا۔ ساویہ تب تک اٹھ کر کچن میں جا چکی تھی۔ چائے اس نے پہلے ہی چڑھا رکھا تھی۔ چائے کے ساتھ منٹوں میں کیاب فرانی کر کے لے آئی تو نرگس اسے دعائیں دینے لگیں۔

”سچ ہے بھابھی، بیٹی سے ہی سکھ ہے۔“ چائے کی پیالی پکڑتے انہیں پھر کسک ہوئی۔

”تمہاری بیٹی بھی آ جائے گی، فکر نہ کرو۔ اسفہ کی پھر اس شریر کی شادی کرو گی تو اللہ دیویشیاں دے۔“

دے گا۔“ صدف نے جیسے صبرِ شکر کے ساتھ نئی راہ دکھائی۔

”مائی جان ایسی باتیں نہ کریں مجھے شرم آتی ہے۔“ وہ منہ چھپا کر شرمانے کی ایکٹنگ کرتے کباب اٹھا کر کھانے لگا۔

”اویز یوسف! آپ کی باتیں ختم ہوگئی ہوں تو آپ یہاں تشریف لے آئیں۔ شاباش۔“ سادو یہ سحر نے خشک آواز میں اسے پکارا تو کباب اس کے منہ تک جا کے رک سا گیا۔ سادو یہ سحر سے اسے بچپن سے ہی تھوڑا ڈر لگتا تھا۔ وہ تختی ذہین فطین اور سمجھ دار بھی وہ اتنا ہی نہٹ کھٹ اور شیریر تھا۔

وہ اکلوتی لڑکی تھی۔ اس بات پہ اس میں غرور و مہمندی تو نہ تھا، ہاں وہ بہت رکھ رکھاؤ والی لڑکی تھی۔ بلاوجہ فضول گوئی اور حرکتوں سے اجتناب کرتی تھی اور نہ ہی ایسا کرنے والوں کو پسند کرتی تھی۔ محلے، خاندان بھر سے جیسے سادو یہ سحر کی تعریفیں آتیں، ایسے ہی اویز یوسف کی شرارتوں کی داستان آتی تھی۔ آج اس نے کسی کی بکری کے کان مروڑ دیے۔ آج اس نے کرکٹ کھیلنے کسی کا شیشہ توڑ دیا۔ آج اس نے ہائیک ٹھونک دی۔

وہ دونوں مزاجاً اک جیسے تھے، مگر اطوار الگ تھے۔ وہ سادو یہ سحر کی گڈ بک میں کبھی نہیں رہا تھا۔ وہ ہمیشہ چاچی، چاچا کو اس کے لیے فکر مند ہی پاتی تھی۔ اس کی خشک پکار پہ منہ بسورتا بیک اٹھانے لگا کہ اس پڑھا کو سے تھوڑا دبتا بھی تھا جو ہر سال ٹاپ کرتی تھی اور محلے، خاندان بھر میں اس کی واہ واہ ہوتی تھی۔ جب جب بڑھنے سے کوئی جی چراتا تو خاندان بھر کے لڑکے، لڑکیوں کو سادو یہ کی مثال دی جاتی تھی۔ جن میں اویز یوسف سرفہرست تھا۔ جسے اپنی اٹھتے بٹھتے سادو یہ کی مثال دے کر پڑھنے کی طرف راغب کرنے کی ناکام سعی کرتے تھے۔

چند دنوں میں ہی سادو یہ کو احساس ہو گیا کہ وہ بے حد ذہین ہے، مگر پڑھائی میں دلچسپی نہیں لیتا تھا اور جلد ہی سادو یہ سحر نے سراغ بھی لگایا کہ اس کی

دلچسپی کا سامان کیا ہے۔ اس دن تمام بچے چلے گئے تھے، مگر اس نے اویز یوسف کو روک رکھا تھا اور حساب کے سوال حل کروا رہی تھی۔ ایگزام سر پہ آگئے تھے۔ اب تو اسے مسلسل پڑھتے چار گھنٹے ہونے کو آئے تھے۔

”سادو یہ آپ! پلیز میں تھک گیا ہوں۔“ اویز یوسف نے جیسے رہائی کے لیے آواز بلند کی۔

”حب کر کے سوال نمبر چار حل کرو۔“ سادو یہ نے سختی سے کہا۔ وہ منہ بتائے سوال نمبر چار کا پانی کرنے لگا۔ نظریں مسلسل روشن ہوئی اسکرین پہ ٹھہری۔ سادو یہ سحر بھی یہ تماشا اور اس کی چور نظروں کو کافی دیر سے دیکھ رہی تھی۔ تب ہی اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے سامنے سے سیل فون اٹھا کر کال پک کی تھی۔ اویز یوسف اپنی جگہ جھکا رہ گیا۔

”السلام علیکم! اجی اویز پڑھائی میں بڑی ہے، آپ بعد میں کال کر لیجیے گا۔“ اس نے کال ریسیو کر کے دوسری طرف کی بات سننے بغیر کہا۔ وہ کال منقطع کرنے لگی تھی، جب نو عمر لڑکی کی آواز آئی۔

”آپ کون ہیں اویز کی؟“ حد درجہ شکی لہجہ پہ سادو یہ کو اک لمحے میں احساس ہوا کہ نئی نسل کہاں جا رہی ہے۔

”میں اس کی کزن ہوں۔“ سادو یہ نے بہت ضبط کر کے کہا۔ ”صرف کزن یا کچھ اور.....“ دوسری طرف سے آتی نو عمر آواز پہ سادو یہ کا فشار خون بلند ہونے لگا تھا۔ اپنے سے چار سالہ چھوٹے اویز کو اس نے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا تھا۔ سیل فون سے باہر آتی آواز اویز یوسف کی سماعت نے بھی محفوظ کر لی تھی۔ وہ نظر کے ساتھ سر بھی کتاب، کا پی پہ چکائے کب سے سوال پہ ہی پین پھیرے جا رہا تھا۔ کال پہ بتا کوئی جواب دیے اس نے سیل فون ہی آف کر دیا۔

”یہ کس قسم کی فضول لڑکیوں کی کالز آتی ہیں، تمہارے نمبر پہ۔“ سیل فون اس کی کا پی پہ پھینک کر اس نے سخت درستی سے سوال داغا تھا۔ اویز یوسف کا

سب کچھ ہوا اور محبت نہ ہوئی تو شاید میں خود کو بہت غریب خیال کروں گا۔

کسی کو چاہنا، کسی کو چاہتے رہنا یہ احساس ہی بہت دل فریب ہے اور میں ایسی ہی کیفیت میں جینا اور مرنے چاہتا ہوں۔ آپ کو میری یہ ایکٹیوٹی اچھی نہیں لگی، ٹھیک ہے۔ آپ کے انداز سے سمجھ گیا ہوں کہ آپ کی نظر میں میری اس حرکت سے میں مائنس ہو گیا ہوں۔ میں آج ابھی سے یہ حرکت چھوڑ کر اپنے دوستوں کی گید رنگ بدل لوں گا۔ آئی پراس۔ لیکن میں اس محبت کا انتظار ضرور کروں گا۔ جسے میں اپنی زندگی میں دیکھنے کا خواہش مند ہوں، جو میری زندگی ہوگی۔“ پندرہ سالہ اویز یوسف کیا بول رہا تھا۔ سماویہ سحر تو بس ساکت اسے دیکھے جا رہی تھی۔ اس کے چہرے کے عزم کو اس نے چنداں اہمیت نہیں دی تھی۔ اس کے خیال میں یہ لو اسٹوری پٹنی فلیس دیکھنے کا بھوت تھا جو اسے اس عمر میں محبت نامی بلا کو گلے لگانے کا چرکا لگا ہوا تھا۔ لیکن جب اگلے روز اس کے سیل فون کی اسکرین اک بار بھی روشن نہ ہوئی تو سماویہ کو حیرت ہوئی جس کا اس نے اظہار بھی کر دیا۔

”میں نے تم بدل لی ہے۔ صرف ماما، پاپا کے پاس نیا نمبر ہے۔“ اس نے بہت سنجیدگی سے بتایا تھا۔

”اور محبت۔“ سماویہ نے جیسے چڑایا۔

”اسی کا تو انتظار ہے۔ دیکھیں کب درد لی ہے“

دستک دیتی ہے۔“ وہ شوخ مسکراہٹ اور سیلی آنکھوں میں شرارت سمو کے ایسے بولا کہ سماویہ سحر ہاتھ میں تھامی حساب کی بک اس کے سر پہ مار کے رہ گئی۔

”سدھر جاؤ چھوٹو۔“ وہ بھی ہنس پڑی تھی۔

☆☆☆

میٹرک کے امتحان بھی ہو گئے اور اویز کی کلاس بھی ختم ہو گئی۔ مگر وہ روز ہی کسی نہ کسی بہانے آ جاتا تھا کہ اک ہی کئی میں تو گھر تھا۔ دونوں خاندان اکثر و بیشتر اک ہی جگہ پائے جاتے تھے۔ صدف کچھ اچھا

سر اور جھک گیا۔ ”کرتی ہوں بات میں چچا جان سے..... کہتی ہوں واپس لیں سیل فون تم سے..... اسی لیے تم بھند تھے سیل فون کے حصول کے لیے۔ ہر دو منٹ پہ تمہارا سیل فون بجنے لگتا ہے۔“ سماویہ بھڑک اٹھی تھی۔ وہ کتنی ہی بار اس عمل پہ اس سے بات کرنا چاہتی تھی، مگر ہر بار بچوں کے سامنے اسے موقع نہیں ملتا تھا۔ سب کے سامنے بات کر کے وہ اس کی عزت نفس مجروح نہیں کرنا چاہتی تھی اور آج جب اسے قسمت سے موقع ملا تو اس نے ساری حسرت پوری کر دی۔ نہ صرف اسے اس بد تمیز لڑکی پہ غصہ تھا، وہ اویز یوسف پہ بھی شدید براہم تھی۔

”آپنی پلیز سے اسے ذکر نہ کیجیے گا۔ قسم آپ کی۔ میں خود لڑکیوں کو کال نہیں کرتا۔ وہ خود میرے پیچھے پڑی رہتی ہیں۔“

اویز یوسف منہ بسوس کر جیسے خود کو بری الذمہ ظاہر کرنے کی کوشش۔ سماویہ نے نیکیھی چتونوں سے اسے گھورا۔

”ہاں تم فلمی ہیرو ہوتا۔ اسی لیے سب تم پہ مرتی ہیں۔“ سماویہ کے جل کے بولنے پہ وہ بے ساختہ مسکرا کے لب دبا گیا۔ اگر اسے بتا دیتا کہ ایسا ہی ہے تو وہ اور لتے لیتی۔ لیکن سماویہ اس کی مسکراہٹ دیکھ چکی تھی۔ ”اب سے اگر پڑھائی کے دوران تمہارا سیل آن ہوا۔ کوئی کال، میسج آیا تو سب کے سامنے تمہاری کوٹ لگاؤں گی۔ چچا جان کو تو میں نے ہر حال میں تمہاری اس ایکٹیوٹی کی رپورٹ دینی ہے۔ غضب خدا کا، عمر دیکھو اپنی اور حرکتیں دیکھو۔ درجن بھر لڑکیوں کے نمبر ہیں تمہارے سیل فون پہ..... یہ زیب دیتا ہے تمہیں، پڑھ لکھ کر نام کمانا ہے یا عاشقی میں ہی عمر گزارنی ہے۔“ سماویہ سحر کا غصہ کسی طور قابو میں نہیں آ رہا تھا۔

”اگر پاپا کو بتا کر آپ کو سکون ملے گا تو آپ بتا دیں شوق سے۔ آپ کی ہر بات اپنی جگہ درست ہے۔ سماویہ آپنی پڑھ لکھ کر نام پیسا کمانا ہے، تاکہ معاشرے میں اک اسٹیشن ہو، لیکن اگر میرے پاس

اور مضبوط لہجہ میں اپنے عزم و ارادے در پردہ چیلنج کر کے چلا گیا۔

”جانے کب بڑا ہوگا۔“ سادوہ نے اس کے اس عمل کو بچکانہ حرکت سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ اس کا خیال تھا کالج کھلنے تک چچا جان اسے خود اس کے پاس پڑھنے کے لے آئیں گے۔ مگر جب ایسا نہ ہوا تو اسے اویز کے لفظ یاد آنے لگے۔ اس کے فاضل ایئر کے پیپرز ہونے والے تھے۔ وہ ساری توجہ پڑھائی میں مبذول کر کے اویز کیا اس سے جڑی ہر بات بھول گئی۔ اویز نے فرسٹ ایئر کے ساتھ ایونٹک پروگرام میں سافٹ ویئر انجینئرنگ میں بھی ایڈمیشن لے لیا تھا۔ یہ خیر اسے صدف سے ملی تھی۔ پڑھائی چور اک ساتھ دو ڈگری کیسے لے گا۔ اس کے لیے بھی باعث حیرانی تھی، لیکن جب فرسٹ ایئر میں اس کی بورڈ میں دوسری اور سافٹ ویئر میں پہلی پوزیشن آئی، تو سب کے ساتھ سادوہ سحر نے دانتوں تلے انگلی دبالی۔

پھر تو کامیابی کا نہ رکنے والا سلسلہ چل نکلا تھا۔ کامیابی کے جھنڈے گاڑتا وہ جیسے سادوہ کو کہیں بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ سادوہ نے ماسٹرز کے بعد مقامی کالج میں لیکچرار کے لیے ایلانی کیا تھا اور جلد ہی اسے تعینات بھی کر لیا گیا تھا۔

”یہ لیں سادوہ جی! میری سافٹ ویئر انجینئرنگ کی ڈگری۔“ وہ شاور لے کر نکلی تھی، جب سرشام اویز یوسف اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ لمبا چوڑا اویز یوسف اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ کافی عرصہ بعد اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے پاس اب ٹائم ہی کب ہوتا تھا چچا جان کے گھر چکر لگانے کا۔ جب بھی وہ جاتی تو کم ہی ان کا سامنا ہوتا تھا کہ وہ گھر پہ رات کو ہی لوٹا تھا۔

”مجھے کیوں دے رہے ہو؟“ سادوہ نے ڈگری لے کر حیرت کا اظہار کرتے اک نظر مارکس پہ ڈالی، جوں جوں نظریں مارکس پہ پڑ رہی تھیں اس کے چہرے کا رنگ بدل رہا تھا۔

پاکتیں تو زنگس کو فون کر دیتیں کہ آج ہانڈی نہ بنانا، میں بھجوا دوں گی یا گھر آ جاؤ کھانے پہ..... یوں یہ سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ رزلٹ آ گیا تھا۔ اویز نے بورڈ پہ تیر نہیں مارا تھا، ہاں مگر اس کے اچھے نمبر لینے پر سب کی رکی سانس بحال ہوئی تھی۔

”یہ تمہارا ہی کمال ہے سادوہ، ورنہ تو مجھے پکا یقین تھا کہ اس کی اک دو پرچوں میں سہلی تو ضرور آئے گی۔“ نیکی مٹھائی سادوہ کے منہ میں ڈالتے اسے سراہ رہے تھے۔ اویز یوسف کا منہ بن گیا، جسے دیکھ کر کنزیر اور صدف مسکرانے لگے۔

”یہ زیادتی ہے پپا، مانا سادوہ آپ نے بہت اچھا پڑھایا، مگر پڑھنے والے کو بھی کریڈٹ جاتا ہے۔“ اس نے جیسے احتجاج ریکارڈ کروایا۔

”بھئی بات تو سو فیصد درست کہی ہے میرے بچے نے۔“ نذیر احمد نے اسے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ ووٹ پا کر وہ اور گلے کا ہار بن گیا۔ اسی اثنا میں اسفر کا فون کینیڈا سے آ گیا۔ ”واہ چھوٹے، تو نے اے گریڈ لاکر تو ہم سب کو حیران کر دیا۔ سادوہ کو سلام ہے۔“ اور وہ جو اپنی تعریف پہ کھلنے لگا تھا۔ پھر کریڈٹ سادوہ کو جاتا دیکھ کر لب بچ گیا۔

”بھئی سادوہ اب تم اس کو پڑھانے کا ذمہ لے لو۔ تاکہ کم از کم گریجویٹ تو ہو جائے۔“ زنگس نے بھی آئندہ کی ذمہ داری سادوہ پہ ڈالی۔ وہ مسکرا کر سعادت مندی سے سر ہلا بیٹھی۔

”میں اب آپ سے نہیں پڑھوں گا۔ سارا کریڈٹ آپ کو مل گیا، مانا آپ نے مجھے تعلیم کی طرف راغب کیا، لیکن اس سے کہیں زیادہ اب میں آپ سے مسابقت کرنے کے لیے پڑھنے لگا ہوں، جب ہر کوئی خاندان میں آپ کی علیست، ذہانت کی مثالیں دیتا ہے۔ پہلے شرمندگی ہوتی تھی، مگر اب..... اب میں آپ کا ریکارڈ توڑوں گا۔ جہاں لوگ خاندان بھر میں آپ کی مثال دیتے ہیں، اب وہیں میری بھی دیا کریں گے۔ جسٹ ویٹ اینڈ کی۔“ وہ وقت رخصت اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا

”واہ چھوٹو، غضب کے مارکس ہیں شاباش۔“
اس نے نظر دوڑاتے ہوئے سابقہ لب و لہجہ میں کہا۔
”شکر یہ سادہ یہ جی..... لیکن میں اب چھوٹو نہیں
رہا دیکھیں۔“ اس نے سرودھ ہوتے اس سے نکلنے قد
کو دکھایا۔ وہ چھوٹا تھا۔ سادہ سحر کا ساڑھے پانچ فٹ
قد بھی اس کے آگے چھوٹا لگ رہا تھا۔
”قد سے کیا ہوتا ہے چھوٹو۔ عمر میں تم سے چار
سال بڑی ہوں۔“ سادہ نے بتایا۔

”ہاں چار سال بڑی ہیں، جب ہی اک
نوزائیدہ بچے سے اپنی انگلی نہ چھڑا سکی تھیں۔“ بڑوں
سے سنی بات اچانک اویز یوسف کے لبوں سے نکل
گئی۔ سادہ کو بھی یہ بات کچھ خاص یاد تو نہیں تھی، مگر
بڑے اکثر اس قصے کا ذکر کر کے ہنستے تھے۔

”تب میں چھوٹی جو تھی۔“ سادہ نے جیسے
دفاع کیا۔ ”اب بھی لڑائی کر کے دیکھ لیں، نہیں چھڑا
سکیں گی۔ جب میں نوزائیدہ تھا جب آپ کی انگلی
نہیں چھوڑی تو اب تو میں بڑا ہو گیا ہوں۔“ اویز
یوسف کا بدلتا لہجہ، مبہم انداز باتیں۔ سادہ کو کچھ سمجھ
نہیں آ رہی تھی۔

”سادہ جی! میں نے آپ سے کہا تھا نہ مجھے
محبت کی تلاش ہے۔“ وہ اس کے پھیلے بالوں پہ نظریں
جمائے ہوئے کہہ رہا تھا۔
”ہاں تو۔“ سادہ کو حیرانی ہوئی۔

”مل گئی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے جیسے
اطلاع دی۔

”نہیں ایجر والی حرکتیں گئی نہیں تمہاری۔“ سادہ
نے جیسے ہنسی اڑائی۔ ”آپ کی نظر میں شاید میں آج
بھی وہی میٹرک والا اویز یوسف نہیں ایجر ہوں، مگر
اب میں بڑا ہو گیا ہوں۔ بچپن اور فلٹ کرنا میں نے
اسی لمحے چھوڑ دیا تھا، جب آپ نے نازیہ کی کال
ریسیو کی تھی اور اس کی باتوں سے آپ کو اتنا غصہ آیا
تھا، وہ بھی میرے حافظے میں ہے سادہ جی۔“ وہ
بہت بردباری سے کہہ رہا تھا۔
”یہ آپ سے میں سادہ جی کب سے ہو گئی

تمہاری۔“ ساری باتوں کو نظر انداز کرتے اس نے
حیرت سے پوچھا۔ کئی بار وہ یہ سوال کرنا چاہتی تھی، مگر
موقع نہیں ملا تھا۔ اس کے سوال پہ ہولے سے
مسکرایا۔

”جب سے دل کی دنیا بدلی۔“
”ہیں۔“ سادہ ناگہی سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ
بھرپور مسکراہٹ سے اس کے چہرے پہ نظریں
جمائے ہوئے تھا۔

”میری زلیخا بنیں گی؟“ اس کی نظروں اور
سوال پہ سادہ یہ جیسے حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ گئے
تھے۔ وہ نہ بھی کے عالم میں اسے دیکھ رہی تھی۔ جہاں
اسے اویز یوسف کی جرات دیگ کر گئی تھی وہی اپنی تالو
سے لگی زبان بھی حیران کر رہی تھی۔

☆☆☆

مرد محبت کا جو خوب صورت لبادہ اوڑھ کر عورت
کے پاس آتا ہے، عورت اسے کفن بنانے کو ترجیح
دے کر اسے زیب تن کر لیتی ہے، مگر مرد جلد ہی اگر
خوب صورت لبادے کو اپنی انا اور غصے تلے تار تار
کر کے عورت کے تن سے کفن کا احساس تک چھین کر
چلا جاتا ہے۔ کمرے میں دبی دبی سسکی کی آواز سر اسر
رہی تھی۔ کمرے کی روشنی زرد تھی۔ مٹی سے لیے فرش
پہ کمرے کے اک گوشے پہ جائے نماز بجھائے سرسجد
میں رکھے، وہ سسکیاں بھر رہی تھی، کبھی یہ سسکی ہلکی
ہوتی تھی، کبھی تیز.....

”اللہ!“ لبوں سے رب کا نام نکلنے کی دیر تھی،
پھر اک تانا ٹنگ گیا۔

”اللہ..... اللہ..... اللہ..... میرے اللہ.....
میرے اللہ..... یہ محبت لے ڈوبی مجھے..... اے
درد..... اتنی کمک..... اتنی چھین ہے۔ اس میں اگر ج
ہتا ہوتا تو کبھی نہ کرتی۔ اللہ کوئی ایسا بھی کرتا ہے، محبت
میں جیسا اس نے میرے ساتھ کیا۔ کیا یہ ہی اس کی
محبت تھی۔ اتنی کمزور..... اللہ تو نے کیوں ڈالی اس کی
محبت میرے دل میں..... کیوں اللہ کیوں..... دل لگی
میں..... مٹ گئی میں..... اللہ دل گئی ہیں۔“ سرسجد

میں تھا، لیکن اللہ سے ہوتی سرگوشی سے جیسے کرے کی ایک اک شے اس کے دکھ پہ دھبی ہو گئی تھی۔ وہ تڑپ رہی تھی۔ سسک رہی تھی۔ اس کے آنسوؤں سے جا نماز بھیگ رہی تھی۔ ماحول کی اداسی اس کی سسکیوں سے مزید بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

”مما میں لائبریری جاری ہوں۔“ دو پٹا سلیپے سے سر پہ ڈال کر اس نے پرس اٹھاتے ہوئے صدف کو مطلع کیا، وہ عصر کی نماز کے لیے جا نماز بچھا رہی تھیں۔

”اس وقت جاری ہو۔ تھوڑی دیر میں اندھیرا پھیل جائے گا۔“ صدف نے فکر مندی سے ڈھلتے سورج کی طرف دھیان دلایا۔

”کالج میں آج معمول سے زیادہ دیر ہو گئی، ورنہ کالج سے ہی چلی جاتی۔ میں جلدی آ جاؤں گی۔“ سناو یہ کو بھی احساس تھا کہ واپسی میں اندھیرا پھیل جائے گا۔ وہ لائبریری ہمیشہ اپنی کولیگ کے ساتھ کالج آف ہونے کے بعد چلی جاتی تھی، لیکن آج اچانک ڈائریکٹر صاحب نے مینٹنگ رکھ لی تھی، جس کی وجہ سے دیر ہو گئی۔ دیر ہی کے باعث کولیگ نے بھی ساتھ چلنے سے معذرت کر لی تو وہ گھر لوٹ آئی تھی۔ لچ کر کے تھوڑی دیر سستانے کے بعد نماز ادا کر کے وہ لائبریری کے لیے تیار ہو گئی کہ اسے کل کے لیکچر کے لیے ضروری مواد چاہیے تھا۔

”باہر جاری ہو تو گاجر کا حلوہ زنگس کو دیتی جاؤ، میں اوپن کا انتظار کر رہی تھی کہ آئے تو اس کے ہاتھ بھیجوں بلکہ ایسا کروتم اوپن کے ساتھ چلی جاؤ۔ دیر بھی ہو گئی تو مجھے فکر نہیں ہوگی۔“ صدف کو بولتے بولتے جیسے خیال آیا۔ سناو یہ جو حلوہ کا ڈبا اٹھائے کچن کی طرف بڑھنے لگی تھی۔ اس کے قدم بھی اک لمحے کے لیے رک گئے۔

”کہاں تم اکیلی رکشا ٹیکسی کے لیے خوار ہو گی۔ اوپن کے ساتھ جاؤ گی تو کنوں کا ایشو بھی نہیں ہوگا۔“ صدف کی بات پہ وہ سر ہلا کر ڈبا اٹھا کر باہر نکل

آئی۔

بیچی کا اپنا کاروبار تھا۔ گوکہ نذیر صاحب کا کاروبار اچھا چل رہا تھا۔ لیکن بیچی معاشی لحاظ سے ان سے کافی اچھے حال میں تھے۔ پھر اسفر کی کینیڈا کی کمائی بھی آتی تھی اور اوپن کی بھی۔ جن کی وجہ وہ مزید مالی لحاظ سے مستحکم ہو گئے تھے۔ اوپن نے حال ہی میں نئی کار لی تھی۔ گھر میں اک گاڑی پہلے ہی موجود تھی۔ سناو یہ چلی گئی تو انہوں نے ٹھیکٹ لاک کیا اور نماز ادا کرنے لگیں۔

☆☆☆

چند گھروں کے فاصلے پہ موجود بڑے سے گھر کا دروازہ بجانے پہ ماسی نے دروازہ کھولا تھا۔ سناو یہ کو دیکھ کر ماسی نے تیر مقدمی مسکراہٹ چہرے پہ سجائی۔

”سلام باجی!“ ملازمہ پرانی تھی اور سناو یہ سے واقفیت بھی رکھتی تھی۔

”وعلیکم السلام! کہیں ہو گل۔“ اس نے بھی جواباً مسکراتے ہوئے اس کا حوالہ دریافت کیا۔ ”اچھی ہوں باجی، بڑے دنوں بعد چکر لگایا۔“ سناو یہ ماسی کے ساتھ لاؤنج میں داخل ہوئی۔

”ارے سناو یہ! آؤ، آؤ، آؤ، یہاں رستہ بھول آئیں آج۔“ زنگس نے اسے دیکھتے ہی گلہ شروع کر دیا۔

”السلام علیکم۔ یہ ممانے حلوہ بھیجا ہے۔“ ”بیٹھو، بیٹھو بھابھی کے ہاتھ میں تو واقعی جادو ہے۔ جو بناتی ہیں لذیذ ہی ہوتا ہے اور گاجر کا حلوہ تو اوپن کی کمزوری ہے۔“ زنگس اسے قریبی صوفے پہ بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے صدف کی تعریف کرتے لگیں۔ وہ مسکرا کر رہ گئی۔

”نہیں جاری ہو کیا؟“ زنگس نے اس کی تیاری دیکھ کر استفسار کیا۔

”جی لائبریری جاری تھی۔ ممانے کہا آپ کو حلوہ دیتی جاؤں۔“ سناو یہ اٹھنے لگی تھی۔

”ارے تھوڑی دیر تو بیٹھ جاؤ۔ چائے پی کے چلی جانا۔“ زنگس نے اخلاقاً رونا کنا چاہا۔

”چاچی پہلے ہی دیر ہو گئی ہے۔ اندھیرا پھیل جائے گا۔ اماں پہلے ہی فکر مند ہو رہی تھیں۔“ اس نے سہولت سے معذرت کر کے دوپٹا سر پہ جمایا۔ وہ چاہنے کے باوجود اویز کا نام نہ لے سکی کہ صدف نے اسے اس کے ساتھ جانے کو کہا تھا۔ اس میں بھی صدف اور نذر پر احمک کا خون تھا جو اپنی ذات کے لیے کسی کو استہمال نہیں کرتے تھے۔

”ہاں یہ تو ہے۔ تم ایسا کرو اویز کے ساتھ چلی جاؤ۔ اتفاق سے وہ گھر پہ ہے۔“ نرگس کو بھی اس کے اکیلے پن کا احساس ہوا۔ تو انہوں نے بن کہے اس کی انجمن سلجھا دی۔

”چاچی میں چلی جاؤں گی۔“ اس نے تامل کہا۔

”ارے نیوں غیروں والی بات کر رہی ہو۔ اویز گھر میں ہی ہے۔ ناہوتا تو اور بات تھی۔ کہیں بھی جانا ہوا کرے تو بتا دیا کرو اویز چھوڑ آیا کرے گا کچھ تم پہ ویسے ہی جان مارتے ہیں۔ سن لیا کہ تم اکیلی گئی تھیں تو مجھے بھی باتیں سنائیں گے۔ جاؤ وہ اوپر اپنے کمرے میں ہے اسے بولو کہہیں ساتھ لے جائے گا۔“ نرگس کے اصرار پہ وہ سر ہلاتی پرس صوفے پہ ہی رکھتی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

اس نے دروازے پہ دستک دی مگر اندر سے کوئی جواب موصول نہ ہوا تو اس نے لاک گھمایا تو دروازہ کھلتا چلا گیا۔ کمرانیم اندھیرا تھا۔ اک بل کو تو سیاہی کی آنکھیں کچھ دیکھنے کی بصیرت بھی نہیں رکھتی تھیں۔ اندھیرے میں اسے اک شعلہ سا نظر آیا تھا۔ جو بڑی غور کرنے پہ واضح ہوا کہ وہ سگریٹ کا شعلہ تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر دیوار پہ لگے سوچ بورڈ کو تلاش کر کے بن روشن کر دیے کمر روشن ہوتے ہی اس کی نظر نے شعلہ کی طرف تعاقب کیا تھا اور اس کی آنکھیں جیسے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اک ہاتھ میں سگریٹ اور دوسرے ہاتھ میں پستل لیے اویز یوسف بھی کمر روشن کرنے والے کو دیکھ رہا تھا۔ اور سادیہ کو دیکھ کر نا وہ چونکا نا ٹھنکا بس خاموشی سے اسے دیکھتا

رہا۔

”اویز!“ سیاہی کو ہی جیسے ہوش آیا۔ وہ سرعت سے اس تک بڑھی تھی۔

”یہ“ اس کی گھبرائی ہوئی آواز بمشکل نکلی۔ وہ خوف زدہ نظروں سے اس کے ہاتھ میں موجود پستل کو دیکھ رہی تھی۔

”پستل ہے یا قاعدہ لائسنس ہے میرے پاس۔“ اس نے جیسے اس کی لم علمی میں اضافہ کیا۔

”لیکن تم اسے لے کر کیا کر رہے ہو؟“ وہ سخت گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔ وجہ اویز یوسف کے چہرے پہ پھیلی سنجیدگی اور غصہ تھا۔

”خودکشی!“ اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کمال سکون سے کہا۔

”لیکن کیوں؟“ وہ جیسے حیرت کی وادی میں غرق ہو گئی تھی۔ اس کا انداز اس کے تیور سے سمجھ نہیں آ رہے تھے۔

”تمہاری وجہ سے!“ اویز یوسف حیرے سے اٹھ کر اس تک آیا تھا۔

”میری وجہ سے۔“ اس کی حیرت و صدمے سے بری طرح آواز نکلی۔

”اس نے آج تک حشرات تک کو اپنی ذات سے تکلیف نہیں دی تھی۔ اور وہ جیتا جاگتا انسان اپنی خودکشی کے لیے اسے مودالزام ٹھہرا رہا تھا۔

”ہاں تمہاری وجہ سے۔۔۔ سالوں سے تمہارا اقرار سننے کے لیے روز تم تک آتا ہوں اور تم مجھے

دھتکار دیتی ہو۔ میرے محبت سے بھرے دل کو بے گانگی کے پتھر مارتی ہو۔ اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ سمجھیں۔“ اپنی بات کے اختتام میں اس نے

پستل کی نال سے اس کے شولڈر کو ہلکا سا دھکا دیا تھا۔ اس کے سنجیدہ، بے خوف لہجے کی سرد سربراہیت سے

وہ یوں ہی بے دم ہو رہی تھی۔ اس کے تیور اور ہاتھوں میں دبا پستل اسے پہلے ہی حواس باختہ کر گیا تھا۔ ہلکے سے دھکے پہ اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔

”اویز!“ اس کی صدمے سے بمشکل آواز نکلی

”تو پھر جو صحیح ہے۔ وہ کام تم کیوں نہیں کرتیں۔ کیوں اقرار نہیں کرتیں مجھ سے محبت کا۔“ اویز ضدی بچے کی طرح پھر کر بے حد قریب کھڑی ساویہ کے بال چٹھی میں بھر گیا۔ ساویہ کا سر جھکے سے اونچا ہوا تھا۔ وہ سی کر کے رہ گئی۔

”کیوں ستا رہی ہو مجھے۔ عرصہ سے اک ہی سوال کرتا ہوں تم سے اور تم۔۔۔ محبت نہیں کرتیں تو میری محبت کو محسوس تو کرو۔ میری دیوانگی کو سنجیدگی سے تو لو۔ تمہیں خود محبت نا ہو جائے تو پھر کہنا۔“ وہ پتھرائی آنکھوں سے اس کی دیوانگی دیکھ رہی تھی۔ اویز یوسف کو اس کے پتھرائے وجود پہ بلا کا غصہ آیا تھا۔ جھکے سے اس کے بال آزاد کر کے اس نے اس کے وجود کو چھو دھکیلا تھا۔

”پلیز مت کرو۔ میں۔۔۔ میں بھی کرتی ہوں تم سے محبت۔“ ساویہ نے بجلی کی سی تیزی سے اپنے لب کو کہتے سنا تھا۔ اور اسے جیسے خود پہ حیرت ہوئی تھی۔ اس سے کہیں زیادہ حیرت اویز یوسف کو ہوئی تھی لیکن اب کے ساویہ نے اس کے ہاتھ سے پھل لے کر دور اچھال دیا تھا۔

اویز یوسف کے چہرے کی بشارت لوٹنے لگی تھی۔ خوشی سرعت سے اس کے وجود کا احاطہ کر گئی تھی۔ جب کہ ساویہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی تھی۔

☆☆☆

ساویہ کوکل کے واقعے کے بعد سے جب سی لگ گئی تھی۔ لائبریری جانا تو دور وہ گھر تک جھٹل آئی تھی اور جب اس نے حواس کو قابو میں کر کے اک اک منظر کو ذہن کی اسکرین پہ چلنے دیا تو اسے وہ کسی فلم کا سین لگنے لگا۔

”اسٹوڈنٹ گھاسٹر۔۔۔ بالکل ڈفر ہے۔“ وہ ہڑبڑا کر رہ گئی تھی۔ سر جھٹک کر بھی وہ ان مناظر کو جھٹک نہیں پار رہی تھی۔ کانچ میں بھی وہ غیر حاضر دماغ کا مظاہرہ کرتی رہی تھی۔ حیات جیسے سو گئی تھیں۔ اس اک بل میں جیسے کچھ ہو گیا تھا۔ لیکن کیا؟ اس سوال کا جواب وہ خود بھی دریافت نہیں کر پار رہی تھی۔ اک

اگر جو وہ بے حد قریب نا ہوتا تو شاید سن نا پاتا۔
”جب مرجاؤں گا تب اس طرح نکارتی رہو گی۔ دیوانوں کی طرح، پانگلوں کی طرح ممکن میں لوٹ کے نہیں آؤں گا تب تڑپو گی، سسکو گی۔“ اس کا بدلہ لہجہ ساویہ کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے کر گیا تھا۔ اس کے چہرے کی بے خوبی اور اپنے لفظوں کا عزم واضح تھا۔ بات کے اختتام پہ اس نے پھل کپٹنی سے لگالی تھی۔ ساویہ میں جانے کہاں سے اتنا حوصلہ آ گیا کہ اس نے تیزی سے اس کا پھل والا ہاتھ پکڑنے کی اور اس کو کش میں اویز کے سینے سے آگئی تھی۔ وہ اتنی خوف زدہ ہو گئی تھی کہ اس کا دل چڑیا کی طرح ہلچل مچانے لگا تھا۔ اس کی دھڑکنوں کی پھڑ پھڑا ہٹ کو محسوس کر کے اویز یوسف پھرے سمندر سے ساکت جھیل کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ اس کی انگلی میں ابھی تک سکرپٹ سلگ رہا تھا۔ باباں ہاتھ ہوا میں بلند تھا۔ اس کا ہاتھ ابھی بھی ساویہ نے گرفت میں لے رکھا تھا۔ دائیں ٹولڈر پہ ساویہ کے نیلو بڑی طرح پوسٹ ہو گئے تھے۔ وہ خاموشی سے اپنی تھوڑی پہ اس کے بالوں کی سرسراہٹ محسوس کر رہا تھا۔ لہجہ حیات میں پہلا موقع تھا جو وہ اس کے اتنے قریب تھی۔ اس نے اسی خاموشی سے اپنا پھل والا ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑانا چاہا تھا۔ مگر بدحواسی کے باوجود ساویہ نے گرفت مزید مضبوط کر کے اس کے سینے سے سر اٹھایا تھا۔ وہ خاموش نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ کئی ٹاپے اویز بھی اسے دیکھتا رہا وہ یقیناً کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھی تاہم اسے یہ احساس تھا کہ وہ اویز یوسف کے کس قدر قریب ہے۔

”ہاتھ چھوڑو!“ اویز نے آہستگی سے کہا۔
ساویہ نے بے ساختہ نفی میں سر ہلایا۔

”مت کرو یہ پلیز!“ وہ نرم دل لڑکی تھی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

”میں کروں گا۔“ اس کا لہجہ اٹل تھا۔

”اویز یہ غلط ہے۔“ وہ جیسے حواسوں میں لوٹنے لگی تھی۔

”جب تمہارے چہرے کو دیکھ کر مجھے سکون ملا ہے تو کیوں رخ پھیر لیتی ہو؟“ عجیب سی سرسراہٹ تھی اس کے لیے میں۔ بنا کچھ بولے وہ چپ چاپ اسے دیکھ رہی تھی۔ اس میں شاید اتنی مزاحمت کرنے کی بھی ہمت نہ تھی کہ وہ اس کا ہاتھ اپنی ٹھوڑی سے ہٹا پاتی۔ لیکن اس کی آنکھوں میں محبت کے لپکتے شعلے دیکھ کر وہ اک بار پھر نگاہ وند اسکرین پہ مرکوز کر چکی تھی۔ اویز یوسف نے اس کے اس عمل کو بے حد مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔

”محبت نے بالآخر اپنا آپ منوالیا تم سے۔ محبت ہو چکی ہے تمہیں مجھ سے۔“ اویز یوسف نے جس قدر دھیمے لہجے میں کمال سکون سے جملہ کہا تھا وہ کسی قدر چونک کر اس کی سمت نگاہ کر گئی۔ لمحے کے ہزار حصوں میں حیر اور خوف اس کی آنکھوں میں آسایا تھا۔ اس کی متوحش اور بے یقین نظروں کو اس نے بہت محبت سے دیکھا تھا۔ پھر ہولے سے مسکرا کر سر اشارات میں ہلاتے بیک ویو مر اس کی آنکھوں پہ فوکس کرتے کہا تھا۔

”اپنی آنکھوں کے بدلنے رنگ خود ہی دیکھ لو۔ اپنی متوحش دھڑکنوں کو خود ہی پرکھ لو۔ محبت کا عکس تمہارے وجود سے آشکار ہو رہا ہے سماویہ۔ اب تو اسے قبول کر لو۔ خود کو باد کرادو کہ تمہیں مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔“ وہ ہولے ہولے سحر پھونک رہا تھا اور سماویہ ساکت مہر بہ لب اسے نکلے جا رہی تھی۔

”سچ پوچھو تو میں نے بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ مجھے تم سے محبت ہو جائے گی۔۔۔ ہاں جس لمحے تم نے مجھے فلرٹ سے روکا اس گھڑی میں نے تم سے اک مقابلے کی فضا قائم کر لی۔۔۔ میں بڑھائی میں تمہاری واہ واہ پہ چڑنے لگا تھا۔ تب ہی تمہیں پیچھے چھوڑنے کے لیے جی توڑ محنت کرنے لگا۔ اس مقابلے میں ان گنت راتوں کا ادھار ہے مجھ پہ۔ میں پاگلوں کی طرح بڑھنے لگا۔ صرف تم سے مقابلے میں جیتنے کے لیے اور جبر ہی نہیں ہوئی تم سے مقابلہ کرتے کرتے کب میں خود کو تمہارے دربار دل میں ہار

سنا تا تھا جس نے اس کے وجود کو اسے حصار میں لے رکھا تھا۔ کوئی آکٹوپس تھا جس کے مچھنے میں وہ پھنسنے لگی تھی۔ کالج آف کر کے وہ باہر نکلی تو اس کے اعصاب کو جیسے جھکا لگا۔ نظروں کے عین سامنے اویز یوسف بلو جینز وہاٹ ٹی شرٹ میں یلو جیکٹ پہنے گلاسز آنکھوں پر چڑھائے گاڑی سے ٹیک لگائے دونوں ہاتھ سینے پہ باندھے دروازے پہ نظریں جمائے ایستادہ تھا۔ سماویہ کے قدم بے ساختہ اس کی طرف اٹھ گئے۔

”تم یہاں؟“ اس کے ذہن میں فوراً کسی انہونی کا خیال آیا۔

”فوراً چڑیا کی طرح گھبرا جاتی ہو۔ سب ٹھیک ہے کیا میں تمہیں پک کرنے نہیں آسکتا۔“ اس کے گھبرائے انداز کو دیکھ کر اویز نے اپنے آنے کی وضاحت کے ساتھ جیسے سوال کیا۔

”تم کیوں لینے آ گئے۔ مجھے لائبریری جانا ہے۔“ اسے اپنا کل کا ادھورا کام یاد آیا۔

”تو کوئی بات نہیں، میں لائبریری لیے چلتا ہوں۔ ایسی کیا بات ہے۔“ اویز یوسف نے سیدھا ہوتے ہوئے اس کے لیے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

خاموشی سے بیٹھ گئی تو اویز اس کی طرف کا دروازہ بند کر کے ڈرائیونگ سیٹ کی طرف چلا آیا۔

گاڑی راستہ طے کرنے لگی تھی۔ وہ خاموشی سے نظریں وند اسکرین پہ جمائے چپ بیٹھی تھی۔ اویز نے کئی ایک بار اس کے ساکت وجود کو گردن موڑ کر دیکھا تھا۔ اب کے اس سے رہا نہیں گیا تو اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹھوڑی سے پکڑ کر اس کا چہرہ اپنی طرف کیا۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ سماویہ کی نظر اک لمحے کو

اس سے ملی تھیں۔ پھر اس نے دوبارہ اپنی سابقہ سرگرمی میں مصروف ہونا چاہا۔ مگر اویز جیسا ضدی انسان یہ کیسے ہونے دیتا۔ اس نے دوبارہ اس کا چہرہ اپنی طرف کیا۔

سماویہ میں اپنی فیملی کو آپ کے گھر لانا چاہتا ہوں۔“ اس وقت وہ اسٹاف روم میں اکیلی بیٹھی تھی۔ اگلے لپکچر میں تھوڑا نام تھا۔ وہ اپنا لپکچر پڑھ رہی تھی۔ اتفاق سے اس وقت اسٹاف روم خالی تھا۔ عمیر کیمسٹری کے لپکچر آتے۔ بینٹیس چائیس کے لگ بھگ تھے۔ اچھی پرسنالٹی تھی۔ سماویہ کو پسند کرنے لگے تھے اور اب جب گھر میں ان کی شادی کی بات ہونے لگی تو انہوں نے گھر والوں کو اشارے میں بتا دیا کہ وہ کسی کو پسند کرتے ہیں، گھر والوں نے خوشی کا اظہار کیا تو وہ سماویہ سے بات کرنے کا بہانہ ڈھونڈنے لگے۔ اور اب جب وہ اتفاق سے انہیں اکیلی نظر آ گئی تو انہوں نے مدعا عرض کرنے میں ذرا دیر نا لگائی۔

عمیر کے اچانک کہنے پہ سماویہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی تھی۔ ان کے جملے میں نا سوال تھا نا استفسار، یوں جیسے وہ اطلاع دے رہے تھے۔ ”کس سلسلے میں؟“ سماویہ کو ان کے انداز پہ حیرانی تھی۔

”میں آپ کو پسند کرتا ہوں اور شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ عمیر نے کھلے لفظوں میں پسندیدگی کا اظہار کر دیا۔ وہ بے طرح چونک گئی۔ اس کی نگاہ کے سامنے اویز یوسف کا سراپا لہر گیا۔ جانے کیوں، جب بھی کوئی اس سے محبت اور پسندیدگی کی بات کرتا تھا تو چھم سے وہ محض آ جاتا تھا۔ جو اس کے لیے پاگل تھا۔ جیسے دیوانگی سے باز رکھنے کے لیے اس نے جھوٹ کہہ دیا تھا کہ وہ بھی اس سے محبت کرتی ہے۔ لیکن اس دن سے اس کے اندر اک خاموشی اتر آئی تھی۔ جسے وہ کوئی نام نہیں دے پا رہی تھی۔

”اس خاموشی کو میں آپ کی رضا سمجھوں۔؟“ عمیر اسے استغماہمیت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اسی اثنا میں نیل نج اٹھی تو ماحول میں ارتعاش سا برپا ہو گیا۔ بریک ٹائم تھا۔ اسٹوڈنٹس کا شور ماحول میں گونجنے لگا۔ منچر بھی اسٹاف روم میں داخل ہونے

اویز یوسف کسی ساحر کا روپ دھار چکا تھا جو ماحول میں سحر طاری کر گیا تھا۔ ”جس لمحے مجھ پہ منکشف ہوا تھا کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں اور جس محبت کی مجھے تلاش تھی وہ تم ہو تو میں کئی دن تک خود کو، اپنے احساسات کو سمجھ نہیں پایا تھا۔ حیرت کا پہاڑ مجھ پہ ٹوٹ پڑا تھا کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔“

سماویہ چپ چاپ اس کی کھٹا سن رہی تھی۔ یوں جیسے اس کے پاس بولنے کو کچھ نا تھا۔ صد شکر کہ لائبریری کی عمارت آگئی تھی۔ سماویہ کو بھی اس صورت حال سے فرار کا موقع مل گیا تھا۔

عورت کی سیدھی سادی زندگی میں مرد سارے اصول توڑتا داخل ہوتا ہے اپنی محبت اور وفا کے بلند و بانگ دعوے سے عورت کا اعتماد جیت کر اسے اپنا عادی بنا لیتا ہے۔ عورت وہ ہی دیکھتی ہے جو وہ دکھاتا ہے، اپنی ذات، ترجیحات اس مرد سے وابستہ کر لیتی ہے۔ خود پہ انشتی انگلی کی پروا کیے بغیر وفا کرتی ہے۔ اک مرد کی محبت میں سب کا بھروسہ توڑتی ہے۔ لیکن جب مرد کا دل محبت کے کھیل سے اوب جاتا ہے تو جاتے ہوئے اسی عورت کے منہ پہ کس کے تماچا مار جاتا ہے کہ اسے عورت پہ اعتبار نہیں۔

نہجید کے وقت دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے وہ سسک رہی تھی۔ نیم اندھیرا کمرایہ مل گیا ہو گیا تھا۔ ”میں محبت نہیں کرنا چاہتی تھی اس کا نونو بھری راہ گزر رہے تو مجھے گھٹیل لایا اور اب جب میرا وجود لہو ہو گیا ہے تو تو نے منہ موڑ لیا۔ یہ انصاف نہیں۔ میرے اللہ یہ انصاف نہیں۔“ آنسوؤں سے تر چہرہ خود پہ گزری اذیت کی داستان سنار ہاتھ اب الہ عزت کی پارگاہ میں وہ اس بے مہر کی شکایت کر رہی تھی۔ رو رہی تھی۔ سسک رہی تھی۔ تڑپ رہی تھی۔ مگر سنائے میں اس کی پکار سننے والا کوئی نا تھا۔ اس کی تڑپ دیکھنے والا کوئی نا تھا۔

لگے تھے۔ عمیر چند لمحے اسے خاموشی سے دیکھتے رہے پھر اپنی چیز پہ جا کے بیٹھ گئے۔
 سماویہ جب تک بیٹھی رہی اسے عمیر کی نظریں خود پر گڑی محسوس ہوتی رہیں۔
 گھر آ کر وہ بھول بھی گئی تھی۔ کالج سے لوٹی تو صدف نرگس کے ساتھ بازار گئی ہوئی تھیں۔ کھانا کھا کر وہ تھوڑی دیر کے لیے لیٹ گئی تھی۔ پھر جانے کب آ نکھ لگ گئی۔ جاگی تو صدف گھر میں موجود تھیں۔

”سماویہ اٹھ کے تیار ہو جاؤ۔ تمہارا کولیگ عمیر اپنی ماں اور بہنوں کو لے کر آیا ہے۔“ صدف کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔ وہ بہت اکیسا بیٹھ بھی لگ رہی تھیں۔ اس کا دماغ ہلک سے اڑ گیا۔
 ”جی!“ آواز میں حد درجہ تحیر تھا۔ صبح ہی عمیر نے اپنی خواہش ظاہر کی تھی اور شام کو وارڈ بھی ہو گیا تھا۔ جمع ماں اور بہنوں کے۔ اسے کسی قدر کوفت کا احساس ہوا۔ وہ ابھی اس وقت کسی کے سامنے جا کے ڈمی بننے کے موڈ میں نہیں تھی۔

”جلدی اٹھو! میں نے ناشتے کے لوازمات منگوا کر کچن میں رکھ دیے ہیں، تم بس جلدی سے چائے بنا لو۔ کوئی اچھا سا سوٹ پہن کر تیار ہو جاؤ۔“ صدف ماں کی طرح ہدایت کرتی جا رہی تھیں وہ بے دلی سے اٹھ کر وارڈ روب کی طرف بڑھ گئی۔ ہاتھ میں آنے والا پہلا سوٹ نکال کر پہنچ کرنے چلی گئی۔
 لائٹ سا تیار ہو کر کچن میں آئی تو لوازمات کے شارپز بڑے تھے۔ چائے تیار کرتے اس نے لوازمات پلیٹوں پہ سلیقے سے رکھنا شروع کر دیے ٹرائل میں پلیٹوں کو سلیقے سے سیٹ کر کے وہ چائے نکال رہی تھی۔

”کس کی خاطر مدارت کی تیاری ہے؟“ اویز یوسف کی آواز اک دم سے سماعتوں میں پڑی تو وہ بری طرح اچھل پڑی، چائے ہاتھ پہ گرتے گرتے پٹی۔

”ارے آرام سے، میں ہی ہوں، کوئی بھوت

دیکھ لیا جو اتنا ڈر گئی ہو۔“ وہ اس کی چیخ اور اک دم پلٹ کر ہاتھ سننے پر رکھ لینے پر ہنس پڑا تھا۔ سماویہ کی خوب صورت آنکھوں میں اک نامعلوم سا ڈر آ گیا تھا۔ وہ یوں متوحش ہو گئی تھی جیسے اویز یوسف نے چوری کرتے اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہو۔ اس کا پلٹنا تھا کہ اویز یوسف مہبوت ہو کر یک ٹک اسے دیکھے گیا۔

آنکھوں میں خوف سموئے بلک سوٹ میں مسٹر ڈ اور بلیک دوپٹا لیے وہ اتنی حسین لگ رہی تھی کہ وہ بے ساختہ اس کی طرف چند قدم آگے آیا تھا۔
 ”ج سنور کو تو تم مزید حسین لگتی ہو۔“ وہ دھیمے سے سرگوشی کر گیا تھا۔ وہ دو قدم پیچھے ہو کر جیسے خود پہ قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

”گیسٹ آئے ہیں؟“ وہ لوازمات سے سنجی ٹرائل سے سلکٹ اٹھا کر کھانے لگا۔
 ”ہاں وہ.....“ سماویہ گڑبڑا کے چپ رہ گئی۔
 اور اک دم سے رخ پھیر گئی۔

اویز یوسف نے اک نظر سنجی ٹرائل اور دوسری نظر سماویہ کی پشت پہ ڈالی جو ٹرے میں چائے کے کپ سیٹ کر رہی تھی۔ اس نے جھپٹے سے اس کے بازو کو پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف کیا تھا۔

”کون ہیں یہ مہمان!“ سماویہ اس کے انداز سے جیسے لرز گئی۔ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی تیاری۔ ستواں ناک میں چمکتی لوگنگ۔ اس کا سجا سنورا روپ جو مفہوم سمجھا رہا تھا وہ اس کے اندر آگ لگا گیا۔

”میرے کولیگ کی فیملی ہے۔“ سماویہ کی مجبوری تھی کہ اسے جواب دینا تھا۔ وہ ایسے جان چھوڑنے والا تھوڑی تھا۔ سماویہ نے ٹرائل میں چائے کی ٹرے رکھی اور جلدی سے کچن سے نکلنا چاہا۔ مگر اس کے ہاتھ ٹرائل کو پکڑتے اس سے پہلے اس کی کلائی اویز یوسف کے مضبوط ہاتھ کے شکنجے میں آ گئی تھی۔

”اور کس سلسلے میں آئے ہیں یہ لوگ؟“ وہ کلائی پہ دباؤ ڈالتے اس کی کججاری آنکھوں میں

جھانک رہا تھا۔ دھان پان سی ساویہ کو اپنی نازک کلائی چھڑانے کی کوشش میں پسینہ آ گیا۔
 ”تم نے تو کہا تھا، تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔“ وہ جیسے اپنا غصہ کثروں کر رہا تھا۔

”ہاں کہا تھا، صرف تمہیں اس فضول حرکت سے روکنے کے لیے۔ ورنہ اس میں کوئی سچائی نہیں تھی۔“ ساویہ نے ہمت کر کے سچ کہہ دیا۔ اویز یوسف لب تھپتھپنے لگی ٹاپے اسے دیکھتا رہا پھر اس کی کلائی مڑوڑتا کر کے پیچھے لے گیا۔
 ”اویز!“ وہ کراہ کر رہ گئی۔

”میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتی تھیں پر کھنے میں، تا میرا دل تمہارے احساسات پہچاننے میں کیکن اگر تم نے جھوٹ ہی کہا تھا تو تم اب اس جھوٹ کو نبھاؤ گی۔ رہی بات ان مہمانوں کی خاطر تو وضع کی۔ تو آؤ میرے ساتھ۔۔۔“ وہ اس کی کلائی کھینچتا بچن سے نکلنے لگا تھا۔

”اویز کیا بچنا ہے۔ چھوڑو میرا ہاتھ۔“ ساویہ کلائی چھڑانے کے بہت کر نے لگی۔ جو اسے ساتھ لیے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

”ان کی خاطر مدارت کی تم فکر نہ کرو۔ میں انہیں ہمارے ویسے کی شاندار دعوت کھلاؤں گا۔“ اس پر چنداں اثر نہ ہوا تھا۔

”اویز باگل ہو گئے ہو۔ چھوڑو میرا ہاتھ!“ ساویہ اسے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھتا دیکھ کر مزید گھبرا گئی۔ جانے وہ کیا کرنے جا رہا تھا۔ ساویہ کا دل سوکھے پتے کی طرح کا پٹنے لگا۔ لیکن اس ضدی اور ہٹ دھرم پہ کوئی اثر نہ ہوا۔ ساویہ کی دلی خواہش ہوئی وہ اپنی آنکھیں بند کر لے نا کچھ دیکھے نا کچھ کہے کیونکہ جو کچھ وہ کرنے لگا تھا اسے تصور میں سوچ کر ہی اس کی جان نکل رہی تھی۔

اویز یوسف اسے کھینچتا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تھا۔ جہاں عمیر اس کی ماں اور تین بہنوں کے علاوہ صدف اور نذیر احمد بھی براجمان تھے۔ گھبرائی ہوئی سی ساویہ کا ہاتھ تھا سے اویز یوسف جس طرح

کمرے میں داخل ہوا تھا اس سے کمرے میں موجود باتیں کرتے نفوس کے لب جہاں ساکت ہو گئے وہیں نگاہیں پھرا گئیں۔ عمیر اور اس کی ماں بہنیں اک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگی تھیں تو عمیر اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکا تھا۔ صدف اور نذیر احمد بھی ہکا بکا رہ گئے تھے۔

”آپ سب یقیناً ساویہ کو مانگتے آئے ہیں مگر جو ہستی پہلے ہی کسی کی ہو اسے کسی اور کو سونپا نہیں جاسکتا۔ یہ میری ہے اور میری ہی رہے گی۔ آپ سب کی تشریف آوری کا بہت شکریہ خاطر مدارت سے معذرت آپ لوگوں کو شادی میں ضرور بلاؤں گا۔ اب آپ لوگ جاسکتے ہیں۔“ اویز یوسف کی آواز جیسے حضور اسرائیل کی طرح سب کی سماعتوں میں گونجی۔ عمیر کی ماں بہنیں عمیر کی شکل دیکھنے لگیں تو عمیر ساویہ کی، جو اپنا ہاتھ اویز کو پکڑائے سر جھکائے کھڑی تھی۔ اویز کے کیٹ کی طرف اشارہ کرنے پہ مہمان خاموشی سے اٹھے اور دروازے سے نکلتے چلے گئے۔

صدف اور نذیر احمد ساکت بیٹھے دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ بلا کی بے یقینی تھی ان کی نگاہوں میں۔ اویز یوسف نے اک دم سے ساویہ کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ وہ ان دونوں کی طرف بڑھا۔ ان کے قدموں تلے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر وہ ان کے ہاتھ تھام گیا تھا۔

”آپ دونوں کو شاید برا لگا ہو۔ مگر یہ ہی سچ ہے۔ میں ساویہ سے محبت کرتا ہوں اور اسی سے شادی کروں گا۔“ وہ اپنے ازلی بے خوف اور اہل لہجہ میں اپنے عمل کی معافی مانگتا انہیں اپنے خیالات سے آگاہ کر رہا تھا۔

”لیکن بیٹا ساویہ تم سے بڑی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے۔“ صدف جیسے بمشکل بولی تھیں۔ ساویہ کا جی چاہ رہا تھا اویز یوسف کا گلا دبا دے جو اس کے ماں، باپ کے سامنے اسے شرمندہ کر گیا تھا۔ جس نے بڑی صاف ستھری زندگی گزاری تھی اور آج اس پہ انھی بے یقین نظریں اسے چبھ رہی تھیں۔ کچھ نا کر کے بھی وہ

”مجرم بن گئی تھی۔“

”چارسال کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا تائی جان اگر یہ مجھ سے آٹھ سال بھی بڑی ہوتی تب بھی مجھے کوئی عذر قابل قبول نہ ہوتا۔“

”یہ تمہاری سوچ ہے بیٹا زنگس اور بچی کی نہیں۔“ صدف درپردہ جتا گئی تھیں۔ انہیں زنگس کے مزاج کا بہت اچھی طرح پتا تھا۔ بھلے وہ سماویہ سے بہت محبت جتاتی تھیں اگر انہیں واقعی سماویہ سے محبت ہوتی تو وہ اسفر کے لیے اپنے خاندان میں لڑکیاں نادیکھ رہی ہوتیں۔

”میری زندگی میں فیصلے میرے ہوتے ہیں تائی جان، آپ کوئی مینشن نالیں۔“ وہ انہیں اعتماد دلا رہا تھا۔

”تمہارا دماغ تو ٹھکانے پر ہے اویز!“ شومنی قسمت کہ اس وقت زنگس ادھر کو آنکلیں۔ صدف، زنگس کے ساتھ بازار میں ہی تھیں جب عیسر کی کال آئی تھی۔ زنگس بھی مہمانوں سے ملنے کے خیال سے آئی تھیں۔ مگر دروازے پہ ہی مہمانوں کا غصہ اور بڑبڑاہٹ سن کر اندر آئیں تو اویز کے جملے ان کی سماعت پہ تھوڑے کی طرح برے۔ اویز یوسف اک دم سے سروقد ہو گیا۔

”مانا ہم نے تمہاری ہر ضد پوری کی ہے لیکن ابھی تم اتنے بڑے نہیں ہوئے کہ اپنی زندگی کے سب سے اہم فیصلے کرنے کھڑے ہو جاؤ۔“ زنگس نے جو برسوں پرانی کدورت چھپا رکھی تھی وہ اس گھڑی اک دم سے آشکار ہو گئی۔ سماویہ اپنی جگہ پتھر کی بن گئی تھی۔

”تمہارے لیے لڑکیوں کی کمی ہے جو تم عمر رسیدہ کے چکر میں پڑے ہو۔“ زنگس کی سبغ نواں پہ صدف ہکا بکا اس کی شکل دیکھ رہی تھیں۔ نذیر احمد شریف منش انسان تھے انہوں نے کبھی بلا ضرورت زنگس سے گفتگو نہیں کی تھی تو اب ان کی سبغ نوائوں پہ کیسے برہمی کا اظہار کرتے۔ رہی سماویہ تو وہ کچھ بولنے کے قابل ہی کہاں تھی۔ اتنی ذلت پہ اس کی زبان تالو سے لگ گئی تھی۔

”مگر میں موت کی سی خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ صدف اور نذیر احمد اپنی جگہ خاموش ہو گئے تھے تو سماویہ اپنی نظروں میں جیسے چور ہو گئی تھی۔ کچھ تا کر کے بھی وہ مجرم بن کر سب کی نظروں اور باتوں کو برداشت کرنے پر مجبور تھی۔ رشتے جب اپنی اصلیت دکھا دیں تو انسان یوں ہی خاموش ہو جاتا ہے۔ بچی ان دنوں شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ گھر جا کر اویز نے زنگس کو دو ٹوک لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ وہ سماویہ

تھیں۔ خود اس کے لیے کھانا نکالتی تھیں۔ روز کی روداد سنتی تھیں لیکن آج وہ بے جان لیٹی ہوئی تھیں۔
 ”مما طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی۔ ایسے کیوں لیٹی ہوئی ہیں؟“ سماویہ سے زیادہ دیر برداشت نا ہو سکا۔ صدف نے دوپٹا چہرے سے ہٹا کر اسے دیکھا۔ معصوم سادہ چہرہ لیے ان کی پری شکل بیٹی انہیں بہت عزیز تھی۔ بہت محبت تھی انہیں اپنی اکلوتی اولاد سے اتنی کہ اولاد زینہ نا ہونے کا بھی انہیں غم نا ہوا ساری عمر۔

”مما، میرا یقین کریں۔ اوین نے جو کہا وہ اس کی سوچ ہے مجھے اس سے کوئی محبت و جبت نہیں ہے۔ میں۔۔۔۔“

”کاش سماویہ! میں بانجھ رہی ہوتی۔ تو نے میرے گھر جنم نا لیا ہوتا تو آج۔۔۔۔ آج یہ ذلت میرے مقدر میں نا ہوتی۔ زگس نے خاندان بھر میں بات پھیلا دی ہے سب میری تربیت پہ تھوکتہ کر رہے ہیں۔“ صدف کی آنکھوں کے گوشوں کے آنسو بہنے لگے تھے۔ سماویہ لب کاٹ رہی تھی۔

”اوین یوسف! اللہ کرے تم مر جاؤ۔ مر جاؤ تم!“ اس کے دل سے اک بار پھر بدعا نکلتی تھی۔ اسی وقت نذر احمد تیز رفتاری سے بھاگے چلے آئے تھے۔ ”یچی کی کال آئی ہے۔ اوین کا بہت بڑا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ بہت سیریس حالت ہے۔ یچی بس پہنچنے والا ہے۔ اس نے ہمیں اسپتال پہنچنے کی درخواست کی ہے۔“ نذر احمد، سماویہ کو دیکھ کر اک لمحے کے لیے رکے تھے۔ اگلے پل انہوں نے فرائے سے کال کی بابت سب بتا دیا تھا۔

”ہائے میرا بچہ!“ صدف بھی ہول کر اٹھی تھیں۔ جلدی سے چادر لے کر گیٹ بند کرنے کا کہہ کر نذر صاحب کے پیچھے لگیں۔ وہ سب کچھ فراموش کر گئی تھیں۔

”اوین یوسف اللہ کرے تم مر جاؤ۔ مر جاؤ تم!“ اس کے اپنے الفاظ کانوں میں گونجنے تو اس نے لڑکھڑا کر دیوار کا سہارا لے لیا۔ اسپتال میں اک

سے ہی شادی کرے گا۔ زگس بھی اپنے موقف سے اک انچ پیچھے ہٹنے کو تیار نا تھیں۔
 ”تم کسی راہ چلتی کو پسند کر لو میں اس سے تمہاری شادی کر دوں گی مگر سماویہ سے مر کے بھی نہیں۔ جس کی وجہ سے میں برسوں حسد کی آگ میں جلی ہوں۔“

اوین نے یچی کو فون کر کے کل ہی لوٹ آنے کا کہا تھا۔ صبح سماویہ کانچ پہنچی تو عمیر نے یہ بات پورے اسٹاف کے سامنے پھیلا دی کہ کیسے اسے گھر بلا کر سماویہ اپنے کزن کے ساتھ ہاتھ پکڑے کھڑی تھی۔ ان کی بے عزتی کی۔ ہر کوئی فردا فردا اس واقعے کی تفصیل پوچھ رہا تھا۔ اور وہ جو گھر سے اس لیے نکلی تھی کہ ان سوچوں سے رہائی ملے۔ وہ اک نئے امتحان پہ ڈھکی گئی تھی۔

”اوین یوسف جس طرح تم نے میرا تماشا لگا دیا ہے، تم خود سکون سے نہیں رہو گے۔ برسوں کی بنی میری عزت پہ تم نے داغ لگا دیا۔ اللہ کرے تم مر جاؤ!“ کانچ کے سامنے اسے اپنا منتظر دیکھ کر سماویہ کو بلا کا غصہ آیا تھا۔ وہ کل سے چپ تھی مگر اسے کانچ کے باہر دیکھ کر عمیر نے جس طرح اپنے ساتھ کھڑے ساتھی کو لیک کو اشارے سے ان دونوں کی طرف اشارہ کیا۔ یہ سب دیکھ کر وہ برداشت نا کر سکی تو بول پڑی۔ اوین یوسف اسے ساکت نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اسی اثنا میں وہ رکشا کو اشارہ کر کے اس میں سوار ہو چکی تھی۔ وہ نظریں سرک پہ جمائے کتنی ہی دیر کھڑا رہا۔

گھر پہنچ کر وہی کل والی سوگواریت دیکھ کر سماویہ کا دل بوجھ ہو گیا۔

”اوین یوسف یہ کس امتحان میں ڈال دیا تم نے مجھے تم بھی سٹھی نہیں رہو گے۔“ آنکھوں میں آئے پانی کو صاف کرتے اس نے صدف کے کمرے کی طرف قدم بڑھائے۔ وہ دوپٹا منہ پہ ڈالے لیٹی ہوئی تھیں۔ سماویہ کے دل پہ گھونسا لگا۔ روز اس کی واپسی کے وقت کا خیال کرتے صدف چاق و چوبند ہوئی

جکی تھی۔ تب ہی ہر بار اویز یوسف کو دھتکار دیتی تھی۔ مگر وہ بھی اپنی ہٹ کا کیا تھا۔ اپنے فیصلوں میں اس تھا۔ ساویہ نے اپنی ذات کو تباہ بننے سے بچانے کے لیے یہ خول خود ہی تان رکھا تھا۔ مگر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ اور اب اس کی بددعا جانے کیسے قبول ہو گئی تھی۔ اس نے کتنی ہی دعائیں کی تھیں کہ اویز محبت نامی بلا اس کا پچھا چھوڑ دے، مگر ایسا کچھ نہ ہوا اور اب جو ہوا وہ بہت برا تھا۔ رات آدمی بیت گئی تھی، مگر اسپتال سے کوئی امید افزا خبر نہیں آ رہی تھی۔ صدف اس کے اکیلے پن کا خیال کر کے لوٹ آئی تھیں، مگر ان کے چہرے کی ناامیدی انہوں نے جس طرح ساویہ پہ نظر ڈالی وہ ڈھکے گئی تھی۔

”میرے اللہ..... اللہ اس کو زندگی دے دے۔ میرے مالک اسے زندگی دے دے، بدلے میں بھلے میری لے لے۔“ تہجد کی نیت کر کے اس کے لب بس یہ ہی ورد کر رہے تھے۔ جانے کب وہ جا نماز پہنچ سکی تھی۔

☆☆☆

”جب مر جاؤں گا، تب اس طرح بیکارتی رہو گی۔ دیوانوں کی طرح، پانگوں کی طرح، ٹیکن میں لوٹ کے نہیں آؤں گا، تب تڑپو گی، سکسو گی۔“ اس کے لفظوں کی بازگشت اس کے ہوش و خرد سے بے گانہ وجود کو بھی جھنجھوڑ رہی تھیں۔ ساویہ سحر کوئی کمزور، بے لگام نفس و احساسات کے زیر اثر رہنے والی لڑکی نہیں تھی، تب ہی تو اویز یوسف کے شوریدہ جذبات کے آگے سالوں کھڑی رہی۔ وہ اس جنونی لڑکے کو اپنی ذات سے مایوس کرنا چاہتی تھی، اسے خبر تھی وہ جس معاشرے کا حصہ تھی، وہاں چار سال کا فرق لوگوں کو چالیس کے برابر لگے گا اور سب اسے ہی الزام دیں گے کہ اس نے اپنے سے چار سالہ چھوٹے لڑکے کو پھانس رکھا ہے۔ ٹیکن اس کی کوئی احتیاط اس کے کام نہیں آئی۔ اپنے اور اویز کے بیچ رکھے فاصلے کے باوجود اویز یوسف تیزی سے ہر دیوار کو گرا گیا تھا۔ لیکن دیوار گرتے ہی سارا ملبہ اس

قیامت منتظر تھی۔ ڈاکٹر زنا امید کی اظہار کر رہے تھے۔ شولڈر کی بڑی ٹوٹ گئی تھی۔ سر کے پھلے حصے پہ شدید چوٹ لگی تھی۔ پیٹھ پہ جا بجا کچ چھکے تھے۔ نرس، صدف کے گلے لگ کے رو رہی تھیں۔ صدف اعلا ظفر کی مظارہ کرتی انہیں دلا سادے رہی تھیں۔ اویز کے لیے دعا گو تھیں۔ آپریشنز ہو گئے تھے مگر اسے ہوش نہیں آ رہا تھا۔ جس کی وجہ سے ڈاکٹر زنا منتظر تھے۔ کچھ بعید نا تھا اسے ڈیڈ وکلیٹر کر دیا جاتا۔

☆☆☆

کبھی لفظ نہیں ہوتے فقط آنسو ہوتے ہیں، ندامت کے۔ بددعا اتنی جلدی قبول کرنے والا دعا قبول کرنے میں اتنی دیری کیوں لگاتا ہے۔ تجھے دعا دوں تو بھی الگ رہ کر تڑپوں، بددعا دے کر دور کروں تو بھی سکوں۔۔۔ یہ کس عذاب میں جان ہے۔ خلق والے کہتے ہیں تو میرا نہیں ہے۔ لیکن اس دل کا کیا کروں جس میں تیرے علاوہ اور کوئی نہیں۔ نا تجھے سرعام اپنا کہہ سکتی ہوں نا تیرا نام لے کر سرعام رو سکتی ہوں میں کیا کروں۔ میں کہاں جاؤں۔

آنسو قطار در قطار آنکھوں سے بہ رہے تھے۔ کبھی کبھی دنیا کے سامنے، حتیٰ کہ خود کے سامنے بھی ہم مسلسل جھوٹ بولتے رہتے ہیں۔ اپنے احساسات و جذبات کو سات پردوں میں چھپا کر رکھتے ہیں، مگر کوئی اک لمحہ ہمارے اوپر سے سارے پردوں کو سرکا کر ہمیں آشکار کر جاتا ہے۔ جب سب نے ناامیدی ظاہر کر دی تو اس کے لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر لبوں سے نکلنے لگے اور یہی لمحہ اسے باور کر گیا کہ اس کا پردہ سرک گیا ہے۔ اویز یوسف کی دیوانگی نے کب اسے اپنی گرفت میں لیا تھا، اسے خبر نہ ہوئی۔ وہ روز ہی اس کا دامن پکڑ کر عشق و جنون کی داستان سنانے لگتا تھا۔ اس کے لفظوں کی آئینے نے کیسے اس کے دل کو پلیٹ میں لیا وہ نہیں جانتی تھی۔

وہ اس حقیقت کو کبھی کسی لمحے قبول کرنا نہیں چاہتی تھی، وہ جانتی تھی یہ آسان نہیں ہے۔ جو کچھ رونما ہوا۔ وہ بہت پہلے ہی اپنی بصیرت کے بنا پر سب دیکھ

وہ جس کی محبت کو سالوں سے جھٹلاتی آ رہی تھی، اس نے اک ہی جھٹکے میں اسے خود پہ آشکار کر کے جنادیا تھا کہ کسی قدر دیوانگی دکھا سکتا تھا۔ وہ خاموشی سے لینا چھت کو کھورے جارہا تھا۔ ساویہ کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ وہ خود میں اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں کر پاری تھی۔ قدموں کی آہٹ پہ اس کی نظروں کا ارکناز ٹوٹا تھا۔ وہ اس کے بیڈ کے پاس چپ چاپ کھڑی تھی۔ اویز یوسف کے چہرے پہ اسے دیکھ کے جو رنگ آئے تھے وہ اسے مزید شرمندہ کر گئے۔ بیڈ پہ ہاتھ رکھ کر اس نے جیسے بمشکل خود کو کھڑا رکھا ہوا تھا۔ اویز یوسف نے اس کا دایاں ہاتھ اٹھا کر اپنے ہاتھ میں تھام کر خاموشی سے اپنے سینے پہ اس کا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن ساویہ کے ہاتھ سے دل تک پہنچ رہی تھی۔

”اویز یوسف تم سے بہت محبت کرتا ہے۔“ اس نے بہت دھیمے سروں میں کہا تھا۔ ساویہ نے اک نظر اس کے زرد چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ اٹھارہ گھنٹوں نے اس کے صحت مند چہرے کو زردی میں بدل دیا تھا۔ کب کی رکی سسکی ساویہ کے ہونٹ سے پھڑ پھڑا کے آزاد ہوئی۔ وہ پھپک کے رو پڑی۔ روتے روتے اس کی پیشانی بے ساختہ اویز یوسف کے ہاتھ پہ آ پڑی تھی۔ جس کے نیچے ساویہ کا ہاتھ دبا تھا۔ وہ کئی ٹائپے ہچکیوں سے روتی رہی۔ ”میری زلیخا ہوگی؟“ وہ اس کی ہچکیوں پہ بند باندھنا چاہ رہا تھا کہ وہ پھر ترخ کر اسے باتیں سنائے گی، مگر اس کے آنسوؤں میں جب مزید روائی آ گئی تو اویز یوسف کو تشویش ہونے لگی۔

”سماویہ اتنا مت رو۔ میں ٹھیک ہوں یا رہاں
 پتا چلا ہے نرس نے بتایا ہے اک وقت میں مجھے ڈیڈ
 ڈیکٹر کر دیا تھا، ڈاکٹر ز نے۔ لیکن اب میں ٹھیک
 ہوں، تمہارے پاس رہوں گا۔ روز تمہارے گھر آ کر
 تم سے محبت کی بھیک مانگوں گا اور تم ہر بار کی طرح
 دھڑکلا کر رہنا۔ یوں ہی عمر گزر جائے گی۔“ وہ اسے
 چپ کرانے کے لیے جودل میں آ رہا تھا بول رہا تھا۔

کے وجود کو لبو لہان کر گیا تھا۔ وہ جس نے کبھی محبت کی گلاب وادی کی خوب صورتی نہیں دیکھی تھی، وہ اس کے کانٹوں سے لبو لہان ہونے لگی تھی۔ ایسے میں جب اسے دنیا کے سامنے مجرم بنانے والا نظر آیا تو دیکھ دل سے بے ساختہ وہ جملے ادا ہو گئے جو وہ کبھی ادا نہیں کرنا چاہتی تھی اور اب وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبینوں میں جکڑا پڑا تھا۔ اس نے دیکھتے ہی منہ پھاتھر کرکھ کر اپنی چیخوں پہ قابو پایا تھا۔

”تمہاری وجہ سے وہ اس حال کو پہنچا ہے۔ میں نے کہہ دیا تھا کہ تمہیں کبھی بہنوئی بناؤں گی اور اس نے کہا تھا وہ تمہارے بنا مر کے دکھائے گا۔“ زنگس نے اسے دیکھتے ہی جیسے گلے کیا تھا۔ نظریں چرا کر وہ خاموش سے آنسو بہانے لگی تھی۔ جانے زنگس اسے مورد الزام ٹھہرا رہی تھیں یا انہیں کچھ تاؤ استا رہا تھا۔ وہ سمجھ نہ سکی۔

”اللہ پلیز نا!“ آسمان کی طرف سر اٹھا کر اس نے کپکپاتے لبوں سے گڑ گڑا کے کہا تھا۔ آنسو تیزی سے رخساروں پر نہ نکلے تھے۔

”انہیں ہوش آ گیا ہے۔ کانگریس۔ ڈاکٹر چیک کر رہے ہیں انہیں۔“ نرس تمنا تے چہرے کے ساتھ خوش خبری دے کر دواؤں کا پرچا تھانہ لٹی تھی۔ وہ بے ساختہ کھنٹوں کے بل ماربل پتھر گئی تھی۔ بے شک وہ رب ہی ہے جو دلوں کی آہ کو سنتا ہے۔ پھر اک افراتفری لگ گئی اور کئی کھنٹوں کے صبر آزما انتظار کے بعد ڈاکٹر نے اس سے ملنے کی اجازت دی۔

”تم جاؤ..... سب سے پہلے تم ملو اس سے۔ وہ خوش ہو جائے گا۔ جاؤ۔“ نرگس نے سب کے ساتھ کھڑی سماویہ کو تھام کر بے ساختہ دروازے کی طرف چلنے لگا۔ وہ خوف زدہ نظروں سے صدف کو دیکھنے لگی تھی۔ صدف نے نظریں چروالی تھیں۔ نرگس نے اسے دروازے سے اندر دھکیل دیا تھا۔

میرے دل کے ہر صفحے پر
حریر ہو تفصیل سے تم

”میں نے غصے میں کہا تھا۔“ سداویہ کے کپکپاتے لبوں سے بمشکل نکلا۔ اویز یوسف جیسے نثار ہو گیا۔

”ہاں پتا ہے میری کواشار جو ہو۔ مجھ جیسی ہی ہو، جتنا مجھے غصہ آتا ہے، اتنا تمہیں بھی..... لیکن اس حادثے سے اک چہرہ تو اچھی ہو گئی۔“ وہ یوں اس کے دنوں ہاتھ تھامے گفتگو کر رہا تھا۔ جیسے بہت خوب صورت وادی میں ہو، اس وقت اسے کسی درد تکلیف کا نہ احساس تھا، نہ مشینوں میں جکڑے وجود کا۔

”کیا؟“ پانی پلوں پہ اٹکنے لگا تھا۔ اب بوند ٹھنک کر پلوں کی پہرے دار بن گئی تھی۔ جیسے کہ سداویہ کب تیر سے نکل کر پلک جھپکے اور وہ کب رخسار پہ لکیر بنائی اپنا سفر مکمل کرے۔

”مجھے یہ آگاہی ہو گئی کہ میری زلیخا کو بھی مجھ سے بہت محبت ہے، جو میرے بنا اک بل نہیں رہ سکتی۔ بھلے معاشرتی ڈاروؤں نے اسے اپنے جذبات و احساسات چھپا لینے پہ مجبور کیا تھا، مگر مجھے کھونے کے ڈرنے اس آہنی لڑکی کو کالج میں تبدیل کر دیا۔“ اس کے درست قیاس پہ وہ ایک دم سے نظریں چرانے لگی۔ اویز یوسف کے لیے اس کا شرمایا، کھرایا سراپا بن گیا تھا۔ دل کو ایسا سکون ملا جو بھی نہیں ملا تھا۔

”شکر یہ، یہ اعزاز بخشے گا۔ بول نہیں سکتی تھیں، پہلے کہ تمہیں بھی محبت ہے۔“ اس نے دونوں ہاتھوں میں موجود اس کے ہاتھوں پہ دباؤ بڑھایا۔ نیچے میں ڈرپ لگے ہاتھ پہ دباؤ بڑھا تو نینڈل پہ خون کا دھبا نمودار ہونے لگا۔

”اویز!“ اس نے بے ساختہ اپنے ہاتھ چھڑا کر ڈرپ لگے ہاتھ کو تھام کر بغور معائنہ کیا کہ کہیں خون زیادہ تو نہیں نکل گیا، لیکن شکر تھا بچت ہو گئی تھی۔ ”اتنی بے وقوف!“ وہ اس کے چہرے پہ نظر ڈال کر گھر کنے سے خود کو نہ روک پائی۔ جبکہ وہ مسرور رہا تھا۔ اس کی ڈھنساں پہ وہ پھر سے اس کے ہاتھ کا جائزہ لینے لگی۔ ”باہر سب ملنے کو منتظر کھڑے ہیں، جا کر جیتنی

”چپ بالکل!“ سداویہ نے جھٹکے سے سر اٹھا کر نہایت طیش کے عالم میں اپنا ہاتھ اس کے منہ پہ رکھ دیا۔ بایاں ہاتھ پہلے ہی اویز یوسف کے سینے سے لگا ہوا تھا۔ اور دایاں ہاتھ اس کے منہ پہ رکھا تو ماحول میں اک دم سے خاموشی طاری ہو گئی۔ اویز یوسف نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی۔ وہ خاموشی سے اس کے بھیکے رخساروں سرخ ہوتی ناک اور سوچی آنکھوں کے گلابی ڈورے دیکھ رہا تھا۔ جو سارے راز افشا کر گئے تھے کہ وہ پچھلے اٹھارہ، انیس گھنٹوں سے روتی رہی تھی۔ ”کیوں کیا جان بوجھ کے ایکسیڈنٹ تم نے؟“ وہ چہرے پہ نہایت برہمی لیے اسے گھور رہی تھی۔ اک بل کو اویز یوسف کے چہرے پہ حیرت کا رنگ چھایا، پھر اس کے چہرے پہ مسکراہٹ پھیلنے لگی جو یوں پہ ہاتھ رکھنے کی وجہ سے بظاہر نمایاں نہ ہو سکی، مگر مسکرائی آنکھیں سداویہ کو مزید غصہ دلا گئیں۔

”بولو، کیوں کیا تم نے ایسا؟ کیوں ڈالی جان مشکل میں اپنی، اگر جو کچھ ہو جاتا، جواب دو۔“

”او!“ وہ آنکھوں سے اپنے لبوں پہ پڑے اس کے ہاتھ کی طرف اشارہ کرتے منہ سے آواز نکالنے لگا، اس کا اشارہ سمجھ کر سداویہ نے ہاتھ اس کے لب پر سے ہٹا کر پہلو سے لگانا چاہا، مگر اس کا دوسرا ہاتھ بھی اویز یوسف کے قابو میں آ چکا تھا۔

”عجیب دادا گیری ہے، خود منہ بند کر کے کھڑی ہو اور حکم دے رہی ہو، بولو۔“ اس نے شوخی سے اسے دیکھتے مسکراتے ہوئے کہا۔ سداویہ کے تیز انداز، اس کا لٹس اویز یوسف کے عرصہ سے بے قرار دل کو جیسے قرار دیے رہا تھا۔ سداویہ اب بھی سوالیہ نظریں لیے کھڑی تھی۔ وہ اس کی نظروں کا مفہوم جان گیا تھا۔ ”تم نے ہی تو کہا تھا۔ اویز یوسف تم مر جاؤ! پھر کیسے تمہاری بات ٹالتا۔ تم نے پہلی بار تو مجھ سے کوئی فرمائش کی تھی، کیسے نظر انداز کرتا۔“ وہ اتنی محنت اور اتنے پرتیش لہجے سے گویا تھا کہ سداویہ سحر کی آنکھیں پھر پانی سے بھر نہ لگیں۔ اویز یوسف کا چہرہ پانی پہ رقص کرنے لگا۔

خود کو مشق ستم بنایا تھا۔ خود اپنی قسمت کا فیصلہ کیا تھا۔ پھر یہ آنسو کیوں تھے؟ یہ واویلا کیوں تھا؟ اس کے جنوں کو موت کیوں نہیں آ رہی تھی؟ ان سوالوں کے جوابات تو خود اس کے پاس بھی نہیں تھے۔ بس اک آنسوؤں پہ اختیار تھا جو وہ بے دریغ لٹاتی تھی۔ اپنی حماقت پہ..... اپنی کم عقلی پہ.....

☆☆☆

اوز یوسف ڈسجارج ہو کر گھر لوٹ آیا تھا۔ گو کہ ڈاکٹر نے ابھی مکمل ریڈرٹ کا کہا تھا۔ شوذر کی ہڈی کے باعث اسے ڈرائیونگ وغیرہ سے سختی سے منع کیا گیا تھا، لیکن وہ کب تک کر بیٹھنے والا تھا۔ روز ہی صدف کے پہلو سے لگا رہتا۔ ساویہ کی احتیاطی تدابیر پہ ہنستا رہتا۔

”مائی جان اسے یہ پھر ار کے بجائے ڈاکٹر ہونا چاہیے تھا۔ ہر وقت ڈاکٹر ساویہ سحر کے طبی مشورے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ نہ کرنا وہ نہ کرنا۔ دوائی کم پہ لو۔ سچ میں کیا کھایا تھا۔ جنک فوڈ اس وقت اس حالت میں مت کھاؤ۔ لففف..... کیا بیٹی ہے آپ کی۔“ وہ صدف سے جڑا سبزی بناتی ساویہ پہ نظریں جمائے اس کی شکایت کر رہا تھا۔ صدف مسکرا دیں۔

”تمہارے بھلے کے لیے ہی تو کہہ رہی ہے بیٹا۔“ اس واقعے کے بعد سے صدف نے بھی دل صاف کر لیا تھا۔ نرسنگ کا انداز بدلاتا تو انہوں نے بھی سابقہ لب ولہجہ اپنایا کہ ان کے دل میں تو پہلے بھی کوئی کدورت نہیں تھی۔

”ہاں آپ نے بھی بیٹی کا ساتھ دینا ہے۔“ اس نے منہ بھلا لیا۔

”تو یہ ہے مجھے معاف رکھو۔ میں جاری ہوں وضو کرنے۔ تم دونوں خود ہی لڑتے رہو۔“ صدف خود کو صاف بچا کر وضو کرنے چل دیں۔ سبزی بن گئی تھی، وہ ٹوکری اٹھا کر کچن میں چلی گئی۔

”خالہ! چائے ہی پلا دو۔“ وہ بھی کچن میں آ دھکا۔ ساویہ نے کچن کے فرنیچر کے اندر جھانکا۔ تھوڑی دیر پہلے ہی اس نے بنانا شیک بنایا تھا۔ گلاس

ہوں سب کو۔ اب سکون ہے انسانوں کی طرح لیٹے رہو۔“ اس کے ہاتھ کو آٹنگلی سے بیڈ پہ رکھ کر اس نے پروگرام بتایا۔

”اودہ نو یار..... میں کسی سے ملنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ تم بس میرے پاس بیٹھی رہو۔ میرا ہاتھ تھام کر۔“ قسم سے مجھے کسی درد کا احساس نہیں ہوگا پھر۔“ ساویہ کے گھورنے پہ وہ معصومیت سے قسمیں کھانے لگا تھا۔ ”پلیز نہ۔“ اس کے اصرار پہ ساویہ کے لبوں پہ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

☆☆☆

”تعلق سات سال کا ہو یا سات ماہ کا۔ خسارہ نادان عورت کے حصے میں ہی آتا ہے۔ مرد کعبہ میں جا کے مانگتا ہے اور پھر اسی عورت کو بازاری رقیق بنا دیتا ہے۔ لیکن اب دل کی دہلیز سے محبت کو رخصت کر دیا میں نے کہ جب تم اصلی مرد ثابت نہ کر سکے خود کو تو تمہاری رنگ بدلتی محبت کا اعتبار کیا۔ خاص مرد کے لیے کردار کو داغ دار کیا، وہی عام نکلا اور عام مرد کی میری زندگی میں کوئی جگہ نہیں۔“ وہ آج بھی ان لفظوں کو یاد کر کے یوں بلک بلک کے رو رہی تھی، جیسے یہ کل کی بات ہو۔ شدید محبت ہو یا شدید نفرت، دونوں ہی غلط ہیں۔ جنون کبھی سکھ نہیں دیتا اور محبت کا جنوں جب سر چڑھ کے بولتا ہے تو انسان بدحواس ہو کر وہ کچھ کر جاتا ہے جو شاید وہ کبھی حواس میں رہ کر نہیں کر پائے۔ کبھی وہ الفاظ زبان سے محبت کے مارے کے منہ سے نہ نکلیں جو غصے کی حالت میں نکل جائیں۔ ہاں وہ دیوانی ہی تو تھی۔ باگل تھی جو غصے کے پیچھے چھپے جذبات کو نہ دیکھ سکی۔ بس غصیلے لفظوں کی آگ کے شعلوں میں دھڑا دھڑ جل کر سب فراموش کر گئی اور اپنا نقصان کر گئی اور اب اس نقصان میں اسے ساری عمر گزارنا تھا۔ اس خسارے کا اک اک پل اس نے خود خرید لیا تھا اور اب وہ ساری عمر روتی بھی رہتی تو بھی اس کا خسارہ گھٹتا نہیں، بڑھتا ہی جاتا۔ اس نے ایسی سلاخوں میں خود کو جکڑ رکھا تھا جہاں سے رہائی ممکن نہیں تھی۔ اس نے جان بوجھ کر

میں انڈیل کر اس نے ٹیک کا گلاس اس کے قریب
 ٹیلف پہ رکھ دیا۔ وہ ٹیک کا گلاس دیکھ کر بے ساختہ
 ہنس پڑا۔ ”اب چائے کے نقصانات اور ٹیک کے
 فوائد ہی بتا دو۔“ اس نے جیسے اس کی خاموشی پہ
 چوٹ کی۔ اسے بولنے پہ اکسایا۔
 ”نہیں بولتی۔“ اس نے زروٹھے پن سے
 جواب دیا۔

”کیوں؟“ جرح ہوئی۔
 ”میری باتیں پھر تمہیں طبی مشورہ ہی لگیں
 گی۔“
 ”ضروری ہے کہ مریضانہ باتیں ہی ہوں کچھ
 اور باتیں بھی ہو سکتی ہیں۔“ اس نے جیسے دھیان
 دلایا۔
 وہ جتانے لگی، وہ بھرپور انداز میں مسکرایا۔

”مثلاً کیسی باتیں؟“ وہ مطلوب مسالے کا جار
 ڈھونڈ رہی تھی مصروف انداز میں پوچھ بیٹھی۔ اس کے
 انداز کو دیکھتے ہوئے وہ مسکرایا۔
 ”جاری مل گئی تھی جو ہاتھ سے
 چھوٹے چھوٹے جینی۔ وہ ایک دم سے بلش کر کے
 لب دانتوں تلے دبائی۔

”شکل دیکھی ہے اپنی۔“ مسکراہٹ چھپانے کو
 وہ اک دم سے رخ پھیر گئی تھی۔

”تمہاری آنکھوں میں اکثر دیکھی ہے اور
 ساری زندگی دیکھنے کی خواہش ہے۔“ ذرا جھک کر
 اس کے دائیں کان کے قریب اس نے جیسے سرگوشی کی
 تھی۔ وہ اس صورت حال سے بری طرح شیشا گئی۔
 ”ہٹو پرے بہت بد کنیز ہو تم۔“ وہ دو قدم آگے
 بڑھی تھی۔

”ویسے میں نے اک تجزیہ کیا ہے۔“ ٹیک کے
 گلاس اٹھا کر لبوں سے لگاتے اس نے جیسے بات
 شروع کی۔ ”کیسا تجزیہ۔“ وہ اٹھے ہاتھ سے ٹیک کا
 گلاس اٹھائے گھونٹ بھر رہا تھا۔ لٹی میں سر ہلاتے
 ساویہ نے بے ساختہ کہا۔

”سیدھے ہاتھ سے پیو۔ سب شیطان کے

پیٹ میں جا رہا ہے۔“ وہ دائیں شولڈر کی طرف
 اشارہ کر کے بے جا رگی سے کندھے اچکا کر مجبوری
 ظاہر کر گیا۔ ساویہ کو بھی اس کے بینڈیج کا دھیان آیا
 تو اس نے آگے بڑھ کر گلاس اس کے ہاتھ سے لے
 کر اس کے لبوں سے لگا دیا۔ اوپز یوسف کی آنکھوں
 کی روشنی مزید بڑھ گئی، اتنی محبت پہ۔ اس نے ٹیک کا
 خالی گلاس ٹیلف پہ رکھ دیا۔

”بولو نا کیسا تجزیہ۔“ اس کی سوئی وہیں انکی
 ہوئی تھی۔

”مجھے لگتا تھا، میں تم سے بہت شدید محبت کرتا
 ہوں، لیکن ایسا ہے نہیں۔“ وہ اپنی بات کہہ کر اک
 ٹائپے کو رکھا تھا۔ وہ استغنامیہ بھری نظروں سے اسے
 دیکھ رہی تھی۔

”تم مجھ سے کہیں زیادہ شدید محبت کرتی ہو مجھ
 سے۔ بے حد جنونی۔“ اس نے مزید کہا۔ ساویہ کو
 اختلاف کا کوئی پہلو نظر نہیں آیا تھا تو اقرار کا بھی۔

”یہ الہام کب ہوا تمہیں۔“ فروٹ باسکٹ
 سے سیب اٹھا کر اسے دھو کر اب وہ قاشیں کاٹنے لگی
 تھی۔

”بس ہو گیا۔“

”میں اتفاق نہیں کرتی۔“ اوپز اپنے بچتے
 ہوئے سیل فون کی طرف متوجہ ہوا، جس نے ماحول
 میں ارتعاش سربرا کر دیا تھا۔

”کس نے یاد کر لیا۔ اس وقت۔“ وہ سیل فون
 جیب سے نکالتا بڑبڑانے لگا۔

”کون ہے؟“ سب کی قاش اس کے منہ میں
 ڈالتی وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھی اور اسے پوچھتے احساس
 نہ ہوا کہ اس کا لہجہ کتنا شکی ہو گیا۔

”کوئی نامعلوم نمبر ہے۔“ اسکرین پہ نظر
 ڈالتے اس نے سچ گوش گزار کیا، اس وقت تک کال
 کٹ گئی۔

”چلو جی چھٹی۔ تمہاری اسکول والی حرکتیں
 گنیں نہیں نہ ابھی تک۔“ وہ ٹیکھی چتونوں سے گھور
 رہی تھی۔

”نہیں یار..... اتنی بے اعتباری؟“

”تم نئی سم لو، جس کا نمبر صرف میرے پاس ہو۔“ اس نے دھولس سے کہا۔

”او کے اور کوئی حکم۔“ وہ شوخی سے شرارتی مسکراہٹ لیوں پہ سجانے پوچھ رہا تھا۔
”نہیں۔“ وہ منہ بنا کر رہ گئی۔

”میری زلیخا! یہ تیری شدت محبت مجھے مزید پاگل کر دے گی۔“ وہ بے ساختہ کہہ کر اس کی شدت کا اسے احساس دلایا تھا۔ سادہ کے لیے بھی یہ احساس نیا تھا کہ وہ اس کے لیے جنونی ہو رہی تھی۔ حالانکہ جنونی تو اس کی نظر میں وہ تھا۔

☆☆☆

”اب میں تجھ سے تیری محبت نہیں مانگوں گی۔ تو انسان ہے۔ خودی کے نشے میں دھت ہے۔ تکبر کے لبادے میں گم ہے۔ اب میں اس بارگاہ میں اپیل کروں گی، جہاں تیری نہیں چلتی۔ جہاں سے تو مجھے دھتکار نہیں سکتا۔ تیرا مغرور گھر ونداوی اٹھیرے گا۔ محبت کا فیصلہ کرنے والے اگر تو میرا نصیب ہے تو، کتنا ہی بھاگ لے تھک ہار کے تو نے یہیں آنا ہے۔ تیری بڑی بڑی باتیں۔ اک دن تجھے خود جکڑ کر بے بس کر دیں گی۔ تب تیرے پاس کوئی راہ فرار نہیں ہوگی۔ تجھے ندامت ہوگی۔“

لفظ ہمارے قیدی ہوتے ہیں، لیکن جب لیوں سے نکل جائیں تو ہم اس کے قیدی ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی اک عرصہ سے لفظوں کی قید میں سانس لے رہی تھی۔ لفظوں کی دو دھاری تلوار جکڑ کو کاٹ رہی تھی۔ دوسرے پہ کیا وار خالی جائے تو انسان یوں ہی تلملانا رہ جاتا ہے اور جب خود کو مفتوح پاتا ہے تو خود ہی بلبلاتا جاتا ہے۔ وہ بھی اک عرصہ سے بلبلارہی تھی۔ تڑپ رہی تھی، سسک رہی تھی، اپنی ہی عدالت میں خود کو مجرم ٹھہرا کر سزا بھی خود ہی مجتہد رہی تھی۔ یہ سزا کب تک تھی، وہ لاعلم تھی۔ سزا ختم بھی ہوئی تھی یا نہیں، وہ اس سے بھی لاعلم تھی۔

☆☆☆

خاندان بھر میں سادہ اور اویز کے متعلق چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں۔ نیچی تک بھی یہ بات پہنچی تو وہ اک پل کو خاموش ہو گئے۔ اگلے پل انہوں نے اویز کو یقین دلایا تھا کہ وہ اس کی رضا میں راضی ہیں۔ نرس بھی خاموش تھیں۔ یا شاید وہ اویز کی ایکٹیوٹ کے بعد سے چپ سی ہو گئی تھیں۔ شاید وہ اس کی دیوانگی کو بھانپ گئی تھیں کہ وہ خود کو بھی نقصان پہنچانے سے دریغ نہیں کرے گا۔

وہ سادہ کے لیے کتلتان جنونی تھا، یہ ان پہ کھل گیا تھا۔ وہ سادہ کے پاس ہی تھا، جب اس کے نمبر پر مامی کی کال آنے لگی۔ اس نے پک کر لی کہ شاید کوئی کام ہو، لیکن جب دوسری طرف سے مامی کی بیٹی رشا کی آواز آئی تو اسے کچھ حیرانی ہوئی۔
”کیسے ہو اویز۔“ وہ بہت لگاؤ سے پوچھ رہی تھی۔

”ہاں ٹھیک ہوں۔ یہ مامی کا نمبر ہے نا۔“ وہ کنفرم کرنا چاہ رہا تھا۔ سادہ کل کے لیکچر کے لیے پوائنٹس لکھ رہی تھی، لیکن اس کا سارا دھیان اس کی گفتگو کی طرف تھا۔

”ہاں ماما کا ہی ہے۔ اپنے نمبر سے کئی بار کال کی، لیکن تم اٹھاتے ہی نہیں، تو آج ماما کے نمبر سے ٹرائی کیا اور تم سے بات ہو رہی ہے۔“ وہ بہت لگاؤ سے کہہ رہی تھی۔ اس کی بہتی آواز قریب بیٹھی سادہ کی سماعت بھی سن رہی تھی۔
کوئی خاص بات کرنی تھی۔“ اویز جلدی سے جان چھڑانا چاہ رہا تھا۔

”ہاں..... اگر تم بڑی ہو تو میں بعد میں کال کر لیتی ہوں۔“ دوسری طرف سے خیال کر کے آپشن دیا گیا۔

نہیں، تم کرو۔“ اویز نے اک نظر سادہ کے چہرے پہ ڈالی جو خود کو لاپرواہا ظاہر کر رہی تھی۔
”سنا ہے تم سادہ سے شادی کر رہے ہو اور اس

کردگی۔“ وہ تاریکی دوسری طرف سے کپڑے سر کا کر اس کے سامنے آ گیا۔

”میں اپنی قسمت پہ آنسو بہا رہی ہوں۔ کیا ضرورت تھی کہ ہمیں خود سے چار سالہ بڑی کزن سے محبت ہوتی اور تمہاری محبت مجھے بھی محبت کرنے پہ مجبور کر دیتی اور اگر ہونی ہی تھی ہمیں محبت تو کیا یہ ضروری تھا کہ میں تم سے پہلے دنیا میں آ کر لوگوں کے طعنے سنتی۔“ اس کے آنسو بہ رہے تھے۔ وہ یقیناً ہر طرف سے یہ جملہ سن سن کر دل برداشتہ ہو گئی تھی۔

ہم بہت پڑھ لکھ کر بھی کچھ معاملوں میں شاید کبھی باشعور نہیں ہو سکتے تھے۔ جیسے ہمارے معاشرے میں مرد سے بڑی عمر کی لڑکی سے شادی کو یوں معیوب سمجھا جاتا تھا، جیسے خدا نا خواستہ کوئی بیچ فعل ہو۔ حالانکہ اسلام کی واضح مثال حضرت خدیجہ اور پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، مگر ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم اسلام اور اس کی مثالوں کو اپنے مفاد کے لیے بطور ڈھال استعمال کرنے والے لوگوں میں سے ہیں۔

سماویہ نے اک عرصہ تک اپنے جذبوں کی نفی صرف اک اسی فرق کی وجہ سے کی تھی اور شاید تا عمر کی کو اس کے جذبوں کی خبر نہ ہوئی، اگر جو اویز یوسف نے اپنی زندگی کو داؤ پہ نہ لگا دیا ہوتا۔ چار سال عمر کا فرق اس کے حلق کا وہ کائنات بن گیا تھا جو کسی طور نگلا نہیں جا رہا تھا۔ بھلا جذبات عمروں کا فرق دیکھتے ہیں۔ ”کوئی کچھ بھی کہے، جب مجھے فرق نہیں پڑتا تو تم کیوں اپ سیٹ ہو رہی ہو۔“ اویز یوسف اسے تادیر سمجھا تا رہا تھا۔ اس کا موڈ ٹھیک کرتا رہا تھا۔ بظاہر اس کے اصرار پہ اس نے موڈ ٹھیک کر لیا تھا، مگر اندر جو آگ لگ گئی تھی، وہ بجھ نہیں رہی تھی۔

☆☆☆

”اویز! تم سے کچھ بات کرنی تھی۔“ وہ گھر میں داخل ہوا تو زگرس نے اسے دیکھتے ہی آواز دی۔

”آپ نے ممائی جان سے کب اور کیوں رشنا کے لیے بات کی تھی۔“ وہ بھی ان سے بات کرنا ہی

سے محبت کرتے ہو۔“ اویز یوسف جو بے توجہی سے اس کی گفتگو سن رہا تھا۔ سماویہ کے ذکر پہ الرٹ ہو گیا۔ وہ بھی اپنا نام سن کر مزید کانٹشس ہو گئی۔

”ٹھیک سنا ہے۔“ اویز یوسف نے پلک جھپکتے اقرار کر لیا۔

”بہت محبت کرتے ہو اس سے؟“ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

”ہاں.....“

”اور جو میں بچپن سے تم سے محبت کرتی چلی آ رہی ہوں، اس کا کیا؟“ وہاں سے جیسے کوئی بم پھوڑا گیا۔ اویز چونکا ضرور، مگر اس پہ کوئی اثر نہ ہوا۔

ہاں مگر سماویہ کا دل جل کے خاکستر ہو گیا۔ ”پھپھو (زگرس) نے ہمیشہ سے مجھے کہا کہ یہ میرے اویز کی دلہن بنے گی اور میں نے ہمیشہ سے تمہارے سینے دیکھے اور اب تم خود سے بڑی عورت کے لیے مجھے ٹھکرار ہے ہو۔“ چار سالہ بڑائی کا طعنہ جیسے سماویہ کے لیے گالی بن گیا تھا۔ اس کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ اویز یوسف کے چہرے کا رنگ بھی متغیر ہو گیا۔

”شٹ اپ رشنا! نہ مجھے تم سے محبت ہے، نہ میں ماما کی کسی بات کا جواب دینے کا پابند ہوں۔ تمہیں جو گلے شکوے کرنے ہیں ماما سے کرو۔ نہ مجھے تم سے محبت ہے نہ ہی یہ جاننے میں کوئی دلچسپی کہ تم کب سے اور کیوں مجھ سے محبت کر رہی ہو۔“ اپنی بات سختی سے کہہ کر اس نے کال کاٹ دی تھی۔ چند سیکنڈز کے بعد کال دوبارہ آنے لگی تو سماویہ دھواں دھواں چہرے کے ساتھ چھت کو جاتی بیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ جلتی اسکرین کو اس نے طیش سے دیکھا تھا، اس کا حساب بعد میں بے باق کرنے کے ارادے سے اس نے سیل فون سوچ آف کر دیا۔ اور بے ساختہ بیڑھیوں کی طرف قدم بڑھا دیے۔ تار سے کپڑے اتار دی خود کو مصروف ظاہر کرنی وہ لائے ہاتھ کی پشت سے اپنے آنسو صاف کر رہی تھی۔ یقیناً رشنا کے لفظوں نے اس کے دل کو بھیس پہنچائی تھی۔

”اک اسٹوڈ کی بات پہ تم رو کر خود پہ ظلم

کالج آف ہوتے ہی لڑکے لڑکیاں نکل رہے تھے۔
آہستہ آہستہ رش کم ہونے لگا تھا۔ وہ خاموشی سے کھڑا
ہو کر اس کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

”بارنی نیچر کیا مست آئی ہے۔“ لڑکوں کا ٹولہ
آپس میں گفتگو کرتے گزر رہا تھا۔ جب اک لڑکے
نے قدرے اونچی آواز میں کہا۔

”نہیں یار، بھلے مست ہے، مگر جو بات مس
ساویہ کی ہے وہ کسی میں نہیں۔“ پریوں جیسی حسین ہیں،
جب چلتی ہیں تو قیامت ڈھادیتی ہیں۔“ اویز یوسف
بے دھیانی میں ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ساویہ کے نام
پہ اس کی ہر حس متوجہ ہو گئی۔ وہ یقیناً سینکڑا ایر کے
لڑکے تھے۔ جو تھے تو اسٹوڈنٹ، مگر جنہیں فی میل
نیچر کی عزت کرنی نہیں آتی تھی۔ وہ یوں نیچر کے
حسن کی تعریف سر راہ کر رہے تھے، جیسے کوئی اٹھانی
میر کرتا ہے۔ سچ ہی ہے کہ اب اساتذہ کی عزت
خواب بن کے رہ گئی تھی۔

”ہاں یہ تو ہے۔“ پہلے والے نے بھی حامی
بھری۔ اویز کی منتہاں پہنچ گئی تھیں۔ شدید پیش میں وہ
ان کی طرف بڑھا تھا۔

”تم یہاں۔“ اس کے بے حد قریب ساویہ کی
آواز آئی تو اس نے گرون گھا کر اسے دیکھا۔ مسکراتی
ہوئی وہ استغنامیہ بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی
تھی۔ اویز نے دوبارہ گردن گھا کر ان لڑکوں کو دیکھنا
چاہا، مگر وہ ذرا سی دیر میں نظروں سے اوجھل ہو چکے
تھے۔ اس نے پورا گھوم کر دیکھا، مگر اتنے لڑکوں کی
پشت میں انہیں پہچانا مشکل تھا۔

”کسی کو ڈھونڈ رہے ہو۔“ ساویہ نے اس کے
انداز پر پوچھا۔

”آؤ گھر ڈراپ کر دوں۔“ اس نے فرنٹ
ڈور کھول کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کے بیٹھنے کے
بعد ڈور بند کر کے ڈرائیونگ سیٹ پہ آ گیا۔

”لچ ٹائم میں آوارہ گردی ہو رہی ہے۔“

”ہاں، لچ تمہارے ساتھ کرنے کا موڈ تھا۔
اس لیے چلا آیا۔“ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

چاہتا تھا، ایسے میں جب انہوں نے صدا لگائی تو وہ بتا
کسی تامل کے سوال کر گیا۔ نرگس اک لمحے کے لیے
اسے دیکھتی رہیں۔ وہ برہم نظر آ رہا تھا۔

”ہاں بیٹا! مجھے اتنا کبھی حق کہاں ہے کہ میں
کوئی فیصلہ کر سکوں۔“ نرگس کا چہرہ پل بھر میں ملول
ہو گیا۔ اویز یوسف کو اپنے کڑے لہجے پہ اک پل کے
لیے ندامت ہوئی تو وہ صوفے پر ان کے ساتھ بیٹھ
گیا۔

”میرا یہ مطلب نہیں تھا مام، لیکن آپ کو ممانی
اور رشنا سے کوئی بھی بات کرنے سے پہلے مجھ سے تو
پوچھ لینا چاہیے تھا۔“ اس نے نرم لہجہ کر کے شکایت
کی۔

”کب پوچھتی تم سے، جب رشنا میری گود میں
آئی تو تم اس وقت دو سال کے تھے۔ مجھے اتنی بھائی
کہ میں نے پل بھر میں سب کو کھد دیا کہ رشنا میری
اویز کی دہن بنے کی اور پھر بڑے ہونے کے بعد بھی
میں بھابھی اور رشنا کے سامنے یہ ہی مالا چلتی رہی، اگر
جو خبر ہو جانی پہلے کہ تم ساویہ سے.....“ نرگس بولتے
بولتے اک دم دکھی ہو گئیں۔ وہ چپ چاپ انہیں سن
رہا تھا۔

”کھد دیا ہے میں نے بھابھی اور رشنا سے، مار
لیں مجھے جوتے اور معاف کرویں۔ بھابھی کا دل بڑا
ہے، وہ تو چپ کر گئی، مگر رشنا نے رو، رو کر اپنا حشر کر لیا
ہے۔ اس کی اک ہی ضد ہے کہ وہ تم سے ہی شادی
کرے گی۔“

”فارگاڈ سیک مام! آپ جانتی ہیں میں ساویہ
کے علاوہ کسی سے شادی نہیں کر سکتا۔ ختم کریں آپ
اس بکھیرے کو۔ ممانی کو کہیں، کہیں اور شادی کر دیں
رشنا کی، میرا انتظار نہ کریں۔“ اس نے دو ٹوک لہجے
میں اپنا فیصلہ نیا دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ نرگس چند لمحے
کچھ سوچتی رہی تھیں۔

☆☆☆

لچ ٹائم میں وہ جلد ہی آفس سے فری ہو گیا تو
بے ساختہ کالج کے باہر آ کر اس کا ویٹ کرنے لگا۔

”موڈ آف ہے؟“ ساویہ نے اسے بغور دیکھا۔ اس کے چہرے پہ بلا کی سنجیدگی تھی۔

”نہیں ٹھیک ہے۔“ اس نے ریسٹورنٹ کے سامنے گاڑی روک لی تھی۔ اسے اترنے کا اشارہ کر کے وہ بھی اتر آیا تھا۔ ساویہ اس کے انداز کا بغور جائزہ لے رہی تھی۔ وہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ ایسے تاثرات کم ہی اس کے چہرے پہ نظر آتے تھے۔ وہ خاموشی سے بچ کر رہا تھا۔

”کیا بات ہے اویز! ایسے کیوں ہو رہے ہو۔“ ساویہ سے رہا نہیں گیا تو پوچھ بیٹھی۔

”تم مجھ سے کتنی محبت کرتی ہو۔“ فورک ہاتھ میں پکڑے وہ احانک اس سے سوال کر گیا۔ ساویہ اک پل کو حیران رہ گئی۔

”جس طرح سمندر کے پانی کی کبھی کوئی پیمائش نہیں کر سکتا، اتنی ہی محبت ہے تم سے۔“ وہ حیران تو تھی، مگر ساتھ ہی دل کی بات بھی کہہ گئی۔ اویز جیسے کچھ سوچ رہا تھا۔

”تم کالج چھوڑ دو۔“ اویز نے اسے بغور دیکھتے ہوئے جیسے دھماکا کیا۔ ”لیکن کیوں؟“ ساویہ کے لیے اچنبھے کی بات تھی۔ وہ بے طرح چونک گئی۔ ”بس میں نہیں چاہتا کہ اب تم پیکچرار شپ جاری رکھو۔“ اس کا انداز قطعی تھا۔

”لیکن اویز! میں ماسٹرز کے فوراً بعد سے پڑھا رہی ہوں، اب تو کئی سال ہو گئے۔ اچھی چل رہی ہے، مجھے کوئی ایٹو نہیں ہے، پھر.....“ ساویہ کو اس کی ڈیمانڈ کی سمجھ نہیں آرہی تھی۔ وہ تھوڑا پریشان بھی ہو گئی۔

”بس مجھے ایٹو ہے نا۔ اس لیے کہہ رہا ہوں۔“ اس کا انداز قطعی اور دو ٹوک ہو گیا۔

”لیکن وجہ بھی تو ہوتا چلے۔“ ساویہ کو اس کا انداز ہضم نہیں ہو رہا تھا۔

”وجہ جاننا چاہتی ہو تو سنو، جن اسٹوڈنٹس کو تم پڑھاتی ہو وہ تمہارے پیچھے اتنی چپ کمٹ کرتے ہیں کہ.....“ اویز یوسف کی آواز تیز ہوئی، تو اس نے

لب بھینچ کر جیسے اپنی آواز اور اپنے غصے کو کنٹرول کیا۔ ”میں برداشت نہیں کر سکتا کہ میری ہونے والی بیوی کے متعلق لوگ ایسی چپ باتیں کریں اور میں کھڑا انہیں دیکھتا رہوں، اگر نکل نہ جاتے تو حشر کر دیتا دونوں کا۔“ اویز یوسف کا غصے سے برا حال تھا۔ ساویہ کو اس کے غصے کی وجہ تو سمجھ آ گئی، مگر اس کا تقاضا اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔

”اگر کوئی اخلاقی اعتبار سے گراؤٹ کا شکار ہے تو اس کے ڈر سے میں کیوں اپنی سالوں کی پیکچرار شپ چھوڑ دوں۔“ ساویہ کو اعتراض ہوا۔

”میں جو کہہ رہا ہوں، کیسی محبت ہے تمہاری کہ تم اتنا نہیں کر سکتیں میرے لیے۔“ وہ اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ وہ اس وقت ضدی بچہ لگ رہا تھا، جو بحال میں اپنی بات منوانا چاہتا تھا۔

”تم سے محبت اتنی جگہ اویز، لیکن تمہاری ڈیمانڈ نا جائز ہے۔“ وہ کوئی کم عمر الہڑٹیاں نہیں بھی جو بنا چوں و چرا کیے اس کی مان لیتی۔ پیچورڈ سوچ کی حامل درس و تدریس سے وابستہ رہتی تھی۔ اپنے حق و دفاع میں بولنا جانتی تھی۔

”او کے، یعنی تمہاری نظر میں میری بات کی رتی برابر اہمیت نہیں، تمہیں اپنی فیلڈ عزیز ہے۔“ اسے جیسے دکھ ہوا تھا۔

”تم محبت کے نام پہ بلیک میل کیوں کر رہے ہو۔“ ساویہ اسے سمجھانا چاہتی تھی۔

”بس مجھے جواب مل گیا۔ جان گیا ہوں تمہاری نظر میں میری کیا اوقات ہے۔“ وہ سخت طیش میں آچکا تھا۔

”اویز!؟“ ساویہ نے جیسے اسے جذباتی ہونے سے روکنے کی ناکام کوشش کی۔

”بس..... بات ختم ہو گئی۔ اٹھو گھر ڈراپ کر دوں تمہیں۔“ وہ حلاوت سے ہاتھ اٹھا کر خود بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ساویہ کو بھی ہلا کا غصہ آیا تھا۔ لیکن وہ لب بھینچ کر چپ چاپ اٹھ گئی تھی۔ بل کے پیسے رکھ کر اویز بھی نکل آیا تھا۔ سارا راستہ خاموشی رہی تھی۔

دونوں میں سے کسی نے بات نہیں کی تھی۔ اویز اپنی جگہ ناراض تھا کہ سادو یہ نے اس کی بات نہیں مانی تو سادو یہ کو بھی اس کا تقاضا غصہ ولا گیا تھا۔

☆☆☆

بلیقس کے دوسرے نمبر والے بیٹے کی شادی کا شور اچانک اٹھا تھا۔ بلیقس نے آنا فانا دونوں بھائیوں اور باقی رشتے داروں کو کارڈ بھیج کر جلد سے جلد پہنچنے کی تاکید کی۔ بلیقس نے بھائیوں کے میکے تک میں کارڈ بھیجے تھے۔ نیکی اور ندیر صاحب نے تو یہی طے کیا کہ وہ شادی سے اک دن پہلے آئیں گے۔ سادو یہ کو بھی گرمیوں کی چھٹیوں کی وجہ سے آزادی تھی۔ ایسے میں سب نے ہی حویلی جانے کا پلان بنا لیا۔ اویز کی کار میں نرگس، صدف اور سادو یہ تھی۔ اویز ڈرائیو کر رہا تھا۔ نرگس فرنٹ سیٹ پہ جبکہ صدف اور سادو یہ بیک سیٹ پر براجمان تھیں۔ اویز یوسف نے اسے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ ہر بار لڑائی پہ وہ لاطلفی کا مظاہرہ کرتا تھا۔ بول چال بند کر دیتا تھا۔ تاوقتیکہ پاراضی نہ ختم ہو جاتی۔ ہر بار سادو یہ ہی پہل کر رہی تھی اور وہ تھوڑی سی جیل جمت کے بعد مان جاتا تھا، لیکن اب کے اک ہفتہ ہونے کو آیا تھا۔ گزشتہ واقعے کے بعد سے دونوں میں بات چیت بند تھی۔ دونوں ہی اپنی اپنی ضد پہ اڑے ہوئے تھے۔ ہمیشہ کی طرح سادو یہ نے دواک بار کال کر کے بات کرنے کی کوشش کی تھی، مگر وہ کال کاٹ دیتا تھا۔ ایسے میں جب نرگس کی ہدایت پہ گاڑی رکی تو سادو یہ بے زاری سے ارد گرد کا جائزہ لینے لگی۔ لیکن جب رشنا نکل کر آئی تو اسے دھیان آیا گاڑی اس کے گھر کے آگے رکی تھی۔

”رشنا تم یہاں بیٹھ جاؤ، میں پیچھے چلی جاتی ہوں۔“ نرگس فرنٹ سیٹ خالی کر کے تیزی سے نیچے اتر آئیں۔ لہرائی، بل کھاتی رشنا خوشبو میں بسی فرنٹ سیٹ پہ آکر براجمان ہو گئی۔

”السلام علیکم!“ رشنا نے خوش اخلاقی دکھانی چاہی۔ ”وعلیکم السلام خوش رہو“ صدف نے نرگس کے لیے

جگہ بناتے ہوئے کہا۔ نرگس کی یہ حرکت سب کو محسوس ہوئی تھی۔ سادو یہ کا دل جل کے خاک ہو گیا۔

”اویز یوسف پہ اک تیز نظر ڈال کر اس نے غصے سے چہرہ کھڑکی کی طرف پھیر لیا۔

”بھابھی تو جانیں رہیں، طبیعت ٹھیک نہیں ان کی، اس لیے میں نے رشنا کو ساتھ لے لیا کہ یہ بچی کا دل بہل جائے گا۔“ نرگس، صدف سے گویا تھیں۔ اویز یوسف نے بیک ویو مرر سے اس کے غصے سے سرخ چہرے کو دیکھا تھا۔ رشنا کی آمد سے وہ بھی لاعلم تھا۔ نرگس نے رکنے کا کہا تو اسے یہ ہی لگا کہ انہیں کوئی کام ہوگا ممانی سے، مگر رشنا کی آمد اور پھر نرگس کا سیٹ چھوڑ کر پیچھے چلے جانا۔ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ وہ کچھ نہ بول سکا۔ اگر ناراضی نہ ہوتی تو شاید وہ رشنا کو اپنے ساتھ بیٹھنے ہی نہ دیتا۔ لیکن اب جس طرح سادو یہ سگ رہی تھی یہ دیکھ کر دل کو سکون مل رہا تھا۔ اس کی جلن پہ محبت سے ناراض دل کو ٹھنڈی پھوار محسوس ہو رہی تھی۔

”اویز کوئی ڈھنگ کا سوگ ہی لگا دو۔ کم از کم سفر تو خوش گوار ہو۔ لاؤ میں لگاؤں۔“ رشنا خود ہی کہتی سی ڈی لگانے لگی۔

خود کو میں یوں کھودوں کہ پھر نہ کبھی پاؤں ہو لے ہو لے زندگی کو اب تیرے حوالے کروں

صنم صنم..... صنم رہے

تو میرا صنم ہوا رہے

دلفریب رومانٹک سوگ لگا کر وہ انجوائے کرنے لگی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ تھرک رہی تھی، گاڑی میں بیٹھی بیٹھی۔ سادو یہ کاجی چاہا وہ اک سیکنڈ کی بھی دیر کیے بنا گاڑی سے اتر جائے۔ آنکھوں میں بار بار پانی آ رہا تھا، جیسے وہ غیر محسوس طریقے سے دوپٹے سے خشک کر رہی تھی۔ چند فٹ کے فاصلے پہ وہ جیسے لا پرواہ، بے حس سمجھ بیٹھی تھی، وہ بار بار اچھتی نگاہ سے اس کی بے قراری کا جائزہ لے رہا تھا۔

☆☆☆

ہے۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے منہ سے گلے نکل گیا۔ اویز یوسف کے لبوں پہ مسکراہٹ پھیل گئی۔
”اپنی محبت کرتی ہو مجھ سے کہ رشنا سے مجلس ہونے لگیں۔“ اس نے جیسے چڑا کر مزالیا۔
”کوئی نہیں کرتی، میں تم سے محبت، سمجھ تم۔“

وہ چلا اٹھی۔ شدت جذبات سے آواز گلے میں گھٹ گئی، آنسو بہنے لگے۔ اویز یوسف نے بہت محبت سے اس کے عمل کو دیکھا تھا۔ جانتا تھا وہ کل سے سلگ رہی ہوگی۔

”اتنی پڑھی لکھی اور سمجھ دار لیکچرار اور ایسی حرکت، چہ چہ۔“ اس نے جیسے اس کی بچکانہ حرکت پہ تاسف کیا۔

”محبت بے خودی کا سبق ہے اویز یوسف۔ عاقل و بالغ، شعور و بے شعور نہیں دیکھتا۔ عقل، سمجھ بوجھ محبت کے آگے ایڑیاں رگڑتی ہیں۔ بنا سوچے سمجھے عشق کی جلتی بھٹی میں خود کو جھونک دینے کا مطلب آپ نہیں سمجھو گے۔“ ساویہ کو اس کی بات آگ لگا گئی تو ترنخ کے بولی۔

ہاں اتنی محبت ہے تو اک ہفتے سے ناراض ہوں، منانہیں سکتی تھیں۔“ اس نے جیسے کلائی پہ دباؤ بڑھا کر غصہ دکھایا۔

”چار سو بیج کر چکی ہوں، اک کا بھی جواب دیا تم نے؟ سو سے زائد کا لڑکیں، اک بھی ریسوکی، کیا چاند یہ جا کے مناتی تھیں۔“ وہ الٹا برہم ہو کر یاد دلانے لگی۔ وہ جب ناراض ہوتا تھا، اس کی حالت رو، رو کر درگروں ہو جاتی تھی، مگر وہ غصے کا اتنا تیز تھا کہ جب تک غصہ نہیں اترتا تھا وہ بات نہیں کرتا تھا۔ خاموشی سے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا کر بیٹھ جاتا تھا۔

”ہاں تو غصہ تھا۔ تم نے میری بات جو نہیں مانی۔“ وہ خود کو حق بجانب سمجھ رہا تھا۔

”تو ابھی کیوں بات کر رہے ہو، جاؤ تمہاری رشنا تمہیں ڈھونڈ رہی ہوگی۔ بہت محبت کرتی ہے تم سے۔“

وہ سب طویل سفر کے بعد تھکے ہارے حویلی پہنچے تو سب نے ان کا بھرپور استقبال کیا۔ ان کی خوب خاطر تواضع کی گئی۔ رات دیر تک ڈھونڈی کارنگ چھایا رہا۔ بلقیس کا چھوٹا بیٹا حمزہ، ساویہ کو عرصہ بعد دیکھ کر ساکت رہ گیا تھا۔

”میں کیا اویز! یہ ماموں کی کڑی تو بڑی سونی ہوتی جا رہی ہے۔“ اویز یوسف مردوں میں ہی بیٹھا تھا۔ حمزہ سے اس کی اچھی دوستی تھی۔ ایسے میں حمزہ نے جب ساویہ کے بارے میں کہا تو اویز کے جیسے آگ لگ گئی۔

”زبان سنہال کر بات کر، ہونے والی بھابھی ہے تیری۔“ اویز یوسف نے اک سینکڑ کی دیر کیے بنا اسے سختی سے تنبیہ کی۔ حمزہ اس کے انداز پہ اک بلبل کو ٹھٹکا۔

”اچھا..... ابھی ہوئی تو نہیں۔ میں ٹرائی کر لوں۔“ حمزہ نے شوخی سے کہا۔ مگر اویز یوسف کا غصے سے دکھتا چہرہ دیکھ کر جھٹ ہاتھ جوڑ گیا۔

”اویار، مذاق کر رہا تھا۔ خبر آگئی تھی حویلی میں کہ تو پاگل ہے اس کے پیچھے۔“ حمزہ نے جیسے اپنی جان چھڑائی۔ اویز کو اب اس شور و عمل سے الجھن ہونے لگی تھی۔ یہاں آ کر تو وہ اور بھی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ لیکن حمزہ کی بات سن کر اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ ساویہ کو لے کر فوراً واپس شہر چلا جاتا۔ وہ کافی دیر سے اسے ڈھونڈ رہا تھا۔ تب ہی وہ اسے کچن میں نظر آئی۔ کشمیری چائے کے لیے ڈرائی فروٹ کا ٹرے رہی تھی۔ اس وقت کچن میں سناٹا تھا۔ وہ اکیلے تھی۔ اویز یوسف کچن کے دروازے سے ٹیک لگائے خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اتنے دنوں سے وہ اس سے ناراض تھا۔ نل رہا تھا، نہ بات ہو رہی تھی۔ اب اسے دیکھ کر دل اک دم بے قابو ہو رہا تھا۔ نیلے رنگ کے سوٹ میں وہ اتنی معصوم لگ رہی تھی کہ اس کی نگاہ نہیں ہٹ رہی تھی۔

”یہاں کیوں آئے ہو۔ جاؤ اپنی لڑکی سکتی رشنا کو ٹائم دو۔ جو کل سے تمہارے ساتھ چپکی ہوئی

”سمجھ“۔ لہجے میں سختی تھی۔ اس کی شہادت کی انگلی ساویہ کی پیشانی سے لگی ہوئی تھی۔ اسے اس کے انداز پہ ہنسی آگئی۔ ان دونوں کا مسئلہ یہ تھا کہ دونوں ہی جذباتی اور غصیلے تھے۔ دونوں ہی جنون کی حد تک اک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ دونوں ہی اک دوجے کے بتا رہے نہیں سکتے تھے۔

☆☆☆

وہ چار پائیوں پہ بستر سیٹ کر رہی تھی کہ رات گئے تک سب ہلا گلا کر کے پڑ ہی سوتے تھے۔ یہ سارے کام حویلی کی عورتیں ہی مل کے کرتی تھیں، لیکن چونکہ بقیس کی کوئی بیٹی نہیں تھی، تو صرف بڑی بہو صبا ہی لگی ہوئی تھی۔ لیکن ساویہ کے آجانے سے صبا کی ہڈی میں تھوڑی ہوا لگی تھی۔ جس کا اس نے برملا اظہار بھی کیا تھا۔

”اف تو یہ سب کی وقت بے وقت کی جائے، کافی، لسی کھانے کی ڈیمانڈ نے مجھ اکیلی کی تو سمجھو مت ہی مار رکھی تھی۔ جب سے تم آئی ہو تم نے کتنی ہی ذمہ داری اپنے سر لے لی، حالانکہ دو، دو ملازمہ بھی رکھی ہیں، مگر توبہ، اتنے مہمانوں کی فرمائشیں پوری کرنا آسان تھوڑی ہے۔ شکر ہے تم آگئیں اور تم چمی آ کر مہمان بن کر ہر وقت میک اپ کرنے اور ڈانس گانے میں نہیں لگی ہو۔“ صبا اس کی تعریف کرتے دیگر لڑکیوں کی طرف بھی اشارہ کر گئی۔

”بے فکر رہیں بھابھی، شادی تک آپ کے ساتھ ہوں۔“ اس نے بھرپور یقین دلایا تھا۔ اس وقت بھی وہ سب کے لیے بستر لگا رہی تھی۔ جب اس کی نظروں کے عین سامنے آ کر طرح داری رشنا بیٹھ گئی۔ ساویہ نے اک نظر اس کے سجے سنورے روپ کو دیکھا اور پھر سے اپنے کام میں لگ گئی۔ رشنا بغور اسے دیکھ رہی تھی۔

”ساویہ آپ! رشنا نے آپ ہی زور دے کر گفتگو کا آغاز کیا۔ ساویہ کچھ بولی نہیں پس نظر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ غالباً اس سے بات کرنے کے موڈ سے ہی آئی تھی۔“ میں اوپر سے بہت محبت کرتی ہوں

”ہاں یہ تو ہے، کل بتایا اس نے مجھے۔“ شوخی سے اس کا لال بھسوکا چہرے کو دیکھتے اس نے جیسے جلتی پہ پٹرول ڈالا۔ ساویہ بھڑک اٹھی۔

”دفع ہو جاؤ یہاں سے، ورنہ یہ چھری تمہارے سینے پہ اتار دوں گی۔“ اس وقت وہ محبت کی مایہ کی اک الہر دو شیزہ لگ رہی تھی جو رقابت کی آگن میں جل جل کے بھسم ہو رہی تھی۔ اوپر یوسف کو اس کا جنوں نہال کر گیا تھا۔ اوپر یوسف نے اسے شانوں سے پکڑ کر اپنے سامنے کیا۔

”میری زلیخا! اچھا نا اب غصہ چھوڑ دو۔ مجھے کسی رشنا وشنا کی ضرورت نہیں، اس سے بس تھوڑی سی بات کر لی کہ تمہیں ستاؤں بس اور کچھ نہیں۔ تمہاری جگہ کوئی نہیں لے سکتی، آئی سمجھ۔ لاکھ..... دس لاکھ رشنا بھی آ جائیں۔“ وہ چپ چاپ آنسو بہا رہی تھی۔ اوپر کا دل گداز ہو گیا۔ اسے بے حد پیار آ رہا تھا اس پہ۔ پھر نہ لڑنے اور ناراض نہ ہونے کے وعدے وعید ہو رہے تھے۔ جو ہر دو دن میں ٹوٹ بھی جاتے تھے۔ پھر دونوں نے مل کے کشمیری چائے بنائی تھی۔

”تم مردانے میں زیادہ نہ آنا اور خصوصاً حمزہ سے دوری رکھو۔“ وہ اسے تنبیہ کرنا نہ بھولا۔

”کیوں۔“ وہ حیران ہوتے ہوئے سوال کر بیٹھی۔ جواب میں وہ اسے گھورنے لگا۔

”اک تو تمہارے سوال ختم نہیں ہوتے، بس بول دیا تو عمل کرو۔“ اس کے جرح پر وہ چڑنے لگا۔

”میں کیوں کروں..... تم رشنا کو ٹائم دو، میں حمزہ سے مل کے آئی ہوں۔ کیا بات کرنی ہے اسے۔“ ساویہ نے بھی جلانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے وہ چکن سے لٹکنے بھی لگی تھی۔ اوپر نے اس کا بازو پکڑ کر اسے اپنے روبرو کیا۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں اپنی ساحر آنکھیں گاڑ کر دھیسے سے بولا۔

”میری گاڑی میں ہسٹل موجود ہے۔ اک گولی تمہارے پیچھے میں اتاروں گا، دوسری اپنے، آئی

بہتر ہوگا، آپ پیچھے ہٹ جائیں۔ آپ کو شرم نہیں آئی خود سے چار سالہ چھوٹے لڑکے کو پھنساتے ہوئے۔ اگر آپ کو کم عمر ہم سفر کی تلاش تھی تو میرے خیال سے یہ آپ کے لیے کون سا مشکل کام ہوگا۔“

رشنا نے اپنے لہجے کی کڑواہٹ اس پہ انڈیلنا شروع کر دی تھی۔ چار سالہ فرق ساویہ کو اک بار پھر چابک کی طرح لگا تھا۔ ”میں بچپن سے اویز سے محبت کرتی ہوں اور پھپھو (زرگس) کا کہنا ہے میں ہی ان کی بہو بنوں گی۔ سو آپ کے لیے بہتر یہ ہی ہوگا کہ اپنے بڑھتے قدم روک لیں۔ بالفرض اویز نے آپ سے شادی کر بھی لی تو کل کو بڑھی کہہ کر آپ سے بے زار بھی ہو سکتا ہے۔“

رشنا نے اتنی جلدی مستقبل کا نقشہ کھینچا کہ اک بل کو ساویہ سانس بھی نہ لے سکی۔ چار سالہ عمروں کا فرق ہر کوئی جتا جتا کر اسے احساس کمتری میں ڈال گیا تھا۔ اس کے جنون کی اک وجہ یہ ڈر بھی تھا کہ اگر جو اویز اس کا نہ ہو سکا؟ وہ محبت میں اس حد تک آگے بڑھ گئی تھی کہ شاید اویز بھی بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اویز یوسف کے مقابلے میں اس کی محبت میں زیادہ جنون تھا۔

”ساویہ! بھی تمہارے لیے پیغام آیا ہے کہ کافی کی نیڈ ہے۔“ اس سے پہلے کہ وہ رشنا کو کچھ کہتی۔ شاید وہ کچھ کہنے کے لائق ہی نہیں تھی۔ صبا پیغام لے کر آئی تھی، اس کے چہرے پہ معنی خیز متسکراہٹ دیکھ کر ساویہ سمجھ گئی کہ یہ فرمائش اویز کی طرف سے بطور خاص اس کے لیے آئی ہے۔

”میں ابھی بنا دیتی ہوں۔“ اس نے ہولے سے مسکراتے ہوئے کیا۔

”خود دے بھی آنا، کافی کا لطف دو بالا ہو جائے گا۔“ پینے والے کے لیے، صبا آنکھ دیا پانی چلی گئی تھی۔ خاندان بھر میں یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ اویز ساویہ سے ہی شادی کرے گا۔ خود وہ ہر کسی کو میری ہونے والی بیوی کہہ کر ہی متعارف کرواتا تھا۔ اپنے تئیں صبا سے چھیر کر گئی تھی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو

وہ بھی انجوائے کرتی، مگر یہ سب سن کر رشنا نے جتنا کڑوا منہ بنایا تھا، اس سے ساویہ کو ابھرنے لگی تھی۔ وہ خود کو بہت غیر محفوظ محسوس کرنے لگی تھی۔ اسے اپنے محسوسات کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اندر جلن بھی شدید تھی۔ جب بھی رشنا یا کوئی اور اویز کا نام بھی لیتا تو وہ غصے سے بے قابو ہونے لگتی تھی۔ مصروفیت کی بنا یہ اویز ٹائم نہ دے پاتا تو وہ رو، رو کر آنکھیں سجا لیتی۔ محبت سے زیادہ اس کے اندر محبت کو کھونے کا ڈر کڈی مار کر بیٹھ گیا اور اس ڈر پہ مہر لگاتے تھے روز رشنا جیسے لوگ، جن سے کسی کی خوشیاں برداشت نہیں ہوتی تھیں۔ چاہتی تو وہ بھی رشنا کو جواب دے سکتی تھی۔ مگر وہ اس طرح کی غیر سنجیدہ فطرت نہیں رکھتی تھی۔ تب ہی چپ چپ بچن میں آ گئی۔ پین میں دودھ ڈال کر اس نے کافی کا جارجنگالا تھا۔

”اویز کے لیے کافی میں بناؤں گی۔ آخر کو مستقبل میں مجھے ہی اس کے کام کرنے ہیں۔“ اس کے ہاتھ سے کافی کا جارجنگالا چکر رشنا نے کہا۔ ساویہ نے اک نظر اس کی اوچی حرکت پہ ڈالی اور سب کے لیے چائے بنانے لگی۔ وہ جتنی دیر چائے بناتی رہی اتنی دیر میں رشنا کافی بنا کر چلی بھی گئی۔ ساویہ کا ضبط جواب دے گیا۔ اس کی آنکھ سے پانی بہنے لگا۔ کس دبدبے سے رشنا، اویز یوسف پہ حق جتا گئی تھی اور ایسا اس وقت تک ممکن نہیں تھا جب تک اسے زرگس کی سپورٹ نا حاصل ہوئی۔ وہ اسے ساتھ لائی ہی اسی مقصد سے تھیں کہ اویز اس کی طرف سے رخ پھیر لے۔ وہ کھلے عام مخالفت جو نہیں کر سکتی تھیں۔

”میں نے بھابھی سے پیغام بھیجا تھا کافی کے لیے، تم نے کیوں نہیں بنائی۔“ اویز کافی سے بھر انگ شیلف پہ رکھ کر اس سے استفسار کر رہا تھا۔

”اویز! ساویہ آ پی بڑی تھیں تو انہوں نے مجھے کہہ دیا، بنانے کو بس۔“ اس کے پیچھے رشنا بھی بھاگی بھاگی داخل ہوئی۔ ساویہ اس کی غلط بیانی پہ اسے دیکھنے لگی۔ یقیناً کافی کا کھونٹ بھرتے ہی اویز سمجھ گیا تھا کہ کافی اس کے ہاتھ کی نہیں ہے۔

صرف پھولوں اور پھلوں کے بیڑ تھے۔ رات کے وقت یہ حصہ قدرے سنیان ہوتا تھا۔ اکثریت چھتوں یا کمروں میں بائی جاتی تھی۔ ساویہ کافی لے کر آئی تو وہ ماربل کے بیچ پہ بیٹھا ہوا تھا۔ کافی کنگ بیچ پہ رکھ کر وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔ چند ٹائیپے دونوں کے مابین خاموشی طاری رہی۔ ساویہ نے ڈرتے ڈرتے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ لا تعلق بنا بیٹھا تھا۔ جیسے اس کے وجود سے ہی انجان تھا۔

”ناراض ہو؟ جواب نہ ارد تھا۔

”اوئیز تم سے پوچھ رہی ہوں۔ ناراض ہو۔“

جواب نہ پا کر اب کے اس نے اس کا بازو دھلا یا۔

”تو کیا نہیں ہونا چاہیے؟“ گردن موڑ کر وہ

الٹا اس سے پوچھنے لگا۔

”ہاں تم اپنی جگہ درست ہو۔ میری غلطی ہے کہ مجھے رشنا کو روکنا چاہیے تھا، لیکن جانے کیوں جب کوئی ہمارے متعلق کسی قسم کی بات کرتا ہے تو میں کچھ بول نہیں پاتی۔ اس گھڑی مجھے لگتا ہے کہ میرا سارا اعتماد کہیں چھپ گیا ہے۔“ اس نے اپنی دلی کیفیت شیر کر لی۔

”بہت خوب اک کانچ لیکچر اس قسم کی بات کر رہی ہے جو فصاحت و بلاغت رکھتی ہے۔ تم سے اچھی تو پھر رشنا بی بی ہوئیں جس نے بشکل دس جماعتیں پڑھی ہیں اور میرے ساتھ کوئی محبت نامی شے کے نہ ہوتے ہوئے بھی دھڑلے سے تمہارے سامنے مجھے اپنا کہہ گئی۔“ اوئیز نے جیسے استہزائیہ انداز میں غصہ نکالا۔

”ہاں مجھ سے اچھی ہے وہ، تو جاؤ اسی کے پاس“ الٹا ہی اثر ہوا۔ ساویہ بھڑک کر بیچ سے اٹھنے لگی۔ اوئیز نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر اسے اٹھنے سے روکا۔

”صرف مجھے ہی غصہ دکھانا آتا ہے تمہیں۔ زمانے بھر کی باتیں سناتی ہو، ذرا سے شک پہ میری نسلوں کو رگید دیتی ہو۔ مردوں کی شان میں زمین آسمان اک کر دیتی ہو۔ مجھے دو کوڑی کا کرنے میں

”میں تم سے بات نہیں کر رہا رشنا۔ میں نے سوال ساویہ سے کیا ہے۔“ اوئیز نے گردن موڑ کر قدرے تڑخ کر رشنا کو کہا۔

”میں بتا رہی تھی، لیکن رشنا نے کافی کا جار مجھ سے لے کر کہا کہ یہ کافی بنائیں گی، کیونکہ مستقبل میں انہوں نے ہی تمہارے کام کرنے ہیں۔“ ساویہ کو غصہ تھا، تب ہی اس نے من و عنان اس کا جملہ گوش گزار کر دیا۔

”دوسری لکڑ! ساویہ سحر، رشنا بی بی نے کہا اور تم نے ان کے حکم کی تعمیل کی۔ کل کو کوئی مجھے تم سے مانگنے آئے تو طشت میں سجا کر اسے میرا وجود پیش کر دینا۔ کوئی مزاحمت، کوئی جرح نہ کرنا۔“ اوئیز یوسف بخ لہجے میں تاسف سے کہہ رہا تھا۔ ساویہ کو بھی احساس ہوا کہ وہ بلاوجہ رشنا کے سامنے چپ ہے تب ہی اس کی بدتمیزیاں بڑھ رہی تھیں۔

”اور رشنا بی بی! آپ کو کس نجوی نے مشورہ دیا، میری ضروریات کا خیال رکھنے کا؟ کافی میں صرف ساویہ کے ہاتھ کی پیتا ہوں، ورنہ نہیں پیتا اور اگر آپ کو اب بھی کوئی خوش گمانی ہے کہ مستقبل قریب میں آپ نے میرے کام کرنے ہیں تو اسے کسی کنویں میں پھینک آئیں۔ مجھے آپ سے کوئی وابستگی نہیں ہے، نہ ہوگی۔“ اور یوسف کارخ رشنا کی طرف ہو گیا۔ وہ جو اس کی ذرا سی التفات کو محبت سمجھنے لگی تھی، بری طرح تو بہن پہ تمللا کر ساویہ پہ اک قہر بھری نظر ڈال کر پھر پختی چکن سے چلی گئی۔ یقیناً اس کا رخ نرس کی طرف ہی ہوتا تھا۔

”دوسری کافی بنا دوں۔“ ساویہ نے اس کے غصیلے چہرے کی طرف دیکھا۔

”ضرورت نہیں ہے، اپنا کام کرو۔“ وہ چکن سے نکل گیا تھا۔ یقیناً وہ خانا ہو چکا تھا اور اسے ہونا بھی چاہیے تھا۔ وہ اس کے لیے ساری دنیا سے لڑ جاتا تھا اور وہ اس کے لیے ہی بول نہیں پار رہی تھی۔ ساویہ نے ترجمہی نظروں سے اس کے اٹھتے قدموں کو دیکھا تھا۔ وہ حویلی کے پیچھے حصے کی طرف چلا گیا تھا۔ جہاں

دیں نہیں لگاتیں۔ باقی سب کے سامنے تو سانس بونگھ جاتا ہے نا۔“ اویز کو ابھی تک اس کے نہ بولنے کا قلق تھا، جس کا اظہار کر رہا تھا۔

”اسے چاچی کی سپورٹ حاصل ہے، تب ہی وہ اتنا اثر رہی ہے۔“ ساویہ نے احساس دلایا کہ پس پردہ اس کی ماں ہے۔ جس کے لیے وہ کچھ غلط نہیں بول سکتی تھی۔

”پس پردہ بھلے کوئی ہو، تمہیں اتنا تو اعتبار ہونا چاہیے کہ میں صرف تمہارا ہوں۔ نہ کہ تم مجھے دان کرو۔“ اس کا غصہ کم نہیں ہو رہا تھا۔

”دان کب کیا؟“ جرح کی۔

”اس نے ہاتھ سے کافی کا جار لے لیا۔ میرے لیے کچن میں کھڑی ہو کر کافی بناتی رہی اور آپ یہ سارے سین ملاحظہ کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ وہ خراماں خراماں مگ اٹھائے مجھے کافی دیئے بھی آگئی اور آپ چپ رہیں۔“ سارا نقشہ کھینچنے پہ ساویہ کے لبوں پہ مسکراہٹ آگئی۔

”ہنسومت، سخت زہر لگ رہی ہو اس وقت۔ بہت غصہ ہے تم پر۔“ اویز یوسف نے حلقی سے منہ پھلا کے کہا۔ اس کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔

”ایسا کیا کروں کہ تمہارا غصہ ختم ہو جائے۔“ ساویہ نے اسی سے پوچھا۔

”اتنی رومانٹک جگہ ہے۔ پھولوں کی خوشبو ہے، تنہائی ہے۔ باقی بھی میں بتاؤں؟“ اویز کے اک دم سے لہجہ بدلنے اور احساس دلانے پہ ساویہ کو بھی احساس ہوا۔ وہ بہت شرارتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”بہت فضول ہو تم۔“ وہ جلدی سے اپنا مگ اٹھا کر لبوں سے لگا گئی۔

☆☆☆

”محبت اتنی ضدی ہے کہ ہر انسان کو زندگی میں کبھی نہ کبھی چت کر کے۔ اپنا آپ منوا لیتی ہے۔ خواہ عمر کا کوئی بھی حصہ ہو، یہ اتنی ہٹ دھرم ہے کہ جب تک محبت کی لٹی کرنے والے سے اقرار نہ کروالے۔

تب تک اس کے ارد گرد منڈلاتی رہتی ہے اور جب محبت کرنے والا اس کے وجود کو تسلیم کر لیتا ہے تو یہ ہی محبت اسے ذلیل و خوار بھی کرتی ہے، رلاتی بھی ہے، سکاتی بھی ہے۔ محبت کر کے بہت کم لوگ خوش رہے ہیں، دیکھو نہ محبت کرنے والوں کی مثالیں بکھری پڑی ہیں۔ کب کون کسی کو ملا؟ محبت نے سب کو آنسو ہی دان کیے۔ تم میری بہت اچھی بیٹی ہو۔ جب میں نے پہلی بار تمہارا وجود اپنی کونکھ میں محسوس کیا تو میں کتنی خوش ہوئی تھی۔ یہ لفظوں میں بتا نہیں سکتی۔ میری آٹھ سالوں کی مراد تمہاری صورت پوری ہونے والی تھی۔ پھر جب تمہیں پہلی بار اسی طرح میرے پہلو میں لٹایا گیا تو میں ساری رات تمہیں چومتی رہی تھی۔ تم میری بہت اچھی بیٹی بنی رہیں۔ پڑھائی، حسن، کردار تم نے کسی مقام پہ مجھے شرمندہ نہیں کیا۔ پانیس سال بعد خاندان میں آنے والی تم پہلی لڑکی تھیں۔ سب کچھ صحیح چل رہا تھا، لیکن اچانک اویز سے تمہاری محبت..... اس محبت نے تمہیں سب کے سامنے تماشہ بنا دیا۔ نہ صرف تمہارا بلکہ میرا اور تمہارے بابا کا بھی..... زخم کی دل جلی باتیں، طنز، ہنسی..... وہ رشنا کو جس طرح ساتھ لگائے گھوم رہی ہے۔ یہ سب اس بات کا اشارہ ہے کہ وہ کسی طور تمہیں اپنی بہو نہیں بنانا چاہتی، بس اویز کی وجہ سے چپ ہے۔ لیکن میں اپنی اکلوتی بیٹی کی تدلیل نہیں دیکھ سکتی۔ لوگوں کی باتیں نہیں سہہ سکتی کہ میری بیٹی نے کم عمر لڑکے کو پھاس لیا۔ ہمارے معاشرے میں مرد بھلے ہندو سال بڑا ہو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن اگر لڑکی غلطی سے سال بھر میں بڑی ہو تو یہ اس کے لیے بدنام داغ بن جاتا ہے۔ لوگ منہ بھر بھر کر باتیں کرتے ہیں۔ لڑکی کے کردار پہ انگلی اٹھاتے ہیں۔ تب اسلام اور اس کی مثالیں کسی کو یاد دلانے پر بھی یاد نہیں آتیں۔ اس سے پہلے کہ یہ محبت تمہارا مزید تماشہ لگا دے، میں نے اور تمہارے بابا نے فیصلہ کیا ہے کہ آج نماز جمعہ کے بعد تمہارا نکاح حمزہ سے کر دیا جائے، حمزہ کی بھی خواہش ہے اور آپا

”اويز اوپر ہے۔ اس نے بلایا تھا۔ آنے ہی نہیں دے رہا تھا۔ بڑی مشکلوں سے منا کر نیچے آرہی تھی۔ ساوہ آپی! اويز بھلے آپ کے سامنے محبت کا دوا کرتا ہے لیکن پھپھو (زرگس) آپ سے سخت نفرت کرتی ہیں۔ اويز اب مجھ سے بھی لا تعلق نہیں رہا ہے۔ اسے میری محبت کی قدر آگئی ہے۔ وہ آپ سے صرف اس لیے شادی کرے گا کہ آپ اس کی وجہ سے خاندان بھر میں بدنام ہوگئی ہیں۔ اس بدنامی اور بڑھتی عمر کے ساتھ آپ کو کون پوچھے گا۔ اس نے کہا ہے وہ پہلے مجھ سے شادی کرے گا، بعد میں آپ سے..... آپ چاہیں تو جا کر پوچھ لیں اس سے۔“

رشنا جیسے دھماکے پہ دھماکا کیے جا رہی تھی۔ ساوہ صدف کی باتوں سے پہلے ہی نیم مردہ ہوگئی تھی۔ رشنا کی باتیں اسے زندہ درگور کر لیں۔ اگر اويز نے رشنا یا زرگس سے کوئی وعدہ کیا تھا تو اسے کیوں لاعلم رکھا تھا؟ اسے کیوں دھوکا دے رہا تھا؟

”میں تو جا رہی ہوں اب سونے، ساری رات جاگتی رہی ہوں۔“ رشنا عجیب سی ہنسی ہنس کر اس کے سامنے سے چلی گئی۔ وہ کئی ٹاپے اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکی۔ رشنا کے لفظوں کا اثر تھا یا اس کے دل کی بے کلی، اس کے قدم بے ساختہ چھت کو جاتی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے تھے۔ اسے یقین تھا رشنا جھوٹ بول رہی ہے۔ اويز کو رات مردانے میں سونے کے لیے جاتے اس نے خود دیکھا تھا۔ پھر وہ چھت پہ کیسے آیا؟

وہ اپنا شک دور کرنے کو گئی تھی۔ اسے چھت پہ کوئی نظر نہ آیا تو اسے رشنا کے جھوٹ پہ غصہ آنے لگا۔ وہ پلٹ کر سیڑھیاں طے کرنی لگی تھی۔ جب کونے میں جا رہی تھی کہ اسے کوئی وجود نظر آیا۔ وہ اويز نہیں ہو سکتا تھا۔ اپنا شک دور کرنے کو وہ ذرا احتیاط سے آگے گئی تھی۔ لیکن اس پہ حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ وہ اويز یوسف ہی تھا۔ وہ ذرا اور آگے گئی تو اسے اس کی بنیاد پہ سرخ دھبے نظر آئے۔ دھڑکتے دل سے اس کے قدم چار پائی تک جا رہے

(بلیس) کی بھی۔ نکاح یہاں اس لیے کر رہے ہیں کہ سارا خاندان گاؤں والے جمع ہیں اور سب ہی دیکھ لیں گے کہ زرگس کی بات میں کتنی سچائی ہے۔ ہم نے یہ فیصلہ تم سے پوچھنا کیا ہے، اب دیکھنا ہے کہ تم اچھی محبہ بیتی ہو یا اچھی بیٹی۔“ وہ صدف کے پہلو میں آکر کھڑی ہوئی تو صدف نے بنا اسے مخاطب کیے بولنا شروع کر دیا اور ان کا لفظ لفظ بغور سنتی ساوہ جیسے ساکت ہوگئی۔ اس کے لب جیسے پلونا بھول گئے۔ صدف اپنی بات کہہ کر خاموش ہوگئی تھیں۔ شاید انہیں بھی بیٹی کی حالت کا اندازہ تھا۔ اس کے درد کا احساس تھا تو اپنے رحم فیصلے کا بھی، لیکن وہ دل کے ہاتھوں بیٹی کا تماشا نہیں لگا سکتی تھیں۔ رات ساوہ پہ بڑی بھاری تھی۔ تکیہ آنسوؤں سے بھیک رہا تھا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ آواز حلق میں گھونٹا پڑ رہی تھی۔ محبت مورت کے لیے اک امتحان گاہ ہے۔

☆☆☆☆

مشق واجب تھا ہم پر جو ہم نے کر ڈالا وفا فرض ہے ان پر دیکھیے کیا کرتے ہیں فجر کی اذان سے پہلے ہی اس نے بستر چھوڑ دیا تھا۔ رات بھر نرم بستر اسے سویوں کی طرح چبھتا رہا تھا۔ سورج نکلنے والا تھا۔ نیا سورج اس کے لیے کیا پیغام لانے والا تھا، وہ بے خبر تھی۔ صدف نے بھلے اس پہ فیصلہ چھوڑ دیا تھا، مگر وہ ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر سکی تھی۔ اسے تو یہ بھی خبر نہیں تھی کہ یہ سب سن کر اويز کیاری ایکٹ کرے گا۔ وہ جاننا زڈھونڈ رہی تھی، تب ہی چھت کی سیڑھیاں اترتی رشنا کو دیکھ کر وہ کسی قدر چونک گئی۔ وہ اترتی اتنی رازداری سے رہی تھی۔ اسے اچانک سامنے دیکھ کر رشنا جیسے ڈر سی گئی۔

”آپ ہیں ساوہ آپی! توبہ میں تو ڈر گئی۔ کسی نے دیکھ لیا ہوتا تو..... تماشا بن جاتا، توبہ۔“ رشنا اُسی اس وقت بھی یک سب سے تیار لب اسٹک ہل اپ میں گھوم رہی تھی۔ ساوہ کو حیران ہوئی۔ ”کیا دیکھ لیتا کوئی؟“ ساوہ نے چھت کو جاتی بل رہیاں کو بغور دیکھا۔ انداز میں حد درجہ حیرانی تھی۔

آخر ایسا کیا ہے، جس پہ ساویہ چراغ بٹا ہو رہی ہے۔
 ”یہ!“ وہ اچھل گیا۔ ریڈلپ اسٹک کے جا بے جا
 نشان دیکھ کر اس کا چہرہ اک پل کوریگ بدل گیا، جسے
 ساویہ نے چوری پکڑے جانے سے تعبیر کیا۔
 ”کسی تمہاری قسم، مجھے نہیں پتا یہ.....“

”بکواس مت کرو..... اب میں تمہارے لفظوں
 میں نہیں آؤں گی۔ جتنا تم جیسے بچ انسان پہ اپنے
 جذبے لٹائے یہی بہت ہے۔ اب اور نہیں۔ میں حمزہ
 سے آج نکاح کر رہی ہوں۔ نکال پھینکا ہے، تمہیں
 اپنی زندگی اور دل سے۔“ وہ جانے کیا کیا بول رہی
 تھی۔ اس کے کردار پہ جی بھر کر باتیں سن رہی تھی اور
 جب اچھی طرح بھڑاس نکال چکی تو تیزی سے
 سیڑھیاں اتر گئی۔ اوپر یوسف حیران پریشان سر پکڑ کر
 رہ گیا تھا۔ یہ کیا کہہ گئی تھی وہ۔

☆☆☆

ایک لخت و چھوڑا اوکھا ہے
 جن میڈی من مجھ قسطاں کر
 نکاح خواں آچکا تھا۔ اس اچانک نکاح پہ
 حویلی میں گھلبلی سی پہنچی ہوئی تھی۔ اوپر یوسف
 دیوانوں کی طرح سیاویہ کو ڈھونڈ رہا تھا۔ مگر وہ اسے
 کہیں نظر نہیں آ رہی تھی

”تانی جان! یہ سب کیا ہو رہا ہے اچانک۔“ وہ
 صدف کے گھٹنے تھام کر زمین پہ بیٹھتا چلا گیا۔ آواز
 بھرا سی گئی تھی۔ صدف نے دھکی نظروں سے اس کے
 ہارے ہوئے انداز کو دیکھا تھا، پھر نظر چرا لگیں۔

”یہ ساویہ کا فیصلہ ہے۔ میں نے فیصلے کا اختیار
 اس پہ چھوڑ دیا تھا۔“ یہ سن کر وہ مزید ڈھمکے گیا۔

جانے کیوں اک خیال سا آیا
 ہم نہیں ہوں گے تو کیا کمی ہوگی
 وہ اس وقت لڑکیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی
 تھی۔ مولوی صاحب آنے والے تھے۔ جب اوپر
 یوسف بنا کسی کا خیال کیے اندر داخل ہو گیا۔

”آپ سب باہر جائیں، مجھے اس سے اکیلے
 میں بات کرنی ہے۔“ اس کے سر دلچہ پہ سب ہی

تھے۔ قریب آنے پہ وہ دھبے واضح ہو گئے تھے۔ جو
 سفید بنیان پہ جا بے جا نظر آ رہے تھے۔ وہ اک دم
 سے لڑکھرائی تھی۔ تو کیا رشتا بچ کہہ رہی تھی؟ اوپر نے
 اسے دھوکا دیا تھا۔ وہ دیوانوں کی طرح باقاعدہ اس
 کی بنیان کو چھو کر دیکھ رہی تھی۔ تب ہی اوپر کی آنکھ
 کھل گئی تھی۔ وہ خود پہ جھکے وجود کو دیکھ کر اک پل کو
 حیران ہوا، مگر ساویہ کو دیکھ کر جیسے اس کی حیرت دو چند
 ہو گئی۔

”تم..... اس وقت یہاں؟“ وہ اک ساتھ کئی
 سوال کر گیا۔

”تمہیں کیا لگا تھا، تم اپنی عیاشیوں میں لگے
 رہو گے اور مجھے خبر نہ ہوگی۔“ ساویہ کے لہجے میں
 زمانے بھر کی نفرت آ گئی تھی۔ اوپر پہنی نیند سے جاگا
 تھا۔ ایسے میں اپنی بنیان ساویہ کی منہمی میں بھجنے دیکھ کر
 اس کا غصیلہ جملہ سن کر وہ کسی قدر حیران ہوا۔

”کیا ہوا ہے، کیوں غصہ ہو رہی ہو؟“ وہ جیسے
 صورت حال سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”میں غصہ ہو رہی ہوں۔ تم پہ۔“ وہ ہنسی
 ”اوپر یوسف تم پہ غصہ تو دور، اب میں تم پہ تھوکتا
 بھی پسند نہیں کروں گی۔ تم کیا ہو۔ تمہارا کردار کتنا
 مکروہ ہے، سب کھل گیا مجھ پہ۔“ وہ بے رحمی سے اس
 کے کردار کی دھجیاں اڑا رہی تھی۔ منہ بھر بھر کر باتیں سنا
 رہی تھی۔

”کیا بکواس کر رہی ہو؟ ایسا کیا دیکھ لیا تم
 نے۔“ اوپر یوسف کی آنکھیں چو پٹ ہو گئیں۔
 ساری نیند بھاگ گئی۔ اس وقت تو وہ سر پہ کھڑی
 آگ بگولا ہوئی ساویہ کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”دوبارہ میرا نام مت لینا اپنی گندی زبان
 سے۔ مجھے ساری زندگی افسوس رہے گا کہ میں نے تم
 جیسے بد کردار انسان کے لیے خود کو متاثر بنایا۔ تم انتہائی
 گرے ہوئے انسان ہو۔ مجھ سے پوچھ رہے ہو کیا
 ہوا؟ تمہاری بنیان تمہاری بد کرداری کا ڈھنڈورا پیٹ
 رہی ہے۔“ ساویہ کے بنیان سمجھنے پہ وہ بے طرح
 چونک کر مردن پتی کر کے بنیان کا جائزہ لینے لگا کہ

میں چلی گئی۔“

رشنا، نرگس کے شانے پہ جھولتی ہنس ہنس کر
وہری ہو رہی تھی۔

”ہاں..... اور دیکھو سانپ بھی مر گیا اور لاشی
بھی نہ ٹوٹی، یعنی سادو یہ راستے سے ہٹ گئی اور اس کے
سائے میرا نام تک نہ آیا۔“ نرگس کو بھی بے طرح
خوشی تھی۔

”جب اللہ کسی کا پردہ رکھتا ہے تو دنیا کی کوئی
طاقت اسے فاش نہیں کر سکتی۔ بالکل اسی طرح جیسے
آپ نے اپنا پردہ رکھا، مگر اللہ نے اسے میرے
سامنے فاش کر دیا۔ آپ کی سیاست آپ کی نفرت
سب سامنے آ گئی۔“ اویز یوسف اندھیرے سے نکل
کر اچانک سامنے آیا تو رشنا اور نرگس کی شٹی گم ہو گئی۔
”میں شہر واپس جا رہا تھا کہ یہاں میری دنیا لٹ گئی۔
چابی بھول گیا تھا، لینے آیا تو خبر ہوئی کہ میرا تو وجود ہی
مٹ گیا۔“ وہ بہت دھمی نظروں سے نرگس کو دیکھ رہا
تھا۔ شدت کرب سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی
تھیں۔ یقیناً اس کا دل بلبل رہا تھا۔ ماں، بچے کے
لیے قربانی دیتی ہے، لیکن آپ نے آج اپنی انا، ضد
اور نفرت میں اپنے بیٹے کی خوشیاں، دلی سکون اس کی
نوعمری کی محبت، اس کے وجود کی قربانی لے لی۔ کچھ
دیر قبل تک میں سادو یہ کے لیے مر چکا تھا۔ اب آپ
کے لیے بھی مر گیا۔ آج کے بعد آپ میرا چہرہ نہیں
دیکھ پائیں گی، کبھی نہیں۔“ اویز یوسف لہو رنگ
آنکھیں لیے جیسے آیا تھا ویسے ہی چلا گیا۔ نرگس اور
رشنا کتنی ہی دیر چپ رہ گئیں۔

☆☆☆

فارغ نہ جاوے مجھے، مصروف جنگ ہوں
اس چپ سے جو کلام سے آگے نکل گئی
اویز شہر چلا گیا تھا۔ سادو یہ سابقہ انداز میں
مہمانوں کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ صدف بار بار اس
کاسٹ چہرہ دیکھ رہی تھیں۔ نکارج۔ کے بعد یہ اس
نے اک لفظ منہ سے نہیں نکالا تھا۔ نہ ہی روئی تھی۔ وہ
جب اپنا فیصلہ سنانے ان تک آئی تھی تب اس کی

کھٹکتی تھیں۔ آخر میں صبا بھی نکل گئی تو وہ اس بھی
سنوری قیامت کے قریب آیا۔ جس کے ہر انداز
سے سکون جھٹک رہا تھا۔ اویز یوسف کے دل پہ جیسے
بر چھیاں چلنے لگیں۔ ”تو یہ بھی تمہاری محبت..... یہ تھا
تمہارا جنون..... میرے کردار پہ بات کر رہی تھیں،
خود کا کردار کیا ہے جو اک کی ہو گئے نہیں رہ سکیں۔ ایسا
کیا ہو گیا، حمزہ اور تمہارے بچے جو نکاح کرنے لگیں
راتوں رات اس سے۔ میں بھی رشنا سے شادی
کردوں گا اور جلد کر کے تمہیں دکھاؤں گا کہ تم
مہرے بنا رہ سکتی ہو تو مجھے بھی تمہاری کوئی پروا نہیں۔
تم سے لاکھ بہتر وہ رشنا ہے۔“ شدید غصے میں اندر کی
ساری جلن کھول اس کے پرسکون وجود پہ انڈیل رہا
تھا۔ زبان بے قابو ہو گئی تھی۔ وہ مہر بہ لب سب سن
رہی تھی۔ جب وہ اچھی طرح بھڑاس نکال چکا تو خود
پلٹ گیا۔ وہ خاموشی سے مر کے آگے کھڑی جیولری
سیٹ کرتی رہی۔ پھر نکاح خواں آیا اور نکاح بھی
ہو گیا۔ رات حمزہ کے بڑے بھائی کی بارات جانی تھی
اور اس سے پہلے ہی گھر میں اک اور بہو آ گئی تھی۔

☆☆☆

دلا جو وقت گہری رفاقت بدل گئی
سورج ڈھلا تو سائے کی صورت بدل گئی
اک عمر تک میں اس کی ضرورت بنا رہا
پھر یوں ہوا کہ اس کی ضرورت بدل گئی
”واہ پھپھو جان! مان گئی آپ کی ذہانت کو۔
آپ نے واقعی درست کہا تھا، اگر اویز کو کوئی اس محبت
سے منہ موڑنے پہ مجبور کر سکتا ہے تو وہ خود سادو یہ ہے،
اور دنیا کی کوئی طاقت اسے پیچھے نہیں بٹا سکتی ہے اور
بھلا وہ حمزہ کا، جسے سادو یہ اتنی پسند آ گئی کہ اسے اپنانے
کے لیے اس نے ہم دونوں کا ساتھ دیا، اگر وہ نہ ہوتا
تو میری لپ اسٹک لگی میان اویز تک کیسے پہنچتی۔ وہ تو
اندھیرے میں حمزہ نے اسے پہننے کو دی تو اویز کو شک
ہی نہ ہوا کہ اس میں ہماری کوئی سازش ہے جو حمزہ
لے کہنے پہ چھٹ پہ جا کے سو گیا اور بے چاری سادو یہ!
ایز کی بیوی بننے کا خواب دل میں لیے حمزہ کے نکاح

دگرگوں حالت دیکھ کر ان کا دل پتچ گیا تھا۔ اک بل کو خیال آیا وہ خود نرگس کے پاؤں پکڑ کر اپنی بیٹی کی خوشیوں کی بھیک مانگیں او یوسف کا ساتھ مانگ لیں۔ مگر وہ اپنی خود دار فطرت یہ سمجھتا نہ کر سکیں۔ بالآخر شادی بھی انجام پا گئی۔ نئی دلہن گھر آ گئی۔ ولیمہ بھی بخیر و خوبی انجام پا گیا۔ مہمان گھروں کو لوٹنے لگے تو صدف اور نرگس نے بھی رخت سفر باندھا۔

”آپ لوگ جائیں، اب یہی میرا سسرال ہے۔ میں شہر نہیں جاؤں گی۔“ صدف نے جب سماویہ کو چلنے کی ہدایت کی تو اس کی طرف سے آتے جواب یہ سب ہی ساکت رہ گئے۔

”ابھی رخصتی نہیں ہوئی۔ اک سال بعد ہوگی۔“ صدف نے اسے سمجھانا چاہا۔ ”نکاح ہو گیا، اب میرے لیے رخصتی کوئی معنی نہیں رکھتی، ابھی ہوا سال بعد۔ آپ کالج میں فون کر دیجیے گا۔ میرا ریزائن ہے۔“ اس نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔ پھر سب نے لاکھ سمجھایا۔ اس کی نہ ہاں میں نہیں بدلی۔

”بیٹی جیت گئی ماں، لیکن محبوبہ میرے اندر ہمیشہ بین کرتی رہے گی۔“ صدف کے گلے لگتے اس کے دل سے ہوک اٹھی تھی۔ جو فقط اک بجلی کی صورت باہر آئی تھی۔ آنکھیں خشک بچریں تھیں، مگر صدف ماں تھیں، ان کے دل میں نیزے کی طرح چکی چبھ گئی۔

واپسی کے سفر میں سب اپنی جگہ خاموش تھے۔ صدف نے نرگس سے خود بات نہیں کی تو نرگس بھی خاموشی سے رشنا سے سارا راستہ سردبوائی آئی تھیں۔ نذیر اور چکی اپنی اپنی جگہ چپ تھے۔ سماویہ کے بغیر صدف کو گھر کاٹ رہا تھا تو نرگس کے لیے بھی گھر میں داخل ہوتے قیامت منتظر تھی کہ او یز راتوں رات گاؤں سے دہلی اور پھر وہاں سے یو۔ ایس شفٹ ہو گیا تھا۔

☆☆☆

نہیں	لگدا	وقت	و	چھوڑے	دا
بن	یار	گزارا	کون	کرے	
دنیا	توں	کنارہ	ہوسکدا		
یاراں	توں	کنارہ	کون	کرے	

اک دن ہووے تے لنگ جاوے بلھیا ساری عمر گزارا کون کرے دو محبت کرنے والوں کے جنون کو نفرت، حسد اور معاشرے کی فضول سوچ کھا گئی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ زندہ تھے، مگر مردوں سے بدتر۔ آج پانچ سال ہو گئے تھے او یز یوسف کو یو۔ ایس میں۔ اس نے کسی سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ پلٹ کر گھر فون نہیں کیا تھا۔ اپنا کوئی پتا نشان نہیں چھوڑا تھا۔ نرگس تنہائی کا شکار ہو کر بیمار رہنے لگی تھیں۔ سب کچھ جاننے کے بعد چکی نے بھی ان سے بول چال بند کر رکھی تھی۔

اسفر نے کینیڈا میں ہی شادی کر لی تھی اور وہیں سیٹلڈ تھا۔ رشنا نے او یز کا چند ماہ انتظار کیا تھا۔ پھر اپنی سہیلی کے بھائی سے شادی کر لی تھی۔ صدف کو یہ علم کھا گیا تھا کہ انہوں نے اپنی بیٹی کو لوگوں کے ڈر سے زندہ دفن کر دیا تھا۔ ہاں وہ زندہ دفن ہی تو ہو گئی تھی۔ پانچ سال گزرنے کے باوجود وہ اک بار بھی پلٹ کر گھر نہیں آئی تھی۔ کسی سے بات نہیں کرتی تھی۔ صدف کا دل گھبراتا تو جا کر مل آتی تھیں۔ ایسے میں بھی وہ زیادہ تر چپ ہی رہتی تھی۔ صدف جب ملتیں، دل پہلے سے زیادہ بوجھل ہو جاتا تھا۔ بلقیس کا دو سال قبل انتقال ہو گیا تھا۔ حویلی میں صرف بیٹے اور چار بہوئیں۔ ان کی اولادیں تھیں۔ سب اپنی زندگی میں مست تھے۔ سب خوش باش تھے۔ لیکن حویلی میں کوئی بے قرار روح تھی تو سماویہ سحر کی تھی۔ حمزہ کا ضمیر اسے دن رات کچھ کے لگانے لگا تو اس نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر او یز یوسف سے رابطہ کیا۔

”تیری وہ بچی مر جائے گی آ کر اک بار مل لے اس سے۔“ جانے اس اک جملے میں کیا کچھ تھا کہ وہ جو کبھی نہ لوٹنے کا عزم کر کے گیا تھا، لوٹ آیا۔ ”مجھے معاف کر دے، میں بھی تم دونوں کا مجرم ہوں۔ تو دوست تھا۔ لیکن تیرے ساتھ دھوکا کیا۔ نرگس آنٹی نے میری سماویہ میں دلچسپی دیکھی تو مجھے اپنے پلان میں شامل کر لیا کہ تم دونوں کے الگ ہونے سے رشنا تمہیں پالیتی اور میں سماویہ کو۔ لیکن پلان کرنے

ہوئے ہم بھول گئے کہ کچھ رشتے روح کے ہوتے ہیں۔ رشنا تو تمہارا نام تک نہ پا سکی اور میں ساویہ کے حقوق اپنے نام کروانے کے باوجود اسے نہ پاسکا۔ چہرے جانے کے بعد وہ یہاں سے بھی واپس شہر نہیں گئی۔ مردوں سے نہیں ملتی کہ تجھے اس کا مردوں سے ملنا پسند نہیں تھا۔

اک دن اماں نے یوں ہی گھر میں رخصتی کر دی۔ اس نے مجھے پہلی رات ہی واضح کر دیا کہ میں اس کا وجود تو حاصل کر سکتا ہوں، مگر محبت، احساس اور روح نہیں۔ مجھے اس کے لفظ بے روح لگے تھے، مگر وقت کے ساتھ ساتھ اس کے لفظوں کی مغبوطی کا قائل ہو گیا۔ میں مرد ہوں، اس کا تیرے لیے رونا، سسکنا مجھے جلاتا رہا۔ میں نے کئی بار اس کے ساتھ زبردستی کی، مارا پیٹا، تیرا نام لے کر رونے پر تارچہ کیا، مگر اس کے نوے جب میرے دل کو کھنڈر کرنے لگے تو میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ میں نے وجود تو حاصل کر لیا تھا، مگر اس کے دل کی ویران بستی اپنے نام نہ کر سکا۔ میں نے جلد ہی دوسری شادی کر لی کہ مجھے بیوی چاہیے تھی، کسی کے اہر میں رونے والی زلیخا نہیں۔ وہ آج بھی تیرے لیے روتی ہے۔ تجھے غصے میں کہہ لفظ یاد کر کے بین کرتی ہے۔ معافیاں مانگتی ہے۔“

”کہاں ہے وہ؟“ اویز یوسف پوری داستان سن کر کہتا تو بہت کچھ چاہ رہا تھا۔ حمزہ کے کیے مظالم پہ اسے جہنم واصل کرنا چاہتا تھا، مگر اس کے منہ سے نکلنے والا پہلا جملہ اسی کے لیے تھا۔

”خوبی کی پچھلی طرف اک کمرہ ہے، اسی میں ہانما ز بچھلے زرد رہی ہوگی یا نیم کے پیڑ کے سائے میں بیٹھی خود سے باتیں کر رہی ہوگی۔“ حمزہ کی بات ہاری بھی نہیں ہوئی تھی، اس کے قدم تیزی سے پچھلی مت کو اٹھ گئے تھے۔ دور سے ہی سفید دوٹے کے بالے میں وہ نیم کے پیڑ پہ انگلی پھیرنی نظر آئی تھی، اس کے قدم جیسے زمین سے چپک رہے تھے جنہیں وہ مشکل ٹھیس رہا تھا۔ وہ اس کے قریب گیا تھا۔ نیم

کی سخت چھال پہ چلتی اس کی انگلی کو بغور دیکھ رہا تھا اور جب کھر در کی چھال پہ چلتی اس کی انگلیوں کو دھیان سے دیکھا تو اس کی روح تک جھنجھنا گئی۔ ”اویز یوسف“ انگلی سے وہ بار بار اس کا نام لکھ رہی تھی، جس کی وجہ سے چھال اس کی انگلی پہ چبھ بھی رہی تھی۔ وہ آج بھی اتنی بے رحم نہیں تھی کہ چھری یا کسی کھر در کی چیز سے پیڑ کے سینے پہ زخم دیتی۔

”مجھے خبر ہے، میں بہت بے وقوف ہوں، اپنے آنسوؤں کو چھپانے کا قرینہ مجھے آج بھی نہیں آیا۔ حالانکہ اب تو سب روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ اب تک تو تمہارے روز، روزخا ہونے کی ادائیہ مجھے عادی ہو جانا چاہیے تھا، لیکن میں آج بھی پہلے دل تمہیں کھوتی ہوں۔ گاہ گاہ تمہیں پکارتی ہوں۔ محلوں ہاتھوں کی لکیروں میں تمہارا نام ڈھونڈتی ہوں۔ لیکن مجھے کہیں کچھ نہیں ملتا۔ پھر رب نظر آتا ہے اور پچھلے نظر نہیں آتا۔“ اس کے لفظ آنسوؤں میں ڈوب اور ابھر رہے تھے۔ اویز یوسف کا دل جیسے کسی نوک دار پتھر سے کچلا جا رہا تھا۔ اتنا حزن، اتنا غم تھا لہجے میں کہ سماعت سے جیسے درد چپک گیا تھا۔

”سمی!“ اس نے ہولے سے پکارا تھا۔ اس پکار کے ساتھ ہاتھ کی جنبش اور سسکیوں کی صدا بھی جیسے جم گئی تھی۔ کئی ٹائیپ وہ بے حس و حرکت پیٹھ موڑے بیٹھی رہی۔ شاید وہ اس پکار کو اپنا دوا ہمہ بھی تھی۔ ”سمی!“ اس نے دوبارہ پکارا تھا اور وہ اک جھٹکے میں سیدھی ہو گئی تھی۔ بے یقین نظروں اور بے یقین تاثرات تھے۔ اس کا حسین روپ گہنا گیا تھا۔ آنکھوں کے نیچے حلقے زرد چہرہ خود پہ گزرے شب و روز ماہ و سال کی ایسی داستان بیان کر گیا کہ اویز یوسف کے قدم لڑکھڑا گئے۔ وہ بے ساختہ پیڑ کے جڑ تلے اس کے مقابل بیٹھ گیا۔

ساویہ جیسے بنا پلکیں جھپکے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ بالکل ایسا ہی تھا، اگر کچھ تبدیلی آئی تھی تو اس کے چہرے پہ، اک ٹھہراؤ، اک سوز کی صورت۔ جن آنکھوں میں غصہ اور شرارت ہمہ وقت رہتی تھی ان

کے لبوں پہ چل گیا۔

”وہ سب تو غصے میں کہا تھا۔ ہاں جتنی شدید محبت ہے تم سے اتنا شدید غصہ بھی تھا تم پہ..... کسی کا سایہ تم پہ برداشت نہیں تھا، لیکن یہ وجہ نہیں تھی، مجھے محبوبہ اور بیٹی میں سے کسی اک کو زندہ رکھنا تھا بس..... اس کی آواز پہ پھر آنسوؤں کا غلبہ طاری ہو گیا۔

”بے رحم لوگ کھا گئے ہماری محبت اور خوشیوں کو۔“ اویز یوسف دیوانوں کی طرح اپنے بال نوچنے لگا۔

”ابھی بھی دیر نہیں ہوئی، ہم شادی کر لیں گے۔ حمزہ خود تمہیں طلاق دے گا۔“ اویز یوسف نے اس کے ہاتھ پہ دباؤ بڑھایا۔ سادیہ نے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ چمڑانا چاہا۔ ریت کی طرح پھسلنے اس کے ہاتھ پہ دباؤ بڑھاتے ہوئے اویز یوسف کی ہتھیلی میں اس کی شہادت کی انگلی رہ گئی۔

”آج بھی انگلی نہیں چمڑا سکو گی۔“ اویز نے جیسے بچپن یاد دلایا۔ وہ روتے روتے ہنس پڑی۔

”ساتھ رہنا، پیار پانا ہر کسی کے نصیب میں نہیں ہوتا، لیکن اسے مانگتے رہنا اسے سوتے رہنا۔ اسے کھوجتے رہنا۔ یہ وہ عشق ہے جو دل کے کونے میں سلگتا رہتا ہے۔ یہ احساس کہ کہیں بھی رہو۔ کتنے دور رہو۔ خیالوں میں سب سے زیادہ تم ہی پار ہوتے ہو۔“ اس کی ترسی ہوئی آنکھیں اس کا چہرہ نگاہوں میں بھر کر جیسے سیراب ہونے لگی تھیں۔

”بلا نہیں سکتی تھیں مجھے۔“ گلہ اس کے لبوں پہ چل گیا۔

”بلائی تو اچھی بیٹی کیسے کہلاتی۔“ وہ ہنسنے پلکور تلے مسکرائی۔ وہ اذیت سے لب چل کے رہ گیا۔

”تم نے شادی کی؟“ اسے دھیان آیا۔

”نہیں۔“

”کیوں؟“ جرح کی۔

”اتنے سال درپردہ راسی سوال کا جواب ڈھونڈ رہا، کاتب تقدیر سے مانگا رہا کہ اس نے تمہارا عشق

میں اک بے کلی تھی، حزن و ملال تھا۔ وہ آج بھی اتنا وجہ یہ تھا۔“ کیسی ہو؟“ بہت درد تھا اس اک چھوٹے سے سوال میں۔ اسے جیسے یقین آ گیا تھا کہ وہ بقائے اپنے ہوش و حواس میں اسے دیکھ رہی ہے، تب ہی اندر کو دھنسی آنکھوں سے موتی اس تیزی سے ٹوٹ ٹوٹ کر نکلنے لگے کہ اویز یوسف نے بے ساختہ اس کی آنکھوں پہ اپنی ہتھیلی رکھ دی۔

”مت رواتنا۔“ سادیہ نے تیزی سے اس کی ہتھیلی آنکھ پر سے ہٹائی تھی۔

”مت چھپاؤ اپنا چہرہ میری نظروں سے۔ مدتوں دعا کی ہے اس چہرے کو دیکھنے کی۔“ اس کا لفظ لفظ جیسے رورہا تھا۔ پتھر کر ٹوٹا تو وہ بھی تھا، مگر وہ تو جیسے اپنا وجود ہی کھوئے بیٹھی تھی۔ اتنا درد تھا، اس کے لہجے میں ایسی حسرت بھری نظروں سے وہ اسے دیکھ رہی تھی کہ وہ اس کے سنگ مٹی میں بیٹھا اپنے آنسو پہ قابو نہ رکھ سکا۔

”بولو نہ کیسی ہو۔“ سادیہ کا ہاتھ بے ساختہ اس کے بائیں رخسار پہ آٹھرا تھا۔

”جب تم ساتھ نہیں ہوتے تو یہی دنیا بری لگتی ہے، سارے رنگ پھلکے لگتے ہیں خود پہ اختیار کھونے لگتی ہوں۔ تب ہر کوئی روک روک کر پوچھتا ہے۔ ایسی کیوں ہو رہی ہو، اتنی دلچسپی کیوں ہو؟ رونا کیوں آ رہا ہے۔ تب میرے سامنے لفظ نہیں ہوتے کہ انہیں مطمئن کر سکوں، تب انہیں جھٹلا دیتی ہوں۔ نفلی مسکراہٹ اونچی ہنسی سے درد چھپا لیتی ہوں اور اب جب تم ساتھ ہو تو مجھے کسی کو جواب دینے کی فرصت نہیں کہ میری صبح اور شام تمہارے سنگ جویتی ہے۔ تم ضروری یہ ہو میری زندگی کے لیے۔“ وہ واقعی کوئی دیوانی تھی، جس کا لفظ لفظ نوہ پڑھ رہا تھا۔ اویز نے بہت محبت سے اپنے گال پہ موجود اس کا ہاتھ تھام کر اپنے دونوں ہاتھوں میں بھر لیا۔ ”کیوں کیا تم نے نکاح؟ ذرا سی بے اعتباری یہ صرف اک لب اسٹک کے نشان پہ اپنی میری زندگی کو داؤ پہ لگا دیا تم نے..... یہ بھی تمہاری محبت۔“ سادوں پہلے کا گلہ اویز یوسف

بھونٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیر آئل

SOHNI HAIR OIL

- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- بے بال آکاٹا ہے۔
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے
- یکساں منہ۔
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔



قیمت - 150/- روپے

سوہنی ہیر آئل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیار
 کر کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ توڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں
 ایک دوسرے شہر میں دستیاب نہیں کر سکتے ہیں، اس میں دقتی خریدنا جاسکتا ہے، ایک
 بوتل کی قیمت صرف - 150/- روپے ہے، دوسرے شہر والے سنی آڈار بھیج
 کر جڑی بوٹیوں سے منگوائیں، ہر جڑی سے منگوانے والے سنی آڈار اس
 حساب سے بھجوائیں۔

- 2 بوتلوں کے لئے ----- 350/- روپے
- 3 بوتلوں کے لئے ----- 500/- روپے
- 6 بوتلوں کے لئے ----- 1000/- روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارج شامل ہیں۔

منفی آڈر بھجئے گئے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53- اورنگز، باب مارکیت، کیٹھن روڈ، ایم اے جناح روڈ، کراچی
 دستی خریدنے والے حضرات سوہنی بھونٹی آئل ان چیکوں
 سے حاصل کریں
 بیوٹی بکس، 53- اورنگز، باب مارکیت، کیٹھن روڈ، ایم اے جناح روڈ، کراچی
 مکتبہ عمران ڈائریکٹسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
 فون نمبر: 32735021

میرے اندر ڈالا تو نصیب میں کیوں نہیں؟ تب اک
 رات کشف ہوا کہ تم میرے لیے آخرت میں ہو۔ تم
 میری وہ زینا ہو جو بھلے میرا نصیب یہاں نہ بن سکیں،
 وہاں بنو گی اور وہاں میں کسی کو ہمارے بیچ نہیں آنے
 دوں گا۔“ ساویہ کو جہاں اپنا کشف اس کے منہ سے
 سن کر حیرانی ہوئی وہیں اس کی سسکیاں تیز ہو گئیں۔
 ”تم نے کیوں نہ کی پھر محبت، کیوں گھر اور دل
 نہیں بسایا پھر۔“ اویز یوسف کو پرانی ساویہ کو اس کے
 چہرے پہ ڈھونڈنے میں بہت دقت ہو رہی تھی۔ وہ
 واقعی اس سے زیادہ جنونی محبت کرتی تھی۔ تب ہی تو
 کا وجود ہجر میں کھل گیا تھا۔ ساویہ پر درد مسکراہٹ
 چہرے پہ سجائی۔

تم لے لو تمہارے بعد
 کسی کا خواب دیکھا ہو
 کسی کو ہم نے چاہا ہو
 کسی کو ہم نے سوچا ہو
 کسی کی آرزو کی ہو
 کسی کی جستجو کی ہو
 کسی کی راہ دیکھی ہو
 کسی کا قرب مانگا ہو
 کسی کو ساتھ رکھا ہو
 کسی سے آس رکھی ہو
 کوئی امید باندھی ہو
 کوئی دل میں اتارا ہو
 کوئی تم سے پیارا ہو
 کوئی دل میں بسایا ہو
 کوئی اپنا بنایا ہو
 کوئی روٹھا ہو تو ہم نے
 اسے رو، رو منایا ہو
 دسمبر کی حسین رت میں
 کسی کا ہجر کھیلنا ہو
 کسی کی یاد کا موسم
 میرے آگن میں کھیلنا ہو
 کسی سے بات کرنے کو

کبھی یہ ہونٹ ترسے ہوں
کسی کی بے وفائی پر
کبھی یہ نین برسے ہوں
کبھی راتوں کو اٹھ اٹھ کر
تیرے دکھ میں نہ روئے ہوں
قسم لے لو تمہارے بعد
اک بل بھی سوئے ہوں
قسم لے لو بھی جگنو، کبھی تارا
کبھی مہتاب دیکھا ہو
قسم لے لو تمہارے بعد
کسی کا خواب دیکھا ہو

اوزیر یوسف اس کے آنسوؤں میں بھکے لفظ لفظ
یہ دل کو کتنا محسوس کر رہا تھا۔ وہ بچی سب کچھ کہہ گئی
تھی۔ دونوں نظر بھر کر اک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔
دو عشق کے مارے ساتھ رو رہے تھے، کبھی
چپ ہو کر باتیں کرنے لگتے، پھر کبھی ہنسنے لگتے۔ وہ
ان پلوں میں سالوں کی دوری کو سمیٹ لیتا چاہتے
تھے۔

”تم واپس شہر نہیں گئیں آج تک؟“
”تم جو یہیں چھوڑ کر گئے تھے۔ امید تھی ایک
دن ہمیں لوٹ کر آؤ گے۔ نہ ملی تو پھر کہاں ڈھونڈتے
پھرو گے۔“ وہ اس کے زندگی کی رفق سے عاری
چہرے کو دیکھ کر رہ گیا۔
”اتنی محبت کرتی ہو مجھ سے؟“ وہ آج بھی
اظہار سننا چاہتا تھا۔

”تمہاری سوچ سے کہیں زیادہ۔“ اسے پتا تھا
کیا جواب ہوگا، تب ہی مسکرا دیا۔
چلو ان خواب اور برداشت نہیں ہوتا۔ ہم بہت
دور چلے جائیں گے۔“ وہ اس کے ڈھلکتے آنچل کو سر
پہ ڈالنے لگا۔

”دور تو جا رہی ہوں۔“ وہ مجروح انداز سے
مسکرائی تھی، اسے اٹھانے کی کوشش میں وہ ڈر کر اس
کی انگلی پر گرفت مضبوط کر گیا تھا۔
”کیا مطلب..... تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟“

سہمی! اس کے چہرے پہ پھیلی اذیت دیکھ کر وہ ایک
دم سے پریشان ہو کر اسے پکارنے لگا۔
”پریشان نہ ہو، میں ٹھیک ہوں۔“ اس کی
آنکھیں بار بار بند ہو رہی تھیں جنہیں وہ بالکل جھپک
جھپک کر بار بار کھول رہی تھی۔ اوزیر یوسف نے اس کا
ڈھلکتے سر کو اپنے بازو کا سہارا دیا۔ ”تم ٹھیک نہیں ہو۔
جزہ گاڑی نکالو،“ اس نے اسے کہنے کے بعد چیخ کر
جزہ کو آواز دی تھی۔ جزہ دور سے ہی دو دیوانوں کو
ملنے آسو بہاتے دیکھ کر اپنے آنسو صاف کرتے
رب سے معافی کا خواستگار تھا۔ اوزیر یوسف کی پکار پہ
وہ بے ساختہ گاڑی نکالنے بھاگا تھا۔ لیکن بہت دیر
ہو چکی تھی۔ اسے برین ہیمرج ہوا تھا۔ اوزیر یوسف کی
منہی میں دہلی اس کی انگلی بے جان ہو گئی تھی، مگر وہ
دیوانوں کی طرح اس کے زرد چہرے کو تنکے جا رہا تھا،
جس پہ اب ایک سکون طاری ہو گیا تھا۔
”انکل! آپ قاتل ہو۔ آپ نے بڑی ماما کو
مار دیا۔ وہ کہتی تھیں میرے قاتل ایک بار آ کر صورت
دکھا دو۔ پھر میرا دم نکل جائے گا۔ تو آپ ہی وہ قاتل
ہو جس کے لیے بڑی ماما روٹی رہتی تھیں۔“ جزہ کا چار
سالہ بیٹا اس سے خفگی سے پوچھ رہا تھا اور اس کا چہرہ
دھواں دھواں ہو گیا تھا۔ ”میرے قاتل مجھے جینے کا
حق تو دو۔“ وہ جب کبھی ناراض ہوتا تھا تو وہ یہ جملہ
کہتی تھی، لیکن یہی جملہ اس کی زندگی پہ لاگو ہو گیا کسی
نے اسے جینے کا حق نہیں دیا۔ ”مرد کو محبت کرنے سے
پہلے اپنی ماں سے اجازت لینی چاہیے، تاکہ اس خطا
پہ لڑکی ماں کی عزت مجروح نہ ہو۔“ اوزیر یوسف اگر
کے کمرے سے اس کی یادیں سمیٹنے آیا تھا۔ جب
دیوار پہ لکھے اس جملے نے اسے پیشانی دیوار سے
ٹکرا کر آسو بہانے پہ مجبور کر دیا۔

☆☆

شبثہ گل

درس کا لٹریچر



کے خاندان کو پشتوں سے جانتا تھا۔ سلمان تھوک نکل کر بولا۔

”ماں کہتی ہے مولیٰ کے پتوں کا ساگ بڑا لذیذ بنتا ہے۔“ کہہ کر اس نے سر جھکا لیا۔ چاچا کرم دین کی آنکھوں میں ترحم ابھرا پھر اس نے قصداً ”لا پروا انداز اپنایا۔

”ٹھیک ہے پتر۔ ماں کو کمنا رکھ دوں گا کل سے۔“ وہ سر اٹھائے بنا اسی طرح ایڑیوں پر گھوما اور تیز تیز چلتا گھر آ گیا تھا۔ چاچا کرم دین کی متاسف نگاہوں نے دور تک اس کا پیچھا لیا اور جب وہ نظر سے اوجھل ہو گیا تو اپنا رومال جھٹک کر کندھے پر ڈالا اور ایک ٹھنڈی آہ بھر کر بولا۔

”واہ رے مولا، تیری تو ہی جانے... خیرات بانٹنے والے آج خود خیرات پر آگئے۔ ایسی ذلت سے پہلے تو اٹھالے مولا۔“

سلمان ماں کو بتا نہیں سکا کہ مولیٰ کے پتے آج بھی مل جاتے اگر وہ تھوڑا بے شرم بن جاتا۔ مگر کیسے بن جاتا... گھڑی نے دو بجنے کا اعلان کیا اس نے آنٹوں کی آہ وزاری پر اپنی انا کو کوسا قدسیہ نے ٹٹلتے ٹٹلتے یونہی فریج کا دروازہ کھولا اور اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ فریج کے سبزی والے ڈبے میں ایک بڑے سائز کا آلو بڑا تھا۔ قدسیہ نے کسی ہیرے جواہرات کی طرح اسے شخصی میں دو بوجا اور باورچی خانے میں بھاگی۔

نہ پیا نہ نمائے۔ بس آلو کے باریک باریک قتلے کاٹے، ڈھیر سارا پانی اور نمک مرچ ہلدی ڈال کر پو لیے پر چڑھا دیا۔ تین روٹیوں کا آنا گندھا بڑا تھا۔ اس کے پیڑے بنائے اور تو اچو لیے پر رکھا ہی تھا کہ گلی میں شور مچا اٹھا۔ آہو کا، جیج ویکار، گرہی وزاری، آوازیں اتنی بلند ہوئیں کہ وہ دل پر ہاتھ رکھ کر باہر نکلی۔

”یا اللہ خیر۔“ گلی کے رخ پر بنے کمرے کی کھڑکی کھول کر اس نے باہر جھانکا۔ سامنے والے گھر کا دروازہ پورا کھلا تھا اور گھر کی مالکن بانو دلیپز پر کھڑی اپنے کال پیسٹ رہی تھی۔

”کیا ہوا ہے سلیمان؟“

بلا مبالغہ کوئی تیسری بار اس نے ایک ایک ڈبے کو ہلا ہلا کر اور پھر کھول کھول کر دیکھ لیا۔ جب ہلانے پر کوئی آواز نہیں آئی تو صاف ظاہر ہے کہ ڈبا خالی ہے، نجانے پھر ڈمکن کھول کر وہ ڈبے کے اندر کون سا معجزہ تلاش کرنے کے لیے جھانکتی تھی۔ ہر ڈبا یوں کھولتی جیسے پچھلی بار اسے کھولنا بھول گئی ہو۔ وہ قدسیہ کا باورچی خانہ تھا کسی پانچ ستارہ ہوٹل کا نہیں۔ اس میں تو کین کر آٹھ دس ڈبے ہی دھرے تھے بس۔ تھک بار کر اس نے ایک بار پھر کونے میں بڑی پیاز کی ٹوکری سے کپڑا ہٹایا۔ معجزہ وہاں بھی نہ ملا۔ وہ کپڑا واپس سلیقے سے پھیلا کر باورچی خانے سے باہر نکل آئی۔ سفید پوش عورت کے پاس اس کا سلیقہ ہی واحد خزانہ ہوتا ہے جسے نہ تو وہ بیچ سکتی ہے نہ پکا کر بچوں کو کھلا سکتی ہے، یہاں مگر اس سے راز کھولنا تن ضرور ڈھانک سکتی ہے، سو وہ بھی یہی کر رہی تھی۔

”سلمان، میا تم نے سبزی والے سے مولیٰ کے پتوں کا کہا تھا۔“ وہ کمرے میں سر نہیوڑائے بیٹھے اٹھارہ سالہ بیٹے کے پاس آس لیے آئی۔ اس نے سر اٹھا کر ماں کو دیکھا۔

”جی کہا تھا۔ آج تو وہ پتے پھینک چکا، کل کا وعدہ کیا ہے کہ رکھ دے گا میرے لیے۔“

قدسیہ نے ایک گہری سانس بھری۔

”چلو آج نہ سہی کل کی باندھی کی فکر تو دور ہوئی۔“ مولا تیرا شکر۔“ سلمان اور اس نظروں سے ماں کو جاتا دیکھنے لگا۔ بھوک سے سگرتی آنٹوں کے ساتھ وہ شکر کا کلمہ کیسے بڑھ لیتی تھی، سلمان کی سمجھ سے باہر تھا۔ سبزی والے نے اس کے سامنے مولیٰ کے پتے پکڑے کے ڈھیر پر پھینے تھے مگر وہ اسے روک نہ سکا کیونکہ اس وقت دکان پر بے حد رش تھا۔ وہ درجنوں لوگوں کے بیچ کیسے اپنا پردہ کھول دیتا۔ سب کے چلے جانے کے بعد اس نے سبزی والے سے کہا۔

”چاچا۔“ میری ماں نے کہلایا ہے کہ کل سے مولیٰ کے پتے پکڑے پر نہ پھینکنا، ہمارے لیے رکھ دینا۔“

چاچا نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ وہ ان

اس نے کھڑکی کے پاس کھڑی برابر والی پڑوس کو پکار کر پوچھا۔
 ”بانو کی بیٹی کا جینز چوری ہو گیا۔“
 سلیمان نے آہستہ آواز میں کہا تو قدسیہ کا منہ کھل گیا۔

”بانو کی بیٹی... وہ آمنہ؟ اس کا جینز؟ وہ تو ابھی صرف آٹھ برس کی ہے۔ بہن۔“
 سلیمان نے ناک پر انگلی رکھ کر قدسیہ کو افسوس بھری نظر سے دیکھا۔

”ماں تو تجھے نہیں بتا کیا۔ پشوریوں کے گھر تو جس دن لڑکی پیدا ہوتی ہے اسی دن ایک جوڑا صندوق میں گرا کر جینز بنانا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر روزی اس صندوق میں کچھ نہ کچھ گراتے ہیں تو وقت پر جینز بنتا ہے۔“ قدسیہ ہونق بنی سلیمان کو دیکھتی رہی جو مزید کہہ رہی تھی۔

”فیر آمنہ آج آٹھ کی توکل اٹھارہ کی۔ ہے بھی بانو اور مراد کی اکلوتی دھی۔ آٹھ سالوں میں تو نجانے کیا کیا اکٹھا کر رکھا تو دونوں نے۔ چینیوں فریجنر تک رکھا تھا۔ وچاس ساٹھ تو لے تو صرف سونا تھا۔ کیرا برتن الگ۔ پر دیکھو قسمت، سب لٹ گیا۔ بازاری تو گئی ہوئی تھی بانو۔“

سلیمان نے کہیں سے کھینچ کر ایک مونسا آنسو گال پر گرایا اور آگے بڑھ کر بانو سے ہمدردی کرنے لگی۔

”حق بابا۔ سالان سو برس کا مل کی خبر نہیں۔“
 قدسیہ نے دکھ سے سوچا اور کھڑکی بند کر دی۔

”ایک ہم ہیں جو چوہا گرم رکھنے کے جتن کرتے ہیں، ایک وہ ہیں جو سالوں کا جمع جتھا لے بیٹھے ہوتے ہیں۔ یہ بھلا عمر رضی اللہ عنہ کا دور تھوڑا ہی ہے۔ یہ تو فتنے کا دور ہے۔ یہاں کسی کو کسی کی کیا خبر۔ یہاں تو ایسی نفسا نفسی ہے کہ کندھے سے کندھا ملائے بیٹھے کو بھی خبر نہیں کہ ساتھ والا سانس بھی لے رہا ہے یا گزر گیا۔“

قدسیہ زیر لب کہتی کمرے سے نکلی تو کچھ جلنے کی

ناگوار ہونے اسے حال میں لانچا۔
 ”بابے میں مر گئی۔“

ماں تھے پہ ہاتھ مار لی وہ باورچی خانے کی طرف بھاگی چوہا بند کیا، بے دھیانی میں گرم ڈھکن کو جو ہاتھ لگا کر جلد جلائی وہ الگ، جو ایک آنو کی ہنڈیا جلی وہ عم الگ۔ بے اختیار ایک آنسو اس کے گال پر لڑھک کر دوپٹے میں گم ہو گیا۔ بانو کالاکھوں کا مال اسباب لٹا اس کے دل میں دکھ کی ایک لہر بھی نہ اٹھی۔ اپنا چند روئے کا ایک آنو جلا تو اسے لگا کائنات لٹ گئی۔ کون سی شے کس کی کل کائنات ہے، کون جانے۔

جو جھل دل کے ساتھ تین روٹیاں پکا کر اس نے ادھ جلے آنو میں مزید پانی ڈال کر دوسرا ترخان پر رکھ دیا جسے اس نے اپنے میاں اور تین بچوں کے ساتھ احتیاط سے کھایا۔ فیضان اور رائیہ تو چھوٹے تھے البتہ سعادت اور سلمان آدھا پیٹ ہی ہاتھ روک کر پیچھے ہٹ گئے۔ دن کا طعام ہوا تمام۔ شام اتر آنے سے قبل ہی رات کی فکر دامن گیر ہو گئی۔ لیکن رزق کا وعدہ رب کا وعدہ ہے۔ رات کو سلیمان نے چنپالا ڈپکا یا اور بڑی پلیٹ بھر کر ان کے گھر دے گئی۔ ساتھ سوچی کا طلوہ بھی تھا۔ سلیمان کی بیہوش بیٹی آنی تھی اسی لیے اہتمام کیا تھا۔ ان سب نے شکر بجالا کر کھایا اور وہ قائل دن بھی تمام ہو گیا۔



ایسا نہیں تھا کہ سعادت نکھٹو تھا۔ اسے جو تیاں چٹختے ساتھ آٹھ ماہ ہو گئے تھے مگر نوکری نہ ملتی تھی۔ اتنے مہینوں میں ہزاروں روپے کا قرض اس پر چڑھ چکا تھا اور اب مزید کوئی ایک آنہ بھی قرض دینے کو تیار نہ تھا۔ تعلیم اتنی تھی نہیں کہ کوئی اعلا نوکری مل پائی اور معمولی نوکری پر اس کی صورت آڑے آجاتی۔ وہ بلا کا خو برد، وجہ اور شاندار مرد تھا۔ کئی مرتبہ اسے دکان پر سیلز مین رکھا گیا مگر لوگ اسے مالک سمجھنے لگتے اور مالک حسد کا شکار ہو کر اسے نوکری سے فارغ کر دیتا۔ کچھ تو صورت اچھی تھی کچھ اچھے وقتوں کے سنبھال کر رکھے

اس کے ادھورے جملے کے پورے مفہوم سمجھنے میں قدسیہ ماہر تھی۔ تیزی سے برتن اور چھری اٹھا کر وہ برآمدے میں آئی اور بچوں کو پکارا۔
 ”آجاؤ بچو، گرما کھا لو۔“ پھر آواز قدرے دھیمی کر کے خود کھامی کے سے انداز میں بولی۔
 ”گرما بڑا بھاری ہوتا ہے، ایک ایک قاش سے ہی سب کا پیٹ بھر جائے گا۔“

سعادت نے دکھ کو نیزے کی صورت دل میں گڑتا محسوس کیا۔ قدسیہ نے کرے کی چھ قاشیں بنائیں۔ ارادہ تھا کہ چھٹی قاش وہ سعادت اور سلمان کو آدھی آدھی دے دے گی۔ فیضان اور رانیہ تو چھوٹے تھے ان کے لیے ایک ایک قاش بھی کافی تھی۔ رہ گئی وہ خود۔۔۔ تو ماں تو ہمیشہ اپنا نوالہ اولاد کے منہ میں ڈالتی ہے۔ ابھی وہ لوگ کھا ہی رہے تھے کہ گھنٹی بجی۔ سلمان نے کھڑکی سے دیکھا۔

”ابو۔۔۔ مسرور بابا آئے ہیں۔“ قدسیہ اور سعادت کی نظریں ملیں۔ سعادت نے آخری کلمہ منہ میں ڈالا اور اٹھا۔

”بیٹھک میں بٹھاؤ میں آ رہا ہوں۔“ قدسیہ نے خاموشی سے چھٹی قاش پلیٹ میں رکھ کر سلمان کو تھمائی۔

”جاؤ بیٹا، یہ مسرور بابا کو دے آؤ۔“ ڈپلٹ لے کر بیٹھک کی طرف مڑ گیا اور وہ چھوٹے بچوں کی لچائی نظروں کی مایوسی سے نگاہ چراتی اٹھ گئی۔

مسرور بابا، سعادت کے والد کا پرانا نمک خوار تھا۔ اس نے سعادت کو اپنے ہاتھوں میں کھلا کر بڑا کیا تھا۔ دکان کے کام کاج گھر کا سودا سلف سعادت کو اسکول لانے لے جانے کی ذمہ داری ہر کام مسرور بابا کے ذمے تھا۔ وقت بدلا حالات بدلے۔ آج سعادت اور مسرور بابا ایک درجے پر کھڑے تھے۔

”پتر صرف دو سو روپے کی ضرورت تھی، تھوڑا سا سودا گھر لے جاؤں، کھانے کو ایک روٹی تک نہیں۔“ سعادت کا سر جھک گیا۔

”بابا، آپ یقین نہیں کریں گے، سودا ہمارے گھر کا

گئے لباس ایسے تھے کہ سب کو شک میں مبتلا کر دیتے۔ کوئی اسے ضرورت مند سمجھنے پر تیار ہی نہ ہوتا۔ ایک زمانہ جانتا تھا کہ وہ جدی پشتی کاروباری خاندان تھا لیکن باپ دادا کا کاروبار یکنخت ایسا ٹھپ ہوا کہ وہ دیکھتے ہی رہ گئے۔ قریبی خیر خواہ بھی کہتے کہ ان کی ٹھاث باٹ اور آن بان کو بری نظر کھا گئی ورنہ یوں سونا خاک ہوتے کبھی نہ دیکھا تھا۔ جوان کے ملازمین تھے اب وہ ترقی کر کے کاروباری بن چکے تھے۔

نوکری کی تلاش سے تھک کر سعادت اپنے دوست وارث کے میڈیکل اسٹور پر جا بیٹھتا۔ وہ اس کا گہرا دوست تھا لیکن اس کی طرح وہ بھی سفید پوش تھا۔ سیلزمین رکھنے کی عیاشی کا محتمل نہیں ہو سکتا تھا اور بیٹا اللہ نے اسے دیا نہیں تھا سو خود ہی دکان چلاتا تھا۔ ایک آدھ بار سعادت اس سے بھی قرضہ لے چکا تھا لیکن مزید مانگنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ بس سر جھکائے بیٹھا رہتا۔ وارث خوب سمجھتا تھا لیکن کچھ کرنے سے قاصر تھا کیونکہ اس کی چار بیٹیاں تھیں جن میں سے تین بیاہے جانے کی عمر میں تھیں اور ایک کی شادی بھی طے ہو چکی تھی۔ وہ بس اپنا دال دلیہ چلا لیتا تھا۔

اس روز سعادت ضرورت سے زیادہ خاموش تھا۔ کئی دن موبی کے پتے کھالیے تھے۔ ایک بار پھر چولہا ٹھنڈا تھا۔ صبح ناشتے میں سب نے صرف ایک ایک پیالی چائے پی تھی اور پڑوس سے آئی نیاز کا حلوہ دو دو چمچ چھ لیا تھا۔ وارث دوپہر کے کھانے اور قبولہ کے لیے دکان بند کر کے ایک ٹھنڈے کے لیے گھر جاتا تھا۔ وہ اٹھا تو سعادت کو بھی اٹھنا پڑا۔ باتیں کرتے کرتے دونوں پیدل ہی گھر کی طرف رواں دواں تھے۔ راستے میں وارث نے رک کر ایک پھل والے سے گرما خرید اور آدھا کٹوا کر سعادت کو دے دیا۔ دل پر بے حد بوجھ لیے سعادت نے خاموشی سے تھیلہ اس سے لیا اور دونوں اپنی اپنی گلی میں مڑ گئے۔ گھر آ کر تھیلہ اس نے قدسیہ کو پکڑا دیا۔

”وارث نے دلا دیا۔۔۔“

سعادت کی اونچی پر خوش آوازوں پر وہ جھٹکا کھا کر اٹھ بیٹھی۔
 ”کون بھولا بسرا آگیا۔“ اسی وقت سعادت اندر آیا۔

”او بھیلے لوکے، کوئی چائے پانی بن سکتا ہے یا نہیں؟ او کچھ ڈھونڈ میرا یا ر مصطفیٰ آیا ہے۔“
 وہ کہہ کر واپس بیٹھک میں ٹھس گیا اور قدسیہ پریشان سی باورچی خانے میں آگئی۔ مصطفیٰ سعادت کا کادوست تھا۔ کچھ عرصے سے دوسرے علاقے

بھی رہا رہا ختم۔ جس میں یہ سحر شرمندہ ہوں۔ آپ یہ مگر کھا کھائیں، ہم نے بھی دن کے کھانے میں یہی کھلایا ہے جیسے ہی مجھے کہیں سے پیسے ملے میں فوراً آپ کو بھی پہنچا دوں گا۔“ مسرور بابائی آنکھوں میں آنسو آ رہے۔

”مجھ سے تیری یہ حالت دیکھی نہیں جا رہی پتر۔ تیرے باپ کے وقتوں میں تو پھلوں کو نوکرے آتے تھے نوکرے۔“ لنگر چتا تھا تیرے گھر۔ آج یہ کیا ہو گیا پتر۔ اللہ تجھ پر رحم کرے۔“

”آزائش ہے بابا آزمائش“ اسے ہنس کر گزارنا ہے۔“ سعادت نے یہ کہتے ہوئے جیسیں ٹٹولیں تو دوس کا نور ہاتھ میں لے لیا۔ اس نے وہ نوٹ مسرور بابائی جیب میں ڈالیا۔

”یہ ایک نوٹ اٹکا ہے بابا، ایک روٹی تو آجائے گی۔“ مسرور بابا کے اشکوں میں روٹی آگئی۔
 ”اللہ تجھے مال مال کرے پتر تیرے تھوڑے رزق میں کروڑوں کی برکت دے۔“ وہ دعائیں دیتا رہتا ہوا رخصت ہو گیا۔ سعادت اندر آیا تو بچے اپنے کمرے میں لیٹ چکے تھے۔ قدسیہ بھی کمرے میں لیٹی چھت پر لیٹ کر سو رہی تھی۔ وہ بھی خاموشی سے لیٹ گیا۔ جیب خالی ہو تو باباں بھی ختم ہو جاتی ہیں۔ خالی جیب تو خیالی بلاؤ کا گانا بھی اچھا نہیں لگتا۔ اپنی اپنی سوچوں میں گم دونوں کی آنکھ لگ گئی۔



عصر کا وقت ہو گا جب ایک بار پھر گھنٹی بجی۔ سعادت کی آنکھ یوں کھلی جیسے وہ سویا نہ تھا۔ بچوں کی بے آرامی کے خیال سے وہ خود ہی اٹھ کر دروازے پر گیا۔ قدسیہ اسی طرح کسلمندی سے پڑی رہی۔ مضمون پڑی کے غریبوں سے زیادہ مفلس بچے مکان والے سفید پوش ہوتے ہیں، جن کے خونی رشتے بھی ان کے قریب سے سر جھکا کر یوں گزرتے ہیں جیسے ہانتے نہ ہوں۔ ایسے میں کسی مہمان کی کیا توقع ہوتی۔ اس پریشانی سے وہ لوگ آزاد تھے۔ لیکن باہر سے آتی

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنف	قیمت
بسا دل	آمنہ ریاض	500/-
ذروموسم	راحت جبین	1000/-
دعائی اک روشنی	رہسانہ کارعدنان	500/-
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رہسانہ کارعدنان	200/-
شہر دل کے دروازے	شازیہ چوہری	500/-
حیرے نام کی شہرت	شازیہ چوہری	250/-
دل ایک شہر چوں	آسیہ مرزا	450/-
آنکھوں کا شہر	فازہ افکار	500/-
بہل بھلاں حیرتی گلیاں	فازہ افکار	600/-
بھلاں دے رنگ کالے	فازہ افکار	250/-
یہ گلیاں یہ چہ ہارے	فازہ افکار	300/-
میں سے عورت	غزالہ مزین	200/-
دل آء صحر لایا	آسیہ درازی	350/-
نکھرنا چائیں خواب	آسیہ درازی	200/-
دھم کوہندی سہائی سے	فوزیہ یاسین	250/-
شام آرزو	ایم سلطانہ فخر	400/-

اساس ہے۔

ہاتھ کھینچ کر استعمال کرتے چار پانچ دن نکل گئے۔ رب کا کرم یہ تھا کہ وہ لوگ بھوکے بھی نہ سوئے۔ آدھے پیٹ ہی سہی وہ مالک انہیں کچھ نہ کچھ کھلاتا ضرور تھا۔ پانچویں دن مصطفیٰ ایک بار پھر آیا اور سلمان کو بھی بیٹھک میں بلا لیا۔

”دیکھ سعادت، تیرے پاس کپڑے کے کاروبار کا تجربہ ہے، مجھے میری صدر والی دکان کے لیے میجر چاہیے۔ تو وہ سنبھال لے۔ سلمان پتر تو میری شہروالی دکان پر یلزمین لگ جا۔“

سعادت خوشی سے بے حال ہو گیا لیکن سلمان کا چہرہ اتر گیا۔ مصطفیٰ نے صاف محسوس کیا۔

”مصطفیٰ، یہ پڑھنا چاہتا ہے، اس نے صرف انٹر کیا ہے۔“ مصطفیٰ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔

”پڑھ لینا، ریسٹیوٹ پڑھ لینا پتر۔ تو بڑا ہے تجھے قربانی دینی پڑے گی۔ چھوٹے بس بھائی کو اچھا پڑھانے کے لیے تجھے ریسٹیوٹ پڑھنا پڑے گا۔ دل چھوٹا نہ کر۔“

مصطفیٰ کی بات حق تھی۔ سلمان حقیقت پسند باپ کا حقیقت پسند بیٹا تھا۔ رزق گھر چل کر آیا تھا۔ لات مار کر ناشکری کیوں کرتا۔ ایک دس کے نوٹ نے باپ بیٹے کو برسرِ روزگار کر دیا تھا۔ پانچ سو روپیہ مسرور بابا کو دینے کے لیے جاتے وقت دل میں کئی بار خیال آیا کہ دو سو اسے دے کر تین سو جیب میں ڈال لے، لیکن تربیت آڑے آگئی۔ نوٹ بابا کو پکڑاتے وقت بھی اس کا دل گھٹ رہا تھا لیکن مسرور بابا اور اس کی بیوی نے جب جھولی اٹھا کر دعائیں دیں تو وہ شرمندہ ہو گیا۔ یہ پانچ سو دس روپے کی کرامات اس کے سامنے تھیں۔ اس نے تہیہ کیا کہ اپنی تنخواہ میں وہ مسرور بابا کو حصہ دار بنائے گا۔

میں شفٹ ہو گیا تھا تو میل جول چھوٹ گیا تھا۔ کئی سال بعد اس نے اس پرانے محلے کا چکر لگایا تو سعادت کی یاد آئی۔ قدسیہ نے لال شہرت کی بوتل اٹھائی۔ پیندے میں ذرا سا لگا تھا۔ اس نے پانی میں چینی گھول کر وہ ذرا سا شہرت انڈیلا اور برف ڈال کر سلمان کے ہاتھوں بیٹھک میں بھیج دیا۔ فقط ایک گلاس مصطفیٰ نے شہرت کو غور سے دیکھا پھر گھونٹ بھرا۔ شہرت کی رنگت اور ذائقے نے صاف بتا دیا کہ اسے چینی سے میٹھا کیا گیا ہے۔ سعادت کے خوبو چہرے پر بڑی پریشانی کی لکیریں باقی حال بیان کر رہی تھیں۔ اس نے چند سوالات کیے جن کے سعادت نے ڈھکے چھپے جوابات دے دیے۔ یوں کہ بھرم بھی رہ جائے اور پیغام بھی نہ پہنچ جلتے۔ مصطفیٰ کو بے حد دکھ ہوا۔ جاتے ہوئے اس نے ملاقات کے بہانے بچوں کو بلوایا، ”ان سے ملا چھوٹے چھوٹے سوالات کیے اور دس سالہ رانیہ کے ہاتھ پر ہزار کانوٹ رکھ کر نکل گیا۔“

گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ سب کے چہرے چمک اٹھے۔ سعادت نے فوراً ”جا کر ضروری سودا سلف خرید، سودا قدسیہ کو تھمایا اور پانچ سو کانوٹ سلمان کو دیا۔“

”یہ جا کر مسرور بابا کو دے آؤ۔“ سلمان کا منہ کھل گیا۔ تین چار سو کا سودا وہ لے آیا تھا، پانچ سو بابا مسرور کو بھجوا رہا تھا تو جیب میں کیا بچنا تھا۔

”برابو انہوں نے تو بس دو سو روپے مانگے تھے۔“ وہ کہنے بغیر نہ رہ سکا۔ سعادت مسکرایا اور بولا۔

”اس کو دس روپے دیے تو یہ ہزار کانوٹ رب نے اسی کے صدقے دیا۔ پھر تاؤ وہ برابر کا حصہ دار نہ ہوا؟ جیب میں اٹھنی بھی ہو تا تو غریب کو دینے سے گریز نہ کرنا۔ جو اٹھنی تمہارے لیے پچاس پیسے ہیں وہ غریب کے لیے پچاس روپے کی حیثیت رکھتی ہے۔“

سلمان سر ہلاتا ہوا نوٹ جیب میں ڈال کر باہر نکل گیا۔ سعادت کو اطمینان تھا کہ بچوں کو دولت دے سکا یا نہ دے سکا مگر قناعت، شکر گزاری اور فراخ دلی ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ یہی انسانیت کی

نگار خان

حیاتِ جاری

بہارِ انتظار



جی ”کبھی کبھی جو ہمیں اپنے معیار سے نیچے لگتا ہے، وقت دکھا دیتا ہے کہ اصل میں وہ ہمارے معیار سے کس قدر اونچا تھا۔“ اس نے دور آسمان پر نگاہ کی تھی۔ تھکے ہارے پرندے دن ڈھلتے ہی اپنے گھونسلوں کی طرف رواں تھا۔ اور دھندا ترنے لگی تھی۔ وہ شاید اپنے ہی گھر کا پتا بھول چکا تھا۔

☆☆☆

وہ سب گنے کے کھیت میں چھپ کر بیٹھے تھے۔ ان سب کی نظریں ان سے کچھ دور ذرا اونچی پگڈنڈی پہ لیئے وجود کی طرف مرکوز تھیں جس کے صرف ملائم جگے پر صاف نظر آرہے تھے۔ تبھی پگڈنڈی کے دوسری طرف موجود سرسوں کے کھیت میں ذرا سی حرکت ہوئی تھی، راستے پہ لیٹا وجود لیئے لیئے ہی ذرا سا تن گیا۔ وہ سب چونکے ہو گئے۔ اور پھر اچانک ہی اس وجود نے کسی ماہر اٹھلپ کی طرح قلاچی بھری تھی اور اگلے لمحے ایک زوردار چیخ ابھری تھی۔

گنے کے کھیت سے بچوں کی فوج برآمد ہوئی تھی۔ وہ سب پگڈنڈی پر چڑھ آئے تھے۔ آدھے پورے کپڑے پہنے گورے کالے موٹے پتلے بچے بھی اب دوسری طرف اس وجود کو تلاش کر رہے تھے۔ جو ایک اور فاتحانہ چیخ مارتا اور پاتا تھا۔

سبز آچل کی شگفتگی نے سبزے کی تازگی کو بھی جیسے شکست دی تھی۔ کٹورا غلانی آنکھوں اور گلابی ہونٹوں پہ شرارتی مسکراہٹ بچل رہی تھی۔

”کیا ہوا گلابی....؟“ ایک بچہ بے صبر اہوا، یہ عمر میں باقی سارے بچوں سے بڑا تھا۔

”بھاگ گیا؟؟“ ایک چھوٹے سے بچے کو تاسف نے گھیرا

”یہ دیکھو“ اس پری پیکر نے چلا کر اپنے ہاتھ ان کے سامنے کیے تھے، نرم ملائم روئی جیسا سفید خرگوش اس کے ہاتھوں کی قید میں جیسے بے فکری سے آنکھیں پٹپٹائے جا رہا تھا۔

”یا ہوا!“ سب بچوں نے خوشی سے زبردست نعرہ لگایا تھا۔ تبھی جیسے ان کی خوشی سے مست ہو کر

بادل بھی جھوم اٹھے تھے۔ ہلکی ہوا کے ساتھ منھنی منھنی رم جھم بھی شروع ہوئی تو وہ سب باقاعدہ ٹاپنے لگے۔ ”آؤ وہاں... وہاں... وہاں چلیں... آؤ وہاں۔“ وہ بے حد سریلی آواز میں گنگنائی تھی۔

”آؤ وہاں... وہاں... وہاں چلیں“ بچے ایک زبان ہو کر اس کے ارد گرد جھومتے ہوئے چلائے تھے۔

”اوئے ٹھہر جاؤ ذرا گٹوڑے موسیقارو، آج تم سب کی چمڑی اچھڑتا ہوں۔“ دور سے رعب دار مردانہ آواز پکاری تھی۔

”چاچا آگئے۔“ سب سے پہلے مخالف سمت دوڑ لگانے والی گلابی تھی۔ جس کا سبز آچل وہیں سرسوں کے پھولوں پر جا پھیلا تھا وہ البتہ بے خبر تھی۔

☆☆☆

حویلی کا اندرونی دروازہ بہت زور سے بند کیا گیا تھا، اس قدر زور سے کہ ساتھ والے کبھی کمروں کے کھڑکی دروازے بج اٹھے تھے۔

”یا اللہ خیر۔“ کا کی نے دہل کر دل پر ہاتھ رکھا تھا۔ ”سباعون (پشتو میں سبائون لکھتے ہیں) رکھا تھا میں نے اس کا نام یہ سوچ کر کہ صبح کی روشنی کی طرح ہی ٹھنڈے مزاج والا ہوگا بر سکون، نرم مزاج لیکن اس کے تیور تو جولائی کی گرمی کو بھی مات دے جاتے ہیں۔“ زمان خان نے مسکراتے ہوئے اخبار ایک سائنڈ پر رکھتے ہوئے کہا۔

”اتنا غصہ تو تب ہی کرتا ہے جب گلابی نے کچھ کہا ہو“ وہ پریشان ہوئیں۔

”امی.... بابا۔“ سباعون آوازیں دیتا قریب آ رہا تھا، آواز سے بھی غصہ صاف جھلک رہا تھا۔

”میں ہوں نہ، تم فکر مت کرو۔“ انہوں نے تسلی دی، سباعون پچھلی طرف بنے چھوٹے سے برآمدے میں آچکا تھا۔ وہ دونوں یوں بن گئے جیسے اب تک ان کو اس کی کوئی خبر نہ تھی۔

”بابا!“ تیز لہجے میں پکارا زمان خان نے چونکنے کی خوب اداکاری کی۔

”ہاں، کیا ہوا؟ خیریت۔“ اداکاری کچھ دور ہوگئی۔

”خیریت...؟“ گلائی کے ہوتے ہوئے ایسے ممکن ہے پھلا۔“ اس کی خوب صورت کھڑی ٹاک سرخ پڑنے لگی تھی، مطلب غصہ بے حد شدید تھا۔ ”کیا کر دیا پھر اس نے؟“ کا کی نے منہ بناتے ہوئے پوچھا۔

”یہ دیکھیں۔“ سبز ریشمی آنچل رنگ برنگی خوبصورت چارپائی پر اچھا لگایا۔ ”چاچا فانی نے دیا ہے مجھے۔“ کا کی کا تو منہ کھل گیا، زمان کے چہرے پہ البتہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ ”وہاں کیا کر رہا تھا یہ دوپٹا... یہ تو گلائی کا ہے اور فانی چاچا کا کھڑ تو یہاں سے بہت دور ہے،“ کا کی کی سمجھ میں معاملہ نہ آیا تو حیران پریشان ہوتی گئیں۔ ”اس کے پیر نکل آئے تھے، دوڑتا ہوا گیا تھا۔“ سباعون کو مزید غصہ آ گیا۔

”واپسی...؟“ حیرت زدہ سوال، اور زمان کا قہقہہ جاندار تھا۔ ”آپ کی لاڈلی چھوڑ کر آئی ہے فانی چاچا کے کھیتوں میں،“ لب کاٹتے ہوئے اس نے ان کی حیرت دور کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن حیرت سے ان کا منہ مزید کھل گیا تھا۔ ”تو اس میں کون سی بڑی بات ہے۔ کھیل کھیل میں بھول گئی ہوگی، زمان نے بالآخر کہہ ہی دیا، اور اب کی بار حیرت سے گنگ ہونے کی باری سباعون کی تھی۔

”کھیل کھیل میں بابا۔“ اسے جیسے شدید صدمہ ہوا تھا، وہ سر ہلا گئے۔

”وہ پندرہ سال کی سفیدے کے درخت جتنی لمبی لڑکی آپ کو کھیل کھیلنے والی بچی نظر آتی ہے۔“ وہ صدمے سے نڈھال تھا۔

”تم سے تو ذرا کم ہی قد ہے اس سفیدے کا۔“ زمان خان کی زبان بھی لڑکھڑائی۔ ”میرا مطلب ہے گلائی کا۔“ فوراً صبح کی گئی۔

”جد ہے بابا۔“ لہجے میں مزید تاسف گھلنے لگا۔ ”کبھی کبھی مجھے لگتا ہے آپ اس کے ماں باپ ہیں اور میں یتیم ہوں۔“ وہ دکھ بھرے لہجے میں کہتا اندر کی طرف بڑھ گیا۔

”یہ اس نے کیا کہہ دیا۔“ کا کی نے ایک مرتبہ پھر حیرت سے کہا۔ ”ڈائلاگ مارا ہے اور کہا۔؟“ زمان نے بے فکری سے کہتے ہوئے اخبار دوبارہ اٹھایا۔ اور ان کی توقع کی عین مطابق سباعون واپس پلٹ آیا تھا۔

”بابا۔“ اور زمان نے ہنستے ہوئے اس کی چوڑی کمر کے گرد دونوں بازوؤں کا مضبوط حصار باندھ دیا تھا۔ کا کی بھی مسکرا دی تھیں۔

☆☆☆

جیسے ہی دوپہریں لمبی ہوئی تھیں۔ اس کا وقت گزرتا حال ہو گیا تھا۔ گاؤں میں سب ہی چھوٹے بڑے پتی دوپہروں میں نیند کا ہزا لیتے اور وہ اکیلے کسی بدروح کی طرح ادھر اسے ادھر گھومتی رہتی۔ ابھی بھی کا کا، کا کی کے سو جانے کے بعد حویلی کے چھپلی طرف والی نہر کے پاس چلی آئی۔ یہ نہر حویلی کا حصہ نہیں تھی۔ لیکن جب سے پچھلے سیلاب میں حویلی کی چھپلی دیوار کا ایک حصہ گرا تھا اسے یہ نہر اپنے گھر کا ایک حصہ ہی معلوم ہونے لگی تھی، اور جب سب لوگ خواب خرگوش کے مزے لے رہے ہوتے وہ آرام سے اپنی کتابیں لیے ٹالی کے درخت کے نیچے آ بیٹھتی۔

”کوئی نئی کتاب نہیں ہے کہ پڑھ لیتی۔“ ٹالی کے تنے سے ٹیک لگائے ہوئے اس نے ادا سی سے سوچا تھا۔ تب ہی اس کی نظر نہر کے اس پار آم کے درخت سے ٹیک لگائے اس لڑکے پہ پڑی تھی، جو مزے سے کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھا۔ اس کا رخ دوسری طرف تھا تب ہی شاید اس کی نگاہ گلائی پہ نہ پڑی تھی۔ وہ تیزی سے ابھی اور بھاگی ہوئی ایک طرف درخت کے بڑے سے تنے سے بنائے گئے پل کو پار کر گئی، چند ہی لمحوں بعد وہ اس لڑکے کے

”کوئی سی بھی۔ جو اردو میں لکھی ہوں۔ اس میں کہانیاں ہوں، خیال ہوں، نظمیں ہوں، معلومات ہوں۔ اور بہت کچھ ہو۔“ وہ جب بولنے لگی تو اسے لگا وہ اس کی ساری خواہشیں اس کی گہری نیلی آنکھوں میں بولنے لگتی تھیں۔ ”اللہ نے اسے کس قدر پیارا بنایا تھا۔ وہ اٹھ گئی تھی۔

”سنو“ وہ کچھ دور ہی گئی تھی۔ جب اس نے دوبارہ پکار لیا گلانی مڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ بھاگتا ہوا اس کے قریب آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک اور کتاب تھی۔

”تم یہ رکھ لو۔ پڑھ کر مجھے واپس کر دینا۔“ گلانی نے اس کے بڑھے ہاتھ کی طرف ایک نظر دیکھا وہ اشفاق احمد کی ”زاویہ“ پر تھی۔ اس کی آنکھیں یک لخت چمک اٹھی تھیں۔ اس نے بلا حیل و حجت وہ کتاب چھپٹ لی تھی اور تیزی سے واپس کے لیے پلٹ گئی تھی۔ وہ اس کے غائب ہونے تک اسے دیکھتا رہا تھا۔ اسے امید نہ تھی کہ وہ لڑکی یہ کتاب بھی بخوشی لے سکتی تھی۔

☆☆☆

سباعون نے شہر کی سب سے اچھی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تھا۔ جب سے وہ شہر گیا تھا۔ گلانی نے اطمینان کی سانس لی تھی، ورنہ تو اسے لگتا جیسے سباعون کی دوکالی کالی آنکھیں ہر وقت صرف اسے ہی تاڑ رہیں ہیں کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے۔ کا کا اور کا کی البتہ اسے ڈانٹتا تو درکنار نوکنا بھی گناہ سمجھتے تھے۔ سواب اس کا سارا وقت گاؤں کے بچوں کے ساتھ مستی کرتے یا کتابیں پڑھتے گزر جاتا۔ ابھی بھی وہ نہر کی طرف کرکٹ کھیل کر تھکی ماری واپس آئی تو کا کی نے فوراً اٹھ کر برآمدے کا پکھلا پکا کیا۔

”کیسے پسینے پسینے ہو رہی ہے۔ کتنی بار منع کیا ہے کہ گرمی میں اس وقت کم از کم کھیل بند کر دیا کر مگر نہ۔“ کا کی ناراض ہوتے ہوئے دوپٹے سے اس کا پسینہ خشک کرتے ہوئے بولیں۔

”کل سے بند۔“ اس نے سکون سے آنکھیں

سامنے کھڑی تھی۔ لڑکا مطالعے میں اس قدر محو تھا کہ اس کی آمد سے بے خبر ہی رہا۔ وہ گھنٹوں کے بل بیٹھ گئی۔ کچھ دیر اس کے ہاتھ میں پکڑی کتاب کو یوں دیکھتی رہی جیسے بھوکا شیر اپنے شکار کو اور اگلے ہی پل اس نے کتاب اس کے ہاتھ سے جھپٹ لی تھی۔ وہ اس اچانک افتاد پہ گھبرا سا گیا۔ اب وہ مزے سے اس کتاب کے اور اوراق الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ لڑکا البتہ یوں اچانک اس قدر پیاری لڑکی دیکھ کر ابھی تک شاکڈ تھا۔ وہ ابھی بھی کتاب دیکھے جا رہی تھی۔ اور پھر چند لمحوں بعد ہی اس نے اس خوب صورت چہرے پر مایوسی پھیلنے دیکھی تھی۔

”یہ کیسی کتاب ہے؟“ مایوسی بھرا لہجہ۔ لڑکا اب سنبھل چکا تھا۔

”اس میں تو بلی انگریزی اور کیڑے مکوڑے بنے ہیں۔ میری تو آنکھیں چکر اگئیں۔“ وہ اب دونوں ہاتھوں سے آنکھیں مل رہی تھی۔ اس کی معصوم سی حرکت یہ وہ مسکرا دیا۔ مطلب وہ بھی گاؤں کی کئی لڑکیوں کی طرح ان پڑھ تھی۔

”پتہ تھس کی بک ہے۔“ اس نے بتایا۔

”میتھس؟“ وہ سوچنے لگی۔

”حساب؟“ اس کی مسکراہٹ مزید گہری ہوئی۔

”میں نے بھی پڑھا ہے حساب۔ وہ تو ایسا نہیں تھا۔“ اس نے منہ بنایا۔

”کون سی کلاس میں؟“

”پانچویں میں۔“

”وہ اس سے بہت مختلف تھا۔“

”شاید۔“ وہ ذہن تھی تب ہی سمجھ گئی۔ وہ اٹھنے لگی۔

”سنو“ اس نے پکار لیا گلانی نے اس کی طرف دیکھا۔

”تمہیں کون سی کتابیں چاہئیں تھیں۔“ سنہری آنکھیں اس کے خوب صورت چہرے پر جماتے اس نے پوچھا تھا۔

مچیں۔

”کل کہے گی پرسوں سے۔“ کا کی نے منہ بنایا
”نہیں کہوں گی۔“ وہ لاڈ سے ان کی گود میں سر
چھپا گئی۔

”گلائی بیٹا۔ شہر سے تمہاری کتابیں آگئیں۔“
اسی وقت زمان نے اسے پیار سے پکارا۔ وہ جھٹکے
سے اٹھ بیٹھی۔ کا کا کے ہاتھ میں تین چار کتابوں کا
بندل تھا۔ اس نے تیزی سے وہ کتابیں لے لیں۔
”کتنا انتظار کیا میں نے اس دفعہ۔“ وہ ریپر
اتارنے لگی۔

”اب پڑھنے مت بیٹھ جانا، پہلے کھانا کھا لو۔“
کچھ دیر آرام کر لو پھر اٹھ کر شروع کرنا۔“ کا کی اماں
اٹھتے ہوئے اسے تاکید کر گئیں۔ وہ سر ہلاتے ہوئے
باری باری ان کی فہرست چیک کرنے لگی۔
زمان اسے بغور دیکھ رہے تھے۔

”میرے خیال میں اب تمہیں دوبارہ تعلیم کا
سلسلہ جوڑ لینا چاہیے۔“

انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے اسے کہا۔ وہ چونکی۔
”آپ جانتے ہیں کا کا، اس گاؤں میں ہائی
اسکول ہے ہی نہیں۔ اور ساتھ والے گاؤں میں مجھے
نہیں جانا۔ پھر اب میری عمر بھی.... کتنی بری لکوں
گی میں خود سے چار سال چھوٹی بیٹیوں میں بیٹھ کر سبق
پاؤں کرتی۔“ وہ جیسے محفل میں ہی خود کو کلاس میں دیکھ رہی
تھی۔ اس لیے چہرے کے زاویے بدل رہے تھے۔
”علم حاصل کرنے میں بھلا کیسی شرمندگی۔“

کا کا مسکرائے۔

”علم حاصل کر تو رہی ہوں۔“ اس نے چاروں
کتابیں ہاتھوں میں بھر کر ان کے سامنے لیں۔

”یہ تو وقت گزاری ہے بیٹا۔ اصل علم تو وہی ہے
جو درس گاہ سے حاصل ہو، وہاں جا کر ہی تم کندن بنو
گی۔ تمہاری منزل کا تعین آسان ہوگا۔ اور کچھ بن سکو
گی۔“

”میں ان سے یہ سب سیکھ رہی ہوں۔ میں کچھ
بن جاؤں گی کا کا۔“ اس نے اتنی مصومیت سے

جواب دیا کہ زمان خان بے اختیار ہنس دیے۔
”بغیر ڈگری کے کوئی کچھ نہیں بن سکتا بیٹا جی۔“
”ایک اچھا انسان تو بن سکتا ہے نا۔“ وہ چپ
ہو گئے تھے۔ وہ بچپن سے ہی ایسی تھی۔ حاضر جواب
اور ذہین، اور اس لیے زمان کی خواہش تھی کہ وہ بھی
سباعون کی طرح اچھی تعلیم حاصل کرے۔ لیکن مسئلہ
یہ تھا کہ ان کے گاؤں میں صرف پرائمری تک ہی تعلیم
تھی، آگے پڑھنے کے لیے گلائی کو گاؤں سے باہر جانا
تھا، لیکن کا کا کی کی سر توڑ کوشش کے باوجود بھی وہ
اس کے لیے راضی نہ ہوئی تھی۔

”میرے لیے یہ کتابیں کافی ہیں کا کا۔ آپ
پریشان نہ ہوں لیکن میں آپ سب سے دور نہیں رہ
سکتی۔“ وہ چار پائی سے اتر کر ان کے قدموں میں
جا کر بیٹھ گئی۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے دست
شفقت اس کے سر پر رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

گرمیاں جو بن رہیں۔ کڑکتی دوپہر میں چرند
پرند بھی حوصلہ ہار کے گھوسلوں درختوں میں جا چھپتے۔
اور وہ سب کے سونے کے بعد کوئی نہ کوئی کتاب لیے
پہلے نہر پر آ جاتی۔ اس نے ”زادو“ خرید کر لی تھی اور
اب اس کے مالک کو واپس لوٹانا چاہتی تھی۔ لیکن وہ
لڑکا اسے دوبارہ نظر نہیں آیا تھا، وہ روز یہاں آتے
ہوئے کتاب ساتھ لے آئی تاکہ جیسے ہی اس سے
ملاقات ہو، وہ کتاب اسے واپس کر دے۔

جامن کے پیڑ کی چھاؤں کھنی اور ٹھنڈی تھی۔
وہ گھر کی دیواری کے ساتھ بیٹھنے کے بجائے آج نہر کے
کنارے لگے جامن کے درخت کے نیچے بیٹھ گئی،
باؤں نہر کے ٹھنڈے پانی میں ڈال دیے، سکون نس
نس میں اترنے لگا۔ وہ ماؤں ہلاتے کتاب کھول کے
پڑھنے لگی، تب ہی نہر کے دوسری طرف خاصی دور
اس نے سائیکل کی کھنی بجتی سنی تھی، اس نے بے
اختیار اس طرف دیکھا۔ وہ اس دن والا لڑکا تھا۔
بکریوں کے ریوڑ میں سے گزرنے سے اسے مشکل
ہو رہی تھی، گلائی تیزی سے ابھی، ساتھ پڑی ”زادو“

”تمہارا نام کیا ہے؟“ اسے یاد آیا۔
 ”گھلائی اور تمہارا؟“ گھلائی نے فوراً جواب دیا
 تھا۔
 ”درون“ وہ مسکرایا۔

”میں شہر بڑھنے جاتا ہوں اس لیے کئی ہفتوں
 بعد گاؤں کا چکر لگتا ہے۔ تم پریشان نہ ہوا کرو، میں
 جب بھی آؤں آرام سے پڑھ کر کتابیں دے دیا کرنا،
 میں بھی جب اور کتابیں لاؤں گا تو تمہیں دے دیا
 کروں گا۔“

”شکریہ۔“ وہ مسکرائی درون نے آنکھیں بند
 کر لیں۔ یوں جیسے پلکوں نے لمبی جھپک لی ہو، وہ
 پلٹ گئی درون وہیں کھڑا کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ پھر
 سائیکل پر بیٹھتے ہوئے پیدل چل دیا۔

☆☆☆

”سبا عون آگیا ہے شہر سے۔“ وہ گھر آئی تو
 کاکی فوراً اس کا ہاتھ تھامے کمرے میں لے آئیں،
 اطلاع سنتے ہی برا سامنہ بنایا گیا۔

”اب کچھ دن جو بھی کرنا ہے اس کمرے میں
 کیا کرو۔ کھیل، پڑھائی سب۔ ہمیں تمہاری شکایت
 نہیں ملنی چاہیے۔“ وہ اسے پیار سے سمجھا رہی تھیں۔
 ”میں کوئی غلط کام نہیں کرتی۔ وہ ایسے ہی میری
 شکایت کرتے ہیں۔“ اس نے نم ہوئی آنکھوں کو
 چھپانے کے لیے رخ پھیرا۔

اور یہ واقعی حقیقت تھی کہ وہ گاؤں کی لڑکیوں کی
 نسبت جس قدر بچکانا عادتوں کی حامل تھی اسی قدر سمجھ
 دار بھی سب سے زیادہ تھی۔ اس کا رکھ رکھاؤ، بول
 چال سب کسی بڑھی گئی اچھی تعلیم یافتہ لڑکی کی طرح
 تھا۔ اسے دیکھ کر واقعی یہ ماننا مشکل تھا کہ وہ ایک
 پرائمری پاس لڑکی تھی۔

”اسی لیے تو میں اور خان تم سے اس قدر پیار
 کرتے ہیں کہ تم ہماری سمجھ دار بنی ہو۔“ انہوں نے
 محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ ناراض سی بیٹھی
 رہی۔

”لیکن اب تم بڑی ہو گئی ہو گھلائی اور لڑکیاں

جھپٹ کر اور تیزی سے نہر کے دوسری طرف بھاگی،
 اس سے پہلے کہ وہ لڑکا بکریوں کے ریوڑ سے نکلنے
 میں کامیاب ہوتا وہ اس تک پہنچ چکی تھی۔

”شکر ہے تم مل گئے۔“ بانپتے ہوئے کمر پر
 ہاتھ جمائے وہ بولی تو وہ حیران سا مسکرا دیا۔

”اتنے دن میں تمہیں نہر کے اس طرف ڈھونڈتی
 رہی، تم دوبارہ آئے ہی نہیں۔“ نیلی آنکھیں سحر
 پھونک رہی تھیں۔ وہ مفتوح ہوا تھا۔

”تم مجھے یاد کر رہی تھیں؟“ گھلائی ہونٹوں کا
 کٹاؤ جھیکھا ہوا تھا۔

”میں تمہیں یاد کیوں کروں گی؟“ وہ حیران
 ہوئی تھی۔

”کیونکہ میں تمہیں یاد کرتا رہا تھا۔“ اس نے
 اپنی عادت کے مطابق صاف گوئی سے کام لیا تھا۔
 نیلی آنکھوں میں حیرانگی مزید بڑھ گئی۔
 ”لیکن تم تو مجھے جانتے بھی نہیں۔“ گھلائی کے
 ابرو اٹھے۔

”کچھ لوگوں کا جاننا اہم نہیں رہتا۔ ان سے
 ملتے ہی رشتہ بن جاتا ہے۔“ اس نے سائیکل اسٹینڈ
 پر کھڑی کر دی۔ اور دونوں بازو سینے پہ باندھتے
 ہوئے اسے دیکھنے لگا۔ جس نے چند پل اس کی بات
 کو سمجھنے کی کوشش کی پھر سر جھٹک دیا۔

”یہ کتاب دینی تھی تمہیں۔“ اس نے زاویہ اس
 کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”میں نے پڑھ لی تھی، تم رکھ لو۔“ اس نے
 ہاتھ نہیں بڑھایا۔

”نہیں۔ تم لے لو۔“ وہ بضد ہوئی۔ ”اور.....“
 ”وہ شاید کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔“

”اور کیا...؟“ وہ چونکا۔
 ”اگر اور کتابیں ہیں ایسی تو مجھے دے دو وہ میں

واپس کر دوں گی۔“ اس نے جھجکتے ہوئے کہہ ہی دیا،
 وہ مسکرا دیا، اور سائیکل پہ رکھے بیک میں سے کچھ
 نکالنے لگا، تھوڑی دیر بعد اس نے دو کتابیں اسے تھما
 دیں، اور ”زاویہ“ لے لی گھلائی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

”اور تم نے صفایا کر دیا“ وہ بھی وہ شاید اس کی صفائی کی تعریف کر رہا ہے۔ بھی صفائی کا ذکر استعمال کر رہا ہے اس کے لبوں پر فخر پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

”جی“۔ سباعون زندگی میں پہلی بار اس کی تعریف کر رہا تھا، دل عجیب ہی دھڑکا۔ چہرے پر مسکراہٹ جمی گئی۔

”ڈھیٹ ہو تو کوئی تمہاری طرح“۔ اس نے گلابی کی کلائی پکڑی تھی وہ سنبھل نہ سکی تھی، حیران پریشان سی سباعون کا چہرہ دیکھ گئی جس نے اسے جھٹکے سے اُسے قریب کر لیا تھا۔ ”کہا کیا اٹھایا تھا وہاں سے“، ”مگر فت اس قدر شدید ہوئی کہ اس کا بازو درد کرنے لگا، اس کی نیلی آنکھیں بھینکنے لگیں۔

”بتاؤ“ وہ چلا اٹھا۔

”ایک کتاب اٹھائی تھی۔“ اس کی آواز بھی ڈب ڈبانا لگی تھی۔

”کیوں۔ میری اجازت کے بغیر میری کتاب کیوں اٹھائی تھی۔“ وہ مزید پیش میں آیا۔

”سباعون“ کا کی اچانک ہی وہاں آئی تھیں۔

”ایک کتاب ہی تو تھی۔“ گلابی کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ صرف ایک کتاب کے لیے اس کے ساتھ اس طرح پیش آ رہا تھا۔

”سباعون۔ چھوڑو اس کا ہاتھ دیکھو اسے درد ہو رہا ہے۔“ کا کی نے گلابی کا ہاتھ سباعون کے ہاتھ سے چھڑوانا چاہا۔ لیکن گلابی سمجھ نہ سکی۔ درد ہاتھ میں زیادہ ہو رہا تھا یا دل میں، کچھ دیر پہلے دل میں پھیلنے والی خوشبو بد بو میں بدلنے لگی تھی۔

”ایک کتاب تھی۔“ سباعون اس کے جملے پر اٹک گیا۔ ”میرے کمرے سے بلا اجازت کتاب لیتی ہوا درد کبھی ہو کہ صرف ایک کتاب تھی“ غصے سے وہ کانپنے لگا۔ ”ابھی بتاتا ہوں تمہیں کہ کیسے لگتا ہے“ اس نے جھٹکے سے گلابی کا بازو چھوڑا وہ بستر پر گر گئی اور اس کی کمرے کے چاروں طرف بنی نازک سی بک شیلف سے مختلف کتابیں اٹھانے لگا۔

”سباعون۔ چھوڑو۔ پاگل ہو گئے ہو،“ کا کی

جس قدر سنجیدہ اور سمجھ دار ہوں اچھی لگتی ہیں۔ میں اور خان تو تمہیں کچھ نہیں کہتے لیکن سباعون۔ اس کی بات اور ہے بیٹا اس کا اور تمہارا رشتہ اور ہے۔“ وہ اس عمر میں بھی جب لڑکیاں آسانی سے خود سے کسی رشتے کو با آسانی جوڑ لیتی ہیں، اور وہ بھی چاہتی تھیں کہ انہوں نے سباعون اور گلابی کے لیے جو کچھ بھی سوچ رکھا تھا، وہ مکمل ہوا اور ان دونوں کی زندگی خوش گوار ہی رہے اور اس کے لیے ابھی سے گلابی کی شخصیت کو سباعون کے خیالات کے مطابق ڈھالنا بے حد ضروری تھا۔ وہ جس قدر سنجیدہ اور کم گو تھا، گلابی اس قدر چلبلی اور باتونی تھی۔

”جانتی ہوں۔ وہ ان سے لپٹ گئی۔“ آپ دونوں تو میرے کا کا کی ہوا اور سزیل سا منہ بنایا گیا۔ ”وہ میرے سزیل سے رشتے دار۔“ اس کے بے زار سے انداز پر وہ بے اختیار ہنس دیں۔

”بری بات“ گلابی، ”ان کے ٹوٹنے پر وہ بھی مکمل کھلا دی اور کا کی کے گرد پہلے بازو مزید تختی سے باندھ لیے۔

☆☆☆

وہ بیڈ پر لیٹی کتاب میں گم تھی، جب کمرے کا دروازہ اتنے زور سے کھلا تھا کہ وہ ڈر کے مارے بیڈ سے نیچے گرتے گرتے پئی تھی۔ اس نے دھک دھک کرتے دل پر ہاتھ رکھا جو سامنے دیکھنے پر مزید باہر نکلنے کی سعی کرنے لگا تھا۔

”آ۔ آ۔ آ۔ آپ“ وہ بھلا گئی سباعون چند قدم آگے آیا گلابی جھٹکے سے سیدھی کھڑی ہوئی۔

”تم میرے کمرے میں گئی تھیں؟“ بڑی بڑی کالی آنکھیں اس کے چہرے پر جم گئیں، اس کی ہتھیلیاں تک پسینے میں بھینکنے لگیں۔ ”بتاؤ“ وہ اور قریب آیا وہ پیچھے ہٹی۔

”جی۔۔۔ جی۔۔۔“

”کس لیے؟“ ماتھے پر پڑے بل مزید گہرے ہو گئے۔

”کا کی نے کہا تھا کہ صفائی کر دوں۔“

پر اور اکثر ایسا ہوتا وہ کوئی کہانی پڑھتی اور کوئی کردار اسے اپنا ہمسفر بنا لیتا اور بعد میں وہ اس کہانی میں وہ کردار ڈھونڈ ڈھونڈ کے ٹھک جاتی، لیکن نہ ملتا۔۔۔
”تو وہ کون تھا؟“ وہ سوچے جاتی۔

وہ بدل گئی تھی، سباعون گھر ہوتا نہ ہوتا وہ کمرے سے کم ہی باہر نکلتی کا کا نے سباعون کی ٹھیک ٹھاک خبر لی تھی اس کی کتابیں سزا کے طور پر سباعون سے ہی دوبارہ منگوائی تھیں، وہ ان کے سامنے کچھ نہیں بول پایا تھا صرف بڑبڑاتا رہ گیا۔ لیکن اس سب نے بھی گلائی کے من کا ملال کم نہ کیا تھا، سباعون کسی بھی رشتے کی صورت اس کے دل سے مکمل اتر گیا تھا، وہ اب اس کے لیے مکمل اجنبی تھا جسے گلائی کے وجود سے خواہ مخواہ کی چڑھتی۔ اور اس سوچ کے تحت اس نے سباعون کے سامنے جانا ختم کر دیا تھا سباعون کو بھی اس چیز سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ لیکن اس واقعے نے گلائی کی سوچ یکسر بدل دی تھی۔

وہ تنہائی پسند ہو گئی تھی اور اسے خود بھی حیرت ہونے لگی تھی جب اس نے تنہائی میں بھی کئی بولیاں سنی تھیں۔ اس کا دل کرتا وہ یہ باتیں سنتی رہے اور اپنی ڈائری میں اتارتی رہے اور اس نے ایسا ہی کرنا شروع کر دیا تھا۔۔۔ خاموش منظر، خیال اور کردار سب لفظ بنتے گئے۔

☆☆☆

وقت کے پہلے نہیں ہوتے پر ہوتے ہیں، ہم لاکھ اسے قیام پذیر سمجھیں، پڑتا رہتا ہے اور ہمیں اس بات کا اس سفر مسلسل کا اس وقت احساس ہوتا ہے۔ جب منظر، اوقات، حیثیت، کردار سب بدل جاتے ہیں وہ سب بھی وقت کی اس اڑان سے بے خبر اپنے تئیں ایک بہت سست اور خاموش زندگی جی رہے تھے۔

سباعون پہلے بھی شہر جاتا تھا۔ لیکن جلدی جلدی گاؤں کے چکر لگا لیا کرتا تھا اب اسے مہینوں لگ جاتے تھے حصول تعلیم کے ساتھ ساتھ اس نے پارٹ ٹائم جاب بھی کر لی تھی۔ اسے پیسوں کی کمی ہرگز نہ تھی

اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا، جب بالکل بے بس ہو گئیں تو تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئیں اس وقت صورت حال صرف خان ہی سنبھال سکتے تھے، سباعون نے مختلف کتابیں دونوں ہاتھوں کی گود بنا کر اس میں بھر دیں اور لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی گلائی نے سامنے والی کھڑکی میں دھواں اٹھتے دیکھا تھا۔ صرف چند لمحوں بعد ہی وہ واپس پلٹا تھا۔

”یہ سبق ہمیشہ یاد رکھنا اب آئندہ میری چیزوں کو چھونے کی غلطی مت کرنا۔“ شہادت کی انگلی سے اسے وارن کرتا وہ باہر نکلتا تھا۔ گلائی نے پاس پڑی سباعون کی کتاب اٹھائی اور بھاگ کر دروازے میں آنکھیں۔ آنسوؤں کی دھند میں بھی سباعون کی چوڑی پشت واضح تھی اس نے کھینچ کے کتاب اسے دے ماری تھی کتاب اس کی کمر میں لگی تھی وہ بلبلا کے مڑا تھا۔

”تیری تو۔۔۔۔“ وہ کف اڑاتا اس کی طرف آتا تھا گلائی نے تیزی سے دروازہ بند کر کے کٹدی لگائی۔ سباعون نے زور کی لات دروازے پر دے ماری تھی۔

”سباعون۔“ زمان خان کی تیز بھاری آواز نے اسے مزید کچھ بھی کرنے سے فی الحال روک دیا تھا۔ دروازے کے پیچھے گلائی ہچکیوں میں رودی تھی۔

☆☆☆

جو کتابیں سباعون نے جلا دیں تھیں ان میں بہت سی کتابیں ایسی تھیں جو اسے خود سے بھی زیادہ عزیز تھیں، یہ مختلف ملکوں کی فیری ٹیلز اور مختلف دیسوں کی لوک کہانیاں تھیں، اسے ان کہانیوں سے عجیب سی خوشی حاصل ہوتی تھی وہ جب بھی ان کہانیوں کو پڑھتی اسے اپنا آپ اس دور کا باسی لگتا سب کچھ اس کے سامنے ہونے لگتا۔

”وہ سب تھے ابھی یہاں میں نے خود سب کو بولتا، سنتا، روتا محسوس کیا ہے،“
کبھی کبھی وہ خود بھی چونک جاتی تھی اپنی حالت

لیکن وہ ان لوگوں میں سے بھی نہیں تھا جو پرکھوں کی کمائی پر گزارہ کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔ اس کے کئی خواب تھے۔ اسے اپنے بل بوتے پر آگے بڑھنا تھا ایک نام بنانا تھا دنیا میں ایک پہچان بنانا اس خواب تھا۔ اس کے سب ہی راستے بے حد واضح تھے اور منزل بے حد قریب روپے پیسے، سرمایہ کی اسے کمی نہ تھی، تجربہ کی ضرورت تھی ایک کامیاب بزنس مین بننے کے لیے، اور اس لیے اس نے یہ پارٹ ٹائم جاب کر لی تھی۔

کا، کا، کا کی دونوں مطمئن تھے، خوب صورت محنتی بیٹا، اور مسکرائی کم گو شیڈہ سی رہنے والی ہر وقت۔ ہو کے روپ میں نظر آنے لگا لئی۔۔۔

اور حقیقتوں کو اپنے اندر جذب کرتی لیکن ان سے کوسوں دور کا فاصلہ رکھنے والی، خوابوں، جگنوؤں اور ہواؤں کی ہمسفر کوئل سی لگا لئی۔۔۔ اس کا جنون بھی اس کا ہم عمر رہا، ہم زاور ہا۔ وہ پہلے صرف پڑھتی تھی۔ اس سب کچھ پڑھتی تھی۔۔۔

ڈائجسٹ، رسالے، اخبار، کتابیں۔۔۔ پہلے صرف اردو پھر درون نے اس کی ذہانت دیکھ کر اسے انگلش کی ہلکی پھلکی کتابیں بھی لاکر دیں تھیں اسے انگلش سے جان پہچان تھی وہ ذہین بھی تھی اور پھر پڑھنے کا جنون بھی۔ تب ہی وہ دوا نیوں کے لٹریچر تک پڑھ لیتی۔

گھر میں کوئی مشین آتی یا الیکٹرانک کا کوئی نیا سامان۔۔۔ ڈبے کے باہر سے لے کر اندر تک سارا چھپا مواد پڑھ لیتی۔ کا، کا، کا کی شانگ کے لیے شہر لے جاتے تو وہ صرف دیواریں پڑھتی رہ جاتی کا، کا کی خود ہی پسند کر لیتے اس کے لیے چیزیں اور وہ ملتے بھٹتے سائن بورڈز، مختلف برانڈز کے ایڈز اور ہر جہز پر لگے ٹیگ یوں پڑھتی جیسے وہ ان سب پر کوئی ریسرچ کرنے وہاں آئی ہو۔۔۔

لیکن اب اس کا وطیرہ بدلنے لگا تھا۔ جنون نے جمال کا رنگ رنگ اوڑھا۔ اور وہ لکھنے لگی اس نے سب سے پہلے ایک کا لے رنگ کی ڈائری پر لکھنا

شروع کیا، یہ ڈائری اسے کا کانے نئے سال پہ تحفہ دی تھی۔۔۔ جب بھی دل کرتا وہ اس ڈائری پر تحریر کر دیتی۔۔۔

وہ صرف الفاظ کا مجموعہ نہ تھا۔۔۔ وہ کچھ مناظر تھے جو بند کمرے میں اس پر اجاگر ہو جاتے تھے۔۔۔ کچھ کردار تھے جنہیں وہ نہیں جانتی تھی لیکن نہ جانے کیسے ان سے تعارف تھا اس کا۔۔۔ کچھ حقیقتیں تھیں، جن کا سامنا اسے بھی نہ ہوا تھا، پھر بھی اس نے ملل جزئیات کے ساتھ محسوس کی تھیں۔۔۔

”کچھ ہے۔۔۔ کچھ تو ہے۔۔۔“ کئی دفعہ اپنی کیفیت سے گھبرا کے وہ کہہ جاتی۔ ”ضرور کچھ نہ کچھ ہے جو میں نہیں جانتی۔“ وہ اعتراف کرتی۔

☆☆☆

درون تعلیم کے آخری مراحل میں تھا، تب ہی آج کل کم ہی گاؤں آتا تھا، ان پندرہ مہینوں میں گلائی سے اس کی اچھی خاصی دوستی ہوئی تھی، اسے یہ کوئل سی، نرم جذبات والی لڑکی بے حد عزیز تھی، وہ اس کے لیے اب بھی کتابیں لاتا تھا، خوبصورت قلم اور خالی کاغذوں کے بنڈل بھی دے جاتا۔

”جب بھی اندر سے آوازیں محسوس کرو، انہیں اتار لیا کرو۔“ وہ اکثر اس سے کہتا۔

”اندر کی آوازیں؟“ وہ حیران ہوتی، ”ہاں۔“ آم کے پیڑ کے نیچے، گھنٹوں تک پانچے چڑھائے، نہر میں پیر ڈوبے وہ سوچتے ہوئے جواب دیتا۔

”جب انسان کے باہر خاموشی چھا جائے تو اندر کی آوازیں بے حد صاف ہوجاتی ہیں“ وہ اس کی باتوں میں کھوسی جاتی تھی۔ اور اگر ان آوازوں کو نظر انداز کرو گی تو یہ چیخا شروع کر دیتی ہیں پھر بہت درد ہوتا ہے، سب کچھ ہاتھ سے نکل جاتا ہے، تو بہتر یہ ہے کہ ان کو غور سے سنا جائے اور اندر کی باتیں کاغذ پر اتار دو تو اور بھی سکون ملتا ہے۔ اور گلائی کو تو اس سے بات کر کے ہی سکون مل جاتا تھا۔ لیکن وہ اپنی کیفیت

کو سمجھ ہی نہیں پاتی تھی۔ وہ اٹھ کر جانے لگا تھا۔
 ”سنو“ پانی میں پاؤں مارتے ہوئے گلائی
 نے اسے پکارا، وہ رک کر مڑا۔ ”تم نہر کے اس طرف
 کیوں نہیں آتے؟“ وہ پوچھ بیٹھی درون دھیرے سے
 مسکرا دیا۔

”ابھی اس قابل نہیں ہوا نہ۔“ بھاری لہجے میں
 کہتا وہ واپس مڑ جاتا۔ گلائی اسے دیکھے جانی۔

☆☆☆

اس کی ڈائری مکمل ہو گئی تھی پورے ڈیڑھ سال
 اس کے ساتھ ایک کردار نے چلتے چلتے آج دم توڑ دیا
 تھا، وہ کتنی ہی دیر کمرے میں بیٹھی روتی رہی جب
 تھک گئی تو ڈائری سینے سے لگائے نہر کی طرف آ گئی،
 پیری کے درخت سے لگے جھولے پر بیٹھتے رہی اس
 کے آنکھیں پھر بھینکے لگیں۔۔۔

”وہ کیوں مر گیا۔؟“ اس نے پاؤں زمین پر
 مارتے ہوئے ننھا سا جھولا لیا تھا۔

”کیونکہ تم نے مار دیا۔۔۔“ اندر سے آواز آئی۔
 ”میں اس سے اتنی محبت کرتی ہوں۔۔۔ میں
 اسے کیوں کر مار سکتی ہوں“ وہ رونے لگ گئی۔ وہ کتنا
 پیارا تھا۔۔۔ کتنا پیارا بولتا تھا، مجھے جانتا تھا۔۔۔ میں
 اسے جانتی تھی۔۔۔ اسے سمجھتی تھی۔۔۔ پھر بھی آخر میں
 وہ۔۔۔ وہ خود کلام تھی۔

”تم نے تو بس میرا دل ہی توڑ دیا،“ اس نے
 دل ہی دل میں اس کردار سے شکوہ کیا۔

”گلائی۔“ کسی نے دور سے اسے پکارا، اس
 نے چونک کر دیکھا، نہر کے اس پار درون کھڑا تھا،
 اس کے ہاتھ میں کتابیں تھیں، وہ ڈائری تھا اسے اٹھ
 کر وہیں چلی آئی،

”میں واپس جا رہا تھا، سوچا یہ کچھ کتابیں تمہیں
 دے دوں،“ اس نے کتابیں اس کی طرف بڑھائیں
 ، گلائی نے تمام لیں،

”اس بار جلدی لوٹا دوں گی،“ وہ اداسی سے
 بولی۔

”مجھے جلدی آنے کا کہہ رہی ہو؟“ وہ مسکرایا۔

نبلی آنکھوں نے اس کی طرف دیکھا، وہ ہمیشہ کی
 طرح جلدی سے نظریں پھیر گیا، وہ قبول کریتا تھا ان
 آنکھوں کی تاب لانے کی جرأت اس میں نہ تھی۔۔۔
 بالکل بھی نہیں۔

”گلائی۔“ کوئی دھاڑا تھا، گلائی کا ہپی اور اس
 کے ہاتھ سے ساری کتابیں چھوٹ کے زمین پر گر
 پڑیں۔ اس سے پہلے کہ درون کچھ سمجھتا، سباعون
 دوڑتا ہوا ان دونوں کے قریب آیا تھا۔

”بے غیرت انسان۔“ سباعون پاگلوں کی
 طرح درون پر بل پڑا تھا وہ جو بالکل ہی انجان تھا، ا
 س اچانک افاد سے نہ سنبھل سکا تھا، اور زمین پر گر
 پڑا تھا۔ سباعون اسے کمر میں لاتیں رسید کرنے لگا،
 گلائی میں ایک دم سے ہی بجلی سی دوڑی تھی، سارا
 خوف، سارا ڈر جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا، اس نے
 سباعون کے تقریباً ساتھ لگتے ہوئے اسے درون
 سے پرے دھکیلا تھا۔

”درون۔ جاؤ تم یہاں سے،“ وہ چلائی۔

”میں تمہیں جھوڑوں گا نہیں“ سباعون پھر اس کی
 طرف لپکا تھا، گلائی سے اسے سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔

”سباعون۔“ وہ زور سے چلائی تھی، اور ایک
 زنانے دانشور اس کے منہ پر دے مارا تھا، سب ہی
 ساکت ہوئے تھے، خود گلائی دونوں ہاتھ منہ پر رکھے
 حیرانگی سے اسے دیکھ رہی تھی، جو گال پر ہاتھ رکھے
 جلتی آنکھوں سے اسے دیکھے جا رہا تھا، درون کپڑے
 جھاڑتا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں صرف گلائی
 کے لیے فکر تھی۔

”آؤ میرے ساتھ۔“ سباعون نے گلائی کا
 ہاتھ پکڑا اور اسے کھینچتے ہوئے نہر کے اس پار لے
 گیا۔

”سباعون۔ جھوڑو مجھے پلیز“ وہ کہتی رہ گئی
 درون نے غم آنکھوں سے نیچے گریں کتابوں کو دیکھا
 اور ایک ایک کر کے اٹھانے لگا، تب ہی اس کی نظر کالی
 ڈائری پر پڑی تھی، اس نے کچھ سوچتے ہوئے وہ
 ڈائری بھی اٹھائی اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔

دیکھا۔ پھر کھڑکی کی طرف جا کر پردے ہٹا دیے اور کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیے روشنی اور ٹھنڈی ہوائ تارکی اور جس کو مات دے دی تھی، وہ مڑ کر گلائی کے پاس بیڈ پر آکے بیٹھ گئے۔

”میرے خیال میں رونا کسی بھی مسئلے کا حل نہیں۔“ دونوں ہاتھ چھڑی پر جمائے وہ اسے دیکھتے ہوئے بولے۔ ”اور خاص کر بات آپ کی عزت نفس کی ہے۔ تب تو ہرگز نہیں۔“ وہ سر جھکائے روتی رہی ”رون آیا تھا آج“ انہوں نے سوچا وہ ضرور چونکے گی لیکن وہ اس طرح روتی رہی۔ ”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا، وہ میرے سامنے آ سکتا ہے“ وہ مزید بتانے لگے۔

”کیونکہ میرے مطابق وہ ضرور شرمندہ ہوگا۔ اور کیونکہ وہ ہمارے ایک مزارعے کا بیٹا ہے تو شاید خوف زدہ بھی۔“ وہ چھڑی کو گھما رہے تھے۔ ”لیکن نہ وہ شرمندہ تھا اور نہ ہی خوف زدہ۔“ چھڑی رک گئی تھی ”وہ تمہارے لیے کتابیں لاتا ہے بلکہ اپنی کتابیں تمہیں دیتا ہے اور پھر جب بھی واپس آتا ہے۔ کتابیں لے لیتا ہے۔“ گلائی رورہی تھی۔ ”کتابوں کے علاوہ تمہاری کوئی بات نہیں ہوتی اور نہ ہی تمہیں تم دونوں نے ساتھ بیٹھ کر کبھی کوئی لمبی چوڑی گفتگو کی ہے تمہیں کتابوں کا جنون ہے اور تم اس جنون میں اس کے پاس بھاگ کر پہنچتی تھیں۔ اور ہم سب گواہ ہیں کہ کتاب واقعی تمہارا جنون ہے“ وہ بولتے گئے۔ ”یہ سب باتیں اپنی جگہ لیکن مجھے اس کی صرف ایک بات نے متاثر کیا۔“ گلائی کا سسکتا کم ہو چکا تھا۔ غبار چھٹنے ہی والا تھا۔

”اس نے جاتے جاتے مڑ کر کہا تھا کہ اگر بات صرف اس کی ذات تک ہوتی تو وہ بھی اپنے کردار کی وضاحت دینے نہ آتا لیکن بات گلائی کے کردار کی تھی، تب ہی وہ وہاں آیا اور وضاحت دی۔“ وہ اٹھ کر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگے۔ ”وہ تو چلا گیا اور میں۔“ وہ واپس مڑے تھے۔

”میں صرف یہ سوچتا رہ گیا کہ ایک باہر کے آدمی کو تمہارے کردار کے لیے وضاحت دینی پڑی

سباعون کا غصہ آج آسمان کو چھو رہا تھا کا کا، کا کی دونوں ہی گھر پر نہیں تھے۔ اس نے گلائی کو اس کے کمرے میں روک کر دیا تھا اور ملازموں کو بھی اس کو کچھ بھی دینے سے منع کر دیا تھا اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ان دونوں کو گولی مار دیتا زماں خان واپس آئے تو اس کی زبانی سارا ماجرہ سن کر چند لمحے کو بالکل بول ہی نہ سکے۔

”میں یہ نہیں مان سکتی“ کا کی نے تو صاف رد کر دیا۔ ”یہ ہی۔۔۔ یہی باتیں ہیں آپ کی جس نے اس کا دماغ خراب کر دیا ہے۔ خاندان کی عزت تک نیلام کرنے پر آگئی ہے وہ۔“ سباعون بھڑک اٹھا۔ ”آواز پیچی رکھو سباعون۔“ زمان نے کھڑے ہوتے ہوئے، دہلی زبان میں چیختے ہوئے اسے حکم دیا۔ ”باورکھو۔“ بھی بھی معاملہ اتنا بڑا نہیں ہوتا جتنا ہم سمجھ لیتے ہیں اور جذباتیت سے اسے بڑھا دیتے ہیں۔“ انہوں نے سباعون کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پیار سے سمجھایا، وہ خاموش رہا۔

”گلائی میری ذمہ داری ہے ابھی میں زندہ ہوں، تم اس معاملے میں نہ پریشان ہو اور نہ ہی اپنی غلبت پسند طبیعت کے ہاتھوں اس معاملے کو مزید بگاڑو۔ مجھ پورا یقین ہے گلائی میری تربیت کو شرمندہ نہیں کرے گی۔“ ان کی بات پر وہ سر ہلا گیا۔

کمرے میں اندھیرے کا راج تھا، کھڑکیوں پر لگے گہرے رنگ والے پردے سورج کی ننھی سی کرن کو بھی اندر نہیں آنے دے رہے تھے، سب لائٹس آف تھیں، تب ہی دن میں رات کا گمان ہونے لگا تھا۔

ہلکی سی آواز کے ساتھ کمرے کا دروازہ کھلا تو ایک لخت سارا کمرہ روشنی سے بھر گیا، بستر پر بیٹھی ٹھنوں میں سردے اس نے سر اٹھا کر آنے والے کو دیکھنے کی زحمت نہ کی تھی، زمان خان کی بانس کی پھڑکی کی آواز ان کے آنے کا پتا خوب دے رہی تھی انہوں نے ذرا دیر رک کر ہلکے سے کھاتے اس وجود کو

ہمارے لیے اس منظر میں کوئی دل کشی نہ ہو، ہماری نظر کو بس وہ ہی سب سے حسین لگتا ہے۔ اس وقت سباعون آفریدی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ اسے یوں نہیں تکتا چاہ رہا تھا۔ لیکن نظریں پلٹنے سے انکاری تھیں۔

”مجھے تمہارے بارے میں شاید ایسا نہیں سوچنا چاہیے تھا۔“ وہ اسے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

”شاید نہیں۔“ یقیناً آپ کو میرے بارے میں ایسا نہیں سوچنا چاہیے تھا۔“ اب کی بار اس نے بھی سباعون کی طرف دیکھا تھا، نیلی روشنی سی لکرائی تھی سباعون کی آنکھوں سے، ٹھنڈی میٹھی سی روشنی۔۔۔ مڑ جانے اس کے اندر کیسا سکون سرایت کرنے لگا وہ سر جھٹک کے رخ پھیر گیا۔

”کیا ہم یہ بات بھول سکتے ہیں۔“ ٹھہرا بھاری لہجہ۔ ”کیا آپ شرمندہ ہیں؟“ وہ دوبارہ نہر کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

”شاید۔“ وہ اٹھ کر چند قدم آگے جا کر رک گیا، گلابی کی نظریں اب اس کی چوڑی پشت پر جمی تھیں۔ بسھی بسھی ایک چھوٹا سا اعتراف غلطی کی خلش کم کر دیتی ہے۔“ وہ بھی اٹھ کھڑی اور حویلی کے اندر کی طرف بڑھ گئی۔

”گلابی۔“ سباعون کی تیز پکار پر وہ رکی لیکن مڑی نہیں وہ تیز قدم اٹھاتا اس کے قریب آ گیا، حویلی کی دیوار کی بنیاد میں لگے انار کے درخت پر پھول آچکے تھے اس نے ہاتھ بڑھا کر کرنی پھول ایک ساتھ اتار لیے اور گلابی کے سامنے آ گیا اس نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا اور گلابی کا ہاتھ تھام لیا پھر دوسرے ہاتھ سے سارے پھول اس کی کھلی تھیلی پر پھیلا دیے بے اختیار ہی اس نے سارے پھولوں کو سینے کے لئے دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنالیا۔

”آتم سوری“ وہ مسکرایا تھا اور پھر لمبے ڈگ بھرتا حویلی کے اندر غائب ہو گیا، گلابی دیر تک ان ادھ کھلے پھولوں کو دیکھتی رہی تھی۔

☆☆☆

اور وہ دے بھی گیا تو ہم گھر کے لوگ تم سے وضاحت لینے والے کون ہوتے ہیں۔“ وہ اس کے قریب آ کر رک گئے۔ ”وضاحت تب ضروری ہوتی ہے جب رشتوں سے اعتبار اٹھ جائے اور میں خود سے زیادہ تم پر اعتبار کرتا ہوں مجھے وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں نہ ہی سوال جواب کی، تم جانتی ہو نہ گلابی۔“ انہوں نے محبت سے پکارا تھا۔ گلابی نے سر اٹھا کر لال نگاہوں سے ان کو دیکھا تھا، پھر ان سے لپٹ کے رو دی تھی زمان نے اپنا دایاں ہاتھ اس کے گرد پھیلاتے ہوئے اسے تحفظ فراہم کیا تھا۔

☆☆☆

دن ڈھل رہا تھا۔۔۔ شام پر پھیلا رہی تھی۔۔۔ سورج کی تازہ بجی کرنیں ستاروں کی طرح قطار در قطار جھلکتی نہر کے پانی کو عجیب سی چمک بخش رہی تھیں۔۔۔ وہ نہر سے کافی فاصلے پر رکھے سنگی تخت پر بیٹھی محویت سے غروب ہوتے سورج کی کرنوں کی لپک جھپک دیکھ رہی تھی، کہ کوئی اس کے بے حد قریب آ بیٹھا تھا ’ہوائے‘ کی مہکتی خوشبو نے اسے اپنے حصار میں لے لیا تھا اسے رخ پھیر کر اس شخص کو دیکھنے کی ضرورت نہ رہی تھی۔۔۔ وہ خاموشی سے بیٹھی رہی۔۔۔

وہ بھی خاموش رہا۔۔۔ پھر ذرا سا جھکا۔۔۔ نیچے بڑے کچھ پتھر گھاس میں سے پنے اور پھر سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”میں نہیں جانتا کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟“ اس نے ایک پتھر نہر کی طرف اچھالتے ہوئے خاموش بیٹھے پانی کے ساتھ ساتھ اپنی خاموشی بھی توڑی تھی۔

”آپ ہمیشہ نہیں جانتے کہ آپ کیوں کرتے ہو ایسا۔“ وہ ابھی بھی نہر کو ہی دیکھ رہی تھی، سباعون نے ایک گہری نگاہ اس کے سر آپے پر ڈالی تھی۔ سی گرین کاٹن کے سادہ سے سوٹ پر جارحیت کا سرخ دوپٹا، اس کے خوب صورت چہرے کو عجیب سی دل کشی عطا کر رہے تھے، وہ بلا ارادہ ہی دیکھ گیا۔ اور زندگی میں کئی بار ہوتا ہے ایسا کہ نگاہ پلٹنا ہی نہیں چاہتی،

کچھ سوچنے لگا۔ پھر اچانک کسی خیال سے اس کی آنکھیں چمک اٹھیں، تھوڑی دیر بعد ہی وہ فیس بک پر ایک نیا پیج بنا رہا تھا، ”گل آفریدی“
وہ ڈائری میں سے کچھ اہم اقتباس نکالنے لگا جو اسے جلدی سے تصویری شکل میں ڈھال کر گروپ اور پیج پر پوسٹ کرنے تھے اس نئی رائٹر کو متعارف کروانے کے لیے۔۔۔

☆☆☆

وہ حیرت سے اس خاکی لفافے کو نکلے جا رہی تھی جس پر اس کا نام لکھا تھا۔ ”گل آفریدی“۔
یہ کس نے بھیجا تھا اور کیوں؟

اس نے نیچے پڑے ان چند ہزار کے نوٹوں کو بھی اسی حیرت سے دیکھا تھا کسی نے اسے پیسے بھجوائے تھے، ساتھ ہی رسید پڑی تھی۔۔۔ اس نے وہ رسید اٹھالی۔

”ماہنامہ ”جہاں“ کی طرف سے آپ کے ناول کا اعزاز یہ۔۔۔ 5000 روپے“ پڑھ کے حیرت اور کئی گنا بڑھ گئی۔

اس نے تیزی سے خاکی لفافہ کھولا اور اندر سے رسالے نکال لیے، ماہنامہ ”جہاں“ اس کے سامنے تھا اس نے فہرست نکالی۔۔۔ اور تیز تیز نظر ڈالے گئی اور پھر ایک جگہ آکر اس کا ہاتھ جیسے جم گیا۔
مکمل ناول۔۔۔ گل آفریدی۔

وہ دیکھے گئی۔۔۔ دیکھتی رہی۔۔۔ پھر تیزی سے صفحے پلٹتی اپنے مطلوبہ صفحے پر پہنچی۔۔۔ شاید کوئی اور رہا۔۔۔ شاید کچھ اور لکھا ہو۔۔۔ وہ تیز تیز پڑھنے لگی اور ریسالہ اس کے ہاتھ سے نیچے گر گیا وہ اس کی ہی تحریر تھی، وہ بھلا اپنے لفظ کیسے بھول سکتی تھی وہ اس کا اپنا اندازہ ہی تو تھا مگر یہ سب کس نے کیا۔۔۔؟

سباغون۔۔۔؟ خیال آیا۔
”کبھی نہیں، وہ ایسا نہیں کر سکتا۔“ دل و دماغ دونوں نے نفی کی، ”تو پھر۔۔۔؟“ وہ سوچے گئی اور اچانک ہی اسے یاد آیا کہ وہ یہ سب لفظ کہاں چھوڑ کے آئی تھی۔۔۔ نہر کے پار گری اس کی کالی ڈائری

دوپہر بس گھنٹے لگی تھیں، گرمی ختم ہوتے ہی گاؤں کی رونق جیسی بڑھنے لگی تھی، دن چڑھتے ہی گلیوں میں چھا جانے والا سناٹا اب بچوں کی چپکاروں نے ختم کر ڈالا تھا، کیلی مٹی سے لپ کے گئے صاف سترے کچے صحن کے پتھوں بچ برنگ کے پیڑ کے نیچے بنے پتھر لیے تخت پر بیٹھی ہاتھ میں پین رجسٹر لیے وہ تیزی سے نہ جانے کیا لکھیے جا رہی تھی۔ اس کے لکھنے کی اسپید بھی اس قدر تیز تھی جس قدر بڑھنے کی۔۔۔

”گلائی۔۔۔ تم نے کسی کو نمبر دیا تھا اور مگر کا ایڈریس۔“ کا کا کی حیران آواز پر وہ چونکی تھی، نظر اٹھا کر دیکھا ان کے ہاتھ میں کچھ تھا۔
”نہیں کا کا۔“ وہ نفی میں سر ہلا گئی۔

”کیا ہوا ہے؟“ نہ جانے کیوں اس کا دل دھڑک اٹھا۔

”شہر سے تمہارے لیے کچھ آیا ہے۔“ انہوں نے پیکٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ شک نہ کر رہی تھی۔

☆☆☆

شام سے رات ہوئی اور رات سے فجر۔۔۔ اسے خبر تک نہ ہوئی تھی وقت کی۔ ڈائری کب شروع ہوئی کب ختم۔۔۔ کچھ پتا نہ تھا، لفظوں اور کرداروں کا ایک سحر تھا، جس نے اسے جکڑ لیا تھا، وہ خود بچپن سے کہانیوں کا دلدادہ تھا، کس ملک کا ادب تھا جس سے وہ ناواقف تھا۔ تاریخ سے لے کر فلکشن تک کی ہر کتاب پڑھنا جیسے اس پر فرض تھا، تمام تر تہمت ترین اسٹڈی شیڈول کے باوجود اس کا یہ شوق نہیں مریا تھا، بلکہ اس نے سوشل میڈیا پر اپنے پسندیدہ رسالوں کے گروپ اور مجبزی بھی بنائے تھے، کہانی کو اس سے اچھا بھلا کون سمجھ سکتا تھا۔

اور یہ کہانی۔۔۔۔ اس نے اسے اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا۔ ”کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ مسودہ ایک ان پڑھ لڑکی نے لکھا ہے۔ جو صرف اپنے جنون کی تسکین کرتی رہی اور جنون کب ختم ہوا اور جمال کو پہنچا شاید سے خود بھی خبر نہ ہو۔“ وہ نمسکرا دیا تھا۔

اس نے ڈائری بند کر کے تھوڑی سے لگائی اور

۔۔۔ جسے نہ جانے کتنی بار میں نے وہاں جا کر ڈھونڈا تھا وہ رسالے اور پیسے اٹھانے لگی۔
 ”میں تمہارا کون کون سا احسان چکاؤں گی درون۔۔۔“ خود کلامی کرتے ہوئے وہ کا کا کو حقیقت بتانے چل دی تھی۔

☆☆☆

سباcon کی تعلیم مکمل ہو چکی تھی۔ وہ شہر میں اپنا کاروبار شروع کرنا چاہتا تھا۔ ان چند ماہ میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ سباcon اور گلابی میں کافی دوستی ہو چکی تھی، اور انہوں نے جانا تھا کہ کوئی بھی انسان مکمل نہیں ہوتا، ہر دفعہ ہر ایک کو کچھ نہ کچھ مفاہمت کرنی پڑتی ہے۔ تب ہی زندگی نارمل رہتی ہے اور خوب صورت۔۔۔

گلابی اب بھی لکھتی تھی، پڑھتی تھی لیکن اب وہ باقاعدہ کا کا کی اور ایڈیٹر کی حوصلہ افزائی کی بدولت خود کہانیاں بھجوانے بھی لگی تھی۔ اور ایڈیٹر کی زبانی ہی اسے پتا چلا تھا کہ اس کی کہانی اس کی کسی دوست نے ان تک پہنچائی تھی، خاص طور پر پڑھنے کے لیے کہ یہ ایک بہت خاص چیز تھی اور انہوں نے بھی اس کی کہانی کو خاص ہی پایا تھا۔ بھی فوراً شائع بھی کر دی تھی، قارئین نے اس کہانی کو اس قدر پسند کیا تھا کہ ایڈیٹر اب اس سے باقاعدہ فون کر کے کہانی منگوایا کرتی تھیں۔

درون کہاں سے آیا تھا کیوں آیا تھا اس کی زندگی میں، کہاں اور کیوں چلا گیا تھا، اس نے سب اللہ پر چھوڑ دیا تھا۔

”اگر میری زندگی میں اس کا کوئی کردار ہے تو وہ ضرور واپس آئے گا۔“ وہ اکثر خود سے کہتی۔۔۔

”بھی پڑھتی رہتی ہو کبھی لکھتی رہتی ہو، کیا ہوتم یار۔“ وہ چھت پر بیٹھی لکھ رہی تھی جب سباcon اس کے قریب آ کے بیٹھ گیا۔

”ایسے ہی کاغذ کالے کرتی رہتی ہوں۔“ وہ مسکرائی، وہ اس کے دھنک رنگ مکان میں کھوسا گیا۔

”کاش کچھ تعلیم حاصل کر لی ہوتی۔ تو یہ کالے

صفحہ تمہاری پہچان بن جاتے۔“ سباcon کے لہجے میں تاسف بھر گیا۔ وہ خاموش رہی۔ ”کچھ تو بن جاتیں۔ مستقبل بن جاتا۔“

”پہچان کالے صفحاتوں سے نہیں بنتی۔ پہچان خود کو کھونے اور اپنے اندر سے مضبوط نعلق سے بنتی ہے۔“

تو یہ ہے باتیں تو فلاسفر کی طرح کرنی ہو۔“ وہ دونوں ہاتھ پیچھے لے کر جا کر ان کے سہارے ٹیک لگا کر تقریر پالیٹ گیا۔

تلاش کر کے حاصل کیے گئے علم سے بندہ فلاسفر ہی بنتا ہے۔ ورنہ آپ کی ڈگری والے تو ڈاکٹر، انجینئر یا کچھ اور۔۔۔“ وہ ذہین اور حاضر جواب تھی، سباcon نے اعتراف کیا۔

”پھر بھی اگر تم نے معیاری تعلیم حاصل کی ہوتی تو یقیناً مستقبل میں بہت آگے جاسکتی تھیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا، گلابی نے چونک کر اسے دیکھا پھر اپنے کاغذ سمیٹتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آئے والے دنوں کے لیے سوچا ضرور کرتے ہیں۔ مگر پریشان نہیں ہوا کرتے۔ اللہ یہ چھوڑ دینا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ وہ سب اچھا کرتا ہے۔“ مسکرا کر کہتے ہوئے وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ سباcon کی نظریں اس کے کھلے لمبے سیاہ بالوں سے الجھ کر رہ گئی تھیں۔

☆☆☆

”گلابی بہت بدل گئی ہے نا۔ سیانی ہو گئی ہے کافی۔“ خشک سبز چائے سے ٹہنیاں چھتے ہوئے کافی نے زمان آفریدی کو مخاطب کیا تھا۔

”نہیں۔ سباcon بدل گیا ہے۔ کافی سمجھ دار ہو گیا ہے۔“ لیٹے لیٹے ہی انہوں نے اپنا تجزیہ بیان کیا۔

”جو بھی ہے۔ اچھا ہے۔“ انہوں نے صاف کی ہوئیں پیتاں اٹھتے پانی میں ڈال دیں۔

”ایک دوسرے کو سمجھنے لگے ہیں۔ ہمارا خواب لگتا ہے جلد تعبیر پانے والا ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئے

”ان شاء اللہ۔۔۔ ان شاء اللہ!“ کافی نے

نورادعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔

”بس ایک مرتبہ سباعون شہر میں اپنا بزنس شروع کرنے والا خواب پورا کرے۔ تو خوشیاں اس گھر کا مقدر بن جائیں گی۔“

”آپ کو ویسے سباعون سے اس بارے میں بات کرنی چاہیے تھی“ قہوہ ان کو تھماتے ہوئے کاکی نے صلاح دی۔

”فی الحال تو وہ بالکل بھی نہیں مانے گا، اسے شہر میں سیٹل ہو جانے دو ویسے بھی میں اس کی طرف سے بے فکر ہوں، کسی لڑکی کو پسند کرتا تو اب تک بتا چکا ہوتا، میرے خیال میں تو اسے اس رشتے پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔“ انہوں نے اندازہ لگایا۔

”نیا دور ہے خان، آج کل کے بچوں کا کچھ پتا نہیں چلتا،“ کاکی نے کہا تو وہ سر ہلا گئے۔

”پھر بھی جس طرح سے وہ اب گھائی کا خیال رکھنے لگا ہے، میرے خیال میں یہ ہی اس کی پسندیدگی کا اظہار ہے۔“

”میں تو یہ ہی کہوں گی کہ اس سے بات کر لیں۔ گھائی کے لیے پوری برادری سے بڑے اچھے رشتے آرہے ہیں۔ ایسا نہ ہو بے خبری میں مارے ہی جائیں ہم۔“ ان کی بات میں وزن تھا۔

”اس بار رہنے دو۔ اگلی بار آئے گا تو بات کر لوں گا۔“ انہوں نے بات ختم کر دی تھی، کھڑکی کے قریب بیٹھی گھائی اس نئے حوالے کو سوچے جارہی تھی۔۔۔ اور اس کے اندر جیسے واقعی خوشی کے پھول کھلنے لگے تھے، وہ اپنی کیفیت سمجھ نہیں پا رہی تھی۔۔۔

☆☆☆

رات جس قدر سیاہ تھی، ستاروں کی ٹٹماہٹ ای قدر تیز اور چمک دار، آج آسمان صاف تھا اور چاند ستاروں کی ہمنوائی میں بے حد خوب صورت۔۔۔ وہ سینے پر ہاتھ باندھے نہ جانے کب سے ان کو دیکھنے میں مگن تھی، جب سباعون کے آنے پر اسے چونکا دیا۔

”تم نیچر سے کتنی محبت کرتی ہونا۔“ چھت کی

خفگی و یوار سے ٹیک لگاتے ہوئے اس نے پاؤں کی قینچی بنائی تھی۔ اور دونوں ہاتھ پیچھے موڑ کے دیوار پر لٹکا دیے تھے۔ گھائی نے ایک گہری نظر اس کے سر پہ پر ڈالی تھی ملائی جیسی سفید رنگت، صاف اور فیئر اسکن، ہمیشہ کی طرح ذرا سی بوڑھی شیو، کھڑی ناک اور بڑی بڑی کالی آنکھیں۔۔۔ وہ کس قدر خوب صورت تھا۔۔۔ وہ اسے دیکھے گئی۔

”اگر مچو نہ ہو تو بالکل کوئی ہیرو لگے“ دل میں خیال آتے ہی وہ خود بخود مسکرا دی تھی۔

”کیا سوچ رہی ہو۔۔۔“ سباعون نے اسے

چپ چاپ کھڑے دیکھا تو بوجھ لیا،

”یہی کہ آپ کس قدر خوب صورت ہیں۔“ وہ

صاف گوشتی نور اُتار دیا، سباعون کا قہقہہ جاندارتھا۔

”شاید۔۔۔ میں نے اتنا خوب صورت مرد نہ

دیکھا نہ سوچا۔“ گھائی نے اعتراف کیا۔

”درون بھی نہیں“ گھائی کے دل نے ایک

بیٹ مس کی تھی۔ وہ جواب نہ دے پائی تھی۔

”میں مذاق کر رہا تھا۔“ وہ مسکرایا۔ ”اچھا ٹھہرو

تمہیں ایک چیز دکھاتا ہوں“ اسے اچانک جیسے کچھ

یاد آیا تھا۔ وہ اپنی جینز کی پائٹس میں کچھ تلاش کر رہا تھا

، گھائی بد دل سی اسے دیکھے گئی نہ جانے کیوں اس کا

دل ایک دم سے ہی اچاٹ ہو گیا تھا۔

درون کا اس کی زندگی میں کوئی کردار تھا یا نہیں

لیکن یہ ایک حقیقت تھی کہ اسے اس کی خود کی تلاش کا

سرا درون نے ہی پکڑا یا تھا۔ اپنی ذات سے آگاہی

بھی ایک نعمت ہے اور یہ نعمت درون کی ہی بدولت

اسے حاصل ہوئی تھی، جو کچھ اپنے اندر اتنے سالوں

سے وہ ذخیرہ کرتی رہی اسے باہر کا راستہ درون نے

ہی دکھایا تھا، اللہ جب بھی کسی انسان کی مدد کرتا ہے،

کن کہہ دیتا ہے یا ویلے بنا دیتا ہے درون اس کے

لیے ایسا ہی ایک وسیلہ تھا لیکن وہ اسے بھول کیسے گئی

تھی، اسے خود پر غصہ آنے لگا تھا۔

”یہ دیکھو“ وہ چونکی اس کے ہاتھ میں بے حد

خوب صورت پین تھا۔ ”یہ میں تمہارے لیے لایا تھا

دینا ہی بھول گیا،“ نفیس سا گولڈن پین بے حد خوب صورت تھا۔ اس نے نرمی سے وہ پین تھام لیا۔“ اور یہ بھی تمہارے لیے،“ سونے کا خوب صورت نازک بریسلٹ اس نے اتنی اچانک اور تیزی سے اس کے دائیں ہاتھ میں ڈالا تھا کہ وہ ساکت کھڑی رہ گئی، سنہری بریسلٹ مرمرس کلائی پر جیسے چمکنے لگا تھا، گلابی کی آنکھوں میں ستائش کے رنگ ابھرے تھے۔
 ”واؤ، تمہارے ہاتھ بہت خوب صورت ہیں،“ سباعون کہے بنانا رہ سکا تھا۔ وہ خاموشی سے بریسلٹ کو دیکھنے لگی۔

”تمہیں پسند آیا میرا گفٹ۔“ اس نے پوچھا۔
 گلابی سر ہلا گئی۔

”میں نے سوچا تھا تم تعریف کرو گی۔“ وہ پھر سے سینے پر ہاتھ باندھ گیا۔

”شاید میں حیران بہت ہوں، تب ہی۔۔۔“ آپ نے کبھی کچھ گفٹ کیا بھی تو نہیں۔“ اس کی بات پر وہ ہنس دیا۔

”چلو اب نیچے جا کر سو جاؤ، کافی رات ہو گئی ہے۔“ سباعون نے کہا تو وہ سر ہلا کر نیچے کی طرف بڑھ گئی۔

”اس گفٹ کو کچھ اور نہ سمجھ لینا۔ تم میری کزن ہو بس اس لیے دل کیا کہ تمہیں کوئی تحفہ دوں۔“
 ”میں جانتی ہوں۔“ وہ کہہ کر نیچے بیٹریاں اتر گئی، وہ وہیں کھڑا نہ جانے کسے تلاش تار رہا۔۔۔

☆☆☆

سردیاں اس بار بہت دیر سے آئی تھیں، لیکن پورے جوین سے سرشام دھند اترتی تو اگلے دن دوپہر کے قریب جا کر کہیں کچھ دیکھنے کے قابل ہوتا انسان۔

موسم کوئی بھی ہو اس کی کمزوری رہا تھا گرمی کی طویل دوپہر، چلتی دھوپ سے نبرد آزما اونچے نیچے درخت اور چھاؤں تلے رکھے برتنوں سے پانی پیتے بے تاب پرندے۔۔۔ وہ گرما کے حسن کی دل دادہ ہو جاتی۔

خزاں میں جب ہر طرف خشک، سوکھے پتوں کی برسات ہوتی تو وہ دیر تک نکلے پاؤں چلتی، پتوں کی چرچراہٹ سے جیسے خزاں کے حسن کو سلامی دیا کرتی پہار کے آتے ہی ایک ایک پودے کو دوبارہ سے زندگی پاتے اپنی آنکھوں سے دیکھتی اور چھوٹی۔ اور سرما۔۔۔ جس دھند میں ٹریفک تک معطل ہو جاتی اس دھند میں نہ جانے وہ کیسے کیسے انوکھے رنگ دیکھ لیا کرتی، پتوں پر گھبرائی نمی اور شاخوں سے چمکتا کٹہرا اسے پریوں کا مسکن لگنے لگتا۔ جو صرف چند دنوں کے لیے وہاں بنایا گیا تھا۔ پشیمانی قطروں سے بنا گھر۔

ابھی بھی کافی دھندھی لیکن منظر صاف ہونے لگے تھے۔ وہ چادر لیے نہر کی طرف آگئی، ٹالی کے درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر اس نے نہر کے اس پار دیکھا کتنے ہی منظر واضح ہونے لگے تھے۔ وہ درون کی کتابیں چیک کر رہی تھی اور وہ مسکرا رہا تھا۔ بکریوں کے ریوڑ میں پھنسی یعنی درون کی سائیکل اور بکریوں کو ادھر ادھر کرتی آگے بڑھتی وہ خود۔۔۔ اس کے لب مسکرا دیے۔

”اتنی سردی میں یہاں کیا کر رہی ہو۔“ سوچوں میں غرق گلابی کو خبر تک نہ ہوئی تھی کہ سباعون کب وہاں چلا آیا تھا۔

”میں یہاں آتے وقت موسم کا خیال کبھی نہیں کرتی۔“ وہ اس کی طرف دیکھ کے مسکرائی۔ ”مجھے یہاں سے نہر کے اس پار کا منظر بہت پیارا لگتا ہے“ وہ اب ایک مرتبہ پھر سامنے دیکھ رہی تھی۔ نہر کے پار۔

وہ تمہیں اتنا یاد آتا ہے۔“ سباعون کی آواز بھاری سی لگی اسے۔
 ”کون“ وہ واقعی نہیں سمجھ پائی تھی۔

”درون۔“ گلابی نے دیکھا اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

”مجھ تو لگتا ہے وہ آپ کو بہت یاد آتا ہے۔“ وہ کھلکھلائی۔

”مجھے تو اکثر یاد آ جاتا ہے۔ خاص کر تمہیں ان جگہوں پر اس طرح کھویا ہوا دیکھ کر۔“

ہم نے ساری تیاری مکمل کر رکھی ہے، انہوں نے نفی دی۔
”لیکن میں ابھی ذہنی طور پر شادی کے لیے تیار
نہیں، پھر ابھی۔۔۔“ وہ ڈلڑا کر۔

”صاف بات کرو بخرودار۔۔۔“ زمان کی تیز
نظریں اس کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

”میرا مطلب ہے بابا ابھی میں اپنے شوق کی
تعمیل کرنا چاہ رہا ہوں اور پھر ابھی میں نے یہ بھی
ڈیسا یہ نہیں کیا کہ میں شادی کس سے کروں گا۔“

”شوق تعمیل کے قریب ہی ہے اور رہی بات
لڑکی کی تو یہ فیصلہ کب کا ہو چکا۔ تمہیں اس کے لیے فکر
مند ہونے کی ضرورت نہیں یہ انہوں نے حتیٰ فیصلہ سنایا۔
”کیا مطلب؟“ وہ پھر حیران ہوا۔

”تمہاری اور گلابی کی بات بچپن سے طے ہے
اس وقت سے جب تمہارے چاچا اور دادا زندہ تھے۔
اور یہ ان کا فیصلہ تھا۔“

”کیا؟“ وہ چلاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔
”اس میں اتنا اچھلنے والی کیا بات ہے، گلابی
اس گھر کی بیٹی ہے۔ نیک ہے شریف ہے، خوب صورت
ہے۔“

”لیکن گلابی میرے قابل نہیں ہے بابا! اس
نے زمان کی بات کاٹ دی تھی لمبے برآمدے سے
متصل کچن سے باہر آتی گلابی ساکت ہوئی تھی۔
”مطلب کیا ہے تمہارا سباعون۔۔۔؟“ زمان کو
طیش آ گیا۔

مطلب بہت صاف ہے بابا آپ نہیں سمجھنا
چاہتے تو اور بات ہے۔“ وہ نظریں جھکا گیا۔
”تو تم مجھے سمجھا دو۔“ زمان ضبط سے لب
کچلنے لگے۔

”بابا۔ میں نے یہ اعلا تعلیم اس لیے حاصل نہیں کی
کہ ساری عمر ایک گنوار عورت کے ساتھ گزار دوں۔
میں مانتا ہوں کہ گلابی اچھی لڑکی ہے خوب
صورت ہے لیکن پھر بھی اس کے پاس ایسا کچھ نہیں
کہ وہ میرے ساتھ چل سکے۔ میں شہر میں بزنس
شارٹ کر رہا ہوں، کل میرا ایک نام ہوگا، ایک

”میں ہمیشہ ایسی ہی رہتی ہوں ان جگہوں میں
سو آپ میرے بہانے درون کو یاد کرنا چھوڑ دیں۔“
وہ ناراض کچے میں بولی اس کا موڈ آف ہو چکا تھا۔

”ویسے ایک بات کہوں۔ اگر تم کہو تو میں درون
کے لیے بابا کو مناسکتا ہوں۔“ وہ اسے آزار ماٹھایا
واقعی ہمدردی جتا رہا تھا۔ وہ فیصلہ نہ کر پائی۔

”اگر کبھی اس کی ضرورت پڑی تا تو یقین کریں
بابا کو درون کے لیے میں خود منالوں گی۔ مجھے اس کام
کے لیے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔“ تیز لہجے میں
کہہ کر وہ رکی نہیں۔ تیز قدم اٹھاتی اندر چلی گئی تھی،
سباعون نہر کے دوسری طرف دیکھنے لگا۔

”میں نے شاید پھر ناراض کر دیا اسے۔“ دل
فکر مند سا ہوا۔

”ڈونٹ کیئر“ اس نے سر جھکا۔

☆☆☆

”گلابی۔ بیٹا آج تو اپنے ہاتھ کی کھیر بنا کر
کھلاؤ، بیٹھے کے لیے بہت دل کر رہا ہے، رات کے
کھانے کے بعد زمان نے گلابی سے فرمائش کی۔ تو
وہ خوش ہوتی تیزی سے کچن کی طرف چلی گئی،
سباعون بھی اٹھا۔

”تم بیٹھو، زمان نے سباعون سے کہا۔ تم سے
بات کرنی ہے۔“ وہ واپس بیٹھ گیا تو انہوں نے بات
شروع کی۔

”میرے خیال میں اب جبکہ تمہاری تعلیم بھی
مکمل ہو چکی ہے اور تم سیٹ بھی ہو چکے ہو نہ صرف
بزنس میں بلکہ جلد رہائش کا بھی بندوبست ہو جائے
گا۔ ان شاء اللہ مگر فی الوقت ہم نے تمہاری شادی کا
فیصلہ کیا ہے۔“

”شادی؟“ وہ اچھل پڑا۔ ”کیا مطلب بابا؟“
”تمہیں اب شادی کا مطلب بھی سمجھنا پڑے
گا۔“ انہوں نے مونچھوں کو تالا دیا۔

لیکن میں ابھی شادی کے لیے تیار نہیں۔“ وہ انکار
کر گیا۔ ”تمہیں کسی تیاری کی ضرورت بھی نہیں ہے،

اسٹینس ہوگا اور ایسے میں ایک پرائمری پاس لڑکی میرے ساتھ کھڑے ہونے کا کیسے سوچ سکتی ہے۔ بابا۔

”کسی کے بھی شانہ بہ شانہ چلنے کے لیے تعلیم ضروری نہیں ہوتی۔ اخلاق، سادگی اور نفاست پہلے درجے پر آتا ہے۔ دنیاوی تعلیم ثانوی ہے پھر کل بھی کسی سے کم نہیں ہے۔ اس کی شخصیت سے کوئی بھی اس کے پرائمری پاس ہونے کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔“

”اندازہ اور حقیقت میں بہت فرق ہے بابا۔ لوگ تو مجھ سے پوچھیں گے، اس سے بات کریں گے، کس کس سے جھوٹ بولیں گے ہم، بتائیں“ وہ اپنے فیصلے میں اٹل تھا، اس کا لہجہ بتا رہا تھا۔

”تو تم گلائی سے شادی نہیں کرو گے؟“ انہوں نے آخری بار پوچھا تھا۔

”بالکل بھی نہیں“ میں نے کہا نہ وہ میرے معیار کی نہیں ہے۔“ صاف جواب آیا۔

”تمہاری مرضی لیکن ایک بات یاد رکھنا سباعون۔“ بابا نے کہا تو وہ ان کی طرف دیکھنے لگا۔

”غور کا کوئی درجہ نہیں، یہ بے بنیاد ہے۔۔۔ وہ بے معنی چیز جو انسان بڑی خوشی سے اپناتا ہے۔۔۔ میری دعا ہے جب یہ غور ٹوٹے تو تمہیں زیادہ تکلیف نہ ہو۔“ کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے گلائی اپنے کمرے میں آگئی اسے سباعون کے ہاتھوں رد ہونے کی وجہ سے رونا کیوں آ رہا تھا، تکلیف کیوں ہو رہی تھی۔۔۔ وہ نہیں سمجھ پاتی تھی۔

☆☆☆

بابا اور اماں اس سے ناراض تھے، وہ شہر نہیں جا سکا تھا۔۔۔ ان کو منائے بغیر وہ اپنا نیا پروجیکٹ بھلا شروع بھی کیسے کر سکتا تھا، لیکن وہ دونوں اس سے مکمل بے نیاز ہو گئے تھے بات چیت بھی ضروری کام تک محدود رہ گئی تھی۔ بالآخر وہ اس کی مدد لینے اس کے کمرے میں آیا تھا۔

”تمہیں کیا ہوا ہے اتنے دن سے تم سے بات کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور میڈم ہیں کہ ملتی ہی

نہیں۔“ کمرے میں آتے ہی وہ اس پر برس پڑا تھا۔

”ایک کردار نے الجھا رکھا ہے بس اسی کو واضح کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔“ وہ بیڈ پر بیٹھی اپنے سامنے رکھے رجسٹر پر آڑھی ترچھی لکیریں لگا رہی تھی۔

”یار پہلے میری زندگی سلجھاؤ بعد میں سلجھا لینا یہ سارے فرضی کردار۔“ اس نے گلائی کے سامنے سے وہ رجسٹر اٹھا لیا۔

”یہ فرضی کردار نہیں ہوتے، کچھ بھی فرضی نہیں ہوتا جو محسوس ہوتا ہے وہ تخلیق ہو جاتا ہے چاہے صرف احساس ہی کیوں نہ ہو کردار تو پھر جسم ہے۔“ وہ بہت مشکل زبان بولتی تھی سباعون نے دل میں اعتراف کیا۔

”تمہیں غالب کے دور میں پیدا ہونا چاہیے تھا، یہ تو تشریح پڑھنے والوں کا دور ہے۔“ سباعون نے تبصرہ کیا۔

”کیا کام تھا آپ کو۔“ وہ اپنی کتابوں کو ترتیب سے رکھنے لگی۔

”یار، امی بابا کا خیال ہے کہ مجھے تم سے شادی کر لینی چاہیے۔“ اس کے ہاتھوں سے کتاب جھوٹے پچی۔

”لیکن تم جانتی ہو میں تم سے شادی نہیں کر سکتا کہاں میں ایم کی اے ٹاؤن پر ائمری پاس۔۔۔“ وہ لیکھت رکھا تھا گلائی کی آنکھیں جلنے لگی تھیں وہ رخ پھیرے کتابیں ترتیب دیتی رہی۔

”میں تمہیں حق نہیں جان رہا بس تمہارے اور اپنے بچ کے تعلق بات کر رہا ہوں تم سمجھ رہی ہونے۔“ گلائی کو کندھے سے تھام کر اس نے اسے باقی کتابیں رکھنے سے روک دیا تھا وہ اسے دیکھنے لگی۔

”میں غلط کہہ رہا ہوں۔“ نیلی آنکھوں میں جھانکا گیا اور پھر نظر ہٹا بھی لگئی۔

”بالکل نہیں۔“ وہ ہمیشہ کی طرح فوراً سنبھل چکی تھی۔

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں، پھر یہ آپ کا حق ہے۔“ اس کی بات پر وہ کھل کے مسکرایا تھا۔

”اور مجھے بھی۔۔۔“ وہ مزید بولی تھی، سباعون چونکا تھا۔

”میں خود بھی منع کرنا چاہ رہی تھی کا کا کی کو
آپ بے فکر رہیں۔“ گھائی کہہ کر اس کے پاس سے
گزر کر باہر جانے لگی سباعون نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
”کون ہے وہ؟“ نیلی آنکھوں میں جھانکا۔
”کون۔؟“ وہ حیران ہوئی۔

”جس کے لیے تم کا کی، کا کا کو میرے لیے منع
کرنے جا رہی تھیں۔“

”اچھا پھر وہ کون ہے؟“ وہ مسکرائی۔

”کون؟“ اب کی بار حیران ہونے کی باری
سباعون کی تھی۔

”جس کے لیے آپ مجھے اپنانے سے انکاری
ہیں۔“ اس کا لہجہ پر اعتماد تھا۔

”میں تو ایسے ہی۔۔“ وہ بول نہ سکا۔ اس کا ہاتھ
مھوڑ دیا۔

”میں بھی ایسے ہی۔۔۔“ وہ بول گئی اور آگے
بڑھ گئی۔

”مگر میں جانتا ہوں۔۔ وہ درون ہے۔“ وہ بڑ
بڑا ہاتھ لیکن اس کی آواز گھائی نے بھی سن لی تھی، اس
کی آنکھیں جھپکنے لگی تھیں۔

☆☆☆

سباعون چلا گیا تھا، اس کی دنیا ایک مرتبہ پھر قلم
کا فذ اور کتاب تک سمٹ گئی تھی اس کے لیے کالز آتی
اس قدر زیادہ ہو گئیں تھیں کہ کا کا نے اسے اپنا الگ
موبائل لے دیا تھا۔ وہ ہمیشہ اس کے خاکی لفافے اور
میں وصول کرتے کہ یہ اس کی کہانیوں کا اعزاز یہ ہے
میں وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا لکھتی ہے اور اس کا
تفنا نام بن گیا ہے۔

گھائی اب مزید رسالوں میں بھی لکھنے لگی تھی
اس کے دوستوں میں بھی دھیرے دھیرے اضافہ ہوا
فنا، ملک کی نامور لکھاری خواتین اس کی دوست تھیں،
ان ہی دنوں اسے ایک ٹی وی چینل سے کال موصول
ہوئی تھی، وہ اس سے مل کر اس کی کچھ کہانیوں پر
اعلان کرنا چاہتے تھے، تاکہ ڈرامہ کے لیے کوئی
اہل چنا جاسکے اس نے وہاں آنے سے معذرت

کر لی تھی وہ لوگ گاؤں آنے کی ضد کرنے لگے۔
”میرے خیال میں اس میں کوئی قباحیت
نہیں۔“ اس نے کا کا کو بتایا تو انہیں بے حد خوش
ہوئی۔ ”تم انہیں جو ملی میں ہی بلا لو۔“ انہوں نے
مشورہ دیا وہ سر ہلا گئی۔ ”میری بیٹی گھر بیٹھے مشہور
ہو گئی۔“ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے
فخریہ لہجے میں کہا وہ بس مسکرا کر رہ گئی۔

اور پھر اگلے چند ماہ میں اس نے یکے بعد
دیگرے نئے نئے پروجیکٹ سائن کر لیے تھے۔ لکھنا بڑھتا
اس کا جنون تھا اور اوڑھنا بچھوڑنا بھی، سو اسے کوئی
دقت نہ تھی۔

☆☆☆

وہ شہر آچکا تھا۔ اس نے دن رات محنت کر کے
قابل ترین لڑکوں کی ایک بہترین ٹیم بنالی تھی ان
سب لڑکوں کا تعلق غریب اور اوسط گھرانے سے تھا
اس کا ماننا تھا کہ ایسے لڑکوں میں آگے بڑھنے اور جلد
سے جلد کچھ کر گزرنے کا جذبہ ان لڑکوں کی نسبت
کبھی زیادہ ہوتا ہے جو ایک آرام دہ اور پر آپاس کش
زندگی گزارتے ہیں۔۔۔ ان سب لڑکوں کا تعلیمی
ریکارڈ بھی شان دار تھا اور سلیکٹ ہونے کے چند ماہ
کے اندر ہی انہوں نے ثابت کیا تھا کہ سباعون کا ان
پر بھروسہ ہرگز غلط نہ تھا اس نے ان سب لڑکوں کا
انتخاب کر کے ایک بہترین فیصلہ لیا تھا۔

اس کے علاوہ اس نے ان لوگوں کو بھی ڈھونڈا
تھا جو کئی سال مختلف کمپنیوں کی ترقی میں اہم کردار ادا
کرنے کے بعد اب گھروں میں آرام کے دن گزار
رہے تھے۔ ایسے لوگ تجربہ کے ذخائر رکھتے تھے اپنے
اندر، اور اس کے بزنس کے لیے بہترین ستون ثابت
ہو سکتے تھے جس جس شخص تک اس نے رجوع کیا تھا
انہوں اسے خوش آمدید کہا تھا کیونکہ عمر کے اچھے
خاصے حصے میں ہونے کے باوجود ان کے ذہن ابھی
زرخیز تھے اور وہ اس کے بزنس کی ترقی میں بہترین
کردار ادا کر سکتے تھے۔

”سباعون نے بہت تیزی سے نام بنایا تھا،

سب اس کی مرضی کے مطابق ہو رہا تھا لیکن اس کے باوجود وہ خوش نہ تھا، اندر کہیں کوئی کسک ہی تھی۔ تیز ہوا سے کھڑکی کھلی تھی، اس کے سامنے بکھرے کاغذ اڑنے لگے تھے وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس آیا تھا، بارش ہونے والی تھی شاید، ہوا تیز تھی اور موسم خوش گوار۔

”وہ بھی اس وقت ضرور کھڑکی میں کھڑی ہوگی۔“ وہ مسکرایا تھا اور دل۔۔۔ دل نہ جانے کیوں ڈوبا تھا، دور کپتار کے درخت کے پاس پھول چلتی گلگالی نہ جانے اسے کیوں اتنی صاف نظر آ رہی تھی جبکہ وہ جانتا تھا وہ یہاں کہیں نہیں تھی۔

☆☆☆

اس کے سامنے مختلف قسم کے کاغذ بکھرے ہوئے تھے ہاتھ سے لکھے خطوط ٹائپ لیے گئے خطوط، ہاتھ سے ڈرائنگ کیے ہوئے کارڈز اور نہ جانے کیا کچھ۔۔۔ ان میں ایڈیٹرز کی طرف سے بھیجے جانے والے اس کے فین قارئین کے لمبے خطوط، ٹی وی ڈراموں کا آن لائن ملنے والے ریویوز کے پرنٹس، اس کے سننے پرانے دن لائٹسز اور تحفے بھیجے جانے والے کارڈز۔۔۔ اس کے علاوہ کچھ دعوت نامے بھی تھے اس کے سپرہٹ ڈرامے سے متعلق شو میں اس کی خصوصی شرکت کی استدعا لیے دعوت نامہ۔۔۔ کچھ دوسرے شوز میں ان کا انٹرویو لینے کی درخواست اور ایک دعوت نامہ آل پاکستان افسانہ مقابلہ میں حصہ لینے کا بھی تھا، یہ ملک کی ایک بہت بڑی پبلشنگ ایجنسی منعقد کروا رہی تھی۔ قواعد و ضوابط بہترین تھے اور انعامات بھی۔۔۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی مراعات تھیں۔ ملک کی نامور لکھاری خواتین اس مقابلہ میں حصہ لے رہی تھیں، اس نے وہ دعوت نامہ اٹھا لیا۔ جس کے اوپر سنہری حروف میں اس کا نام جگمگا رہا تھا۔

”گل آفریدی“ وہ دھیرے دھیرے چلتی کھڑکی کے پاس آگئی شیشے کی دوسری طرف ہوا سے جھومتے پودے اسے صاف نظر آ رہے تھے آسمان کالے بادلوں سے مکمل طور پر ڈھک چکا تھا۔ اس کی

نظر حویلی کی بیرونی دیوار کے اس پار کے منظر پر جم گئی۔

ٹالی کا درخت اداس تھا۔۔۔ وہ اتنے دنوں سے اب وہاں جاتی جو نہیں تھی۔ آم کے درخت سے پھل پتے سب غائب ہو چکے تھے۔ کچھ دن پہلے ہی تو بابا نے اس کی کٹائی کروائی تھی، تاکہ شاخیں زیادہ مضبوط ہو سکیں۔ جاسن کا درخت بھی تہی داماں تھا۔۔۔ نہ جانے کیوں وہ بھی اسے اداس سالگ۔ تب ہی اس کی نظر نہر کے پار گئی اور اس جگہ پر ٹھہر گئی جہاں درون پہلی بار اسے ملتا تھا۔

”اوہ تو میرے اندر کا موسم اداس ہے اس لیے مجھے سب کچھ۔۔۔ ہر منظر اداس نظر آ رہا ہے“ وہ اداسی سے مسکرا دی۔

”درون۔“ اس نے دھیرے سے پکارا۔ پھر ہنس دی۔

”مجھے آج تمہاری بات سمجھ آئی۔“ وہ کھڑکی کے مزید قریب چلی آئی ”تمہارے دل کا رشتہ اس قدر سچا ہے کہ اس کی خوشبو میرے دل سے بھی اپٹ سی گئی ہے۔“ باہر بارش شروع ہو چکی تھی،

”اور مجھے آج یہ کہنے میں کوئی شرم نہیں کہ مجھے بھی تم یاد آنے لگے ہو۔“ دوسری طرف کھڑکی کا شیشہ بھینچنے لگا تھا اور اس طرف اس کی نیلی ساحر آنکھیں۔۔۔۔

☆☆☆

بارش کی وجہ سے سردی مزید بڑھ گئی تھی۔ اور سخت ٹھکے وجود میں سردی مزید درد بھرنے لگی تھی۔ لیکن اسے ابھی گھر نہیں جانا تھا، لمبا کالا اور کوٹ پہنے وہ بارش سے بچتا اس بک شاپ پر پہنچا تھا۔ چند لمحوں بعد ہی اس کی مطلوبہ چیز اس کے ہاتھ میں تھی یہ ایک مقامی اخبار تھا جس کے فرنٹ پیج پر آل پاکستان افسانہ مقابلہ کے نتائج چھپے تھے اور پہلے نام کو دیکھتے ہی اس کی ساری ٹھکن زائل ہو گئی تھی اس کی خوب صورت سنہری آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ وہ تیزی سے پیسے ادا کر کے باہر نکل گیا تھا۔

”کون ہو آپ؟“ وہ شاید غیر ملکی نمبر دیکھ کر حیران تھی۔

”میں نے سوچا تھا۔ میری آواز سنتے ہی تم پہچان جاؤ گی۔“ وہ تاسف بھرے لہجے میں بولا۔
 ”ساعون۔“ اس نے واضح طور پر گلانی کی آواز میں خوشی کھلتی محسوس کی تھی۔ وہ خوش ہو گیا۔
 ”اتنی دفعہ کال کرتا ہوں بابا تو تم بات کیوں نہیں کرتیں؟“ اس نے گلے کیا۔

”مصرف ہوتی ہوں نہ۔“ دوسری طرف شاید وہ مسکرا رہی تھی وہ مطمئن ہو کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگا گیا۔

”اچھا۔ ایسا کیا کرتی ہو تم؟“ وہ ہنسا۔
 ”آپ جانتے ہو میری مصروفیت۔“ وہ مسکرائی تھی۔

”وہی لکھتا پڑھا۔۔۔ اوہ مائی گاڈ ابھی تک۔“ وہ حیران ہوا۔ وہ اس بار خاموش رہی۔

”مجھے امی کو سمجھانا پڑے گا۔ جلد از جلد کوئی اچھا سالاکا ڈھونڈ کر تمہارا بندوبست کریں۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”کاکا تو بندوبست کرتے کرتے تھک گئی ہیں۔ میں ہی نہیں مان کر دی۔“ وہ ہنسی بھل ترنگ سی ہنسی۔ وہ کھوسا گیا۔

”اب تو کاکا نے صاف کہہ دیا ہے، میری زندگی کا یہ فیصلہ تب ہی ہو گا جب میں چاہوں گی۔“ وہ اتر رہی تھی۔

”اچھا۔“ وہ مسکرایا، ”تو تم نے کہا فیصلہ کیا؟“ تجسس اٹھا۔

”ابھی تو میں خود بھی نہیں جانتی۔ بس آنے والے دنوں کے لیے منتظر ضرور ہوں۔“

”تمہاری منزل تو صاف تھی ہمیشہ سے۔“ وہ اسے کرید رہا تھا۔

”میری منزل تو کبھی صاف نہیں رہی زندگی میں جو کچھ بھی ہوا میں نے کبھی نہ سوچا تھا اور جو کچھ ہونے والا ہے اسے سوچ کے خواہ مخواہ پریشان ہونے

”اس کی آنکھیں کتنی خوب صورت تھیں۔“ دکاندار نے اس کے باہر نکلنے ہی حیرت سے خود گلانی کی تھی۔

☆☆☆

وہ کارڈ دیکھ کر اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ وہ آل پاکستان افسانہ مقابلہ جیت گئی تھی۔ اس کی پلکیں پکھننے لگی تھیں۔ کارڈ ہاتھ میں لیے وہ روٹی ہوئی سب سے پہلے اس جگہ پہنچی تھی جہاں درون اس سے ملا تھا وہ کچھ دیر یونہی کھڑی رہی اس کی پلکیں پکھننے لگی تھیں وہ دوزخ میں پر بیٹھ گئی۔ ”دیکھو درون تم نے جس گل آفریدی سے میرا تعارف کروایا تھا وہ آج کہاں پہنچ گئی ایک پرائمری پاس لڑکی کہاں پہنچ گئی۔“ وہ کارڈ زمین پر رکھ کے پھوٹ پھوٹ کے رو دی تھی۔

☆☆☆

”وہ آج کل بزنس ٹور کے سلسلے میں انگلینڈ آیا ہوا تھا وہ روز شام کو گھر فون کیا کرتا بابا اور اماں سے تو بات ہو جاتی تھی لیکن گلانی سے بات کرنے میں وہ کامیاب نہ ہو پاتا اور یہ بات اسے بے طرح اداس کر دیتی تھی اس کا دل ہر چیز سے اداس ہونے لگتا۔

”میں تمہیں اس کا نمبر دے دیتا ہوں“ اس دن اس کے اصرار پر بابا نے کہا تو وہ حیران رہ گیا۔
 ”گلانی نے اپنا نمبر کب لے لیا؟“ اس نے حیرانگی سے سوچا۔ ”اسے بھلا فون کی کیا ضرورت؟“ وہ سوچے گیا۔

”درون“ کوئی کیڑا سا دماغ میں کلبایا تھا۔ اس طرف کٹھنی میں درد کی شدید لہر ابھی تھی، اس نے ہند لے مو بائل اسکرین پر اس کے چمکتے نام کو دیکھا تھا پھر کال کو بچ کر دیا۔ بیل جاری تھی۔۔۔
 ”ہیلو“ کال پک ہوتے ہی وہ تیزی سے بولا۔

ہا۔

”السلام علیکم!“ یہ ٹھہرا سادہ ہم لہجہ۔ وہ ایسے ہی بولتی تھی۔ شام کے وقت رک رک کے بہتی سریلی آواز پیدا کرتی لہروں کے جیسی۔۔۔ وہ کھوسا گیا۔

سے فائدہ سب اچھا ہی ہوگا۔“ وہ پر امید تھی۔
 ”اچھا میں رہتی ہوں۔ دوسری کال آ رہی ہے۔“ کال ختم کر دی گئی تھی۔ وہ تو اس سے مزید بات کرنا چاہتا تھا۔

”دروں کی ہی کال ہوگی۔“ وہ موبائل کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔

”وہ شاید اس کے متعلق مجھے بتانا نہیں چاہتی۔“
 کچھ دیر پہلے غائب ہونے والا تاسف پھر سے اسے جکڑنے لگا تھا۔

☆☆☆

”اس سال بہترین ڈرامہ کے لیے وہ دو بڑے چینلز کے ایوارڈ کے لیے نامزد ہوئی تھی، اس نے ایوارڈ شو کا پاس حاصل کر لیا تھا۔ یہ اس کے لیے مشکل نہ تھا۔ مشکل تھا تو بس اس دن کا انتظار۔۔۔ جب اتنے عرصے بعد وہ گلائی کو اپنے سامنے دیکھتا۔۔۔ پری پیکر جو اس لمبے عرصے میں اس کی آنکھوں میں اپنی لودیتار ہا تھا۔ اس آواز کو سنتا۔۔۔ جو اسے دنیا کی سب آوازوں سے سربلی اور با مقصد لگا کرتی تھی۔ جو کچھ وہ اس کی نیلی آنکھوں میں پڑھتا تھا۔۔۔ با آسانی پڑھ لیتا تھا، جو کچھ بھی وہ اپنے اندر چھپائے پھرتی تھی۔

”اس نے سب سے آخری رو کا پاس لیا تھا۔ تاکہ وہ اسے نہ دیکھ سکے۔ نہ پہچان سکے۔ لیکن وہ اسے با آسانی دیکھ سکے۔“ ہمیشہ کی طرح میٹ آف لک گلائے۔“ وہ مسکرایا تھا۔

☆☆☆

”یہ کیا بات ہوئی بھلا؟“ اس نے ایوارڈ کی تقریب میں جانے سے انکار کر دیا۔ کا کا، کا کی دونوں ناراض ہونے لگے۔

”اللہ نے اتنی عزت دی ہے تیری دن رات کی محنت کا انعام ملنے لگا ہے تو تم منکر ہو رہی ہو۔“ کا کا اسے سمجھانے لگے۔

”میں تو سمجھتی تھی، تم بس ایسے ہی اتنے صفحے کالے کر کر کے بھیج دیتی ہو اور وہ نمنا (ایڈیٹرز)

تمہیں یہ ہرے ہرے نوٹ بھیج دیتے ہیں۔ میں تو دل میں ان پاگلوں پر خوب ہنسا کرتی تھی۔ مجھے تو اندازہ ہی نہیں تھا، میری بیٹی ہیرا ہے ہیرا۔ پورا پاکستان جاننے لگا ہے میری بیٹی کو اور تمہاری بیٹی وجہ سے ہمارے سارے خاندان کا نام روشن ہوا ہے۔“ کا کی مارے تشکر کے بہنے والے آنسوؤں کو دودھ پٹے سے صاف کرتے ہوئے بولیں تو وہ ان کی سادہ لوحی پردل سے مسکرا دی

”بالکل۔ اور تب دیکھنا جب میری بیٹی کو بولتا ساری دنیا دیکھے گی اور سنے گی۔“ کا کا فخر سے بولے ”لیکن کا کا۔۔۔ میں کبھی گھر سے باہر نہیں گئی کسی بھی تقریب میں پھر ملک کے ایک بڑے سے شہر میں گاؤں سے دور اتنی بڑی تقریب میں، اتنے زیادہ لوگوں کے سامنے میں بھلا میں کیسے۔۔۔؟“ وہ خوف زدہ تھی۔

”سب کچھ ہو سکتا ہے پتر۔۔۔“ کا کا نے اسے اپنے قریب بٹھالیا۔ وہ انگلیاں مروڑے گی۔ ”یہ سب بھی تو مشکل تھا۔۔۔ یاد ہے مہینے میں نے، سباعون نے تمہیں کتنا سمجھایا تھا کہ آگے پڑھ لو۔ لیکن تم نے صرف دوسرے گاؤں میں اسکول ہونے کی وجہ سے میری بات نہ مانی، اس وقت مجھے امید تھی کہ میری بیٹی کبھی نہ کبھی راضی ضرور ہوگی۔ لیکن تم نہ مانیں اور اب، اتنی بڑی کامیابی دیکھ کر یقین مانو میری وہ امید ٹوٹنے کا سارا غم بانی کی طرح بہہ گیا ہے، ایک سرخوشی ہے کہ سب کچھ ممکن ہے۔ میرا یقین کرا بیٹا۔ یہ سب بھی بہت آسان ہوگا۔“ کا کا نرم لہجے میں اسے سمجھا رہے تھے۔ مگر وہ اب بھی متذبذب تھی۔

”میری بیٹی ٹی وی پر آئے گی وہ بھی ایک خلیق کار کی حیثیت سے میرا تو سر فخر سے بلند ہو جائے گا پھر تمہارے لیے بھی نئی راہیں کھل جائیں گی۔“ گلائی نے کا کا کی طرف دیکھا ان کے چہرے پر سچی خوشی کھلی تھی۔ ”میری خاطر بیٹا۔“ انہوں نے کمرہ بوڑھے ہاتھوں سے اس کے ہاتھ تھامتے ہوئے جیسے گزارش کی تھی۔ وہ ہارنے لگی تھی۔

”ٹھیک ہے کا کا۔ مگر میرے لیے دعا کیجیے گا۔“
ان کو خوش چھوڑ کر وہ کمرے میں چلی آئی گھڑی کی
طرف دیکھارات کے گیارہ بج رہے تھے۔
”کیا اس بارے میں سباعون کو بتاؤں؟“ اس
نے خود سے مشورہ مانگا۔ ”وہ بھلا کہاں یقین کرے گا
۔“ اس نے سوچتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ ”الٹا ہنسنا
شروع کر دے گا، مذاق اڑائے گا۔“ وہ خود کو ڈرینک
ٹیبیل کے قد آور آنسنے میں دیکھتے ہوئے سوچنے لگی
کہ یکلخت منظر بدلنے لگے تھے وہ گھبرا کے دو قدم
پیچھے ہٹی تھی۔

وہ سباعون تھا۔۔۔

وہ اس کی کتابیں جلا رہا تھا۔۔۔ گلائی کا چہرہ
اس آگ کی تپش سے جلنے لگا تھا۔
منظر پھر بدل گیا تھا۔

درون زمین پر لیٹا تھا اور سباعون لاتوں سے
ایسے پیٹ رہا تھا۔ گلائی کے دل میں درد کی شدید لہر
اٹھی تھی، سباعون اب اسے ہاتھ سے پکڑے کمرے
میں بچنے کے لارہا تھا۔ اب وہ دروازہ لاک کر رہا تھا
۔۔۔۔

”آئم ساری۔“ درد ذرا سا کم ہوا۔ ”تم درون
کو یاد کرتی ہو نہ۔“ اس کی کالی آنکھیں سرخ ہوئی
تھیں۔ گلائی مزید پیچھے ہونے لگی۔

”وہ درون ہے نہ؟“ چہتے سوالات۔۔۔

”کا کا نظر رکھا کریں۔ لڑکی ذات ہے۔ نہ
ہانے کیا لکھ کے بھیجتی ہے کیا لکھا واپس آتا ہے“ وہ
اس کے لیے آنے والا خاکی پارسل چیک کر رہا تھا
۔۔۔۔

”گلائی اچھی لڑکی ہے، خوب صورت ہے پھر
بھی اس کے پاس ایسا کچھ نہیں کہ وہ میرے ساتھ
ہل سکے۔“ منظر صاف ہو گیا تھا اس نے لمبی سانس
لے کر خود کو نارمل کیا تھا

”نہیں۔ میں اس قابل نہیں کہ سباعون میرے
ساتھ چلے میری وجہ سے اسے شاید مزید شرمندگی ہو“
اس نے سوچا یا پھر غصہ ہو جائے اور جانے سے منع

بھی کر دے۔“ وہ بیڈ پر بیٹھ گئی ”میری تو پھر بھی خیر ہے
مجھے خود بھی کوئی شوق نہیں جانے کا لیکن کا کا کی وہ
دونوں کس قدر خوش ہیں۔“ وہ سوچے لگی۔ ”نہیں۔
میں اسے نہیں بتاؤں گی۔“ اس نے موہل آف کر دیا۔
”درون“ اس نے آنکھیں میچ لیں۔
”تم ہوتے تو میں تمہیں ضرور بتاتی۔“ وہ
دھیرے سے مسکادی تھی۔

☆☆☆

”اس کا فیورٹ چمیل آن تھا، کوئی ایوارڈ شو
آ رہا تھا۔ وہ اوپن جکن میں ایسے لیے نوڈلز بنا رہا تھا
ٹی وی کی آواز اس قدر اونچی تھی کہ آواز اس تک پہنچ
رہی تھی گا ہے بگا ہے وہ ذرا رخ موڑ کر اسکرین کی
طرف بھی دیکھ لیتا تھا نوڈلز بن چکے تھے وہ ابھیں
باؤل میں انڈیلنے لگا۔

”تشریف لا رہی آپ سب کی بھرپور تالیوں
میں عائشہ پذیر۔“ ڈراموں کی نوٹیز شروع ہو چکی
تھیں ایورڈ دینے کے لیے مشہور اداکارہ کو دعوت دی
گئی تالیوں کی گونج میں سب ہی نامزد لکھاریوں کے
نام دہرائے جانے لگے۔

”گل آفریدی۔“ اس کی پسندیدہ رائٹر کا نام
بھی شامل تھی۔ وہ مسکرایا۔ اور گا جرش کرنے لگا۔
اسے ہمیشہ سے نوڈلز کے ساتھ کش کی کنکس کا جریں
بے حد اچھی لگتی تھیں۔

”اور اس دفعہ بہترین رائٹر کا ایوارڈ جاتا ہے گل
آفریدی کو“ تالیاں گونج اٹھی تھیں۔

”میں جانتا تھا یہ“ وہ گا جریں نوڈلز پر ڈالنے لگا۔
”بسم اللہ الرحمن الرحیم“ سکوت سا چھایا تھا
سباعون کے چلتے ہاتھ ایک دم رک سے گئے تھے۔

”سب سے پہلے اللہ پاک کا شکر ہے اور میرے
کا کا کی کا، اور ان قارئین کا جنہوں نے مجھے بتایا
کہ میں یہاں تک آسکتی ہوں۔ صاف انگلش میں
بولتی وہ آواز۔ سباعون مڑنے تک کی سکت کھوچکا تھا
جیسے“ اور اس دوست کا۔۔۔ جس نے مجھے میری
ذات کا سرا تھا یا اور جس کی وجہ سے آج میں یہاں

النگش، اس قدر صاف لیکن توجہ پروردہ شاکد تھا۔ اس نے تیزی سے بابا کا نمبر ملا یا۔ کال اماں نے اٹھائی تھی۔
 ”وہ اور گلائی تو شہر گئے ہوئے ہیں۔ گلائی نے انعام جیتا ہے بہت بڑا میری بیٹی نے ہمارا نام روشن کر دیا ہے۔“ اماں خوشی سے روئے جا رہی تھیں۔
 ”مگر یہ سب مجھے کیوں نہیں بتایا گیا اماں۔“ وہ غصے سے پھٹ پڑنے کو تھا۔

”لے۔“ تجھے سب پتا تو تھا، پر تو کبھی خوش تھوڑی ہوا۔ تم نے تو اس بے چاری کو ہمیشہ ناکارہ کہا۔ ٹوکتے ہی رہے اس لیے اس بات پر غصہ ہونے لگیں۔
 ”چھوڑو! اس پر غصہ ہونے لگیں۔“
 ”اچھا ابھی بند کرنی ہوں شاید گلائی کال کرے انہوں نے کال بھی کاٹ دی تھی۔
 ”تم نے تو اس بے چاری کو ہمیشہ ناکارہ کہا، ٹوکتے ہی رہے۔“ اس کی آنکھیں جلنے لگیں، ضبط کے مارے وہ لب کھلنے لگا۔

☆☆☆

”درون۔“ وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس قدر قریب کہ وہ اسے ہاتھ بڑھا کے چھو سکتی تھی۔ کا کا ہوٹل میں آرام کر رہے تھے رات کی فلائٹ سے انہیں واپس اسلام آباد جانا تھا اور پھر وہاں سے گاؤں اسی لیے وہ درون سے ملنے یہاں آئی تھی ہوٹل کے چھلی طرف بنے چھوٹے سے ہرے سبز پارک میں۔
 ”مجھے یقین تھا، تم ایک دن اسی منزل پہ ملو گی۔“ وہ مسکرایا اس کی خوبصورت آنکھیں بھی۔

”میں نے تمہیں بہت یاد کیا۔“ وہ زندگی میں دوسری بار اسے بتا رہا تھا۔ ”اور تم جانتی ہو کہ اس کے لیے مجھے تمہیں جاننے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”لیکن میں تمہیں اچھی طرح جان گئی ہوں۔“ وہ بھی اداسی سے مسکرا دی۔ ”آج مجھے بھی تم سے کہنا ہے کہ۔۔۔“ وہ دراز کی اور رخ پھیر کر دوسری طرف سڑک پر چلتی گاڑیوں کو دیکھنے لگی، درون خاموش کھڑا اس کے اگلے جملے کا منتظر رہا۔

آج آپ سب کے درمیان موجود ہوں۔“ تالیاں شور مچانے لگی تھیں۔ وہ دھیرے دھیرے مڑا تھا۔ پھر بھاگ کر دی کے نزدیک آیا۔
 ”اور آخر میں بس اتنا کہ انسان کچھ بھی نہیں ہوتا لیکن اس کو مکمل اور نکھارتی اس کی محنت ہے۔ اپنے باہر کو سمجھیں، جانیں اور اپنے اندر کو سنیں۔ یقین کریں یہی انسان کی کاملیت ہے اور آپ کی ذات کا جمال بہت شکریہ۔“

سادہ سفید چادر میں ڈھکا وہ نازک سا دھوکا بلا شبہ گلائی ہی تھی وہ ایوارڈ وصول کرنے کے بعد تالیوں کے شور کی گونج میں اسے نیچے جا رہی تھی۔ اور ایک چھوٹے سے گاؤں کی اس لڑکی کی مزید ہمت افزائی کے لیے سارا ہال تالیاں بجاتا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ باوقار سی مسکراہٹ لیے گلائی اس کے آنسوؤں کی دھندلے اس سے چھپائی تھی۔

”وہ اسے نیچے اتر کے پھلی لائنز میں بیٹھے کا کا کی طرف آئی تھی۔ لوگ کھڑے ہو کر اس کے لیے تالیاں بجا رہے تھے اور وہ آنسو بہاتی کا کا کے سینے سے جا لگی تھی۔ انہوں نے محبت سے اس کو اپنے ساتھ لگایا تھا۔

تقریب جاری تھی لوگ دوبارہ سامنے کی طرف متوجہ ہو چکے تھے کہ اچانک ہی اس کی نظر اٹھی تھی اور جیسے پلٹنا بھول گئی تھی بالکل آخری رو میں مسکراتی آنکھوں سے اسے دیکھ جانے والا وہ شخص وہ اسے بھلا کیسے بھول سکتی تھی وہ فوراً اس کی طرف بڑھی تھی کہ اس نے مسکراتے ہوئے اسے رکنے کا اشارہ کیا تھا اور واپس جانے کا بھی وہ اس کی بات سمجھ گئی تھی تب ہی خاموشی سے واپس اپنی سیٹ پر جا بیٹھی تھی البتہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ پیچھے مڑ کر اس کی موجودگی کا اطمینان ضرور کر لیتی تھی۔

☆☆☆

اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا
 ”یہ گلائی کیسے ہو سکتی ہے۔“ وہ پریشان ہو گیا۔
 ”ایک پرائمری پاس لڑکی۔۔۔ اور اس کی

کے ہاتھ تھام لیے نظریں جھکالیں وہ ان کے مزید بولنے کی منتظر رہی۔

”وہ پلٹ آئے گا۔“ بالآخر انہوں نے لب کھولے۔ گلائی کی نظر جھک گئی ”میں نے اس کی آنکھوں میں بھی تمہارے ہی عکس دیکھے ہیں وہ تب سمجھ رہے۔ جب سمجھ جائے گا۔ لوٹ آئے گا“ ان کی آنکھوں میں التجا تھی۔

”میں ان کے قابل نہیں ہوں کا کا۔“ وہ غم لہجے میں بولی زمان خان کے اندر جیسے سب کچھ ٹوٹ کے بکھرا تھا۔

”وہ اب سب سمجھ بھی جائیں تو میں خود کو ان کے قابل کبھی نہیں سمجھ سکتی۔ مجھے اس الجھن میں نہ الجھائیں کا کا کہ ساری زندگی ہی سلجھانے میں گزر جائے۔ آپ خود بتائیں کا کا کسی نرم کرم موسم کا طویل انتظار کرنے کے بجائے میں اس بہار کا ہاتھ کیوں نہ تھام لوں۔ جو خود میری منتظر ہے۔“ وہ امید بھری نظروں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی تھی۔ ساری بات صاف ہو گئی تھی زمان خان نے سر ہلاتے شفقت سے ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا تھا۔ ”اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔ آمین۔“ وہ ان کے گھٹنوں پر سر رکھے رو دی تھی۔

”میں نے بھی تمہیں بہت یاد کیا۔“ اس نے اعتراف کیا تھا اور آنکھیں موند لیں، آنسو گالوں پر لوٹ گئے۔

”میں تمہارا ہر لفظ اپنے اندر اتارتا رہا۔ میری سانسیں چلتی رہیں۔“ وہ دو قدم قریب آ گیا تھا۔ ”میں نے ہر لفظ لکھتے وقت تمہیں یاد کیا تھا میں مانتی ہوں میں نے دیر کر دنی تھی لیکن بالآخر میں نے اپنے اندر کی پکار سن لی تھی۔“ وہ اس کی طرف مڑی۔ ”میں مانتی ہوں کہ گلائی۔۔ درون کے بغیر ادھوری ہے اس بار مجھے اکیلے چھوڑ کر مت جانا درون۔“ اس کی نیلی آنکھوں نے گواہی دی تھی، گزارش کی تھی۔ جبکہ لب خاموش رہے تھے۔

”وعدہ رہا۔“ سنہری آنکھوں نے وعدہ کر لیا تھا۔ ”میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں کا کا۔“ وہ ان کے کمرے میں آئی تو وہ جو کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے چونک پڑے۔ گلائی کو دیکھ کر ان کے چہرے پر نرمی مسکان ابھری۔

”میں جانتا ہوں۔ جو میری بیٹی مجھ سے کہنے آئی ہے۔“ گلائی حیرانگی سے ان کو دیکھنے لگی۔ ”لیکن میں بھی تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“ انہوں نے اس

ایک میں
اور ایک تم



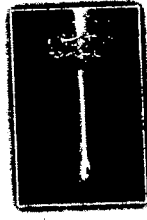
تزییلہ ریاض
قیمت - 350 روپے

اُجالوں کی بستی



فاخرہ جمیں
قیمت - 400 روپے

کسی راستے کی
تلاش میں



میمونہ خورشید علی
قیمت - 350 روپے

میرے خواب
لوٹا دو



نگہت عبداللہ
قیمت - 400 روپے

فون نمبر:
32735021

منگوانہ
کاتبہ
مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی

نے اسے اتارے بغیر ہی چڑیاں پہنا شروع کر دیں۔

”اسے اتار دو۔“ وہ جو دروازے میں کھڑا اسے دیکھ رہا تھا پاس چلا آیا وہ چونکی پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”سباغون“

”تم نے تو حد ہی کر دی بدلہ لینے میں گلائی۔“
”میں نے تو بس دل کی مانی میں بدلہ لینے والوں میں سے نہیں ہوں۔“

”تو وہ درون ہی تھا۔“ وہ اب بھی بدظن تھا۔
گلائی کو افسوس ہوا۔

”نہیں تھا۔ مگر اب ہے۔“ وہ ہمیشہ کی طرح مسکرا دی تھی۔

”کچھ دیر تو انتظار کر لیتیں۔“ اس کی غم نظریں گلائی کے خوبصورت چہرے پر جمی تھیں۔

”بہار منتظر ہو تو انتظار نہیں کرایا کرتے۔“ اس نے پلٹ کر باقی چوڑیاں اٹھائیں ”اور ہاں۔ یہ تحفہ تمہارا ہمیشہ میرے ساتھ رہے گا۔“ اس نے بریسلٹ کی طرف اشارہ کیا۔ اور ڈوپٹا لیے باہر نکل گئی۔ وہ بھی کمرے سے باہر نکل آیا۔
شام ڈھل رہی تھی۔۔۔

پرندے قطار در قطار اپنے ٹھکانوں کی طرف رواں تھے۔ اور دریا کنارے کیلی ریت پہ ننگے پاؤں چلتا سباغون بے نشان منزل کی طرف رواں دواں۔۔۔

اس سے ذرا دور حویلی کے اندر شاد بائے بیج رہے تھے۔ سرخ کا مہار سوٹ میں دہن بنی مسکرائی گلائی، سویرسی شخصیت والے درون کے ہمراہ اس نئے سفر پہ نکلنے کے لیے قدم بڑھا رہی تھی، جس کی راہ پر بہار اس کی منتظر تھی خزاں کے ڈوبتے سورج نے تاریخی شعاغون والے ہاتھ پھیلا کر اس کی خوشیوں کی دعا کی تھی۔

”تم نے دیر کر دی سباغون۔“ ان کی آنکھوں میں جلن سی اترنے لگی وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ سباغون اس قدر جلدی پلٹ آئے گا ورنہ وہ ضرور گلائی کو مزید منانے کی کوشش کرتے۔ لیکن وہ اس وقت پلٹا تھا جب درون اور گلائی کی شادی کی تیاریاں بھی شروع ہو چکی تھیں۔

”ایسا نہ کہیں بابا میں سمجھ نہ سکا ورنہ میرا دل تو اس کو اپنا کہنا رہا میں اس سے دور جا کر بھی دور نہ رہا اسے روک کرنے کے بعد بھی میں اس کا طلب گار ہی رہا۔“ وہ سرخ آنکھوں سے جیسے ان کو اپنی حالت سمجھا رہا تھا۔

”لیکن تمہیں اس بات کا احساس ہوتے ہوئے بہت دیر ہو گئی سباغون اب میں تم سے گزارش کرتا ہوں اس سرتیبا سے تکلیف نہ دینا،“ اور لب کاٹنا سباغون کچھ بول بھی نہ پایا تھا۔ وہ اٹھ کر جانے لگا کہ بابا کی آواز نے اس کے قدم روک دیئے وہ اٹھ کر اس کے قریب آئے اور ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا۔
”بھی کبھی جو ہمیں اپنے معیار سے نیچے لگتا ہے وقت دکھا دیتا ہے کہ وہ ہمارے معیار سے کس قدر اونچا تھا۔“ ہماری پہنچ سے کافی دور چلا جاتا ہے وہ۔۔۔ ہمارے نیچے لاکھ سخت سہی، وقت کا فیصلہ سخت ترین ہوتا ہے۔“ اس نے آنسو روکنے کے لیے زور سے آنکھیں بند کی تھیں۔

”میں اس کے لیے تب اتنا داس نہ تھا جب تم نے اسے روک دیا تھا لیکن میں تمہارے لیے فکر مند ضرور ہوں سباغون تم نے بہت قیمتی شخص کو کھو دیا۔“ وہیے لہجے میں کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئے وہ وہیں کھڑا آنسو بہاتا رہا۔

مہندی کے ہرے زرد سوٹ میں وہ اس قدر دلکش لگ رہی تھی کہ نظر بھر کے دیکھنا مشکل ہو رہا تھا وہ مسکراتے ہوئے خود کو آئینے میں دیکھتے ہوئے ہری چوڑیاں پہننے لگی کہ نظر سنہری بریسلٹ سے الجھ گئی اس

راستہ ساری

مہر کو کمائیاں سننے کا بے حد شوق ہے اسکول کے فنی ڈریس شو میں وہ شہزادی راپنزل کا کردار ادا کر رہی ہے اس لیے اس نے اپنے پیپا سے خاص طور پر شہزادی راپنزل کی کمائی سنانے کی فرمائش کی۔ کمائی سنانے ہوئے اسے کوئی یاد آ جاتا ہے جسے وہ راپنزل کہا کرتا تھا۔

نینا اپنے باپ سے ناراضی کی وجہ سے اپنے خرچے مختلف ٹیوشن پڑھا کر پورے کرتی ہے۔ اس کی بہن زری ٹیلی فون پر کسی لڑکے سے باتیں کرتی ہے۔ نینا کی سلیم سے بہت دوستی ہے۔ سلیم کی محلے میں چھوٹی سی دکان تھی۔ ایک ایک سیڈنٹ کی وجہ سے وہ ایک ٹانگ سے معذور ہو جاتا ہے۔ سلیم نے پرائیویٹ انٹرکیم ہے اور اس کی غزل احمد علی کے نام سے ایک ادبی جریدے میں شائع ہوتی ہے۔

سمیع اور شہرن نے ضد کر کے اپنے والدین کی مرضی کے خلاف جا کر شادی کی ہے، لیکن شہرن اپنے والدین کی ناراضی کی وجہ سے ڈپریشن کا شکار ہو جاتی ہے۔ سمیع اور شہرن دونوں اپنی بیٹی ایمن کی طرف سے بہت لاپرواہی اور انہوں نے گھر کی دیکھ بھال کے لیے دور کی رشتہ دار اماں رضیہ کو بلا لیا ہے۔

صوفیہ کا تعلق ایک متوسط گھر سے تھا، صوفیہ کی شادی کا شف ثار سے ہوتی ہے جو وجاہت کا اعلا شاہ کا بھی تھا۔ شادی کے بعد صوفیہ کو کا شف کا غیر عورتوں سے بے تکلفی سے ملنا پسند نہیں آتا اور وہ شک کا اظہار کرتی ہے، لیکن کا شف کا روبرا کا تقاضا ہے کہ کہ اس کو مطمئن کر دیتا ہے۔ صوفیہ کو کا شف کے دوست مجید کی بیوی حبیبہ بہت بری لگتی ہے کیونکہ وہ کا شف سے بہت بے تکلف ہے۔ صوفیہ کی ایک بیٹی پیدا ہوتی ہے۔ زرمین۔

چھبیسویں اور آخری قسط





کاشف نے گاڑی پارک کی تھی اور پھر موبائل وغیرہ سمیٹ کر وہ گاڑی سے باہر نکلے۔ گھر کی طرف جاسا کا دروازہ آگے کی طرف تھا۔ وہ گاڑی گودام کے باہر پارک کرتے تھے جس کا بڑا سا گیٹ بازار والے حصے کی طرف تھا۔ وہ کروڑوں سے ملتے گھر والے حصے کی جانب بڑھے تھے جب انہیں خیال آیا کہ انہیں کچھ لے جانا چاہیے۔ زری کی وجہ سے اظفر روز ہی کھانا ان کی طرف کھاتا تھا۔ صوفیہ اہتمام تو کرتی تھیں لیکن انہوں نے سوچا کہ وہ تنکے کباب وغیرہ لے جاتے ہیں۔ شوروم سے نکلتے ہوئے صوفیہ کو فون کیا تھا تو انہوں نے بتایا تھانری کی فرمائش پر مٹر پلاؤ بنایا ہوا ہے۔

"مٹر پلاؤ کے ساتھ چپلی کباب اچھے لگیں گے" انہوں نے سوچا اور واپسی کے لیے مڑے۔ خالصتا لاہوری ہونے کی وجہ سے باہر کے اشتہار انگلیز مرغن کھانے انہیں بھی پسند تھے لیکن اظفر کی وجہ سے وہ آج کل روز ہی کچھ نا کچھ لے جاتے تھے۔ سڑک کے بالکل آخری کنارے پر ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا جہاں کے چپلی کباب انہیں کافی پسند تھے سو اسی کا ارادہ کر کے وہ چل پڑے تھے۔ وہاں بھی کافی رش تھا۔ انہیں کافی دیر لگ گئی لیکن وہ خوش تھے کہ انہوں نے بیٹی کی پسند کی چیز لے لی تھی۔

واپسی پر وہ گودام کے قریب سے گزرے تاکہ آگے گھر کے دروازے کی طرف جاسکیں تو انہیں وہاں ایک گاڑی نظر آئی تھی۔ یہ گاڑی ان کی نہیں تھی۔ یہ گاڑی اظفر کی بھی نہیں تھی۔ وہ کچھ حیران ہوئے کہ اس وقت ان کے گھر کون آ گیا تھا کیونکہ یہاں گاڑی ان کا کوئی رشتہ دار ہی پارک کر سکتا تھا۔ وہ ذرا سا آگے ہوئے لیکن پھر پیچھے ہٹ گئے۔ گاڑی میں اظفر تھا اور اس کے ساتھ کوئی لڑکی بھی تھی۔ اظفر نے اس لڑکی کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی اس لڑکی کا میک اپ کافی گہرا تھا اور اس کے انداز بھی کاشف، کو کچھ عجیب سے لگے۔ وہ مزید پیچھے کی جانب بٹلے تھے کہ کہیں اظفر کی نظر ان پر پڑنا جائے۔ انہیں وہاں رکنا مناسب نہ لگا۔ دوبارہ سے آگے کی سمت ہو کر گھر کی سیڑھیوں کی طرف آگئے لیکن ان کے اندر کھد بند سی مچ گئی تھی۔

"آپ نے بڑی دیر کر دی۔۔۔ مجھے تو بہت بھوک لگ رہی ہے۔۔۔ زری نے بھی آپ لوگوں کے انتظار میں کچھ نہیں کھا ابا تک" صوفیہ نے انہیں دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ زری بھی آج لاؤنچ میں بیٹھی تھی۔ بچی کی کاٹ بھی وہیں رہی ہوئی تھی لیکن کاشف کو کسی میں بھی دلچسپی محسوس نہ ہوئی۔

"اظفر نہیں آیا؟" انہوں نے زری کو دیکھ کر پوچھا تھا اور ساتھ ہی اس کا چہرہ بغور دیکھا تھا "بس آنے والا ہے۔۔۔ ابھی آپ کے آنے سے دو منٹ پہلے ہی اسے فون کیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ آفر سے نکلا ہی ہے ابھی ایک کو لیگ کے ساتھ۔۔۔ بس بیس پیچیس منٹ میں پہنچ جائے گا" اس نے اطمینان سے جواب دیا تھا۔ کاشف نے ہنکارا بھرا تھا۔ ان کی تسلی نا ہوئی تھی زری کے جواب سے "لڑکیاں بھی ہیں اظفر کے آفس میں۔۔۔؟" یہ بات انہوں نے بلا ارادہ ہی پوچھ لی تھی۔ اظفر نے چہما پہلے جا ب تبدیل کی تھی۔ زری نے ذرا چونک کر ان کا چہرہ دیکھا۔ کاشف کو لگا وہ اس سوال پر توقع سے کچھ زیادہ حیران ہوئی ہے۔

"پتا نہیں ابا۔۔۔ میں نے کبھی پوچھا نہیں۔۔۔ شاید ہوں۔۔۔ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں" وہ حیران ہوئی تھی۔

"وہ دراصل ایک دوست اپنی بیٹی کی نوکری کے لیے کچھ پریشان تھے۔۔۔ اس لیے پوچھا میں نے کہ شاید اظفر کوئی مدد کر سکے" انہوں نے بات بتائی تھی۔

"مجھے کوئی آئیڈیا نہیں ہے ابا۔۔۔ لڑکیاں شاید نہیں ہیں اس کے آفس میں۔۔۔ آپ کو بتایا تھا کہ اس کی فر تو فریلا نر اور پیسٹی سائیڈ زیر اڈمنسٹریشن کے ساتھ ڈبل کرنی ہے۔۔۔ فیزیوٹیشن وغیرہ ٹائپ کے کانٹریکٹس لیا

ہے۔ یہ تو کام ہی مردوں والا ہے لیکن پھر بھی پوچھ لیجئے گا۔۔۔ اظفر کے کافی کانٹیلٹس ہیں ادھر ادھر۔۔۔ اس نے تسلی سے جواب دیا تھا۔ کاشف لمحہ بھر کو پُچ سے رہ گئے پھر بولے۔
 "یہ کیا بات ہوتی۔۔۔ خبر خیر رکھا کرو ایسی باتوں کی۔۔۔ شوہر کے ہر معاملے کی خبر رکھنا اچھی بیوی کا فرض ہوتا ہے" پھر انہیں احساس ہوا کہ زری کی نگاہوں کا تاثر کچھ مشکوک سا ہوا ہے تو سر جھٹک کر بولے۔
 "ذرا پھر سے کال کر لو نا۔۔۔ کدھر تک پہنچا ہے۔۔۔ ابھی تاخیر ہے اس کے آنے میں تو تم کچھ کھا لو۔۔۔ کب تک بھوک بیٹھی رہو گی؟"

انہوں نے بات برائے بات کی تھی۔ ان کا ذہن اظفر اور اس کے ساتھ نظر آنے والی لڑکی میں اٹکا تھا۔ اب یہ کوئی اتنی انہونی بات تو تھی لیکن اس لڑکی کے انداز اور اظفر کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ۔۔۔ انہیں سب کچھ سخت نامناسب سا لگ رہا تھا۔

"جی ابا۔۔۔ میں فون کرتی ہوں اسے" زری نے سعادت مندی سے کہتے ہوئے اپنا موبائل فون اٹھالیا تھا۔ کاشف اٹھ کر ہاتھ روم کی جانب چل دیے۔ وہ دس منٹ بعد واپس آئے تھے لیکن تب تک بھی اظفر نہیں آیا تھا۔ انہوں نے دیوان پر بیٹھتے ہوئے زری کی جانب پھر سے سوالیہ انداز میں دیکھا۔

"ابا آج ٹریفک بہت ہے۔۔۔ بس آنے والا ہے وہ۔۔۔ آپ کھانا کھالیں۔۔۔۔۔" زری نے شرمندہ سی ہو کر کہا تھا۔ کاشف عموماً اپنے کمرے میں کھانا کھانے کے عادی تھے لیکن آج کل چونکہ اظفر بھی آجاتا تھا تو وہ لاؤنج میں سب کے ساتھ بیٹھ جایا کرتے تھے۔ کاشف نے بیٹی کی تجویز پر فقط سر ہلایا تھا پھر وہ اٹھ کر دوبارہ اپنے کمرے میں آگئے۔ وہاں ایک کھڑکی گودام والی سمت میں کھلتی تھی۔ انہوں نے وہی کھڑکی کھول کر دیکھی تھی۔ وہ گاڑی ابھی تک وہیں موجود تھی۔

وہ سخت آگ بگولا ہو کر واپس آئے تھے لیکن اس سے پہلے کہ وہ زری سے کچھ کہتے اظفر سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر آ گیا تھا۔

"السلام علیکم۔۔۔" زری نے اسے دیکھتے ہی سلامتی کی دعا بھیجی تھی۔

"کہاں رہ گئے تھے برخوردار۔۔۔ کب سے انتظار ہو رہا ہے تمہارا۔۔۔ ہم سب بھوکے بیٹھے ہیں۔۔۔ زری نے ابھی اب تک کچھ نہیں کھایا۔۔۔" انہوں نے بمشکل لہجے کو معتدل رکھا تھا اظفر کے چہرے کا رنگ بدلا۔

"میں نے تو کہا تھا اس کو کہ کھانا کھالے۔۔۔ میں ذرا لیٹ ہو جاؤں گا۔۔۔ ٹریفک بہت رہنے لگے آج کل" اس نے ناک سے کبھی اڑانے والے انداز میں کہا۔ کاشف کو اس کا انداز ذرا اچھانا لگا۔ وہ جھوٹ کیوں بول رہا تھا۔ جھوٹ تو وہیں بولے جاتے ہیں جہاں پردہ داری کا احتمال ہو۔ کوئی بات صیغہ راز میں رکھنا مقصود ہو۔۔۔

"امی۔۔۔ ٹینگ لے آئیں۔۔۔ اظفر آ گیا ہے" زری نے آواز دی تھی۔ اظفر نے ناک چڑھایا
 "مجھے نہیں پتا وہ پیلا شربت۔۔۔ روز آئی بنا کر لے آئی ہیں وہاں سی سیرپ" اس کے انداز میں نخوت تھی۔ زری نے قہقہہ لگا یا حالانکہ اس بات پر تو کاشف کو ہنسی بھی نا آتی تھی۔

"امی اظفر کے لیے پیپسی لے آئیں۔۔۔ ٹینگ مت لائیے گا" اس نے پھر وہیں بیٹھے بیٹھے آواز لگائی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ شوہر کے سامنے اہن دل نکال کر رکھ دے۔ کاشف کو بہت برا لگا۔ وہ اپنی خدمت تو کروا رہی تھی اپنی ماں سے لیکن ساتھ ساتھ اپنے شوہر کی خدمتیں بھی کروانا چاہتی تھی۔ جبکہ اس کے چہرے سے ظاہر تھا کہ کاشف کا استفسار کرنا اسے برا لگ گیا ہے ☆☆☆

"ایمن نے کھانا کھالیا۔۔؟" سمج نے پوچھا تھا۔ وہ آج کافی دن کے بعد گھر میں کھانا کھا رہا تھا۔ نینا نے اس کو دیکھتے ہی روٹی موجود ہونے کے باوجود دوبارہ سے تازی روٹی بنائی تھی۔ سلاد کا تھار اور پودینے کی چٹنی بنائی تھی حالانکہ خود اس نے دودھ کے گلاس کے ساتھ ایک سلاکس کھالیا تھا لیکن سمج کے لیے اہتمام کرنا ضروری سمجھا تھا اس نے۔۔ وہ تقریباً دس دن بعد اس وقت گھر میں کھانا کھا رہا تھا اور ذرا فرصت میں بھی لگتا تھا۔

"جی۔۔ ایمن تو سو بھی چکی۔۔" اس نے جواب دیا۔ سمج نے سر ہلایا پھر اس کی جانب دیکھا۔

"آپ نے کھانا کھالیا۔۔؟" وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔ نینا اپنا پیٹ بھر چکی تھی لیکن اس خیال سے کہ وہ اسے یہاں سے جانے کو ناکہ دے دے اس نے سر ہلا کر بولی۔

"نہیں۔۔ ابھی تو نہیں۔۔۔۔"

"کھانا کھالیں آپ بھی۔۔" سمج نے کہا تھا۔ وہ فوراً اس کے سامنے والی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی پھر کھانا تو خاموشی سے ہی کھایا گیا کہ کرنے لائق کوئی بات تھی ہی نہیں۔ شہرین کی کنڈیشن اس قدر خراب تھی کہ ان سب کو اس کے علاوہ کچھ نہ جھتا ہی نہیں تھا۔

"آپ اگر مصروف نہیں ہیں کوئین تو دس منٹ بعد ذرا بیڈروم میں آئیے گا۔ مجھے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔" سمج نے اپنا کھانا ختم کرتے ہوئے کہا تھا۔ نینا نے چونک کر اس کی شکل دیکھی پھر اس نے سر ہلایا تھا۔ پھر اس سے لمحہ بھر انتظار نا ہوا تھا۔ کھانے کے برتن لیک جھپک کر سیٹھے ہوئے وہ یہی سوچتی رہی کہ اسے کیا کہنا ہوگا۔ وہ ٹھیک دس منٹ بعد اس کے کمرے میں موجود تھی۔

"آئیں۔۔ آپ بس دو منٹ دیں مجھے۔۔ میں ٹو تھ برش کر لوں ذرا" سمج نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ آرام دہ لباس میں بیڈروراز تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کا ہاسٹل واپس جانے کا ارادہ نہیں تھا۔ وہ اس کو دیکھ کر اٹھا تھا اور ہاتھ رووم کی جانب چل دیا تھا۔ نینا نے ادھر ادھر دیکھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ کہاں بیٹھے پھر وہ کچھ سوچ کر کاؤچ پر بیٹھ گئی۔ وہ بہت ہمت کر کے آئی تھی لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔

سمج نے "ضروری بات" کا حوالہ دیا ہوتا تو وہ اس کے انداز کو سرسری لیتی مگر اب اسے نا صرف اس کا انداز کچھ انوکھا سا لگا تھا بلکہ اس کے لہجے میں موجود نرم سا تاثر بھی اسے بے چین بنا کر رہا تھا۔ اس انداز میں تو کبھی اس نے اس سے بات نہ کی تھی۔ وہ پہلے بھی اس بیڈروم میں جانے کوئی بار آئی تھی۔ وہ اس بیڈروم میں سو بھی جاتی تھی لیکن سمج نے پہلے بھی اسے اس طرح بیڈروم میں مدعو تو نہیں کیا تھا۔

"خدا جانے۔۔ کیا کہنے والے ہیں؟ کیا پتا کہیں کہ کوئین تم بہت اچھی ہو۔۔ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے وہ سمج کے متعلق ہمیشہ ہی ایسے بے ڈھنگے پن سے سوچتی تھی اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوئی۔

"ہائے اللہ۔۔ کیا واقعی۔۔؟" وہ ایسی باتیں سوچتی رہی۔ اس کا ذہن کسی ایک نقطے پر مرکوز نہیں ہو پا رہا تھا۔ ان کے درمیان "ضروری باتیں" تو ہوتی رہتی تھیں۔ پوٹیلیٹی بلز، ایمن کی فیس، شہرین کی ادویات۔۔۔ یہ سب معاملات نینا ہی دیکھتی تھی اور سمج کی ہدایات کے بعد ہی کرتی تھی لیکن یہ سب باتیں کرنے کے لیے وہ اسے بالخصوص کمرے میں تو بھی نہیں بلواتا تھا۔۔۔ وہ بہت کنفیوزڈ ہو رہی تھی۔ اسی دوران سمج ہاتھ رووم سے نکل آیا تھا۔

"آپ مصروف تو نہیں تھیں نا۔۔؟" اس نے میز پر پڑے ٹشو پیپر کے ڈبے سے ایک ٹشو پیپر لیتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔

نینا نے ٹنٹی میں گردن ہلائی۔ سمج نے راکنگ چیر گھسیٹی اور کاؤچ کے بالکل قریب اس کے سامنے کر لی۔ نینا کو لگا وہ اب تو وہ کاؤچ پر سے گر ہی جائے گی۔ وہ بالکل اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ اس کے اتنے قریب

پھر چپ ہو گیا۔ اب کی بار نینا اسی کی جانب دیکھ رہی تھی۔ وہ ذرا سا آگے ہوا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ نینا کو کرنٹ سا لگا تھا۔

"ابھی بھی نہیں ہے" اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے وہ مزید بولا تھا۔ اس کی نگاہوں کا مرکز نینا کا چہرہ تھا۔ نینا کو لگا اب کی بار تو ضرور ہی اس کی سانس رُک جائے گی۔ اس کا دل چاہا وہ کسی فلمی ہیروئن کی طرح اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑوائے اور "ہائے اللہ" کہتی ہوئی کمرے سے فرار ہو جائے جبکہ وہ اس کے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے مزید کہہ رہا تھا۔

"کوئین کچھ مرد تو حید کے اتنے قابل ہوتے ہیں کہ ان کے لیے پہلی محبت ہی آخری ہوتی ہے۔۔۔ ان کی زندگی میں دوسری عورت کی گنجائش کبھی نہیں نکلتی۔۔۔ تجھے پتا ہے ایسے مرد اچھے نہیں ہوتے۔۔۔ آپ ایسے مردوں کو محبوظ الحواس بھی کہہ سکتی ہیں۔۔۔ لیکن بس میں ایسا ہی ہوں۔۔۔" وہ ایک بار پھر چپ ہو گیا تھا۔ نینا کا دل اب کی بار ایک اور ہی انداز میں دھڑکا۔ وہ کیا کہنے والا تھا۔ اس کا انداز ایک دم بے حد لائق سا ہو گیا تھا۔

"میری زندگی میں کسی دوسری عورت کی گنجائش کبھی پیدا نہیں ہوگی۔۔۔" اس نے انتہائی مستحکم لہجے میں کہا تھا جیسے اسے باور کروا رہا ہو کہ میرے متعلق سوچنا چھوڑ دو۔

"شہرین کی بیماری نے اسے ہی ایب نارل نہیں کیا بلکہ مجھے بھی نارل نہیں رہنے دیا۔۔۔ میں اندر سے اتنا مردہ ہو چکا ہوں کہ کسی کو کوئی خوشی نہیں دے سکتا۔۔۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہمیں الگ ہو جانا چاہیے اب کی بار اس کا لہجہ بے حد لائق نظر آتا تھا۔ نینا نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑوانا چاہا تھا لیکن سمجھنے سے اس کے ہاتھ پر اپنی گرفت ہلکی تکی تھی۔

"آپ بہت اچھی ہیں کوئین۔۔۔ آپ نے میرے اور میرے گھر کے لیے میری بچی کے لیے جو بھی کیا ہے۔۔۔ میں تو مرتے دم تک اس کا احسان نہیں اتار سکتا۔۔۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کوئین کہ میں آپ کو کوئی خوشی بھی نہیں دے سکتا۔۔۔ بھلا ایب نارل لوگ کب کسی کا احسان اتار سکتے ہیں۔۔۔ میں تو کچھ نہیں دے سکتا آپ کو۔۔۔ اور آپ تو بہت کچھ پزیر کر رہی ہیں۔۔۔ ایک اچھا لائف پارٹنر۔۔۔ گھربار۔۔۔ اولاد۔۔۔ میری دعا ہے کہ اللہ آپ کو زندگی کی ہر وہ خوشی دے جس کی آپ کو خواہش ہے" وہ چپ نہیں ہوا تھا لیکن نینا نے اپنا ہاتھ ایک جھٹکے سے چھڑوایا تھا۔

"مجھے آپ کی خواہش ہے۔۔۔ اتنا کچھ سمجھ سکتے ہیں آپ۔۔۔ بڑی بڑی باتیں کر سکتے ہیں آپ۔۔۔ یہ کیوں سمجھ میں نہیں آتا آپ کو کہ آپ کی ہی خواہش ہے مجھے۔۔۔ بس آپ کی خواہش" وہ چلائی تھی اور پھر ناچاہتے ہوئے بھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ اس کا دل اب مزید تیز دھڑک رہا تھا لیکن اب کی بار اس دھڑکنے کی نوعیت مختلف تھی۔ پہلے حیا نے ہیر رکھا تھا جبکہ اب خفگی اور دکھ نے دل کو بو جھل کر دیا تھا۔

"محبت کرنی ہوں میں آپ سے۔۔۔ ہاں ٹھیک ہے اتنی نہیں کرتی ہوں گی جتنی شہرین کو تھی آپ سے۔۔۔" اس نے ہاتھ کی پشت سے آنکھیں صاف کیں پھر مزید بولی۔

"لیکن اتنی ضرور کرتی ہوں کہ صبح آنکھ کھلنے پر صرف آپ کا چہرہ دیکھنے کی خواہش ہوتی ہے۔۔۔ آپ کا چہرہ دیکھے بنا نیند نہیں آتی ہے۔۔۔ آپ کو تو کبھی پتا نہیں چلا لیکن آپ جب تک گھر نہیں آ جاتے۔۔۔ مجھ سے کھانا بھی نہیں کھا جاتا۔۔۔ اور جب آپ گھر آ جاتے ہیں تو بلا وجہ آپ کے آس پاس گھومتی رہتی ہوں کہ شاید کسی لمحے تو آپ مجھے دیکھیں گے۔۔۔ آپ کی ایک نظر کی خاطر رات کو اٹھ اٹھ کر آپ کو دیکھنے آتی ہوں۔۔۔" وہ رو رہی تھی اور بول رہی تھی۔

"آپ آفس کے لیے نکلتے ہیں تو آپ پر دعائیں پڑھ پڑھ کر پھونکتی رہتی ہوں۔۔۔ آپ کھانا نہیں کھاتے

تو مجھ سے بھی ایک فقرہ نہیں لیا جاتا۔۔۔ ایسی نہیں تھی کوئین۔۔۔ بخدا ایسی نہیں تھی۔۔۔ آپ نے بنادیا ہے مجھے ایسا۔۔۔ اور آپ کہتے ہیں کہ مجھے کچھ نہیں دے سکتے۔۔۔ آپ چاہتے ہیں مجھے اچھا لائف پارٹنر مل جائے۔۔۔ اتنی ہی فکر ہے آپ کو میری تو آپ خود کیوں نہیں بن جاتے۔۔۔ "اچھے"۔۔۔ "وہ بلک رہی تھی۔۔۔ صبح چیمبر پر بیٹھا مسلسل اس کی جانب دیکھ رہا تھا پھر اس نے مجھے ہوئے انداز میں چیمبر کی پشت سے ٹیک لگائی تھی جاری رہی تھی۔۔۔ صبح کا لالعلق انداز اسے مزید دکھ دے رہا تھا۔ وہ کیسے پھر ہو کر بیٹھا تھا۔ وہ رونی چلی جا رہی تھی۔

"کیوں دکھ دے رہی ہیں مجھے۔۔۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ آپ کے آنسو کیا کر رہے ہیں میرے ساتھ۔۔۔" وہ لاجت بھرے انداز میں بنا اس کی جانب دیکھے بولا تھا۔ نینا نے ہاتھ کی پشت سے آنکھیں صاف کیں پھر ناک صاف کی اور گلو کیر لہجے میں ترخ کر بولی۔

"کچھ نہیں کر رہے میرے آنسو۔۔۔ آپ کے ساتھ۔۔۔ آپ بالکل پتھر ہیں۔۔۔ کچھ نہیں پتا چلتا آپ کو۔۔۔ ورنہ میری محبت بھی تو محسوس ہوتی آپ کو۔۔۔ آپ کے پاس مجھے دینے کو بس ایک ہی چیز ہے۔۔۔" وہ لہجہ بھر کوڑی پھر آنسو ضبط کرتے ہوئے بولی۔

"کوئین۔۔۔ آپ فی الفور اپنی چیزیں لیں۔۔۔ اماں رضیہ سے اپنا حساب کتاب کلیمبر کریں اور میرے گھر سے چلی جائیں۔۔۔ مجھے آپ کی سرورسز کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ میں دوبارہ آپ کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا اپنے گھر میں۔۔۔ ہر ہفتے دو ہفتے بعد بس یہی کہہ سکتے ہیں آپ مجھے۔۔۔ میں جانتی ہوں۔۔۔ آپ کو نفرت ہے مجھ سے۔۔۔ آپ کو میری محبت کی ضرورت ہے تا مجھ سے کوئی سروکار۔۔۔ میں آپ کے لیے ذرا سی بھی اہم نہیں ہوں۔۔۔ ذرا سی بھی نہیں۔۔۔ شاید میں بھی کسی کے لیے اہم نہیں ہو سکتی۔۔۔" وہ بکتنے گلی تھی، سچ چوکر اس کی جانب دیکھنے لگا۔

"ایسے بی ہیومت کریں کوئین۔۔۔ خدا را مرے ہوئے کو مزید مت ماریں۔۔۔ میں بچہ نہیں ہوں۔۔۔ میں سمجھ سکتا ہوں سب۔۔۔ سب نظر آتا ہے مجھے۔۔۔ آپ کی آنکھیں جب میرے ارد گرد گھومتی رہتی ہیں۔۔۔ مجھے سب محسوس ہوتا ہے۔۔۔ اور جتنا محسوس ہوتا ہے اتنا ہی دکھ ہوتا ہے۔۔۔ بے حد دکھ ہوتا ہے۔۔۔ میں نے کب چاہا تھا کہ زندگی میں کسی کو اتنے دکھ دوں گا۔۔۔ لیکن پہلے شہرین اور اب آپ۔۔۔ میں کسی کے لیے بھی خوشی کا باعث نہیں بن سکتا۔۔۔ میں نے کہا تا میں بھی ایب نارل ہو چکا ہوں۔۔۔ میں جس کے ساتھ رہوں گا اسے بھی ایب نارل کر دوں گا۔۔۔ اداے صحیح کہتی ہیں۔۔۔ میں واقعی منحوس ہوں۔۔۔ میری زندگی میں جو بھی شامل ہوا۔۔۔ اس کو تکلیف ہی ملی ہے مجھ سے۔۔۔ آپ تو محسن ہیں میری۔۔۔ اب آپ کو بھی تکلیف دوں کیا۔۔۔ آپ کو دکھ نہیں دینا چاہتا۔۔۔ بہت احسان ہیں آپ کے میرے سر۔۔۔ آپ کو دکھ دیا تو میرا اللہ مزید خفا ہو جائے گا مجھ سے۔۔۔ پھر ایمین کے آگے آئے گا سب۔۔۔ اپنی بچی کو آنسو نہیں دے سکتا میں۔۔۔ اس لیے جہاں اتنے احسان کیے ہیں آپ نے۔۔۔ وہاں یہ بھی کریں۔۔۔ چھوڑ دیں ہمیں۔۔۔ اپنے متعلق سوچیں۔۔۔ اپنی زندگی جنیں۔۔۔ آپ اپنا سامان پیک کر لیں۔۔۔ ایمین کے اسکول جانے کے بعد ڈرائیور آپ کو چھوڑ آئے گا" وہ اتنے دو ٹوک انداز میں بولا اور پھر اٹھ کر دوبارہ سے ہاتھ روم میں چلا گیا۔

کوئین سے وہاں زکا ہی نا گیا۔ اس سے زیادہ کیا بے عزتی سہتی وہ۔۔۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور تیز تیز قدموں سے چلتی باہر نکل گئی تھی۔

سب ختم ہو گیا تھا۔

کبزی جادوگر نے رنلزل کو بھی دکھا نہیں دیا تھا۔ اس شہزادے کو بھی اندھا کر ڈالا تھا جس کی خاطر

راہنزل نے اپنے اونچے لمبے قلعے کی کھڑکی سے چھلانگ لگائی تھی
اب اندھا شہزادہ راہنزل کو زندگی بھر نہیں پہچان سکتا تھا۔

☆☆☆

"صوفیہ۔۔۔" کاشف نے پکارا تھا۔ وہ سوئی تو نہیں تھیں لیکن غنودگی ذہن پر مکمل طور پر طاری ہوئی جا رہی تھی۔ ان کا دل نہیں چاہا کہ وہ کوئی جواب دیں سو وہ چپ چاپ بیٹھی رہیں
"صوفیہ۔۔۔ سوئی ہو گیا" انہوں نے پھر پکارا تھا اور ساتھ ہی صوفیہ کو کندھے پر ان کا لمس بھی محسوس ہوا۔ انہیں کروٹ بدلتی پڑی۔

"بس یہی سمجھیں۔۔۔ اگر آپ دو منٹ کے لیے بھی خاموش ہوئے تو میں نیند کی وادی میں اتر جاؤں گی" وہ نیم خوابیدہ لہجے میں بولی تھیں۔ کاشف سر ہانے کو بیڈ کے کراؤن سے لگائے بیٹھے تھے۔ چہرے پر کچھ اوجھن سی تھی صوفیہ کو ذرا حیرت بھی ہوئی۔ وہ جاگ رہے ہوتے تھے تو بی وی یا موبائل میں مصروف ہوتے تھے۔ اس طرح کسی بھی پریشانی میں کم بیٹھے رہنا ان کی عادت نا تھی۔ صوفیہ کی نیند اڑی گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

"کیا بات ہے۔۔۔ آپ کی طبیعت تو ٹھک ہے۔۔۔؟ دل تھرا رہا ہے کیا؟" وہ پریشانی بھرے لہجے میں پوچھ رہی تھیں۔ کثرتِ تباہ کو نوشتی کی وجہ سے ان کی طبیعت اکثر خراب ہو جایا کرتی تھی۔
"صوفیہ! یہ اظفر کیسا لڑکا ہے۔۔۔؟" انہوں نے بنا ان کی جانب دیکھے سوال کیا تھا۔ صوفیہ کو ان کے سوال پر بھی حیرت ہوئی۔

"یہ کیسا سوال ہے۔۔۔ وہ آپ کی بیٹی کا شوہر، آپ کا داماد ہے۔۔۔ آپ کو نہیں پتا وہ کیسا لڑکا ہے؟" صوفیہ نے جواب دیا تھا۔

"تم سو جاؤ صوفیہ۔۔۔ رات کے اس وقت طنز کرنے سے بہتر ہے تم سو ہی جاؤ" کاشف نے ایک نظر ان کی جانب دیکھا تھا اور چوکر کہا تھا۔ صوفیہ کو اس جواب کی توقع نہیں تھی۔

"میں طنز نہیں کر رہی۔۔۔ میں تو حیران ہو رہی ہوں کہ آپ کو یہ سوال کرنے کی ضرورت کیوں پڑی۔۔۔ وہ گھر کا بچہ ہے۔۔۔ داماد ہے ہمارا اچھا لڑکا ہے ظاہر ہے تب ہی تو آپ نے اپنی بیٹی کا ہاتھ دیا اس کے ہاتھ میں۔۔۔ نمیز دار بھی ہے۔۔۔ کھانا کھاتا بھی اچھا ہے۔۔۔ ہماری بیٹی کا دم بھرتا ہے۔۔۔ ہماری عزت بھی کرتا ہے۔۔۔ میں تو یہی کہوں گی کہ بہت اچھا لڑکا ہے" صوفیہ نے لہجے کو معتدل رکھتے ہوئے جواب دیا۔ وہ جس طرح خفا ہو کر بولے تھے اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کچھ پریشانی میں مبتلا ہیں۔ کاشف نے اپنا رخ ذرا سا ان کی جانب موڑا

"صوفیہ تمہیں نہیں لگتا کہ اظفر ہر وقت موبائل استعمال کرتا رہتا ہے۔۔۔ بہت زیادہ استعمال۔۔۔ جب دیکھو موبائل میں مگن رہے گا۔۔۔ نگاہیں ہمیشہ موبائل کی اسکرین پر مرکوز رکھے گا۔۔۔ چاہے بات کر رہا ہو یا کھانا کھا رہا ہو۔" صوفیہ کے چہرے پر پہلی بار طنزیہ سی مسکراہٹ چمکی تھی۔

"کاشف صاحب۔۔۔ یہ تو گھر گھر کی کہانی ہے۔۔۔ آج کل تو ہر شخص ہی یہی کام کرتا دکھائی دیتا ہے۔۔۔ کچھ دن ہوئے آیا آئی ہوئی تھیں۔۔۔ وہ بھی اپنے بیٹوں کی یہی شکایت کر رہی تھیں کہ موبائل سے نظریں نہیں اٹھتیں ان کے بیٹوں کی۔۔۔ ہر وقت بس موبائل رہتا ہے ہاتھوں میں۔۔۔ اور پھر۔۔۔ آپ خود بھی تو خوب کھیلتے ہیں اس کھلونے کے ساتھ" صوفیہ کا مقصد انہیں سلی دلانا تھا کہ یہ عام سی بات ہے لہذا لہجے کو شوخ بنا کر بولی تھیں مگر آنکھوں میں چھپا طنزیہ مسخر مکمل طور پر عیاں تھا۔

"میں تو گیم کھیلتا ہوں۔۔۔ گولیاں ٹافیاں توڑتا رہتا ہوں۔۔۔ اور کوئی مصروفیت بھی تو نہیں ہے اس عمر

میں۔۔۔" وہ چوکر بولے تھے۔

"اظفر بھی کیم ہی کہتا ہوگا۔ اور وہ کیا لوگوں کے بچے انخوا کرتا رہتا ہے موبائل پر۔۔۔ عجیب باتیں کرتے ہیں آپ۔۔۔ آپ کا مشغلہ۔ اس کا گناہ" صوفیہ بھی اب کی بار ان کے لہجے سے زچ ہو کر بولی تھیں

"تم سمجھ ہی نہیں رہی ہو میری بات۔۔۔ میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ کہیں۔۔۔" وہ کہتے کہتے لمحہ بھر کو چپ ہوئے پھر کمری سانس بھر کر بولے۔

"مجھے اس لڑکے کے رنگ ذہنک ٹھیک نہیں لگتے۔۔۔ کچھ رنگین مزاج سا ہے۔ لا پرواہی۔۔۔ زری کا خیال بھی نہیں رکھتا" کاشف نے دوبارہ سے کراؤں سے ٹیک لگائی تھی۔ وہ اپنی بات سمجھا نہیں پا رہے تھے۔ صوفیہ کے چہرے پر طنز یہ مسکراہٹ چمکی لیکن وہ بولی شرارتی لہجے میں تھیں۔

"وہ تو آپ بھی ہیں۔۔۔ رنگین مزاج۔۔۔ اس عمر میں بھی بائیکلے بجیلے بنے پھرتے ہیں۔۔۔ وہ تو پھر جوان بچہ ہے کاشف صاحب۔" ان کے چہرے پر بے انتہا حُلی نمایاں ہوئی تھی۔

"ایک تو تم مجھے ہر بات میں ٹھیک لیا کرو۔۔۔ غضب خدا کا میں اپنی پریشانی کا اظہار کر رہا ہوں اور تمہیں یہاں طنز و مزاح سے فرصت نہیں مل رہی۔۔۔ میری بیٹی کا ذرا خیال نہیں ہے اس شخص کو۔۔۔ وہ اس کی وجہ سے بھوکے پیٹ رہتی ہے اور یہ محترم جانے کہاں کہاں گھومتے رہتے ہیں۔۔۔" وہ ناراض لہجے میں بولے تھے۔ وہ چاہہ بھی صوفیہ کے سامنے کھل کر اپنے خدشات کا اظہار نہیں کر پا رہے تھے۔۔۔ انہیں اس درجہ سنجیدہ دیکھ کر صوفیہ بھی سنجیدہ ہوئیں پھر اپنی جگہ پر لپٹی ہوئی بولیں۔

"آپ سو جائیں کاشف۔ خواہ مخواہ میں پریشان ہو رہے ہیں۔۔۔ جیسا آپ سوچ رہے ہیں، ایسا کچھ نہیں ہے۔۔۔ وہ جوان بچہ ہے۔ اس عمر میں ایسے ہی ہوتے ہیں لڑکے۔۔۔ پچاس سال والی ذمہ داری اب سناٹا نہیں اٹھائیں میں تو نہیں آئے گی نا۔۔۔ آپ باپ ہیں زری کے۔۔۔ جیسا خیال آپ رکھتے ہیں۔۔۔ ویسا وہ تو نہیں رکھ سکتا نا۔ آپ کو زری سے زیادہ ہی محبت ہے۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ آپ بلاوجہ وہمی ہو جاتے ہیں" صوفیہ نے انہیں سمجھایا تھا اور ساتھ ہی کروٹ بدل لی تھی۔ کاشف چند لمحوں کی پشت کی طرف دیکھتے رہے پھر انہوں نے سر جھٹکا تھا۔

"نہیں صوفیہ۔۔۔ معاملہ اتنا سادہ نہیں ہے۔۔۔ میری آنکھوں نے جو دیکھا وہ وہم نہیں ہو سکتا" انہوں نے سوچا تھا۔ آج کی رات انہیں نیند نہیں آنے والی تھی۔

☆☆☆

"اپنے متعلق سوچیں۔۔۔ اپنی زندگی جنیں" اس کا لہجہ کتنا سیاہ تھا۔ نینا کا دل جل کر خاکستر ہو چکا تھا۔ وہ رونا نہیں چاہتی تھی لیکن پللیں ہر پانچ منٹ بعد بھاری ہو جاتی تھیں۔ آنسوؤں کا بوجھ سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا پھر وہ ناچا جتے ہوئے بھی رونے لگتی تھی۔ پانچ منٹ رو لیتی تھی تو پھر غصہ آنے لگتا تھا۔ بیڈروم سے نکل کر آتی تھی تو انداز ایسا تھا کہ ساری دنیا کو آگ لگا کر سمج رندھاوا کو بھی اس میں جھونک دے گی اور خود پاس بیٹھ کر تماشا دیکھے گی لیکن دس منٹ ایمن کے کمرے میں بیٹھ کر جلنے لڑھکنے کے بعد اس پر عقدہ کھلا تھا کہ وہ یہ کبھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ سمج رندھاوا کو نہیں چھوڑ سکتی تھی۔

"اپنی زندگی جنیں۔۔۔ کیسے جلیوں اپنی زندگی۔۔۔ آپ کے نام کا رنگ لگ چکا ہے میری زندگی کو۔۔۔ اور رنگ اترتے ہیں بھلا" وہ جلے کھنے انداز میں سوچتی تھی۔ سمج کے تاثرات یاد آتے تھے تو دل چاہتا تھا کہ ابھی سب کچھ چھوڑ چھاڑ یہاں سے بھاگ جائے لیکن دل میں اس کا جو مقام تھا وہ یہ بھی نہیں کرنے دے رہا تھا۔

"اپنی زندگی جنیں۔۔۔ اونہہ اتنا آسان ہے کیا اپنی زندگی جینا۔۔۔ اور اگر جی سکتی اپنی زندگی تو آپ کے حکم کا انتظار تھوڑی کر رہی ہوتی۔۔۔ عرصہ پہلے سب چھوڑ چھوڑ آپ کی اس سلطنت کو ٹھوکر مار کر جا چکی ہوتی۔۔۔ لیکن قسمت خراب۔۔۔ ایسا کر نہیں سکتی۔۔۔ یا اللہ۔۔۔ کیا اپنی گناہ گار ہوں میں کہ مجھے ہر جگہ سے اسی طرح دھکا مارا جائے گا۔۔۔ ماں باپ ہیں تو وہ بھی مشکل دیکھنے پر راضی نہیں۔۔۔ اور یہ جو آپ نے شوہر دیا ہے۔۔۔ (گہری سانس۔۔۔ ایک ساعت کا وقفہ) ہاں ٹھیک ہے میں نے ضد کر کے لیا تھا اس بدتمیز انسان کو۔۔۔ لیکن یا اللہ اب میں محبت کرتی ہوں اس سے۔۔۔ اس کی خاطر سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔۔۔ (ایک اور گہری سانس۔۔۔ ایک مزید ساعت کا وقفہ) ہاں ٹھیک ہے پیارے اللہ! آپ کی خاطر تو کبھی کچھ نہیں کیا میں نے۔۔۔ لیکن آپ کے ساتھ کوئی سودے بازی تو نہیں ہو سکتی نا۔۔۔ آپ کی محبت تو ہر شرط سے بالاتر ہے۔۔۔ تو پھر پلیز میری خاطر اس احمق شخص کو تھوڑی عقل دلائیں۔۔۔ ایسے کون چھوڑتا ہے اپنی بیوی کو۔۔۔ کیسے کہہ رہے تھے پہلا سامنہ بنا کر۔۔۔ میں واقعی منحوس ہوں۔۔۔ اونہہ۔۔۔ منحوس نہیں جناب! کم عقل ہیں آپ۔۔۔"

بستر پر لیٹے لیٹے وہ جلے بجھے انداز میں بڑبڑاتی جا رہی تھی۔ اس کا ذہن اتالا چار تھا کہ سوچیں بھی بتر جتری ہوئی جا رہی تھیں۔

اگلا لمحہ اس نے کیا ہونا چاہیے۔۔۔ یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کشتیاں اتنی بُری طرح جل چکی تھیں کہ واپس پلٹنا بھی مشکل تھا اور واپس پلٹنے کی خواہش نہیں کئے تھی۔

"یا اللہ۔۔۔ میں نے کیا غلط کیا۔۔۔ شادی ہی تو کی تھی۔۔۔ ہاں ٹھیک ہے۔۔۔ ضد کر کے کی تھی لیکن آپ سے بہتر کوئی نہیں جانتا کہ یہ شادی کس لیے کی تھی میں نے۔۔۔ اچھا میں مانتی ہوں کہ میری جذباتیت میرے اس فیصلے کا سب سے بڑا محرک تھی۔۔۔ اور ایں یں سے تو میں واقعی تخلص رہی ہوں یا اللہ!۔۔۔ لیکن یہ فضول شخص جو اتنا مغرور بنا پھرتا ہے۔۔۔ اس کی خاطر تو نہیں کی تھی نا۔۔۔ لیکن میں اس شادی کو بچانا اسی شخص کی خاطر چاہتی ہوں۔۔۔ آپ گواہ ہیں یا اللہ میں نے اس کے علاوہ کبھی کسی سے محبت نہیں کی۔۔۔ اور اس سے بھی تب کی جب میرا نکاح ہو چکا تھا اس سے۔۔۔ کچھ غلط تو نہیں کیا۔۔۔ تو پھر مجھے تو انعام ملنا چاہیے۔۔۔ سزا کی حق دار تو نہیں ہوں میں۔۔۔ بس مجھے نہیں پتا یا اللہ۔۔۔ مجھے اس مشکل سے نکالیں۔۔۔ اس شخص کو سمجھائیں کہ مجھے کھونا سکے سمجھ کر ہی سہی لیکن اپنی زندگی سے نکال باہر مت کر۔۔۔"

اس کو احساس دلائیں اس کی بے عقلی کا یا اللہ۔۔۔ یہ تو کوئی بات نا ہوئی۔۔۔ بس مجھے نہیں پتا۔۔۔ میں نہیں جاؤں گی اس گھر سے۔۔۔ میں نہیں جاؤں گی۔۔۔ کیا کیا نہیں کیا اس کی خاطر میں نے۔۔۔ کھانا پکانا، صفائیاں کرنا، کپڑے دھونا، اور سب سے بڑھ کر چُپ رہنا۔۔۔ خیر سے بولنا۔۔۔ ہر بات کے جواب میں "جی" "جی" کرنا۔۔۔ ورنہ کوئین تو چُپ رہنا جانتی تھی نا۔۔۔ بس اسی لیے سر جڑھ گئے ہیں محترم مسیح صاحب۔۔۔ اسی بات کا انعام دے دیں مجھے یا اللہ کہ میں نے بدتمیزی کرنا چھوڑ دی ہے۔۔۔ اب تو سب کی عزت کرنے لگی ہوں۔۔۔ آپ کو تو پتا ہے میرا یا اللہ۔۔۔ مجھے نہیں پتا۔۔۔ مجھے کچھ نہیں پتا "اس کا دعائیں مانگنے کا بھی اپنا ہی انداز تھا۔ اسی طرح بڑبڑاتے بڑبڑاتے جانے کب آنکھ لگ گئی تھی۔ صبح معمول کے مطابق الارم پر ہی آنکھ کھلی تھی۔

وہ آنکھ کر بیٹھ گئی تھی۔ ایک منٹ میں ہی رات والی سب باتیں یاد آ گئی تھیں۔ دل پھر سے بوجھل ہونے لگا وضو کرتے ہوئے بھی مسیح کا چہرہ اور الفاظ آنکھوں اور سماعتوں میں گھومتے رہے۔ ایک عرصے بعد نماز اس نے بہت ہی خشوع و خضوع سے ادا کی تھی۔

"یا اللہ۔۔۔ میں کیا میری اوقات کیا۔۔۔ پہلے بھی مجھ گناہ گار کو آپ ہی نے سنبھالا ہے اور اب بھی میں پوری کی پوری آپ کے حوالے۔۔۔ آپ کو میرے لیے جو مناسب لگے، مجھے بس اسی پر راضی کر دیجیے۔۔۔ اگر

تو میرے چلے جانے سے کوئی بھلائی مقصود ہے تو مجھے جانے کی ہمت عطا کیجیے۔۔۔ ورنہ مجھے کوئی ایسی راہ نہجھا دیں جو میری مشکلات کو حل کر دیں۔۔۔ آمین ثانیہ آمین۔۔۔ یارب العالمین۔۔۔“
ایسے دعا تو اس نے پہلے بھی ناما لگی تھی۔ دل کو ایسا سکون ملا جو شاید پہلے کبھی ناما تھا۔ اس نے جائے نماز کی تہ لگائی اور اطمینان سے امین کو جگانے لگی۔ ذہن میں گردش بھی لیکن دل پرسکون تھا۔ وہ سارا معاملہ اب اللہ کے حوالے کر چکی تھی۔ اب جو بھی ہو جاتا اسے منظور تھا۔ امین کا ہاتھ منہ ڈھلا کر اسے یونین فارم پہناتے ہوئے اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کودنا تھا۔

”امین۔۔۔ آج آپ اسکول سے گھر نہیں آؤ گی۔۔۔ بلکہ نانو کے گھر آؤ گی۔۔۔ میں نے ڈرائیور انکل کو سمجھا دیا ہے۔۔۔ ہم کچھ دن ان کے گھر رہیں گے۔۔۔ زری خالہ کے بے بی کے پاس۔۔۔ اوکے“ اس نے اسے سمجھایا تھا۔ امین نے اس کا چہرہ دیکھا تھا اور پھر سر ہلا دیا تھا۔

☆☆☆

”تمہیں آگئی بہن کی یاد۔۔۔؟“ زری نے اس کو دیکھتے ہی کہا تھا۔ وہ اپنا اور امین کا کچھ سایاں جس میں کپڑے اور امین کی کتابیں وغیرہ شامل تھیں لے کر امین کے اسکول سے آنے سے پہلے وہاں آگئی تھی۔ ڈرائیور کو اس نے کہہ دیا تھا کہ آج امین کو اسکول سے میری امی کے گھر لے آنا اور کل سے پھر روزانہ پک اینڈ ڈراپ وہیں سے کیا کرنا۔ اماں رضیہ کو اس نے بس یہی بتایا تھا کہ زری کی وجہ سے کچھ دن وہ اپنی امی کے گھر رہے گی۔ گھر سے نکلتے ہوئے بھی اس کا دل پرسکون ہی تھا

”پہلے بھی جو کچھ ہوا، اس پر میرا اختیار کب تھا۔۔۔ اور آئندہ بھی جو ہوگا۔ میرے اختیار میں کب ہے۔۔۔ میں اب بس اپنی اوقات میں رہوں گی۔۔۔ رب جانے اور اس کے کام“

گھر کے گیٹ سے نکلتے ہوئے اس نے ایک نظر اور اس کمرے کی بڑی سی کھڑکی پر ضرور ڈالی تھی جو صبح کے کمرے میں چلتی تھی۔ اس کے دل سے بس یہی صدا لگتی تھی۔ اسی لیے جب وہ امی کے گھر پہنچی تو اس حالت میں نہیں تھی جس حالت میں وہ رات سوئی تھی۔ اس نے راستے سے زری کا پسینہ چاکلیٹ کی ٹیک لیا تھا۔ اس کی بیٹی کے لیے شاپنگ کی تھی۔ اس کے پورے وجود سے اطمینان نکلنے لگا تھا۔ زری کا طعنہ بھی اسے طعنہ نہیں لگا تھا۔

”یاد تو مرنے والوں کو کیا جاتا ہے۔۔۔ تم تو ابھی تک زندہ ہو“ اس نے بشارت بھرے انداز میں جواب دیا تھا حالانکہ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ امی اسے بغور دیکھ رہی ہیں۔

”امین کی باز ایسی ہے۔۔۔ کچھ بہتر ہوئی حالت۔۔۔ میں نے آنا تھا اسے دیکھنے۔۔۔ لیکن زری کی وجہ سے گھر سے نکلتا ہی نہیں ہوتا۔۔۔ اب تم آگئی ہو تو تمہارے ساتھ جاؤں گی ہاسپٹل“ انہوں نے جیسے اس کے شکوہ کرنے سے پہلے ہی وضاحت کر دی تھی۔

نینا نے ان کی بات کے جواب میں بھی فقط سر ہی ہلا دیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس نے بہت عرصے بعد ایک دعا اتنے خلوص سے مانگی تھی جو فوراً قبول ہوگئی تھی۔ زندگی وہی تھی، حالات اور مسائل ویسے ہی تھے جیسے رات تھے۔ لیکن خدا نے اس کے دل کو سکون کی دولت بخش دی تھی۔ اس نے غل کرنا سیکھ لیا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو اپنے خالق کے ہاتھ میں سوپ دیا تھا جس کی بنا پر اس کا وجود بالکل ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ اب کوئی کچھ بھی کہتا یا کرتا اسے پروا نہیں تھی۔

”میں امین کے لیے کیا بناؤں۔۔۔ نوڈلز بنا دوں؟“ امی اس کے چپ رہنے پر دوبارہ بولی تھیں۔
”نہیں نہیں۔۔۔ آپ آرام کریں۔۔۔ میں خود بنا لوں گی بلکہ مجھے بتائیں زری کے لیے کیا بنانا ہے۔۔۔ میں اس کے خچرے اٹھانے ہی تو آئی ہوں“ وہ مسکرا کر بولی۔ امی کے چہرے پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ارے یار۔۔۔ تم اس مصیبت کو بھی لے آئی ہو ساتھ۔۔۔ اسے تو وہیں چھوڑ آئی۔۔۔ رہے اپنے باپ کے ساتھ۔۔۔ ایک تو میں تمہارے اس ذم چھلے سے بڑی عاجز ہوں "زری چو کر بولی تھی۔ نینا نے اس کی جانب دیکھا۔ ایمین کے معاملے میں وہ ابھی بھی جذباتی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ زری کو اس طرح کہنے پر ٹوکتی۔ امی بولی تھیں۔

"زری تم کب عقل سیکھو گی۔۔۔ وہ ایک چھوٹی بچی ہے۔۔۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ ہی رہے گی اور نینا اس کی ماں ہی ہے اب۔۔۔ تم جانتی ہی ہو وہ نینا کے بغیر نہیں رہتی۔۔۔ اب نینا تمہاری خاطر یہاں آئی ہے تو بچی کو بینک میں تو جمع نہیں کروا کر آسکتی۔۔۔ اور خبردار اس کے سامنے کچھ بھی الٹا سیدھا مت بولنا۔۔۔ تم خود بھی اب ایک بیٹی کی ماں ہو۔۔۔ سوچتی سمجھ کر بولنا سیکھو۔"

امی نے اسے ٹھہر کا تھا۔ اسے نہ تو لگا مگر چپ ہو گئی، وہ اپنے گزشتہ بار کے روپے کی وجہ سے شرمندہ تھی اس لیے نینا کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی مگر اسے ایمین بھی پسند نہیں رہی تھی لیکن وہ نینا کے آنے سے خوش تھی۔ اس نے بھی آتے ہی زری کے کافی کام سنبھال لیے تھے۔ اسکول کے بعد ایمین بھی وہیں آگئی تھی تو گھر میں مزید رونق ہو گئی۔ وہ زری کی بیٹی کو دیکھ کر بے تحاشا خوش تھی۔ اس کی بار بار تعریفیں کر رہی تھی کہ زری کا مزاج مزید اچھا ہو گیا۔ ابائے کے آنے کے بعد نینا اپنے کمرے میں ہی محدود رہی تھی لیکن پھر بھی پہلادان اطمینان سے گور گیا تھا۔ اس سب کے دوران اس کا دھیان مسلسل اپنے موبائل فون کی جانب لگا رہا تھا کہ شاید سمج فون کر کے اسے ڈانٹے گا کہ وہ ایمین کو کیوں لے کر گئی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔

"ایک فون تو کر ہی لیتا ہے انسان۔۔۔ اور اللہ پاک کیسے شخص سے محبت کروادی آپ نے مجھے۔ انہیں تو اپنی بیٹی کا بھی احساس نہیں ہے"

یہ نیا مشغلہ ہاتھ لگا اس کے۔۔۔ ساری زندگی دنیا بھر سے لڑتی جھگڑتی رہی تھی۔۔۔ ذرا ذرا سی بات پر چلا کر آسان سر پر اٹھا لیتا اس کی عادت رہی تھی لیکن اب جا کر سمجھ میں آیا تھا کہ فرسٹریشن نکالنے کا سب سے بہتر طریقہ تو یہ تھا کہ ساری شکایتیں اللہ کے پاس رجسٹر کروادو۔۔۔

"دعا سے بہتر انتقام کوئی نہیں ہو سکتا۔ میں اللہ سے دعائیں کر کر کے دراصل آپ سے انتقام لے رہی ہوں سمجھ رہا ہوں" اس رات امی کے گھر اپنے بستر پر ایمین کے ساتھ سوتے ہوئے اس نے سکر اتے ہوئے سوچا تھا۔ یہ اچھا انتقام تھا جس میں اسے مزا آ رہا تھا

☆☆☆

"یہ ہے کون۔۔۔؟" مقبول حسن نے ان سے پوچھا تھا۔ انہوں نے اپنے اس دیرینہ کسٹمر کو اظفر کے متعلق کچھ معلومات اکٹھی کرنے کی درخواست کی تھی۔ مقبول حسن نے زندگی کا بڑا حصہ پولیس ڈپارٹمنٹ میں گزارا تھی۔ ان کی کافی تعلقات تھے ادھر ادھر۔۔۔ وہ ان کے شوروم سے اپنے گھر کے لیے کافی اپلا منسز وغیرہ لیتے رہتے تھے۔ ان کی بیٹی کا جہیز بھی سارا ان ہی کے شوروم سے گیا تھا۔ کاشف شاکر کو اپنے ہی داماد کے متعلق انکو آڑی کرنے کے لیے وہی ایک بہتر شخص نظر آئے کہ ان کی آپس میں کوئی رشتہ داری نا تھی۔ وہ ان کی بات کو صیغہ راز میں رکھ سکتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے ان سے درخواست کی تھی۔

دراصل یہ میرے ایک بہت عزیز دوست کے داماد ہیں۔۔۔ وہ کچھ شلوک کا شکار ہیں۔۔۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ اس لڑکے کے متعلق معلومات اکٹھی کروں۔۔۔ مجھے آپ اس کام کے لیے بہترین نظر آتے ہیں۔۔۔ ایسے کام اب انسان ہر ایرے غیرے سے نہیں کہہ سکتا۔۔۔ معاملہ ذرا نازک ہے۔۔۔ آپ یوں سمجھیں میرے گھر کا معاملہ ہے۔۔۔ یہ کام کر دیں پلیز۔۔۔ میرے دوست کافی پریشان ہیں" انہوں نے درخواست کی

تھی۔ رشتہ کرتے وقت تو انہوں نے ہر بات کا دھیان رکھا تھا۔ جاب، گھربار، دوست احباب سب معلومات حاصل کی تھیں لیکن یہ خیال تو ذہن میں نہیں آیا تھا۔ ان کے لیے تو اتنا کافی تھا کہ ان کی حسین و جمیل بیٹی اس شخص کو پسند کرتی تھی۔ اور وہ دیکھنے میں کافی خوش حال اور خوش شکل تھا لیکن اب انہیں لگ رہا تھا کہ انہوں نے غلت کا مظاہرہ کیا۔ "مقبول حسن نے انہیں سلی دی تھی۔"

"کاشف صاحب۔۔۔ آپ مجھے بس اس کا فون نمبر دے دیں۔۔۔ باقی میں جانوں اور میرا کام۔۔۔ آپ مجھ پر چھوڑ دیں یہ معاملہ۔۔۔ دو دن میں سب پتا کروادوں گا آپ کو۔"

دو دن بعد جب وہ دوبارہ ملے تھے تو مقبول صاحب کی رپورٹ کافی اطمینان بخش تھی۔

"اچھا لڑکا ہے کاشف صاحب۔۔۔ دیانت دار ہے۔۔۔ ذمہ داری سے کام کرتا ہے۔۔۔ کسی نے کوئی شکایت نہیں کی۔۔۔ رویہ بھی دوستانہ سا ہے۔۔۔ مل جل کر رہنے والا انسان ہے۔۔۔ حلقہ احباب کافی وسیع ہے۔۔۔ دوستوں کا دوست ہے۔۔۔ میں نے اس کے آفس سے سب معلومات نکل والی ہیں۔۔۔ کوئی پولیس ریکارڈ وغیرہ بھی نہیں ہے۔۔۔ اپنے دوست کو بولیں بلاوجہ وہم کا شکار نا ہوں۔۔۔۔۔ سب ٹھیک ہے" وہ عام سے انداز میں بولے تھے۔

کاشف چند لمحے ان کا چہرہ دیکھتے رہے پھر دھیمی سی آواز میں بولے۔

"سنا ہے آفس کی خواتین میں بہت مقبول ہے؟" مقبول حسن ہنسے تھے۔

"ارے یہ تو اچھی بات ہے نا۔۔۔ جو خواتین میں مقبول ہوتا ہے۔۔۔ وہ تو بہترین انسان ہوتا ہے۔۔۔ کوئی کسی قابل ہوتا ہے تو اس کی تعریف ہوتی ہے۔۔۔ تب ہی وہ مقبول ہوتا ہے۔۔۔ اور پھر عورت کسی مرد کی تعریف کر دے تو اس سے تو مرد کی شان بڑھتی ہے" انہوں نے کاشف کی بات کو سنجیدگی سے نہیں سنا تھا۔

"نہیں۔۔۔ میرا مطلب تھا کوئی انیئر وغیرہ تو نہیں۔۔۔ سنا ہے کافی دل پھینک ہیں حضرت" کاشف نے بالا آخر کہہ ڈالا تھا۔ مقبول حسن نے تہقیر لگایا۔

"وہ تو میں بھی ہوں۔۔۔ آپ نہیں ہیں کیا۔۔۔؟" کاشف شار کے چہرے کا رنگ اڑ سا گیا تھا۔ مقبول حسین مذاق کر رہے تھے۔

"جوان بچہ ہے۔۔۔ اس عمر میں انیئر نہیں ہوگا تو کس عمر میں انیئر ہوگا۔۔۔ وہ تو آج کل سب مردوں کے ہوتے ہیں۔۔۔ آپ کا کوئی انیئر نہیں ہے کیا۔۔۔؟" وہ ہنستے ہوئے انہیں آنکھوں ہی آنکھوں میں ٹٹول رہے تھے۔

کاشف چپ سے رہ گئے۔ ایک سال ہی تو گزرا تھا ان کے گزشتہ انیئر کو۔۔۔ اچھا بھلا ان کی کزن ان پر مہربان تھیں۔ صوفیہ کے مشکوک ہونے کے باوجود ان کا وقت اچھا گزر رہا تھا مگر پھر نیلم (وہ انہیں پیار سے نیلم ہی بلاتے تھے) نے ان سے شادی کی فرمائشیں شروع کر دی تھیں۔۔۔ ناصر ف شادی کی بلکہ وہ کسی پوش علاقے میں ذاتی گھر کا بھی مطالبہ کرنے لگی تھیں۔ روز روز کی فرمائشوں سے تنگ آکر کاشف نے ان سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ یہ زیادہ پرانی بات تو نہیں تھی۔

"اپنے دوست کو سمجھائیں ایسی باتوں پر پریشان نہیں ہوتے۔۔۔ اگر تو یہ لڑکا ان کی بیٹی کو خوش رکھ رہا ہے۔۔۔ بچی اپنے گھر سکون سے رہ رہی ہے تو اس کا گھر برباد نا کریں۔۔۔ اچھے رشتے روز روز نہیں ملتے۔۔۔ اور ویسے بھی آج کل "گرل فرینڈ" کوئی مسئلہ نہیں بلکہ گھر کی پریشانیوں سے دور رہنے کا نسخہ ہے۔۔۔ سوشل میڈیا پر لاکھوں ایسے نسخے دستیاب ہیں۔۔۔ ایک آدھ گرل فرینڈ سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔۔۔ آپ نے میں نے بھی تو جوانی ایسے ہی گزاری ہے۔۔۔ ایسی ذرا ذرا سی بات پر کون طلاق لیتا ہے" مقبول حسن نے ناک سے کبھی اڑانے والے انداز میں کہا تھا۔ کاشف شار کو لگا کسی نے ان کے منہ پر پتھر دے مارا ہے۔

وہ بھی تو ایسی ہی باتیں اسی انداز میں کیا کرتے تھے۔ صوفیہ کو کبھی ہی بار یہ کہہ کر مطمئن کیا تھا انہوں نے

کہ۔۔۔ ایسی "ذرا ذرا" سی بات پر گھر پر باندھیں کرنا چاہیے لیکن اب جب اپنی بیٹی کا معاملہ درپیش تھا تو ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اظفر کو ایک کی چار سا ڈالیں۔۔۔ لیکن اس کے ساتھ رشتہ ہی ایسا تھا کہ چاہتے ہوئے بھی وہ فوراً کچھ نہیں کر پار ہے تھے مگر ان کا دل بے حد بے چین تھا۔

☆☆☆

"تم واقعی جارہی ہو؟" اس نے زری سے پوچھا تھا جو نہایت نزاکت سے اپنا سامان سمیٹنے میں مگن تھی۔ اس کے آپریشن کو بیس دن گزر چکے تھے۔ اسے ابھی جھک کر کام کرنے میں کافی مشکل کا سامنا تھا۔ منال (بچی) کو اکیلے سنبھالنا بھی اس کیلی غم کے بس کا روگ نہیں تھا لیکن اس نے واپس اپنے گھر جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔

"ہاں۔۔۔ بہت رہ لیا امی کے گھر۔۔۔ اظفر کہتا ہے بس اب واپس آ جاؤ۔۔۔ میں بہت اداس ہو گیا ہوں" وہ قطعیت سے بولی تھی۔

"ابھی کچھ دن اور رہ لو زری۔۔۔ تم سے نہیں سنبھالا جائے گا سب۔۔۔ بہت مشکل ہے یہ سب" اس نے راسنیت سے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ اس کی جانب دیکھ کر اپنے کام میں مگن رہی۔

"اوہو۔۔۔ تم لوگوں نے کیا مشکل مشکل کی رٹ لگا رکھی ہے۔۔۔ امی بھی یہی کہتی چلی جارہی ہیں۔۔۔ اتنا بھی مشکل نہیں ہوتا اب۔۔۔ اور پھر سب ہی کر لیتی ہیں۔۔۔ میں بھی کر لوں گی۔۔۔ اظفر کہتا ہے۔۔۔ آنٹی کو بلا لیں گے" نینا اس کی پشت کی جانب دیکھتی رہی۔ وہ بہت ضدی ہو گئی تھی۔ ہر بات سے انکار کرنے کا، ہر بات میں تنقید کرنے کا ایک نیا ہی پہلو نکالنے لگی تھی وہ۔۔۔ امی نے اسے سمجھانے کی کافی کوشش کی تھی لیکن وہ تہیہ نہ کر سکی تھی کہ اسے واپس جانا ہے اور اب وہ کسی کی بات سننے کو تیار نہیں تھی۔

"اپنا گھر اپنا ہی ہوتا ہے۔۔۔ اور شادی کے بعد ماں باپ کا گھر بھی اپنا نہیں ہوتا۔۔۔ امی کا رویہ دیکھ رہی" نام۔۔۔ بیس دن نہیں سنبھال سکیں بیٹی کو۔۔۔ وہ ہر وقت مجھ سے اور اظفر سے اکتائی رہتی ہیں۔ اسی لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اپنے گھر واپس جانا ہی بہتر ہے" وہ سابقہ انداز میں بولی تھی۔

نینا نے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ کچھ خفا سی لگتی تھی۔

"ایسا نہیں ہے زری۔۔۔ وہ اکتائی ہوئی نہیں رہتیں۔۔۔ بس ہائی بلڈ پریشر کی وجہ سے ذرا خفا جلدی آ جاتی ہیں۔۔۔ لیکن یہ ان کی عمر کا تقاضا ہے۔۔۔ تم کیوں محسوس کرتی ہو" اس نے اسے محبت سے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"تم تو ایسے ہی کہو گی نینا۔۔۔ کیونکہ تمہارے ساتھ ان کا رویہ بہت اچھا ہے۔۔۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تم امیر ہو۔۔۔ بہت پیسہ ہے تمہارے شوہر کے پاس۔۔۔ آج کل رشتے بس روپے پیسے کے محتاج ہیں۔۔۔ امی مجھے اہمیت دیتیں ہیں نا اظفر کو۔۔۔ کیونکہ ہمارے پاس اتنی دولت نہیں ہے جتنی تمہارے پاس ہے" وہ چوکر بولی تھی۔

نینا چپ کی چپ رہ گئی۔ زری غلط سوچ رہی تھی۔

اس کی اور امی کی اب بہت نوک جھوک رہے لی تھی حالانکہ پہلے ایسا نہیں تھا۔ زری کی شخصیت میں بہت تہدیلیاں آ گئی تھیں۔ وہ بلاوجہ ہر بات میں ناراضی کا پہلو تلاش کرتی رہتی تھی۔ ہر بات میں مین میکھ نکالنا، ہر چیز کو ناپسند کرنا اس کا محبوب مشغلہ ہو چلا تھا۔ اس کو امی کی اور امی کو اس کی ہر بات پر اعتراض رہنے لگا تھا۔ امی اگر اس کے لیے کچھ بناتی تھیں تو وہ اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔

"یہ کیا بنا لیا ہے آپ نے۔۔۔ آلو مٹر۔۔۔ یہ کون بنا تا ہے امی۔۔۔ اس سالن کی تو شکل دیکھ کر ہی انسان خود کو غریب سمجھنے لگتا ہے۔۔۔ تو اب اظفر کے سامنے مت رکھ دیجیے گا یہ غریب مسکین سی ڈش" وہ چوکر کہتی تھی تو امی کو برا لگ جاتا تھا لیکن وہ خاموش رہتی تھیں۔

اس کے علاوہ امی منال کے لیے کچھ لاتی تھیں تو وہ اس میں بھی کیڑے نکال دیا کرتی تھی۔
 "اف ف۔۔۔ یہ دو سو روپے کا فراک کیوں لے آئیں۔۔۔ اتنا رَف پڑا ہے اس کا۔۔۔ چھینے والا۔۔۔ منال کی اسکن تو پہلے ہی اچھی حساس ہے۔۔۔ نشان پڑ جائیں گے اس کے جسم پر۔۔۔ ایسے کیڑے میں اپنے گھر لے کر گئی تو اظفر نے اٹھا کر باہر پھینک دیئے ہیں۔۔۔ امی آپ کو کیوں سمجھ میں نہیں آتیں ایسی باتیں"
 وہ چیزوں کو ان کی قیمت کے حساب سے جا چُختی رہتی تھی۔ اس کی اپنی پسند ناپسند جیسے بالکل ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ جو اظفر کو پسند تھا وہی اسے پسند تھا۔ اور جو اظفر کو ناپسند تھا، وہ اسے بھی ناپسند تھا۔ امی کو یہ باتیں اچھی نہیں لگتی تھیں اور گزشتہ بیس دنوں میں وہ کئی بار نینا کے سامنے زری کی ان عادات پر پریشانی کا اظہار کر چکی تھیں
 "یہ تمہاری بہن کا دماغ الٹ چکا ہے۔۔۔ اس کو دس روپے کا آزار بند اٹھا کر دے دو اور کہو کہ دو ہزار روپے کا میزرو (مال) سے لائے ہوں تو یہ اسے سننے سے لگا کر رکھ لیں گی۔۔۔ اور دو ہزار کا فراک یہ پیچھے چلی میں فاروق بے بی مارٹ سے لا دو تو کہے گی۔ اٹھا کر پھینکو اس غلیظ چیز کو۔۔۔ غضب خدا کا اب کیا ہر چیز روپے پیسے سے تو لا کرے گی یہ لڑکی" وہ ناراض ہی ہو جاتی تھیں۔ اسی لیے دونوں کی نوک جھوک بھی زیادہ ہو جاتی تھی جبکہ نینا نے محسوس کیا تھا کہ وہ اس سے خوش رہتی تھیں۔ انہوں نے اشاروں اشاروں میں اس کی اس احساس ذمہ داری کی تعریف بھی کی تھی۔ نینا نے آتے ہی سب کچھ بہت خوش اسلوبی سے سنبھال بھی لیا تھا جو کہ اس کی عادت کے بالکل برخلاف تھا۔

وہ روزانہ زری کا اسٹیشنل سائٹا شٹا بناتی تھی پھر ایمن کو اسکول کے لیے تیار کر کے بھیجتی تھی۔ امی ابا کے لیے ناشتا بھی بنا۔ ان کے کپے بنا دیتی تھی۔ زری کے لیے مخصوص قسم کے کھانے، اس کی بچی کا خیال رکھنا۔۔۔ اس کے کپڑے دھونا۔۔۔ رات کو اس کے رونے کی آواز سن کر اٹھ کر اس کے جھوٹے کو تھلاتے ہوئے سلا دیتا۔ وہ ہر کام ایسے کر رہی تھی جیسے یہ سب اس کا ہی فرض ہو۔ ان سب کاموں کے درمیان بس وہ غلوں دل سے دعائیں کرنا بنا جھوتی تھی کیونکہ ایک ہفتے میں اس کی توقع کے باوجود سچ نے اسے ایک بار بھی کال نہیں کی تھی۔
 وہ اس کا گھر چھوڑتے ہوئے اس کے کپڑوں کی الماری بے ترتیب کر آتی تھی، ساری پرفیوم کی شیشیاں غائب کر آتی تھی، موزے جو جوڑوں کی شکل میں سلیقے سے جما کر دراز میں رکھے ہوتے تھے ان سب کو بے ترتیب کر کے رکھ آتی تھی۔ حتیٰ کہ اس نے اس کے کمرے میں موجود ہیر برش بھی چھپا کر رکھ دیا تھا۔ اسی وجہ سے اسے امید تھی کہ سبج ایک ہی دن میں اس کو یاد کرتے ہوئے کال ضرور کر لے گا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ اس شخص کو تو اپنی بیٹی کی یاد بھی نہیں آتی تھی۔ دوسری جانب اس کی امی کے گھر میں حالات کافی بہتر ہو گئے تھے۔ اس کا اور امی کا رشتہ پہلے کی نسبت مضبوط ہونے لگا تھا۔

قسمت مہربان ہونے لگتی ہے، مقدر بدلنے لگتا ہے، مشکلیں آسان ہو جایا کرتی ہیں اور نصیب روشن ہونے لگتے ہیں لیکن تب تک دل کی "طلب" بدل چکی ہوتی ہے۔

نینا کے ساتھ یہی ہو رہا تھا۔ اسے ہمیشہ یہی آس رات تھی کہ امی کا رویہ اس کے ساتھ ایسا ہی ہو جائے جیسا کہ ان کا زری کے ساتھ ہے۔ وہ ان کے ساتھ جھگڑے کرنا چھوڑ دے۔ ابا کی نفرت میں ان کو حصہ دار بنانا چھوڑ دے۔ لیکن پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ اب ایسا ہو رہا تھا۔ لیکن اب اسے بے چینی تھی تو بس یہ کہ وہ شخص جسے وہ چاہتی تھی، اس کا نصیب بنا رہے۔

اس کا دن گزر جایا کرتا تھا لیکن رات کو فراغت میں اسے یہی خدشہ ستاتا رہتا تھا کہ سبج اسے چھوڑ نا دے "سبج مجھے چھوڑ تو نہیں دیں گے نا۔۔۔ یا اللہ۔۔۔ آپ دیکھ رہے ہیں نا۔۔۔ کتنے بد تمیز آدمی ثابت ہو رہے ہیں سبج۔۔۔" وہ اللہ سے خود کلامیاں کرتی رہتی تھیں اور پرسکون رہتی تھی۔

”دیس ناٹ فیمیر یا اللہ۔۔۔ سچ کو میرا خیال ہی نہیں آتا۔ اس کے باوجود مجھے ان کا خیال رہتا ہے۔۔۔ دیس ناٹ فیمیر یا اللہ۔۔۔ دیس ناٹ فیمیر۔۔۔ وہ مجھے ایک کال بھی نا کریں اور یہاں میرا دل بے چین ہوا جا رہا ہے۔۔۔ اگر انہوں نے مجھے آج بھی کال نا کی تو میں خود کال کر لوں گی۔۔۔“ وہ رات کو نیچے میں منہ دیے بس اللہ سے باتیں کرتی تھی۔

”یا اللہ یہ اچھی بات نہیں ہے۔۔۔ اتنا مغرور بھی نہیں ہونا چاہیے اب انسان کو۔۔۔ سچ نے آج بھی کال نہیں کی۔۔۔ بڑے ہی بد تمیز انسان سے محبت کی ہے میں نے۔۔۔ یا اللہ آپ میرا دل بدل دیں بس۔۔۔ یہ تو کوئی بات نا ہوئی۔۔۔ میں کیوں خوار ہوئی رہوں ایسے۔۔۔ بس آپ میرا دل بدل دیں۔۔۔ میری دعا میں کب قبول ہوں گی“ وہ روز دعا کرتی تھی۔ اسے خبر بھی نہیں تھی کہ اس کی دعائیں کیسے قبول ہو رہی تھیں۔ ایسا پہلے کب ہوا تھا کہ امی نے زری پر اسے ترجیح دی ہو۔ اس کی تعریف کی ہو لیکن اب ایسا ہو رہا تھا۔

وہ اپنی ”ذات“ میں اتنی مگن رہنے لگی تھی کہ اسے احساس نہیں ہوا تھا کہ زری کے بدلے روپے کا اصل محرک کچھ ”اور“ بھی ہو سکتا ہے۔

☆☆☆

روشنی یکدم اس کے چہرے پر بڑی تھی۔ اسے لگا اس کا پورا چہرہ جیسے روشنی کی وجہ سے زرد ہو گیا ہے۔ اس نے آنکھیں کھولنی چاہی تھیں لیکن روشنی اتنی زیادہ تھی کہ اس سے آنکھیں کھولی نا جاسکیں۔ اس نے اپنی طرف سے بھرپور کوشش کی تھی کہ وہ آنکھیں پٹپٹا کر ہی سہی لیکن ایک بار ضرور کھولے۔ وہ دنیا کا چہرہ دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اس کے آس پاس کیا ہو رہا ہے۔۔۔ لیکن بھرپور کوشش کے باوجود اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس سے اپنی پلمیں ایک سینکڑے لیے بھی اوپر کی جانب اٹھانی نا جانی تھیں۔

اسے یہ بھی احساس ہوا کہ اس کے پاس بہت سے لوگ ہیں، وہ انہیں ان کی آوازوں سے پہچان رہی تھی۔ وہاں ادے تھیں۔۔۔ بابا ان کے ساتھ بیٹھے تھے۔۔۔ گل مینے نہیں با میں جانب کھڑی مسلسل اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ وہاں اس کے بھائی بھی تھے۔ ان کے پہلو میں اس کی بھابھیاں بھی تھیں۔ اسے ان سب کو وہاں محسوس کر کے اچھا لگا۔ وہ جانتی تھی وہاں سچ بھی ہے۔۔۔ جو ان سب کی موجودگی کی وجہ سے چپ ہے لیکن وہ جانتی تھی جب سب چلے جائیں گے تو وہ اس سے باتیں کرنے لگے گا۔ اس سے پہلے بھی وہ اکثر اس کے ہاتھوں کے لمس کو اپنے چہرے پر محسوس کرتی تھی۔ وہ سب اس کے پیارے تھے۔ اسے محسوس ہوتا تھا وہ سب اسے مسلسل بلاتے ہیں، جگاتے ہیں، اسے پکارتے ہیں اور اسے پلٹ آنے کی مٹیں کرتے ہیں۔ وہ انہیں دیکھتی تھی اور اس کا دل ڈوبنے لگتا تھا۔ وہ انہیں سمجھنا چاہتی تھی لیکن اس سے اپنے کسی عضو کو حرکت نا دی جاتی تھی۔ وہ جیج کر ان سے مخاطب ہونا چاہتی تھی لیکن زبان ہلانا تو دور کی بات ہے وہ تو سانس کی نالی کو بھی ٹھیک سے استعمال نا کر پار ہی تھی۔ سانس لینے کی کوشش کرتی تھی تو ایسا لگتا تھا جیسے حلق میں پہاڑ جتنے بڑے بڑے پتھر اٹک چکے ہیں۔ وہ بولنے کی کوشش کرتی تھی تو لگتا تھا جیسے اس کے سینے پر کسی نے دباؤ ڈال رکھا ہو۔ وہ بولنا چاہتی تھی، اٹھ کر بیٹھنا چاہتی تھی، ان سب سے مخاطب ہونا چاہتی تھی۔

انہیں بتانا چاہتی تھی کہ وہ بالکل ٹھیک ہے۔۔۔ اب اسے درد نہیں ہو رہا۔۔۔ لیکن یہ سب وہ کہہ نہیں پاتی تھی اور اگر ہمت کر کے وہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں کچھ بتاتی بھی تھی تو کوئی سمجھ نا پاتا تھا۔ اس نے چند ایک بار پھر کوشش کر کے دیکھا تھا مگر اس کی پلمیں اور ہاتھ تھیں نا ہی اس کی زبان میں جنبش ہوئی تھی۔ اس نے تھک کر یہ کوشش ترک کر دی تھی پھر اس نے اپنی سماعتیں آنے والی آوازوں کی جانب مبذول کر لی تھیں۔ وہ سب بائیں کرتے جا رہے تھے۔ وہ ان سب کو ان کی آوازوں کی وجہ سے شناخت کر رہی تھی لیکن جس آواز کو وہ سننا چاہتی تھی

وہ اسے سنائی نہیں دے رہی تھی۔۔۔ اس نے اپنی ساری ہمت مجتمع کر کے سنا چاہا کہ کیا وہ وہاں موجود ہے لیکن اسے مطلوبہ آواز سنائی نادی تھی۔ وہ ایک دم بے چین ہوا تھی۔۔۔
 "کوئین۔۔۔ کہاں ہو تم۔۔۔ تم یہاں کیوں نہیں ہو میرے پاس۔۔۔ اور اگر تم یہاں نہیں ہو تو میری ایمن کہاں ہے۔۔۔ میری ایمن کو کہاں چھوڑ دیا ہے تم نے۔۔۔ کوئین۔۔۔"

☆☆☆

"باجی! صاحب نے بولا ہے ایمن بٹیا کو آج واپسی پر گھر لے کر آتا ہے" ڈرائیور جب ایمن کو اسکول کے لیے لینے آیا تو اس نے نینا کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"ایمن کو۔۔۔؟" اس نے ایمن کو گاڑی میں بٹھایا اور پھر اس کی جانب دیکھ کر پوچھا تھا کہ شاید سبج نے کوئی اور پیغام بھی دیا ہو۔ اس نے سر ہلایا۔ نینا کے دل کو شدید دھچکا لگا تھا۔

"انہوں نے صرف ایمن کو لانے کے لیے بولا؟" اس نے بدقت یہ جملہ ادا کیا تھا۔ ڈرائیور نے اک دفعہ پھر سر ہلایا اور گاڑی اشارت کر دی تھی۔ نینا کا دل ابھی ایک دھچکے سے نہیں سنبھلا تھا کہ وہ مزید بولا۔

"وہ دراصل باجی۔۔۔ شہرین باجی کی طبیعت کافی خراب ہے نا۔۔۔ ڈاکٹرز نے جواب دے دیا ہے۔۔۔" اس نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے اسے اطلاع دی تھی۔ نینا کو یہ بات سن کر بھی ڈکھ ہوا لیکن یہ بات تو ڈاکٹر بہت پہلے ہی بتا چکے تھے۔ وہ سب ذہنی طور پر تیار تھے لیکن نینا کو اس بات کا بھی ڈکھ تھا کہ سبج اسے بھی شہرین سے ملنے کے لیے تو بلوا سکتا تھا۔ حالات اتنے سنگین تھے، کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ وہ ایک بار بھی شہرین کو دیکھنے نہ جا سکی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا وہ ایک بار ضرور جائے لیکن جانے کیوں اب اسے وہاں جاتے ہوئے بھی خوف آتا تھا۔ شہرین کی اداسی کے بستر کے پاس بیٹھ کر نینا کو جھولی بھر بھر کر بد دعا میں دیتی تھیں۔ اس سے ان بد دعاؤں کا بوجھ سنبھالنا نا جاتا تھا۔

"میری قسمت ہی خراب ہے۔۔۔ اور ہمیشہ خراب ہی رہے گی" اس نے سیزرھیاں چڑھتے ہوئے سوچا تھا۔ آنسو آنکھوں سے ٹپکنے لگے تھے۔

دل شہرین کے لیے بھی پریشان تھا اور یہ سوچ کر مزید بوجھل ہوا جا رہا تھا کہ اگر سبج کو ان حالات میں اس کی ضرورت نہیں تھی تو پھر اس کی ضرورت بھی نہیں ہو سکتی تھی۔

"وہ ان جا ہی تھی اور اسے ان جا ہی رہنا تھا" اس نے بمشکل سیزرھیاں عبور کی تھیں اور اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ زری ایک دن پہلے ہی واپس گئی تھی۔ ابانے اسے روکنا چاہا تھا، امی کو اس کے سامنے ان کے روپے پر ڈینا تھا اور اسے مزید کچھ دن رہنے کے لیے بھی کہا تھا لیکن اس نے ان کی بات بھی نہیں مانی تھی اور واپس چلی گئی تھی۔ اس وجہ سے گھر کے حالات کچھ کشیدہ تھے اور دل کی حالت کشیدہ تر بن گئی تھی۔ وہ چپ چاپ اپنے بستر پر بیٹھ گئی۔ اسے سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ شہرین کو دیکھنا چاہتی تھی، مگر واپس جانا چاہتی تھی لیکن اسے ہنک بھی محسوس ہوتی تھی۔ وہ شخص اگر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے دروازے سے نکال باہر کرنا تو کیا عزت رہ جاتی۔

"محبت کی ہے آپ سے۔۔۔ کوئی کاروبار تو نہیں کہ تذلیل کروا کر بھی کچھ حاصل ہونے کی خوشی ہو" اس نے سوچا تھا۔ آنکھیں مسلسل بہہ رہی تھیں۔

"ایمن کا کیا قصور ہے کہ اس بچی کو ڈھال کے طور پر استعمال کیا جائے۔۔۔ کیا بتا اس کی ماں کی کتنی خواہش ہو اپنی بچی کو دیکھنے کی۔۔۔ میں اسے واپس بھیج دوں گی۔۔۔ بچی ہے کچھ دن روئے گی۔۔۔ پھر سنبھل جائے گی۔۔۔ سب ہی سنبھل جایا کرتے ہیں۔۔۔ میں بھی سنبھل جاؤں گی۔۔۔ یہاں واقعی سب ہی سنبھل جایا

کرتے ہیں۔۔۔ سب ہی۔۔۔ آپ کی مرضی اللہ پاک۔۔۔ آپ سے بڑھ کر اپنا اچھا نہیں سوچ سکتی میں۔۔۔ آپ نے میرے لیے اچھا ہی سوچا ہوگا۔۔۔ بے شک۔۔۔ "وہ خود کلامی تو کر رہی تھی مگر آنکھوں سے بے تحاشا آنسو ٹپک رہے تھے۔
اس نے ایمن کی چیزیں سمیٹنی شروع کر دی تھیں۔

☆☆☆

"ہماری وجہ سے کچھ رونق تھی۔۔۔ اب تو بالکل سناٹا ہو گیا ہے گھر میں۔۔۔" اس روز زری نے کہا تھا وہ ایک ہفتہ اپنے گھر رہنے کے بعد دوبارہ ویک اینڈ پر منال کو ایسا سے ملوانے لائی تھی۔ نینا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا مگر بولی کچھ نہیں۔ زری بہت کمزور ہوئی تھی۔ وہ نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تھی اور اب سامنے بیٹھی جانے کیا سوچ رہی تھی۔ ایمن کو واپس گئے آٹھ دن اور چھ گھنٹے ہو چکے تھے اور اس دوران سب نے اسے ایک بار بھی کال کی بھی تھی اس ان کی جانب سے کوئی دوسری اطلاع موصول ہوئی تھی۔

تم نے غور کیا اب بھی بہت خاموش رہنے لگے ہیں۔۔۔ "زری نے منال کو کچھ دیر پہلے ہی سلا یا تھا اور اب جیسے وہ باتیں کرنا چاہتی تھی۔ نینا نے ایک دفعہ پھر اس کی جانب دیکھا۔ اس کا بات کرنے کا بالکل بھی دل نہیں تھا لیکن بہن کی خاطر اس نے سر ہلا کر اس کی بات میں دلچسپی لی تھی۔

"تم اتنی بچپن کیوں ہو۔۔۔؟ واپس کب جاؤ گی؟" زری نے پوچھا تھا۔ نینا کا دل چاہا اس کے شانوں پر سر رکھے اور پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دے۔ ایک یہ کام تھا جو اس نے بھی کسی کے سامنے نہیں کیا تھا۔

"نینا تم میری بہن ہو۔ ایک مشورہ ضرور دوں گی تمہیں کہ اتنے دن اپنا گھر چھوڑ کر ای کی طرف مت رہا کرو۔۔۔ گھر ٹوٹ جاتے ہیں ایسے۔۔۔" وہ سمجھے ہوئے انداز میں بولی تھی۔ نینا نے اس کی جملے میں چھپے اصل مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کی تھی۔

"مرد کو ایلا چھوڑنا عورت کی سب سے بڑی بے وقوفی ہوتی ہے۔۔۔ مرد تو ویسے بھی پرندہ ہوتا ہے۔۔۔ اسے جگہ جگہ اُڑنے اور ادھر ادھر چوچ مارنے کی عادت ہوتی ہے۔۔۔ گھر میں بیوی نا ہو تو وہ زیادہ فشر بے مہار ہو جاتے ہیں۔۔۔"

زری کا لہجہ بالکل ٹوٹا ہوا تھا۔ اس سے بات بھی مکمل نا کی گئی تھی۔ نینا نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ پہلے بھی اسے نصیحتیں کیا کرتی تھی لیکن ایسا ٹوٹا ہوا لہجہ تو پہلے بھی نا سنا تھا اس کا نینا نے۔۔۔ بہن کے لیے متا بھری ساری حیات جیسے جاگی تھیں اس کی۔

"کیا ہوا زری۔۔۔ سب ٹھیک ہے نا۔ اتنی اداس کیوں لگ رہی ہو۔۔۔" اس نے پوچھا تھا۔ زری نے اثبات میں سر ہلایا۔

"سب ٹھیک ہی ہوتا ہے نینا۔ خراب تو بس انسان ہو جایا کرتے ہیں "وہ کھوئی کھوئی سی تھی۔ نینا تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھی اور اس کے پاس آ بیٹھی۔

"کیوں پریشان ہو۔۔۔ کیا ہوا ہے۔۔۔ انظر نے کچھ کہا ہے؟" نینا کا دھیان اسی جانب گیا تھا۔ زری کچھ نہیں بولی لیکن نینا کی سوالیہ نظروں کی تاب نا لاکر اس کی آنکھ سے آنسو پڑکا تھا۔ اس نے اسے ہاتھ کی پشت سے صاف کیا تھا لیکن بولی کچھ نہیں۔ نینا ایسا کی جانب دیکھ رہی تھی۔

"بتاؤ نا زری۔۔۔ کیا پرابلم ہے۔۔۔؟" اس نے دوبارہ پوچھا تھا۔
"نینا! انظر کی زندگی میں کوئی اور بھی ہے۔۔۔ یا شاید۔۔۔ پتا نہیں "وہ نکشمش کی سی کیفیت میں لگتی تھی جیسے کچھ بتانا بھی چاہتی ہو اور نا بھی بتانا چاہتی ہو۔ نینا نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تھا۔ زری کو بس اتنے سے لمس

کی ضرورت تھی۔ وہ اس کے گلے لگ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ نینا کو زیادہ حیرت نا ہوئی۔ اس کا اور اظفر کا رشتہ عجیب سا تھا۔ وہ اسے بہت کم مخاطب کرتی تھی۔ اس کے گمان میں اظفر کے متعلق یہ خدشہ ہمیشہ ہی رہتا تھا کہ وہ زری کے ساتھ مخلص نہیں ہو سکتا لیکن اس کے باوجود اسے زری کے منہ سے یہ سب سن کر ڈکھ ہوا۔ اس نے زری کے شانے سہلا کر اسے تسلی دینے کی کوشش کی مگر وہ الفاظ کی سخت کمی کا شکار تھی۔ اس نے خاموش رہ کر زری کو سننا بہتر سمجھا۔

"اظفر کی زندگی میں بہت ساری لڑکیاں ہیں۔۔۔ وہ سب سے انتہائی بے تکلف ہے۔۔۔ لیکن ایک لڑکی کے ساتھ وہ ضرورت سے زیادہ بے تکلف ہے۔۔۔ اس سے ہر قسم کی بات کرنا رہتا ہے۔۔۔ میں تو کئی ہوں تو وہ برامان جاتا ہے۔۔۔ وہ کہتا ہے وہ صرف فرینڈز ہیں۔۔۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں کنزرویٹیو ہوں۔۔۔ چھوٹے ذہن کی ہوں۔۔۔ اس لیے الٹا سیدھا سوچتی رہتی ہوں۔۔۔ لیکن نینا فرینڈز کو گندے گندے میسج کون بھیجتا ہے۔۔۔ وہ اگر صرف فرینڈز ہیں تو مجھ سے موبائل چھپا کر رکھنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔۔۔ اور پھر ساری ساری رات بیوی کو چھوڑ کر "صرف فرینڈ" سے باتیں کون کرتا ہے۔۔۔؟" وہ بہت ڈھکی تھی۔ بات کم کر رہی تھی اور روز زیادہ رہی تھی۔

"زری تم ایسے مت سوچو۔ کیا پتا وہ واقعی فرینڈز ہوں۔۔۔ تم نے خود ہی تو بتایا تھا کہ اس کی کافی کلاس فیوز وغیرہ ابھی تک اس کے ان پچ ہیں۔ کیا پتا تم زیادہ وہی ہو کر سوچ رہی ہو؟" اس نے زری کو تسلی دینے کی ایک بودی بے کوشش کی تھی۔ وہ خود جانتی تھی کہ اظفر کس قسم کا انسان ہے مگر بہن کو مزید پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے جھوٹی تسلی دینی چاہی تھی۔

"نینا۔۔۔ وہ میرا شوہر ہے، شوہر کے لیے تو ساری عورتیں وہی ہوتی ہیں لیکن یہ میرا وہم نہیں ہے۔۔۔ میں اظفر آکھ کی جنس سے اس کے دل کا حال جان سکتی ہوں۔۔۔ اس کا بدلتا ہوا رویہ مجھ سے چھپا ہوا کیسے رہ سکتا ہے" وہ لا چاری بھرے انداز میں بولی۔

"تم پریشان مت ہو۔۔۔ تم کہو تو میں اس سے بات کروں؟" نینا نے بہت سوچنے کے بعد کہا تھا۔ اظفر سے اس موضوع تو کیا کسی بھی موضوع پر بات کرنا اسے پسند نہیں تھا لیکن بہن کی خاطر وہ یہ بھی کر سکتی تھی۔ زری نے گہری لمبی سانس بھری پھر اپنے گال پر ہاتھ پھیرا تھا کہ آنسوؤں کی نمی کو صاف کر سکے۔

"نینا کیا بات کرو گی تم۔۔۔ بات تو میں کر چکی ہوں۔۔۔ منال کے بعد سے ہمارے درمیان باتیں ہوتی ہی اسی موضوع پر ہیں۔۔۔؟"

"کیا کہتا ہے وہ۔۔۔ تم نے اسے کہا کہ تم یہ سب برداشت نہیں کر سکتی" نینا نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا تھا۔

"اس کے لیے یہ کوئی خاص بات نہیں ہے نینا۔۔۔ میں نے تمہیں بتایا نا وہ سمجھتا ہے میں کنزرویٹیو ہوں اور اس کے اتنے اچھے سرکل آف فرینڈز سے جنکس ہوں۔۔۔ میں جب بھی اس موضوع پر اسے ٹوکنے کی کوشش کرتی ہوں تو وہ کہہ دیتا ہے کہ اپنی بچکانہ سوچ کو بدلوزری۔ زمانہ بدل گیا ہے۔ زمانہ بدل گیا ہے۔۔۔ بس یہی گردان کرنا رہتا ہے۔۔۔ وہ یہی کہہ دیتا ہے کہ میراائف اسٹائل تو پہلے بھی یہی تھا، میں پہلے بھی تمہیں اپنی فرینڈز کی باتیں بتاتا تھا لیکن تب تمہیں برا نہیں لگتا تھا، اب تم خواخوہو جلیں ہو جانی ہو اور برامان جانی ہو۔۔۔ لیکن نینا میں کیا کروں مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہوتا۔۔۔ مجھے غصہ آنے لگتا ہے میں جب اسے ہر وقت سیل فون پر مصروف دیکھتی ہوں۔ ہمارے درمیان کشیدگی بڑھنے لگی ہے حالانکہ میں کوشش کرتی ہوں کہ ایسا نا ہو۔۔۔ میں اسی لیے اپنی حالت کو نظر انداز کر کے اتنی جلدی امی کے گھر سے واپس چلی گئی تھی لیکن پھر بھی صورتحال نہیں بدلی۔۔۔ بلکہ پہلے سے زیادہ مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ اب تو وہ ناراض ہونے لگا ہے اس روز روز کی بحث سے۔۔۔ وہ کہتا ہے میں اس پر شک کر کے اس کی انسلٹ کرتی ہوں۔۔۔"

"ناراض ہوتا ہے تو ہونے دو۔۔۔ آخر یہ تمہارا حق ہے کہ اس موضوع پر اچھے طریقے سے بات کی جائے۔۔۔ پتا تو چلنا چاہیے نا کہ وہ چاہتا کیا ہے؟" نینا کو ساری باتیں سن کر اب غصہ آنے لگا تھا۔

"وہ مجھے چاہتا ہے۔۔۔ یہ بات تو وہ برملا کہتا ہے۔۔۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے دل میں میری بہت اپیل جگہ ہے۔۔۔ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اسی لیے تو اس نے مجھ سے شادی کی ہے اور سچ کہوں نینا وہ میرا خیال بھی رکھتا ہے، روپیہ پیسہ بھی خرچتا ہے، منال سے بھی بہت پیار کرتا ہے، میری ذرا سی تکلیف پر پریشان ہو جاتا ہے لیکن اپنی روش نہیں بدلتا "زری کے جہر سے پر بے انتہا لاچارگی تھی۔ نینا مزید چوٹی۔

"یہ کیسی محبت ہے۔۔۔ تمہیں اتنی ذہنی اذیت دے کر وہ دعا کرتا ہے کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔۔۔؟" چھوڑ دو اسے زری۔۔۔ اتنی اذیت ناقابل برداشت ہے۔۔۔ ایسے مرد کے ساتھ ساری زندگی گھٹ گھٹ کر جینے سے بہتر ہے، پہلے ہی اپنی راہیں الگ کر لی جائیں "اس نے اپنی جانب سے انتہائی پر خلوص مشورہ دیا تھا۔ زری نے قطعیت سے نفی میں سر ہلایا۔

"یہ ناممکن ہے نینا۔۔۔ میں مگر کبھی اظفر کو چھوڑ نہیں سکتی۔۔۔ میں مر جاؤں گی اسے چھوڑ کر۔۔۔ میں محبت کرتی ہوں اس سے۔۔۔ مسئلہ یہ ہے ہی نہیں۔۔۔ میں جانتی ہوں، ہم دونوں کو محبت ہے ایک دوسرے سے۔۔۔" نینا نے اس کی بات کاٹی۔

"لعنت ہو ایسی محبت پر۔۔۔ جو محبت اتنا تڑپائے، زلائے ایسی محبت سے تو موت بہتر ہے۔۔۔ تم کیوں ہر روز نقطہ نقطہ کر کے مرنا چاہتی ہو اوندھے۔۔۔ محبت۔۔۔ اسے کہتے ہیں محبت۔۔۔؟" وہ غر اکر بولی تھی۔ زری نے اس کے چہرے کی جانب دیکھا پھر سابقہ انداز میں بولی۔

"اسے ہی کہتے ہیں محبت نینا۔۔۔ اب تو مان لو کہ اسے ہی کہتے ہیں۔۔۔ تم خود بتاؤ سچ رندھاوانے تمہاری زندگی کو کون سا جنت بنا رکھا ہے، اس کی جانب سے کون سا سکون مل رہا ہے تمہیں لیکن پھر بھی محبت کرنی ہونا اس سے۔۔۔ تب ہی تو برداشت کر رہی ہو یہ سب۔۔۔ میں اگر تم سے کہوں کہ چھوڑ دو اس شخص کو تو چھوڑ پاؤ گی۔۔۔ نہیں نا۔۔۔؟" بس یہی بات ہے نینا۔۔۔ میں بھی نہیں چھوڑ سکتی اظفر کو۔۔۔ میں محبت کرتی ہوں اس سے۔۔۔"

نینا نے جو کہ اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ اسے خبر نہیں تھی کہ اس کے دل کی حالت اس کے چہرے سے اس قدر عیاں رہنے لگی ہے کہ اس کی بہن تک کو اس کی ساری گھٹش کی خبر ہو چکی ہے۔ ایک لمحے کے لیے تو اسے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔

"میں تمہیں طعنہ نہیں دے رہی نینا۔۔۔ تم میری بات کا نہ انا ماننا۔۔۔ میں تو صرف یہی کہتا چاہ رہی ہوں کہ یہ اذیت جو ہم دونوں سہہ رہے ہیں، یہ ہماری قسمت میں ہمارے پیدا ہونے سے بھی پہلے سے لکھ دی گئی تھی۔۔۔ اور اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہمارے نصیب روشن نہیں ہیں۔۔۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے باپ نے جو بویا ہے۔۔۔ ہمیں وہ کاٹنا ہی ہے۔۔۔ ابانے جانے کتنی عورتوں کو خون کے آنسو زلا لایا ہے۔۔۔ کتنی عورتوں کے دل توڑے ہیں، کتنے ارمانوں کا خون کیا ہے۔۔۔ وہ بد دعائیں جو جموئی بھر بھر کر لیا کوئی ہیں۔۔۔ اس کی بھریاکی ہمیں ہی تو کرنی ہے۔۔۔ یہی مکافات عمل ہے۔۔۔" وہ بولتے بولتے بھی رو پڑی تھی۔ نینا کی آنکھوں سے بھی آنسو جھلکنے لگے تھے۔ دونوں بہنیں کچھ دیر اسی طرح بے آواز رو رہی رہیں پھر نینا نے خود کو سنبھالا تھا۔

"زری! ایسا نہیں ہے۔۔۔ ایسا نہیں ہوتا۔۔۔ اللہ پاک ایسا نہیں کر سکتے ہمارے ساتھ۔۔۔ وہ تو ہم سے ستر ماؤں سے بھی زیادہ پیار کرتے ہیں ہم نے ایسی کون سی غلطیاں کی ہیں کہ ہمیں اتنی سخت سزا ملے۔۔۔ میں بات کروں گی اظفر سے۔۔۔ ہر مسئلے کا حل ہوتا ہے۔۔۔ میں سمجھاؤں گی اسے۔۔۔" وہ کہہ رہی تھی کہ زری نے اس

کی بات کاٹ دی۔

"نہیں نیتا۔۔۔ پلیز۔۔۔ تم کسی سے کوئی بات نہیں کرو گی۔۔۔ انظر کو برا لگے گا اگر اسے پتا چلے گا کہ میں نے یہ سب باتیں یہاں اپنے میکے میں کسی سے کی ہیں۔۔۔ مرد اسے اپنی ہنک تصور کرتے ہیں۔۔۔ وہ تو پہلے ہی کہتا ہے کہ میں بلا وجہ الٹی سیدھی باتیں سوچ سوچ کر اپنے رشتے کو کمزور کر رہی ہوں۔۔۔ اس لیے تم اس سے کوئی بات نہیں کرو گی۔۔۔ اور میں تم سے درخواست کرتی ہوں۔۔۔ پلیز ابا سے اس بات پر کوئی بحث نہ کرنا۔۔۔ انہیں کوئی طعنہ مت دینا۔۔۔ انہیں اس بات کی ذرا سی بھی بھونک نہیں پڑنی چاہیے۔۔۔ وہ بہت محبت کرتے ہیں مجھ سے۔۔۔ میری ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتے ہیں۔۔۔ انہیں یہ سب پتا چلے گا تو انہیں بہت اذیت ہوگی۔۔۔ میں ابا کو اذیت نہیں دے سکتی نیتا۔۔۔ اس لیے مجھ سے وعدہ کرو کہ تم ابا سے اس متعلق کوئی بات نہیں کرو گی۔"

وہ التجا کر رہی تھی۔ نیتا اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔ وہ سوچتی تھی کہ زری پہلے سے کتنی بدل گئی ہے، بلا وجہ لڑنا جھگڑنا، طعنہ زنی اس کی عادت بن چکی تھی۔ اب اسے احساس ہوا تھا کہ وہ تو ایک اگلی ہی ذہنی تکلیف سے گزر رہی تھی۔ پانی کا تیز بہاؤ ایک جانب سے روکو تو وہ دوسری طرف سے راستہ بنا لیتا ہے۔۔۔ زری جب اسے شوہر پر اپنا ذہنی غبار نہیں نکال پاتی تھی تو گھر میں ان سب کو ٹوک ٹوک کر اپنا آپ ہلکان کرتی رہتی تھی۔ نیتا کی آنکھوں سے مزید کی آنسو ایک ساتھ ٹپکے تھے۔ وہ خود اتنی تکلیف سے گزر رہی تھی کہ اسے پتا ہی نہ چلا تھا کہ اس کی بہن کے ساتھ کیا کچھ ہو گیا تھا۔ اس نے اسے دوبارہ سے گلے لگا لیا۔

"اللہ تمہاری تمام مشکلیں آسان کرے زری۔۔۔ آمین" اس نے خلوص دل سے دعا کی تھی۔ زری نے بھی "آمین" کہا تھا۔ ان دونوں کو پتا نہیں چلا تھا کہ کمرے کے باہر بہت دیر سے کھڑے ایک اور شخص نے بھی اس دعا پر انتہائی ڈکھ اور خلوص کے طے جملے تاثرات کے ساتھ "آمین" کہا تھا



"وہ آج کل کیوں نہیں آتیں جو پہلے روز شام کو ان کو دیکھنے آیا کرتی تھیں؟" ہینڈ نرس نعیمہ ڈی سوزا نے ڈرپ میں سرنج۔ کے ذریعہ دو منتقل کر کے شہرین کا لحاف درست کیا تھا پھر اس کے ہانپتی سے لگ کر بیٹھے اس کے شوہر کو تاسف بھرے انداز میں دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔ سرطان کی مرہضہ ہونے کی حیثیت سے شہرین اس ہاسپٹل کی مستقل رہائشی تھی۔ اس کا یہاں آنا جانا لگا ہی رہتا تھا۔ اس کے آپریشن قراپیز، ریڈی ایشن سب یہیں ہوتی رہی تھیں۔ وہ اب کی بار چومی بار کو مائیں لٹی تھی اور چومی ہی بار سبکی نرسیں اس کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ یہ مرض ہی ایسا ہے کہ اس میں اسپتال کے اسٹاف کو کومریض کے چہرے سے ہی واقفیت نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ ان کے خاندان کے سب افراد سے واقف ہو جایا کرتی تھیں۔ انہیں دن رات نئے نئے چہروں اور رویوں کو پرکھنے کا موقع ملا کرتا تھا۔

کوما کے بعض مریض تو ایسے ہوتے تھے کہ ان کے جانے والے ہمہ وقت ان کے بستر کے پاس موجود رہنا چاہتے تھے اور بعض کو وہ اکیلے ایذا یاں رگڑ رگڑ کر مارتے بھی دیکھ چکی تھیں۔

شہرین سبج اول الذکر مریضوں ہی میں سے تھی۔ اس کے وجود میں زندگی فقط پانچ سے دس فیصد ہی باقی رہ گئی تھی۔ ڈاکٹر زنی باراس کی آخری سانس کی پیش گوئی کر چکے تھے۔ اس کی موت کے خدشے کا اظہار بھی کئی بار کیا گیا تھا لیکن وہ موت کی دہلیز سے پلٹ کر آ جاتی تھی۔ اس کی حالت اگرچہ بالکل خندوش ہو چکی تھی۔ مہینوں نے اس کا وجود اتنی بری طرح ڈھک رکھا تھا کہ وہ ان میں چھپی ہوئی نظر بھی نہ آتی تھی۔

اس کا جسم بستر پر پڑا رہنے کے باعث اتنا کل چکا تھا کہ اس کے جسم پر جو آلے پڑے تھے، ان میں سے

بدبو آنے لگی تھی۔ اس کے رشتہ دار اب اسے دیکھنے کے لیے آتے تھے تو قریب نہیں آتے تھے بلکہ دور دور سے اسے دیکھتے تھے اور چلے جاتے تھے۔ ایک اس کا شوہر تھا جو روز آتا تھا، اس کے قریب بیٹھ جاتا تھا اور بس چپ چاپ اس کے قطرہ قطرہ پھسلنے جسم کو دیکھتا رہتا تھا۔ ہینڈ نرس نیمہ کو اس پر ترس بھی آتا تھا۔ ان کا دل چاہتا تھا کہ وہ پچھو دیر اس شخص کے قریب بیٹھ کر اسے سمجھائیں کہ

"اس کے قدموں میں مت بیٹھا کرو۔۔۔ ہو سکتا ہے اس کی پرواز تمہاری وجہ سے معطل ہو رہی ہو۔ تم اس کی روانگی کو اس کے لیے کیوں مشکل بناتے ہو!"

وہ سوچتی تھیں مگر کہتے ہوئے جھجک سی جاتی تھیں۔ بعض اوقات اس قسم کے مریضوں کے رشتہ دار ان کی ہمدردی کا نرا بھی مان جاتے تھے۔ انہیں آنی سی یو کا تیرہ سال کا تجربہ تھا۔ گزشتہ پانچ سالوں سے وہ اس پرائیویٹ اسپتال کے نیورولوجی یونٹ میں پارٹ ٹائم کر رہی تھیں۔ کئی لوگ ان کے ہاتھوں میں دم توڑ چکے تھے۔ انہیں مریٹے ہوئے لوگوں کے چہروں میں چھپی المناک ان گنت کہانیاں پڑھنے کا گہرا تجربہ تھا۔

وہ جانتی تھی شہرین کے وجود میں کچھ نہیں بچا لیکن کچھ ہے جو اسے روک لیتا ہے، کچھ ہے جو اسے اتنا بے چین کرتا ہے کہ وہ جاتے جاتے رک جاتی ہے۔۔۔ انہیں محسوس ہوتا تھا کہ وہ مرتا ہوا وجود کی مانند منتظر ہے۔ وہ جانتی تھیں وہ اس کے جانے میں مدد کر دیں، اس کی مشکل کو آسان کر دیں مگر کچھ سوچ کر رنج رہ جاتی تھیں۔ اس روز سمیع کو خالی خالی آنکھوں سے اس کے وجود کے قریب بیٹھنے دیکھ کر وہ پوچھے بنارہ ناپاتی تھیں۔ سمیع نے ایک دم سے ان کی جانب دیکھا۔ ایسے ان کا سوال سمجھنا آیا تھا، ہیڈ نرس نعیمہ نے بہت چاہا لیکن وہ رہ نہیں پائی تھیں۔ وہ اس شخص کے ذرا قریب ہوئی تھیں پھر انہوں نے عیادت کے لیے آنے والوں کے لیے جو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں ان میں سے ایک کرسی چھٹی تھی اور اس پر بیٹھ گئی تھیں۔

"میں آپ کا کچھ وقت لے سکتی ہوں۔۔۔؟" انہوں نے اس سے پوچھا پھر جواب کا انتظار کیے بنا بولیں

"آپ مسلمان ہیں۔۔۔ میں تو نہیں ہوں لیکن مذہب کی بحث میں بڑے بنا بحیثیت انسان ہم دونوں جانتے ہیں کہ موت کا وقت مقرر ہوتا ہے، معین ہوتا ہے۔۔۔ موت اپنے وقت پر آتی ہے لیکن یقین کریں مرتے ہوئے انسان کی آسانی کی دعا کر کے ہم اس وقت کو بہل بنا سکتے ہیں۔۔۔ ان کے لیے آسانی اور راحت کی دعا کریں۔۔۔ بڑی تکلیف میں ہیں یہ۔۔۔ مت روکیں انہیں" وہ زکیں اور ایک نظر شہرین کے وجود پر ڈالی پھر اس کی جانب دیکھا اور بولیں۔

آپ مجھے دقیقاً نو سی بھی کہہ سکتے ہیں اور تو ہم پرست بھی۔۔۔ بے حس اور بے عقل بھی۔۔۔ لیکن میں نے جو محسوس کیا ہے وہ میں کہہ کر ہی رہوں گی۔۔۔" انہوں نے بات کی ابتدا ذرا نرمی سے کی تھی لیکن ان کا لہجہ بالکل ٹھوس تھا جیسے انہیں اپنے موقف پر مکمل یقین ہو۔

یہ جانا چاہتی ہیں۔۔۔ انہیں آپ میں یا اس دنیا میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی۔۔۔ ان کا معاملہ دنیا سے ختم ہونا چاہتا ہے لیکن آپ انہیں جانے نہیں دے رہے۔۔۔ روز ان کے قدموں میں آکر بیٹھ جاتے ہیں۔۔۔ روز آنسو بہا کر انہیں تکلیف دیتے ہیں۔۔۔ وہ جانے کی ہمت کرتی ہوں گی لیکن آپ کو دیکھ کر پھر وہیں ٹھہر جاتی ہیں۔۔۔ کسی مرتے ہوئے انسان کو تکلیف دینا کوئی اچھی بات ہے کیا؟" وہ اس سے پوچھ رہی تھیں، سمجھ کے چہرے پر لکھا تھا کہ اسے ان کی بے سرومات بات سمجھ نہیں آئی۔

ان کی روانگی آسان بنا میں سمجھ صاحب۔۔۔ وہ مشکل جوان کی پرواز میں حائل ہے۔۔۔ اس مشکل کو دور کر دیں۔۔۔ خدا سے ان کی زندگی مت مانگیں۔۔۔ زندگی ان کو درد دیتی ہے۔۔۔ خدا سے ان کے لیے درد مت مانگیں "انہوں نے اپنا موقف اپنی مرضی سے مکمل کیا تھا اور پھر سمجھ کو اس کے دکھ میں تڑپا چھوڑ کر باہر نکل

مٹی تھیں۔ سب کی آنکھوں سے لگا تار کئی آنسو نپکے تھے۔
 "تمہارے لیے درد کیسے مانگ سکتا ہوں شہرین۔۔۔ مرکز بھی نہیں"

☆☆☆

"یہ اذیت جو ہم دونوں سہہ رہے ہیں، یہ ہماری قسمت میں ہمارے پیدا ہونے سے بھی پہلے سے لکھ دی گئی تھی۔۔۔ اور اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہمارے نصیب روشن نہیں ہیں۔۔۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے باپ نے جو بویا ہے۔ ہمیں وہ کاٹنا ہی ہے۔۔۔ ابا نے جانے کتنی عورتوں کو خون کے آنسوؤں لایا ہے۔۔۔ کتنی عورتوں کے دل توڑے ہیں، کتنے ارمانوں کا خون کیا ہے۔۔۔ وہ بد دعائیں جو جھولی بھر بھر کر ابا کو ملی ہیں۔۔۔ اس کی بھرپائی ہمیں ہی تو کرنی ہے۔۔۔ یہی مکافات عمل ہے۔۔۔"

یہ زری کی سسکی ہوئی آواز نہیں تھی۔ یہ پھپھرتا جو کاشف ثار کے منہ پر پڑا تھا۔ انہیں لگا وہ ادھ موئے ہو گئے ہیں۔ اس رات کے بعد سے انہیں کئی رات سکون سے نیند نہیں آئی تھی۔ وہ ہر روز رات کو بس خالی آنکھوں سے چھت کو ٹکا کرتے تھے۔ یہ کسی اذیت بھی جو ان کا مقدر بن گئی تھی۔ انہیں کوئی بیماری نہیں تھی لیکن وہ خود کو برسوں کا بیمار سمجھنے لگے تھے۔

اس روز رات کو اپنی اینٹیوں کے کمرے کے باہر سے گزرتے ہوئے ان کے قدم جیسے کسی مقناطیس نے جکڑ لیے تھے۔

"اظفر کی زندگی میں بہت ساری لڑکیاں ہیں "زری نے کہا تھا۔ یہ بات ان کے لیے کوئی انکشاف نہیں تھا۔ انکشاف یہ تھا کہ زری جانتی تھی کہ اس کا شوہر کس قسم کی حرکات میں ملوث تھا۔ وہ وہیں ٹھہرے ہو کر اس کی باتیں سننے لگے تھے۔

ان کا دل چاہا تھا کہ اندر کمرے میں جا کر بیٹی کو سینے سے لگائیں اور اسے احساس دلائیں کہ "وہ اس کے ساتھ ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے کوئی ان کی بیٹی کو دکھ دینے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔۔۔ وہ اسے قہری دیں کہ ان کے گھر کے دروازے اپنی بیٹی کے لیے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔۔۔ ان کی بیٹی جب چاہے اس شخص کے منہ پر تھوک کر ان کے گھر واپس آجائے۔۔۔ وہ اسے سنبھال لیں گے۔۔۔"

یہ سب کہنے کی نوبت ہی نا آئی تھی۔ انہوں نے سنان کی بیٹی، ان کی چھٹی بیٹی، ان کی نصف جگر کھری تھی "یہ اذیت جو ہم دونوں سہہ رہے ہیں، یہ ہماری قسمت میں ہمارے پیدا ہونے سے بھی پہلے سے لکھ دی گئی تھی۔۔۔ اور اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہمارے نصیب روشن نہیں ہیں۔۔۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے باپ نے جو بویا ہے۔ ہمیں وہ کاٹنا ہی ہے۔۔۔ ابا نے جانے کتنی عورتوں کو خون کے آنسوؤں لایا ہے۔۔۔ کتنی عورتوں کے دل توڑے ہیں، کتنے ارمانوں کا خون کیا ہے۔۔۔ وہ بد دعائیں جو جھولی بھر بھر کر ابا کو ملی ہیں۔۔۔ اس کی بھرپائی ہمیں ہی تو کرنی ہے۔۔۔ یہی مکافات عمل ہے۔۔۔"

کاشف ثار نے یہ سب سنا تھا اور وہ اپنا سامنہ لے کر رہ گئے تھے۔

آپ کا کبیرہ گناہ بھی چھپتا ہے نادیتا ہے نا بھی مرتا ہے۔۔۔ وہ پلٹ کر کسی نا کسی روپ میں آپ کے سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔۔۔ اور پھر آپ ہوتے ہیں اور آپ کا گناہ ہوتا ہے۔۔۔ جیسے بندر اور ڈگڈگی۔۔۔

اس رات سے کاشف ثار بندر کی طرح بس اچھل رہے تھے لیکن ان کا اچھلنا کسی کو نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ الہیت سہم رہے تھے لیکن کسی کو کہہ نہیں سکتے تھے، وہ رو رہے تھے لیکن ان کی آنکھ سے آنسو نہیں ٹپکتے تھے۔ انہیں لگتا نہیں آتی تھی لیکن وہ آنکھیں بند کر کے سوتے بنے رہتے تھے۔
 ان کو کھلی آنکھوں کے خواب میں بھی حبیبہ نظر آتی تھی، کبھی رشی، کبھی شہابہ، کبھی نیلم، کبھی سونیا، کبھی

شاہانہ۔۔۔۔۔ لاقعداد نام تھے، لاقعداد گھونے تھے جوان کے چہرے پر ہر لمحہ پڑتے تھے اور وہ کسی کو بتانا پاتے تھے۔ زندگی ان کے لیے اذیت کا دوسرا نام بن چکی تھی اور وہ اسے گزارنے پر مجبور تھے۔
 "مکافات عمل ایک حقیقت ہے۔۔۔ ایک اہل حقیقت۔۔۔ اللہ دکھا دیتا ہے دنیا میں ہی آپ کے ہر عمل کا رد عمل۔۔۔"

☆☆☆
 "یا اللہ۔۔۔ تو مجھ سے واقف ہے۔۔۔ تو جانتا ہے میں نے کبھی اس عورت کو دکھ دینے کے متعلق سوچا تک نہیں جسے تو نے میری شریک حیات بنایا ہے۔ میں نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ خلوص سے مکمل سچائی سے اس کے نام کیا ہے۔ اس کی بھلائی کے لیے اس کی بہتری کے لیے ہر وہ کام کرنے کی کوشش کی جو جائز تھی، حلال تھی۔۔۔ تیرے علم کے مطابق ہم نے اپنا بستر ہی نہیں بانٹا، بلکہ عزت محبت، دولت ہر چیز ایک دوسرے کے ساتھ بانٹی ہے۔۔۔۔۔"

جو میرا تھا، وہ اس کا تھا۔۔۔ اور جو اس کا تھا، وہ میرا بھی تھا۔۔۔ لیکن ایک درد ہے جو ہم ایک دوسرے کے ساتھ نہیں بانٹ پائے۔۔۔ وہ لاچار تکلیف میں پڑی ہے اور میں اسے تڑپتا دیکھ رہا ہوں، کب سے دیکھ رہا ہوں اور اس کی آسانی کی دعا نہیں کر رہا۔۔۔ میں بس تجھ سے اس کی زندگی کی دعائیں مانگتا چلا جا رہا ہوں۔۔۔ یہ سوچے سمجھے بنا کہ میری دعائیں اسے اذیت دے رہی ہیں۔۔۔ یا اللہ میں آج تجھ سے اس کی زندگی کی نہیں بلکہ آسانی کی دعا کرتا ہوں"

سمجھ نے اپنے ہاتھ تورب کے سامنے دعا کی صورت اٹھا رکھے تھے لیکن اس کا ذہن وہیں کہیں ہسپتال کے بستر پر پڑی شہرین کے گردھوم رہا تھا۔ اس کا تالیوں میں جکڑا بدن جیسے اس کی آنکھوں کے پردے سے چپکا ہوا تھا۔
 "یا اللہ! آج پہلی بار تجھ سے اس کی آسانی طلب کرتا ہوں۔۔۔ اس کے ہراس درد کو ختم کر دے جسے میں چاہ کر بھی بانٹ نہیں پایا۔۔۔ ہر وہ اذیت جس نے اس کے وجود کو لاچار کر رکھا ہے، اس اذیت کو ختم کر دے یا اللہ۔۔۔ بس اسے آسانی دے دے۔۔۔ اسے راحت عطا فرما مولا۔۔۔ میری شہرین کے ہر درد کو ختم کر دے مالک۔۔۔ میں تجھ سے اپنی خوشی نہیں بلکہ اپنی شہرین کی آسانی چاہتا ہوں یا اللہ۔۔۔ اس کی روائی میں جو بھی رکاوٹ ہے۔۔۔ اس رکاوٹ کو دور کر دے یا رب العالمین!۔۔۔ وہ میری جان ہے۔۔۔ میری جان پر آسانی ہوگی تو مجھ پر آسانی ہوگی۔۔۔ یا اللہ ہم دونوں پر آسانی ہوگی۔۔۔ یا اللہ ہم دونوں کو آسانی عطا کر دے۔۔۔ آمین یا رب العالمین۔۔۔ آمین یا رب العالمین۔۔۔ آمین یا رب العالمین۔۔۔"

وہ روتا جا رہا تھا اور بس سسک سسک کر دعا مانگتا جا رہا تھا۔ اسی دوران اس کے سیل فون میں ارتعاش پیدا ہوا تھا۔ وہ ایک دم سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ رات کے اس پہر تو ہسپتال سے ہی فون آسکتا تھا۔ اس نے آگے ہو کر فون کی جانب دیکھا۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی کے باعث اسے فون کی اسکرین پر نمایاں نام واضح نظر نہیں آیا تھا۔ اس نے فون کان سے لگایا۔

"سمجھ۔۔۔ پہلی صد اس کے نام کی ہی ہوئی تھی۔
 "کوئین۔۔۔ آپ۔۔۔؟" اس نے بھیگی ہوئی آواز میں پوچھا تھا۔ وہ کچھ نہیں بولی تھی لیکن اس کے سکنے کی آوازیں سمجھ کو صاف موصول ہو رہی تھیں۔

"آپ برا تو نہیں مائیں گے۔۔۔ اگر میں ایک بار شہرین کو دیکھنے ہاسپٹل جاؤں؟" وہ پوچھ رہی تھی۔ اس کی کال کا اس وقت آنا سمجھ کے لیے حیران کن تھا۔ وہ رُب سے آسانی مانگ رہا تھا اور اسی لمحے کوئین نے اپنے ہونے کا احساس دلا دیا تھا۔

وہ جب رُب کو اتنی شد و بند سے یاد کر رہا تھا، کوئی اسے اتنی ہی شدت سے یاد کر رہا تھا۔ وہ جب رُب سے اپنی آسانی طلب کرنے میں لگن تھا، کوئی اسے رُب سے طلب کرنے میں لگن تھا۔ بعض فیصلے بس اچانک ہی کرنے پڑتے ہیں۔۔۔ وہ فیصلہ بھی بس اچانک ہو گیا تھا۔

☆☆☆

"اپنا اسم کارڈ نکال کر فون بند کر دیں" سمیع نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔ ایمین اس کے ساتھ دوسری کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔

"کیوں۔۔۔؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا تھا۔

"اس لیے کہ وہاں یہ کام نہیں کرے گا۔۔۔ وہاں دوسرا اسم کارڈ لینا پڑے گا نا۔۔۔" سمیع نے وضاحت کی تھی۔

"ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے۔۔۔ وہاں تو یہ ڈی ایکٹیوٹ ہو جائے گا" اس نے سر ہلایا تھا۔

"ماشاء اللہ بڑی ذہین ہیں آپ۔۔۔ بہت جلدی سمجھ میں آگئی یہ بات آپ کو" سمیع نے مسکراتے ہوئے اسے چڑایا تھا۔

"کونین کی اچھی بات یہ تھی کہ وہ اس کی ہر بات فوراً مان لیتی تھی۔

"آپ نے جانے سے پہلے کسی کو پھول بھجوانے تھے نا۔۔۔ بھول تو نہیں گئیں؟" سمیع کو اس کی سب ضروری باتیں یاد رہتی تھیں۔

"جی جی۔۔۔ بھجوادے تھے۔۔۔ میرے ایک بہت اچھے دوست کی شادی ہے کل۔۔۔ مہر ہے نا۔۔۔ میری

بھانجی۔۔۔ اس کے چاچو کی شادی ہے۔۔۔ میں نے بتایا تھا نا آپ کو اس کے متعلق۔۔۔ اس کے بڑے احسان ہیں مجھ پر۔۔۔ اسی کو بھجوانے تھے پھول اور مبارک باد کا پیغام۔۔۔ میں نے بھجوادے تھے پھول اور کارڈ بھی" اس نے جواب دیا تھا۔

"اچھی بات ہے۔۔۔ آپ اپنے سب دوستوں کے کانٹیکٹ نمبرز ڈیوائس میں محفوظ کر لیں۔ تاکہ وہاں جا کر آپ کو سب کے ساتھ رابطہ کرنے میں آسانی ہو" سمیع نے اسے مشورہ دیا تھا۔

"اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ میرا رابطہ آپ سے شروع ہو کر بس آپ پر ہی ختم ہو جاتا ہے۔۔۔

مہرے لیے بس ایک ہی کانٹیکٹ اہم ہے۔۔۔ سمیع رندھاوا۔۔۔ میرے سارے کانٹیکٹس بس آپ سے شروع ہو کر آپ پر ہی ختم ہو جاتے ہیں۔

وہ ڈالار بھرے لچھے میں بولی تھی اور ساتھ ہی اس کے کندھے میں اپنا بازو محائل کیا تھا۔ سمیع مسکرایا۔ وہ

ایسی ہی تھی۔ اس کے ساتھ اپنی محبت کا ہر لمحہ اتنا نکل کر اظہار کرتی تھی کہ بعض اوقات سمیع اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھنے لگتا تھا۔ زندگی میں دوبارہ سے مسکرانے میں اس لڑکی کا کردار بے حد اہم تھا۔ اس نے اسے بدل کر

رکھ دیا تھا۔ وہ اس روز رات کو کونین کو خود جا کر اس کے گھر سے واپس لایا تھا اور اس کے تین دن بعد شہرین نے خاموشی سے دم توڑ دیا تھا۔

یہ بات اذیت ناک تھی لیکن وہ سب جیسے اس دھچکے کے لیے تیار تھے۔ وقت گزرنے لگا تھا۔ زندگی اپنے مقام پر واپس آنے لگی تھی۔ سمیع کو نارمل ہوتے کافی وقت لگ گیا تھا لیکن کونین نے اس دوران بھی اس کا ساتھ

نہیں چھوڑا تھا۔ وہ ہر مقام پر اس کے ساتھ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب سمیع نے کینیڈا کی امیگریشن لینے کا فیصلہ کیا تو اگلی اس نے اس کا ساتھ دیا تھا۔

"میں یہاں نہیں رہنا چاہتا۔۔۔ میں یہاں سے چلے جانا چاہتا ہوں۔۔۔ چاہے چند سالوں کے لیے ہی

سہی لیکن میں اس سارے دائرے سے نکلنا چاہتا ہوں۔۔۔۔ مجھے یہاں رہنے میں اذیت ہوتی ہے " کوئین نے ایک بار بھی نہیں کہا تھا کہ میں ایسا نہیں چاہتی۔ اس نے سمجھ کے اس فیصلے پر بھی لبیک کہا تھا۔ اس سارے عمل میں کافی مہینے لگ گئے تھے اور آج وہ دونوں ایمین کے ساتھ ایئر پورٹ کے ڈیپارچر لاونج میں بیٹھے تھے۔ ایمین ساتھ بیٹھے بچوں کے ساتھ کھیلنے میں مگن ہو گئی تھی۔

" کوئین بہت بولتی ہیں آپ۔ اور یہ ایئر پورٹ ہے۔ آپ کا بیڈروم نہیں ہے۔۔۔ ذرا ٹھیک ہو کر بیٹھیں۔" سمجھ نے سنجیدہ رہنے کی کوشش کرتے ہوئے اسے ٹوکا تھا۔ وہ مزید اس کے قریب ہوئی پھر ناک چڑھا کر بولی۔ "میں زیادہ اس لیے بولتی ہوں تاکہ تو اذن قائم رہے۔ آپ اتنا کم بولتے ہیں۔۔۔ تو، مجھے خدشہ رہتا ہے کہ لوگ ہمیں گونگا سمجھ لیں۔۔۔ اچھا تو نہیں لگتا کہ یہاں بیٹھیں لوگ سمجھیں کہ یہ کپل جو اتنا خوب صورت ہے۔۔۔ اور لڑکی یعنی کہ میں جو کہ بہت ہی خوب صورت ہے۔۔۔ کوٹنے ہیں۔۔۔ اسی لیے زیادہ بول رہی ہوں میں۔" وہ ایسی ہی بے سرو پا باتیں کرتی تھی لیکن سمجھ کو اس کی زندگی سے بھرپور باتیں اچھی لگتی تھیں۔ اسے لگتا تھا کہ اس کی ذات کے اندر جو سناٹے ہیں، کوئین کی باتیں اس سناٹے کو ختم کر دیتی ہیں۔ اس وقت بھی سمجھ کو ایسی آگئی۔ اس نے اس کے دوسرے ہاتھ میں موجود سیلف فون پکڑا تھا۔

"اچھا تو آپ بہت خوب صورت ہیں۔۔۔؟" وہ اسے چڑاتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ اس نے سر ہلایا "اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ میں بہت خوب صورت ہوں لیکن آپ کو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی گی کیونکہ آپ نے بھی مجھے غور سے نہیں دیکھا" وہ لالہ روائی سے بولی تھی۔ "یہ گس نے کہا کہ میں نے آپ کو غور سے نہیں دیکھا۔۔۔ جناب میں نے تو آپ کی پہلی ملاقات میں ہی بہت غور سے دیکھ لیا تھا؟" وہ بات برائے بات کر رہا تھا۔

"اچھا واقعی۔۔۔ پھر آپ تو مر مٹے ہوں گے مجھ پر۔۔۔ آپ نے سوچا ہو گا تاکہ کتنی حسین لڑکی ہے یہ؟" وہ پوچھ رہی تھی۔ سمجھ مسلسل مسکرا رہا تھا اور ساتھ ساتھ اس کے موبائل میں محفوظ نمبر زکوٰۃ پوائس پر منتقل کر رہا تھا۔ "ہاں۔۔۔ یہی سوچا تھا میں نے کہ کتنی خوب صورت لڑکی ہے۔۔۔ لیکن اللہ نے اسے عقل کتنی کم دی ہے۔ کاش ذرا سی عقل دی ہوئی تو مجھ غریب کا بھلا ہو جاتا" وہ باتیں اس سے کر رہا تھا لیکن توجہ موبائل کی جانب تھی۔

"آپ پہلے دن سے مجھے پر فدا تھے نا۔۔۔ مجھے پہلے ہی شک تھا آپ پر۔۔۔ کہ یہ بندہ شکل سے ہی گھٹا مینا لگتا ہے" وہ اسے چڑا رہی تھی۔

"اچھا اب ذرا خاموش رہیں ایک منٹ۔۔۔ ایک ضروری کال کرنی ہے مجھے۔۔۔" وہ اسے ٹوک کر بولا تھا۔ دوسری جانب کال مل گئی تھی۔ سمجھ بات کرنے لگا تھا۔ اسے بات کرتا دیکھ کر وہ بالکل چپ ہو گئی تھی کیونکہ اسے چا چل گیا تھا کہ وہ کسی سے بات کر رہا ہے۔ ایک منٹ میں اپنی علیک سلیک مکمل کر کے سمجھ نے اسے فون تھما نا چاہا تھا۔ وہ متذبذب تھی۔ سمجھ نے فون کی اسکرین کو ہاتھ سے چھپایا تھا تاکہ دوسری جانب آواز نا جا سکے۔ "میری خاطر۔۔۔ پلیز۔۔۔" وہ بہت محبت بھرے لہجے میں بولا تھا۔ کوئین نے فون تھام لیا تھا۔

"جی ابا۔۔۔ ٹھیک ہوں۔۔۔ جی بالکل۔۔۔ ہاں جی ابا۔۔۔ ایمین بھی ٹھیک ہے۔۔۔ ہاں جی ابا۔۔۔ جاتے ہی نمبر بھجوا دوں گی اپنا۔۔۔ آپ بھی اپنا خیال رکھیے گا ابا۔۔۔ دو وقت پر لیتے رہیے گا" اس نے رپورٹ کی طرز بات کی تھی لیکن کر لی تھی۔ فون بند کر کے اس نے اپنا فون دوبارہ سے سمجھ کو پکڑا دیا تھا۔ ان دونوں نے اس موضوع پر کوئی بات نا کی۔ سمجھ جانتا تھا کہ کوئین کے تعلقات اپنے ابا سے واجبی نوعیت کے ہیں لیکن وہ بھر مگی دھیان رکھتا تھا کہ وہ ان سے رابطے میں رہے۔ اسی طرح وہ بھی سمجھ کے والدین کے ساتھ رابطے میں رہتی

فی۔ وہ اکثر ایمن کی اپنی نانوادے اور خلاؤں سے بھی بات کروادیا کرتی تھی۔ سمیع نے فون بند کر کے اس کے ہیک کی زب کھولی بھی اور فون اس میں رکھ دیا تھا۔

"تھینک یو" سمیع نے کہا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر سادہ سے انداز میں بولی۔
 "آپ کی خاطر میں بھی سکتی ہوں۔۔۔ یہ تو بس ایک فون کال تھی" سمیع نے سر ہلایا پھر ایک بار پھر سر اٹھنے والے انداز میں اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔

"تھینک یو سوچ۔۔۔" اس نے ناگ چڑھائی اور منہ بنا کر بولی۔
 "تھینک یو سوچ۔۔۔ اونہ۔۔۔ ارے بندہ خدا! ایسی باتوں کے جواب میں "آئی لویو" کہتے ہیں "سمیع لاشی آگئی۔

"والئی۔؟" وہ اس سے پوچھ رہا تھا پھر اس کے جواب کا انتظار کے بغیر بولا۔
 "لیکن میں ایسی باتوں کے جواب میں "آئی لویو" نہیں کہتا" کوئین نے پھر اسے گھورا تھا اور طنزیہ انداز میں بولی۔

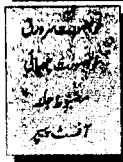
"اچھا۔؟ تو آپ ایسی باتوں کے جواب میں کیا کہتے ہیں؟" سمیع چند لمحے مسکرا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس کی ناک کو ہلکا سا چھوتے ہوئے ذومنی انداز میں بولا۔
 "وہ میں آپ کو گھر جا کر بتاؤں گا۔ اب ہر بات کا جواب انٹر بورٹ پر بھی نہیں دیا جاسکتا" کوئین اس کی بات میں چھپی شرارت کو سمجھ کر جینپ کر مسکراتے ہوئے ایمن کو دیکھنے لگی تھی۔ اس کی بازو ابھی بھی سمیع کے بازو کے گرد لپیٹا تھا۔ اس کا ہاتھ سمیع کی بازو پر دھرا تھا۔ سمیع نے اس کے اسی ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا تھا اور اطمینان سے اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا تھا۔

☆☆☆

پھر اس کے قدموں نے کسی سطح کو چھوا تھا۔ اسے لگا اس کا پورا وجود اوپر سے نیچے ہل گیا ہے۔۔۔
 ایسے جیسے غلاء باز خلا میں قلابازی کھاتے ہیں۔۔۔ اس نے بھی دھیرے دھیرے ایسی ہی قلابازی کھائی تھی۔۔۔ اور پھر وہ اپنی ٹانگیں اپنے پیٹ سے چپکا کر پرسکون ہو کر لیٹ گئی تھی۔۔۔ ایسے جیسے اپنی ماں کے رحم میں ان کے رحم و کرم پر ہو۔



دارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول



☆ تتلیاں، پھول اور خوشبو راحت جبین قیمت: 250 روپے
 ☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں فائزہ افتخار قیمت: 600 روپے
 ☆ محبت بیاں نہیں لہنی جدون قیمت: 250 روپے

نوائے بہار: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

دو لکے کین

ہے۔ اس کے علاوہ خاندان میں اماں جی ہیں جن کو ہر ماں کی طرح اپنی اولاد نکمی لگتی ہے۔ یہ تھا ہمارے خاندان کا مختصر سا تعارف اب میں سونے لگی ہوں بائے بائے۔



صبح کا آغاز ہمیشہ کی طرح پانی سے ہوا۔ پینے والے پانی سے نہیں بلکہ اس فریج کے اس ٹھنڈے پانی سے جو اماں نے ہمیں غفلت کی نیند سے جگانے کی غرض سے میرے منہ پر پھینکا تھا اور اس کے کچھ چھینٹے ہنہ کے چہرے پر پڑے تھے جو خواب میں عمر اکمل کے ساتھ شاید ساتھ افریقہ کے ٹور پر نکلی تھی۔ ہنہ کے بارے میں دو باتیں ذہن نشین کر لیں نمبر ایک ہنہ کو کرکٹ کا جنون ہے نمبر دو ہنہ ہر بات میں کسی نہ کسی شعر کا غلط حوالہ ضرور دیتی ہے۔

”اٹھ جاؤ نکمبھوں نماز کا ٹائم جا رہا ہے۔“ اماں کی آواز ساتھ والا محلہ بھی سن سکتا تھا۔ مجھے اماں کی اگلی کارروائی کا پتا تھا اس لیے میں نے چلدی سے بستر چھوڑ دیا۔ ہنہ ابھی تک آدمی نیند میں تھی۔

”کیا ہے اماں سونے دس پورا دن تو آپ کام کرواٹی ہیں کبھی تو یہ بھی کہہ دیا کریں سو جاؤ میری لڑائیوں۔“ بقول شاعر ”ایک بار کہو میں تیری ہوں۔“

ہنہ کو شاید یاد نہیں تھا کہ اماں نے کل ہی ایک نئی چپل خریدی جو پولیس والوں کے پتھر جیسی ہے اس لیے اگلے لمحے میں اس کی چیخ مجھے وضو کرتے ہوئے سنائی دی اور میری روح تک سیراب ہو گئی۔ نماز پڑھنے

جس طرح ڈگری ڈگری ہوتی ہے چاہے اصلی ہو یا نقلی اسی طرح کھڑ تو کھڑ ہوتا ہے چاہے جس کا ہو۔ دین محمد دودھی کا گھر تو گھر تھا مگر بقول اماں جی اولاد نے اسے ہنگامہ خانہ بنا دیا تھا۔ تو حضرات آپ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ آخر یہ پڑ پڑ بولتی زبان کس کی ہے، کہیں ناشتے میں کو اتو نہیں کھالیا اس لڑکی نے نہیں جی بالکل بھی ایسی بات نہیں بولتے رہنا ہماری بچپن کی عادت ہے اور عادت کب بدلتی ہے۔ جس طرح عوام کو سیاست دانوں کا ہر سچا جھوٹا بیان سیاسی بیان لگتا ہے اسی طرح میرے بولتے رہنے کو اماں جی کو اس ہی لگتی ہیں۔ ارے یار میں بھی ٹکن باتوں میں لگ گئی۔ میں ذرا اپنا تعارف کروالوں۔ میرا نام فریدہ ہے اور میں لاہور کے ایک خوب صورت محلے کی رہائشی ہوں۔ ہمارا گھر چھوٹا سا مگر خوب صورت ہے۔ والد محترم کا نام دین محمد ہے اور اپنے دودھ کے کاروبار کی وجہ سے دودھی کہلائے جاتے ہیں۔ اباجی کے اباجی یعنی میرے دادا کے زمانے سے یہ ہمارا خاندانی کاروبار ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اباجی اس کاروبار میں ایڈجسٹمنٹ کے قابل ہیں۔ ایڈجسٹمنٹ یعنی چار کلو دودھ میں سے دو کلو نکال کر اسے دوبارہ چار کلو بنا دینا۔ باقی تنسی خود بیانے ہو۔ میرے علاوہ ہمارے خاندان میں میری چھوٹی بہن ہنہ ہے جو اٹھارہ سال کی ہے اور مجھ سے چار سال چھوٹی ہے۔ اس حساب سے میری عمر ہو گئی ایڈجسٹمنٹ کر کے صرف بیس سال ہے نا؟۔ تیسرے نمبر پر میرا لاڈلا بھائی احتشام ہے جس کو بھی غصہ آئے نکلتا اسی پہ



پکانے لگا۔

”براں مر میں پڑھنے جارہی ہوں۔“ فہمی کی گھورتی نظروں کو میں نے ایسے نظر انداز کیا جیسے سفارشی کھلاڑیوں کی کارکردگی کو کرکٹ بورڈ والے کرتے ہیں اور لا بریری کی طرف چل دی۔

☆☆☆

گھر کی چھت پر پتنگ بازی عروج پر تھی۔ میری پتنگ نے جیسے ہی احتشام کی پتنگ کو کاٹا میری منہ سے خوشی کے مارے ناقابل فہم آوازیں نکلیں۔ ”یا ہووو“ میرا عروس کرینچے سے اماں کی آواز آئی۔

”لی تیرے ابائی شادی ہے جو چٹیں مار رہی ہے۔“
”اماں جی! اباب ایک بار سبق سیکھ چکے ہیں دو سری غلطی نہیں کریں گے بقول شاعر اب کے تجلہ شادی کا نہیں امکاں اماں“ میرے جیسے کا جواب ہنہ نے دیا۔

”تو جا کے اپنے کچھ لگتے عمارا کسل کو دیکھ وڈی آئی احمد فراز۔“ اماں کا جواب سن کر ہنہ کے ساتھ مجھے بھی یاد آیا کہ آج تو پاکستان کا بیچ ہے۔ میں چھت سے اترنے ہی والی تھی کہ سامنے نظر پڑی۔

”اوہ! تو یہ ہیں ڈاکٹر صاحب! بات تو فہمی کی بیج ہے ہینڈ سم تو بڑا ہے۔“ میں نے سادہ سے کپڑوں میں لمبوس خالہ کے گھر کی چھت پر بیٹھے اس شخص کو غور سے دیکھا۔ ”خیر سامنوں کی۔“

بیج دیکھتے ہوئے بھی میرا دھیان بار بار اس کی طرف جا رہا تھا۔ میں سب جھوڑ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ میری منگنی سولہ سال کی عمر میں محسن سے ہوئی تھی۔ محسن ہمارا رشتے دار تو نہیں تھا، مگر اباجی کو بہت پسند تھا۔ محسن پچھلے سال جاب کے سلسلے میں انگلینڈ چلا گیا تھا۔ محسن کارنگ ساولا تھا، مگر چرے کے نقوش پیارے تھے اس کے باوجود بے چارہ اکثر میرے مذاق کا نشانہ بنتا۔ ماضی کی درپچوں یں ٹھوکی نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

☆☆☆

ایگز امز سے جان چھوٹتے ہی گھر کے کام لگے

کے بعد کچھ دیر آرام کیا پھر ناشتا کر کے کالج آگئی۔ آج کل ایگز امز کی تیاری عروج پر تھی اور تو اور تمرین عرف مس نیک چڑھی بھی فیشن چھوڑ کے نوٹس ڈسکس کر رہی تھی۔

”اوئے فری اڈھر دفع ہو۔“ یہ فہمیدہ تھی جو ہمارے پڑوس میں رہتی تھی۔

”کیا ہے فہمی کبھی تو پڑھ بھی لیا کر دیکھ سارے ایگز امز کے لیے رٹا مار رہی ہیں تو بھی کچھ کر لے۔“

”چھوڑ سب کو، ایک دھماکے دار نیوز ہے میرے پاس۔“
”کیا؟“

”ہماری پچھلی گلی میں آج جانے کتنے دنوں کے بعد چاند نکلا۔“ اس نے لٹک کے گلے کی کوشش کی مگر میڈم نور جہاں کی جگہ عدنان سمیع جیسی آواز سن کر اپنا ارادہ بدل لیا۔

”اصل بات بتا دو اس نہ کر۔“
”آج وہ آگیا ہے۔“ اس نے شرمانے کی ناکام کوشش کی۔

”کون تیرا بھائی جو پچھلے سال انگلینڈ گیا تھا۔“ مجھے محسن کی یاد آئی۔

”فہمی منہ بھائی نے عید پر آتا ہے ویسے اس کا بڑا انتظار ہے؟“

”اور نہیں تو کیا آخر میرا منگیتر ہے چاہے کالی بھیئس سے کچھ زیادہ کالا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”چل چھوڑ مجھے تو اس میں خامیاں ہی نظر آتی ہیں“ میں نے یہ بتانے کے لیے بلایا ہے وہ جو ہمارے گھر سے پچھلے والے گھر میں خالہ رہتی ہیں جن کو کرائے پر گھر دینا تھا وہاں ایک ہینڈ سم اور خوب صورت نوجوان آیا ہے۔ سنا ہے محلے کے اکلوتے اسپتال کا اکلوتا ڈاکٹر ہے پر میں تو ایک جھٹک دیکھ کر ہی قریان ہو گئی۔ ”فہمی نے شرمانے کی ایک اور ناکام کوشش کی۔

”چھاتو پھر میں کیا کروں۔“ میں نے پوچھا۔

”کچھ نہیں بس کسی طرح میری اس سے بات کروا دے۔“ فہمی کا لہجہ ہمیشہ کی طرح کام پڑنے پر شمد

خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہونے والے مقبول ناول

کتاب کا نام	مصنفہ	قیمت
وہ جھپٹی سی دیوانی	آسیہ سلیم قریشی	600/-
آرزو گھر آئی	آسیہ سلیم قریشی	500/-
تھوڑی دور ساتھ چلو	آسیہ سلیم قریشی	400/-
ایمان، امید اور محبت	عمیرہ احمد	300/-
امر تیل	عمیرہ احمد	600/-
لا حاصل	عمیرہ احمد	300/-
ریگ زارتنا	ماہا ملک	600/-
اک دیا جلائے رکھنا	ماہا ملک	350/-
میرے خواب ریزہ ریزہ	ماہا ملک	350/-
جو چلے تو جاں سے گزر گئے	ماہا ملک	250/-
شہر دل کے دروازے	شازیہ چوہدری	500/-
تیرے نام کی شہرت	شازیہ چوہدری	250/-
کھلے دامناشا	شازیہ چوہدری	250/-
زندگی اک روشنی	رخسانہ نگار عدنان	500/-
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رخسانہ نگار عدنان	200/-
میرے چارہ گر	رخسانہ نگار عدنان	400/-
کوئی دھپک ہو	رخسانہ نگار عدنان	350/-
بھول بھلیاں تیری گلیاں	فائزہ افتخار	600/-
آئینوں کا شہر	فائزہ افتخار	500/-
پھلاں دے رنگ کالے	فائزہ افتخار	300/-
یہ گلیاں یہ چو بارے	فائزہ افتخار	400/-
ستاروں کا آئین	سیم سحر قریشی	450/-
تو شریک سفر رہا	سیم سحر قریشی	400/-

پڑ گئے۔ سارا دن کام کر کے تھکن سے برا حال ہو جانا۔ اس دن موسم نے اثر دکھایا اور زکام کے ساتھ بخار نے گھیر لیا۔ احتشام اور ابو گھر نہیں تھے ماں جی نے بڑوسیوں کے بچے کو بھیج کر ٹیکسی منگوائی اور مجھے لے کر اسپتال آگئیں۔ ڈاکٹر چیک کرنے آیا تو دیکھا ”ارے یہ تو بڑوس والا ہنڈسم ہے“ اس مغبور نے ایک بار بھی نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔ بس چپ چاپ چیک اپ کے بعد میڈیسن تجویز کرنے لگا۔

”بیٹا تم وہی ہو نا جو سسلی کے گھر رہتے ہو۔“ ماں نے پہچان دینے کی کوشش کی۔

”جی خالہ وہی ہوں اور یہ محترمہ موسم کی پروا کیے بغیر پتنگ اڑائیں گی تو بخار تو ہو گا۔“ لیوں پر ہلکی مسکراہٹ لیے اس نے شرارتی لہجے میں جب یہ بات کی تو بے اختیار اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ دل دھڑکنا بھول گیا۔ مسکراہٹ اس کے چہرے پر ج رہی تھی۔ چہرے پر نرمی کا تاثر اور عام سرکاری اسپتال کے ڈاکٹروں کے برعکس وہ ذرا بھی تھکا ہوا نہیں لگ رہا تھا۔ میڈیسن لے کر گھر واپس آتے ہوئے اس کا مسکراتا چہرہ جتنا بھلانے کی کوشش کرتی اتنا زیادہ یاد آتا۔ دوسرے دن اتوار تھا۔ آرام کر کے تھک گئی تو چھت پر کرسی ڈال کر بیٹھ گئی۔ اس دوران احتشام اور ہنہما اوپر آ گئے۔

”کیا بات ہے آپنی کن خیالوں میں گم ہو۔“ احتشام قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

”کچھ نہیں۔“

”لگتا ہے باجی کو جناب کا انتظار ہے جو پرانے دس میں بیٹھا ہے بقول شاعر وہ عشق جو انگینڈ بیٹھ گیا۔“ ہنہما عادت سے مجبور تھی۔

”کیا ہنہما ہر وقت ایک ہی بات خدا کے لیے کبھی محسن کا ذکر نہ بھی کیا کرو۔“ میرا لہجہ نہ جانے کیوں سخت ہو گیا۔ ہنہما اور احتشام حیران رہ گئے۔ میں اٹھ کر نیچے جانے لگی تو پیچھے سے احتشام کی آواز سنائی دی۔

”یہ آپنی کو کیا ہوا ہے۔“ بخار تو اتر گیا مگر علاج کرنے والا عجیب طرح کا احساس دے گیا۔ چہچہاہٹ

نے جیسے گھیر لیا ہو۔ اماں جی بھی اب مجھ سے کم بات کرتیں۔ احتشام اور ہنی بھی دور دور رہتے۔ مجھے سمجھا نہیں آ رہا تھا میرے ساتھ ہو کیا رہا ہے۔

اس دن سب بیچے تھے اور میں چھت پر چل آئی۔ غیر ارادی طور پر سامنے والی چھت پر دیکھا تو وہ دکھلا دیا۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ دور سے ہاتھ ہلا کر قریب چلا آیا۔

”کیسی طبیعت ہے آپ کی فریدہ۔“

”ٹھیک ہوں ڈاکٹر صاحب“ اسے میرا نام کہے معلوم ہوا۔ یہ سوچتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تو ہاں مسکرا کے بولا۔

”ہارون نام ہے میرا ڈاکٹر صرف اسپتال میں ہوا ہوں یہاں انسان ہوں۔“ یہ مسکراہٹ شاید اس کے چہرے کا حصہ تھی۔

”تو ڈاکٹر کیا انسان نہیں ہوتے۔“

”جی ہوتے ہیں مگر لوگ ڈاکٹر کے نام سے ایسے ڈرتے ہیں جیسے چڑیلا ہو۔“

”میں تو نہیں ڈرتی۔“

”اس لیے آئے دن اسپتال کا چکر کاٹنا پڑتا ہے۔“

”کیا!۔۔۔ میں صرف ایک بار گئی ہوں۔“

”ہاں مگر ہر وقت دکھائی دیتی ہو۔“ اس کے لہجے میں ایسی کوئی بات تھی جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ وہ یہ کہ کر چلا گیا اور میں اس کو دیکھتی رہی ”تو کیا وہ بھی؟“



اداسی کا یہ پیر طویل ہوتا چلا گیا۔ پھر اکثر جب چھت پر کوئی نہ ہوتا تو وہ چلا آتا نہ جانے کب وہ میرے لیے لازم ہو گیا۔ اس کی باتیں اس کی علوتیں اور سب سے بڑھ کر اس کی مسکراہٹ میں لگتا جیسے میری زندگی کے سب سے خوب صورت لمحے اس کے ساتھ ہیں۔ ام نے اظہار نہیں کیا تھا مگر اپنے اپنے دل کی حالت سے خوب واقف تھے۔ کبھی کبھی وہ میرا ہاتھ پکڑ لیتا تو اس کا لمس دل میں خوب صورت احساس جگاتا۔ دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی مگر خوشی کا یہ وقت بہت مختصر قلم

اس شام قسمی نے بتایا کہ محسن آ رہا ہے۔ میں نے
امدن کو اپنے بارے میں سب بتا رکھا تھا۔ جب اسے
بتایا کہ محسن واپس آ رہا ہے تو وہ بھی پریشان نظر آنے
لگا۔

”اب کیا ہو گا فری میرا تو آپ کے بغیر ایک پل بھی
گزارا نہیں ہوتا۔“

”میں کیا کہہ سکتی ہوں ہارون۔“ امں جی نے
محسن کے آتے ہی میری تاریخ طے کر دی تھی ہے اور شاید
ایک ماہ کے اندر شادی ہو جائے۔“

”فری میری بات نوکی“

”کیا۔“ اس کی بات سن کر میرے ہوش اڑ گئے۔
”مگر ہارون! میں کیسے کر سکتی ہوں یہ۔“

”کیوں نہیں کر سکتی تم اپنا اچھا راسوچ سکتی ہو اگر
میں کر سکتی تو میں سمجھوں گا میری اور تمہاری محبت
اس نام پاس تھی۔“ وہ یہ کہہ کر چلا گیا لیکن میرے
لپے سوچوں کا ایک نیا باب چھوڑ گیا۔

”کیا میں ہارون کے لیے امں بھالی ابا اور ہنی سب کو
بھوڑوں گی؟ کیا میں بے حس بن کر اپنے باپ کی
وزت سے کھیل سکتی ہوں؟ کیا میں گھر سے بھاگ سکتی
ہوں ایک ایسے شخص کے ساتھ جس کا اور میرا ساتھ
صرف ایک باہ اور کچھ دن کا ہے۔“ دل اور دماغ کی یہ
جنگ جاری تھی۔

میں اپنے کمرے میں بیٹھی بے دھیانی میں کھڑکی
پر ہاتھ رکھ کر اور احتشام کی لڑائی دیکھ رہی تھی۔ شاید
احتشام کی فیورٹ ٹیم جیت گئی تھی اس لیے ہنسیہ بیٹہ
کی طرح ہارمانے کی بجائے بحث پر اتری ہوئی تھی۔

”ہنسیہ! احتشام ادھر آ۔“ میں نے انہیں بلا لیا۔ نہ
مانے کیوں مجھے لگ رہا تھا میں ان کے پاس بہت
گھومے دن ہوں۔

”آئی دیکھیں ہنی آج پھر ہار گئی ہے اور پھر بھی
میری شرط پوری نہیں کر رہی۔“ احتشام نے آتے ہی
حیثیت جڑ دی۔

”آئی اس کی شرط تو سنیں ذرا بقول شاعر پوری کریں
امونہ جائیں۔“

”کیا شرط ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”کہتا ہے شعروں کے حوالے نہ دیا کر۔“ مجھے ہنسی
آئی۔ مجھے ہنسا دیکھ کر وہ دونوں بھی خوش ہو گئے۔ آج
جانے کتنے دنوں کے بعد ہم یوں مل کر بیٹھے تھے۔ ان
سے باتیں کرنے کے دوران میرے نگاہوں کے
سامنے ہنی، احتشام اور امں کے چہرے گھومتے تو کبھی
ڈاکٹر ہارون کی مسکراہٹ اور باتیں ذہن میں گھومنے
لگتیں۔ آخر میں ایک فیصلے پر پہنچ گئی۔

☆☆☆

گھر سے رخصتی کا وقت ہر لڑکی کی طرح میری
آنکھیں بھی بھگور رہا تھا۔ امں جی سے لپٹی ہوئی اور
احتشام سے گلے ملنے اور ابا جی سے دھیر ساری محبتیں
لے کر آج مجھے پرانے گھر جانا تھا۔ جہاں ایک شخص
میرے لیے دھیروں محبتیں لے کر بیٹھا تھا۔ زندگی کی وہ
رات مجھے بھول ہی نہیں سکتی جب ڈاکٹر ہارون کے
کمرے پر میں اپنے تھوڑے سے کپڑے لے کر اس
کمرے میں پہنچی تھی جہاں وہ رہتا تھا۔ اس نے مجھے
دوسری رات کو نکلنے کا کہا تھا مگر یہ سوچ کر آئی کہ آج
موقعہ اچھا ہے سب جلدی سو گئے ہیں ہم چلے جائیں
گے سب سے دور۔ مگر ہارون کے کمرے کا دروازہ کھول
کر سامنے جو منظر نظر آیا وہ میری آنکھیں کھولنے کے
لیے کافی تھا۔ ہارون کے ساتھ مکان بالکن چالہ سلمیٰ
کی اکلوتی بیٹی شرم ناک حالت میں موجود تھی۔ میں
نے یہ دیکھ کر اپنی بیچ مشکل سے روکی۔ ہارون کی محبت
ایک سیکنڈ میں ختم ہو گئی اور میں واپس اپنے کمرے
آئی۔ میں خدا کی ذات کا جتنی بار شکر کروں گم ہے جس
نے میری اور میرے والدین کی عزت رکھ لی۔ شاید
امں کی دعاؤں کا اثر تھا۔

محسن کے گھر وداع ہوتے ہوئے یہ سب باتیں
میرے ذہن میں تھیں۔ اس گھر کی دہلیز پر قدم رکھتے
ہی سوچ لیا تھا میں اس گھر کو جنت بناؤں گی کیونکہ اس
گھر کا مالک مجھے پوری عزت کے ساتھ بیاہ لایا تھا۔



مصباح علی سید

Waqar

از میر اور مریم آسٹریلیا کے مشہور کشور میں رہتے ہیں۔ ان کی اکلوتی بیٹی روائیہ شادی کے گیارہ سال بعد پیدا ہوئی۔ لمبے معمولی خوب صورت اور معصوم روائیہ کی سالگرہ جندب نے وہاں کے مشہور ہسپتال گرین فورسٹ میں ارنج کی۔ جندب از میر کے پرانے دوست رضا حیات کا بیٹا ہے۔ جو آسٹریلیا میں پڑھ رہا ہے، جندب اور روائیہ کی پر خلوص دوستی ہے۔ جندب اسے پسند بھی کرتا ہے، مگر اظہار نہیں کرتا۔

میرز کا فیصل آباد کے نواحی گاؤں میں ماٹے ہوئے زمیندار اور اہم سیاسی شخصیت ہیں۔ بیوی وفات پا چکی ہے۔ ان کے دو بیٹے خیام و کا، حبیل و کا ہیں۔ خیام کی دوستی بچے اعشال اور ازلان ہیں۔ ان کی بیوی آنکھ روائیتی زمیندارنی اور حویلی پر حکمران ہیں۔ میرز کا کی والدہ ماں جان فاج کی مریضہ ہیں۔

زینب حویلی میں جدی پشتی خدمت گزار ہے، لیکن جنبل کی پرکشش شخصیت کے سحر میں بری طرح جکڑی ہے اسی لیے اپنے ہر آنے والے رشتے کو ٹھکراتی رہتی ہے۔

شہروز کمال ایک اکھڑ داغ شخص ہے۔ دولت مند ہونے کے ساتھ رنگین مزاج بھی ہے۔ سپرینہ سے پسند کی شادی کرنے کے باوجود اس سے اکٹایا رہتا ہے۔ وجہ چار بیٹیوں کی اوپر تلے پیدائش ہے اور وہ بیٹے کا تمنا ہے۔



اماں جان کی طبیعت شدید خراب ہوتی ہے وہ اپنے بیٹے از میر سے ملنے کی خواہش رکھتی ہیں۔ جب کہ میرز کا کی ان سے ناراضی چل رہی ہے کیوں کہ از میر نے ان کی سالی کو طلاق دے کر آسٹریلیا میں کر سجن لڑکی مریم سے شادی کی تھی، لیکن اب ماں کے اصرار پر عیال ذکا از میر کو پاکستان بلانے کے لیے قائل کر لیتا ہے۔
 رضا حیات کی بیٹی ماہم کی منگنی ہے انہیں بتا چلتا ہے از میر پاکستان آ رہا ہے وہ شرکت کی دعوت دے دیتے ہیں۔
 از میر مریم دونوں پاکستان آتے ہیں۔ کچھ ناراضی کے اظہار کے بعد میرز کا نے انہیں معاف کر دیا روائیہ کو نہ لانے پر فحش کا اظہار بھی کیا۔

آٹھویں قسط

مکمل فنانس



ازمیر اور مریم ہفتے بعد ماہم کی منگنی اٹینڈ کرنے اسلام آباد جا رہے تھے راستے میں ہی ایر کرش میں ان کی وفات ہو جاتی ہے۔

شہروز کمال کے طعنے اور رنگینی عروج پر ہے جس سے سبیرینہ ہر وقت پریشان ہے۔ آئمہ کی بہن سلوی، سبیرینہ کی خالہ زاد ہونے کے ساتھ گہری سبیلی ہے اور اس کا دکھ اپنی نسلی سے کم کرتی رہتی ہے۔

ماں باپ کی وفات پر روائیہ پاکستان آتی ہے۔ سب اس سے پہلی بار ملتے ہیں۔ اس کی اداسی کے سبب سب ہمدرد ہیں۔ کچھ عرصے بعد زہدہ واپسی کا تقاضا کرتی ہے تو میرزا کا اسے روکنے کے لیے اس کی شادی کے درپے ہیں اور ازلان کا رشتہ پیش کرتے ہیں۔ یہ رشتہ ماں جان کو پسند نہیں وجہ پرانی رنجش ہے۔ ازمیر نے آئمہ کی پھپھو ہاجرہ کو طلاق دی تھی۔ ہاجرہ سبیرینہ کی والدہ تھیں جو اب مرحومہ ہیں۔ ماں جان حنبیل کا رشتہ روائیہ کے لیے قبول کر لیتی ہیں۔ سلوی حنبیل کی بچپن کی منگنی تھی۔ اپنی منگنی ٹوٹنے پر بہت دل برداشتہ ہے۔ جنبد بھی اس رشتے سے بری طرح ٹوٹا ہے۔ میرزین اور اسمتہ ان دونوں کے دوست ہیں اور دونوں کو سمجھاتے ہیں۔

روائیہ اور حنبیل کی مرضی کے بغیر ملے پائے والی شادی کچھ ہی عرصے اور واقعات کے بعد محبت میں بدل جاتی ہے۔ شوخ چچل ازلان اپنی چاچی سے بہت محبت کرتا ہے، ہم عمر ہونے کے سبب بہت فری ہے۔ جب کہ حنبیل بڑی عمر کا ہونے کے سبب سویر۔

جرمنی میں نیا کاروبار شروع کرنے کی غرض سے حنبیل شادی کے چار ماہ بعد ہی جرمنی چلا گیا ہے۔ روائیہ اس کی غیر موجودگی میں بے حد اداس ہے اور ازلان اس کی اداسی دور کرنے کے لیے اکثر اپنے کسی کام میں لگھائے رکھتا ہے۔ ازلان رات کو صحن میں بانسری بجا رہا تھا۔ روائیہ سننے کے لیے باہر آ جاتی ہے۔ حنبیل کا فون آنے کے سبب اسے وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آنا پڑتا ہے۔ فون سننے ہوئے اسے کمرے سے باہر کسی کے ہونے کا گمان ہے۔ پھر دروازہ پر دستک شروع ہو جاتی ہے۔ وہ فون بند کر کے دروازہ کھولتی ہے۔

تفریحی ٹور فوراً کینسل کر کے پاکستان کی ایمر جنسی سیٹ ریزرو کروائی تھی۔

☆☆☆

جہاز اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھا۔ اک فرحت بخش احساس نے اسے اپنے گھرے میں لے لیا لگتی باتیں تھیں جو ان دس ماہ میں اکٹھی ہو چکی تھیں۔ جیسے جیسے فاصلہ سمٹ رہا تھا اس کی بے قراری بڑھ رہی تھی۔ پچھلے چند ہفتوں میں جانے کیوں اسے ایسے لگنے لگا تھا شاید وہ بھی پاکستان نہیں جاسکے۔ مگر کیوں کہ پاکستانی فیٹری تک جرمنی کے قانون کے آگے ناکام ہو چکی تھی۔ وہاں کی حکومت نے اس مقدمے کو انڈینیشنل دہشت گردی کے قوانین میں درج کیا تھا۔ ظہیر لقی تو قاتل ثابت ہو چکا تھا البتہ حنبیل ذکا کو سہولت کار کے زمرے میں رکھ کر انویسٹی گیشن کی جا رہی تھی۔ وہ ہر طرح سے بے قصور ثابت ہو چکا تھا، مگر ظہیر لقی سے رابطہ ان ہی دنوں ہوتا اسے بری طرح پھنسا گیا۔ ظہیر لقی کا ملنا اتنا

برسوں ریاضتوں کا نتیجہ اس کے سامنے موجود تھا۔ جانے وہ کون سی دعا تھی یا عمل جس کے صلے میں مراد بر آئی۔ اس کی آنکھیں بے یقینی سے پھٹی تھیں پانی کسی دریا کی لہر کی طرح کروٹیں بدل رہا تھا۔ اسے قطعاً "یقین نہیں تھا وہ اس عہدے پر فائز ہو سکتی ہے، بار بار اس کے چہرے کو چھو کر دیکھتی اس کے ہاتھ پاؤں چومتے سینے میں بہت سی نیسیں بیک وقت اٹھتیں۔ بیٹے ماہ و سال کا ایک ایک لمحہ، شہروز کمال کے کہے لفظ روح پر چاچک کی طرح بڑتے وہ سسکیاں لیتی اس بچے پر جھک گئی۔ گول گونھنے سے روٹی کے گالے کو اپنے سینے میں دبوچ لیا۔ اک سمندر تھا جو خاموشی سے اٹھتا آ رہا تھا۔ اس نے ٹوٹے دل سے بار بار لڑکا چاہا تھا اور اس کی یہ چاہت پوری ہوئی شادی کے چودہ سال بعد وہ ایک وارث کی ماں کہلانے کے قابل ہو چکی تھی۔ شہروز کمال جو سوائے حبہ کے کسی بچی کو دیکھنے نہیں آیا تھا۔ جیسے ہی بیٹے کی پیدائش کی اطلاع گئی۔ حیران سا حیران تھا۔ اپنا

آسان نہ تھا جس طرح سے وہ روپوش ہو چکا تھا۔ اس رات صبل کے ساتھ ڈنر کرنے کے بعد صبل نے اسے اس کے بتائے پتے پر ڈراپ کیا تھا۔ وہ بہت دیر سڑکوں کی خاک چھانٹا رہا پھر اس کے دماغ نے ایک ہی کام کیا کہ وہ اپنے گھر جائے اور ضروری سامان سمیت کمرات کے اندھیرے میں نکلے۔ وہ اپنے گھر میں داخل ہوا تب اس کے میل فون پر ایک اجنبی نمبر سے فون آیا۔ اس نے فوراً اٹھالیا تھا۔ دوسری جانب مارٹین کی بیوی بات کر رہی تھی۔ اس نے چھٹے ہی پوچھا تھا۔

”مارٹین گھر نہیں پہنچا، کہاں ہے۔ فون بھی ریسیو نہیں کر رہا۔“ ایک بار تو ظہیر لقی کا دماغ گھوم گیا پھر سبھل کر بولا تھا۔

”مجھے نہیں معلوم.... وہ میرے پاس نہیں آیا۔“ اس کی بیوی کو حیرت سی حیرت تھی۔ وہ صاف اسے ظہیر لقی کی طبیعت کا بتا کر گھر سے نکلا تھا۔ اس کے بار بار اصرار پر وہ بکڑ کر بولا

”میں نے کہا ناں۔ میں نہیں جانتا.... اور میں نے اسے کوئی فون نہیں کیا، بلانے کے لیے.... بلکہ میں تو اپنے پارٹر صبل کے ساتھ تھا آج سارا دن اس کے ساتھ رہا ابھی ابھی ہم ہاٹ ران سے ڈنر کر کے آرہے ہیں۔ تم کسی سے بھی پتا کر سکتی ہو۔“ اس نے اپنا فون فوراً آف کر دیا تھا اور ضروری سامان سمیٹا جس میں اس کی چیک بک شامل تھی اور گھر سے نکلا اس کا ارادہ آج رات کسی ہوٹل میں گزارنے کا تھا اور پھر جرمنی چھوڑنے کا۔ ہوٹل جانے سے پہلے اس نے تین اے بی ایم کیبن سے رقم لکوائی ایک مخصوص رقم نکل جانے کے بعد بھی اس کے اکاؤنٹ میں خاصی رقم تھی جو اس نے صبح ہونے تک ملوی کر دی تھی۔ تقریباً دس بجے کا وقت تھا۔ اس کا ارادہ سب سے پہلے بینک سے اپنی رقم لکھوانا اور پھر یہ شہر چھوڑنے کا تھا۔ وہ ہوٹل ریپشن پر چیک آؤٹ کے لیے آ رہا تھا نگاہ سامنے چلتی بڑی سی ایل ای ڈی ہنگی وہاں فورس کے مارٹین کے قتل کی خبر نشر کی جارہی

تھی۔ مارٹین کی بیوی نے ظہیر لقی کا فون کاٹ دینے کے بعد ٹیلی کام سسٹم آفس سے رابطہ کیا تھا۔ مارٹین کے نمبر پر کال کرنے سے اس کی لوکیشن ڈیکلکھنے والی واضح کر دی۔ تلاش پر ظہیر لقی کے گھر سے ڈیڈ باڈی برآمد ہوئی۔ اسی کے بتانے پر فورسز نے صبل ڈکا کو ’ہاٹ ران‘ ہوٹل کے سی سی ٹی وی کے ذریعے ٹریس کیا۔ ظہیر لقی کی تلاش ہوئی رہی۔ نہیں کہیں سی سی ٹی وی میں اس کے گزرنے کا معمولی گمان ضرور ہوا تھا، مگر واضح نہیں تھا اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ اسے اپنے جرم کا پتا تھا وہ خود کو قدرے چھپا کر چل رہا تھا۔ ریپشن پر خبر سننے ہی وہ واپس کمرے میں گیا۔ لاٹک کوٹ، گلوڈر سینے کے ساتھ ہیٹ اور مفکر ایسے سیٹ کیا تھا۔ جیسے قتل کا مریض ہو اور جلدی سے چیک آؤٹ کر کے وہاں سے نکلنے کی کوشش کی تھی۔ بینک کا ارادہ وہ ملتوی کر چکا تھا۔ اب اسے کسی محفوظ مقام پر پہنچنا تھا۔ اس کا ایک پرانا جاننے والا ہاگ برگ کے کوچی علاقے میں رہتا تھا۔ ظہیر ٹرین کے ذریعے اس علاقے تک پہنچا۔ ایک چور کو، چور ہی بہتر پناہ دے سکتا ہے، اسی طرح ظہیر لقی کا دوست اس کے کام آیا تھا۔ اس کے خاندان والوں کو اس کی خیریت کی اطلاع دینا اور مارٹین کے قتل کے سلسلے میں ہونے والی پیش رفت لمحہ لحوہ اس تک پہنچانا رہا۔ اتنا لمبا عرصہ اگر صبل نے مصیبت کی طرح کاٹا تھا تو مطمئن ظہیر لقی بھی نہیں تھا۔ ایک رات ظہیر لقی کے دوست کی طبیعت اچانک خراب ہوئی۔ اسے فوری طبی امداد کے لیے قریبی اسپتال میں لے جانا پڑا۔ اس کی بیوی بچی نگاہ سے ظہیر کو دیکھتے کہہ رہی تھی ”اس وقت رقم نہیں ہے، اگر زیادہ ضرورت پڑی تو....“

”آپ فکر نہیں کریں سرکاری طور پر سب ہو جائے گا اور ویسے بھی میرے پاس ہیں۔“ وہ دونوں میاں بیوی کو اسپتال چھوڑ کر خود گھر جانے سے پہلے کچھ رقم اس کی بیوی کو تنہا گیا۔ اگر ضرورت پڑی تو یہ استعمال کر لیتا۔ اسی شام کو وہ اس رقم سے چند ڈالر لے کر کینیڈین پرگنی تھی۔ کھانے پینے کے سامان کی ادائیگی کرتے وقت سیلز مین نے اچانک ہی ڈالر پر

آپ کے مشورے سے ہمارا بزنس بہت اچھا سیٹ ہو گیا ہے..... آپ تو اب خیر مستقل جیل میں سیٹ رہیں گے۔“ وہ نخوت سے اسے ہورتا ہر چلا گیا۔

☆☆☆

ایک ناقابل یقین خوش مناسر پرانز، ہلکے سے کپڑے میں لپٹے صحت مند بچے کو وہ دیکھ جا رہا تھا اس کی آنکھوں اور رخساروں پر عرصہ دراز بعد سیرینہ نے خوشی دیکھی تھی۔ اس کی ہر آنے والی سانس میں نرمی اور محبت چھپتی تھی۔ کب ہوا، کس وقت ہوا، کیسے اسپتال تک آئیں یا کس کے ساتھ یہ سب باتیں اب اس کے لیے ثانوی حیثیت رکھتی تھیں۔ کانوں میں اپنے ابا کے سننے لفظ گردش کر رہے تھے۔

”بیٹیاں تو عذاب ہوتی ہیں، پہلے پالو، پوسو، تربیت کرو، اگر دماغ میں خناس بھر جائے باپ کی پکڑی روند کر جلتی بنتی ہیں، چاہے بعد میں خود ساری زندگی رگیدی جائیں۔ اس سے بہتر ہے بیٹا ہو جائے، اس پر کسی نے انگلی اٹھانی ہے۔“ شہروز کمال کی پھوپھی نے بھی اپنی مرضی سے شادی کی تھی اور خاموشی سے گھر چھوڑ دیا۔ برسوں بعد آئی تو شکل سے بے شکل ہو چکی تھی جو کچھ اس کے ساتھ میاں نے کیا وہ گھر والوں کو بتانے سے بھی گریز کرتی تھی۔ باپ نے اسے قبول تو کر لیا تھا، مگر حیثیت ملازماؤں سے بھی کم تھی۔ اس کے بچے کی پرورش گھر کے بے کار سامان کی طرح ہوئی تھی۔ وقت گزرتا رہا۔ بیٹا جوان ہو گیا۔ جو کچھ شہروز کی پھوپھی نے کیا تھا۔ وہ ہی سب بیٹی (شہروز کمال کی بہن) نے کیا۔ فرق صرف اتنا تھا وہ پھوپھی کے بیٹے کے ساتھ گھر چھوڑتے ہوئے پھوپھی کو ساتھ لے گئی تھی اور تاحیات واپس نہیں آئی۔ باپ کے آنکھوں کی نفرت شہروز کمال کے خون میں رچ بس گئی تھی۔ بس نہیں چلتا تھا بیٹی پیدا ہوتے ہی ماردیں اور یہی وجہ تھی وہ چھوٹی سی حبہ کو کڑے تیوروں سے دیکھتا تھا۔ اپنی بہن بیٹی کا بدلہ دوسرے کی بہن بیٹی کو نیچا دکھا کر اپنی روندی انا کو تسکین پہنچانے کا سبب بنا رکھا تھا۔ اب اللہ نے بیٹا

درج سیریل چیک کی تو چونک گیا۔ دو دن پہلے ہی ایک شخص کسی کیس کی نفیٹش کے سلسلے میں بات کر رہا تھا کہ ملزم نے وقوعہ کی رات تین اے ٹی ایم سے رقم نکلوائی تھی جن کی سیریل اس نے اپنے والٹ میں سے اسے دکھاتے ہوئے کہا تھا۔

”اگر یہ بندہ پکڑا جائے، گورنمنٹ کی جانب سے معقول الاؤنس مل سکتا ہے۔“ اس شخص کے بتانے میں حسرت ٹپک رہی تھی جیسے آج ہی ایسے وہ ملزم ملے تو پکڑ کر الاؤنس حاصل کرے۔ کینٹین کے سیزر مین کو بھی لالچ آپاس نے وہ سیریل لکھ کر رکھ لی تھی کہ شاید اس سیریل بھر کے ذریعے وہ ملزم پکڑا جائے۔ وہ کل سے ہر آنے والے ڈالر کو غور سے دیکھ کر پکڑتا اور اب اس عورت سے ڈالر پکڑتے ہوئے اس کی آنکھیں پوری طرح پھیلیں۔ اس نے غیر محسوس طریقے سے عورت کو کاؤنٹر پر روکے رکھا اور جو سیریل کے ساتھ کاٹمیٹ دیے تھے اس پر رابطہ کیا۔ ”یہ لیں.....“ پھر اس نے اس کا سامان ایک شاہر میں ڈال کر اس عورت کو تھماتے ہمدردی میں پوچھا تھا ”آپ بہت پریشان ہیں، خیریت.....“ میرے میاں کو ہارٹ ایک آیا ہے..... میں واقعی پریشان ہوں۔“ اس نے متاسف چہ چہ کی کہاں ہیں وہ..... میرے لائق کوئی خدمت..... تو پلیز بتائیے۔“ وہ اس سے معلومات لینا چاہتا تھا اور وہ پریشانی میں اتنی گھری تھی۔ آہستہ آہستہ سب بتانے لگی کس طرح سے میاں کو اسپتال تک پہنچایا۔ فورس نے اس شخص کی نشاندہی پر ریڈی اور ظہیر بی کو برآمد کر لیا تھا اور جنرل کی جان خلاصی ہوئی۔ وہ پاکستان آنے سے پہلے ظہیر بی سے ایک ہارٹیل میں مل کر آیا تھا۔

”تم نے کیا سمجھا تھا، یہ پاکستان ہے، جو آسانی سے چھپ سکو گے..... یہ انگریز ہمیں زمین کے چھنٹ پیچے سے بھی نکال لیتے.....“ وہ کہہ کر جانے لگا پھر کچھ یاد آنے پر مڑا ”ایک بات یاد رکھنا ظہیر صاحب! خون کبھی چھپتا نہیں ہے، اس کا رنگ بہت گہرا ہوتا ہے، آسانی سے نہیں دھلتا..... خیر

عطا کر دیا۔ اس کی خوشی دیدنی تھی۔ جب، عشا اچک اچک کر بھائی کو دیکھ رہی تھیں۔ شہروز اسے بے بی کاٹ میں لیٹاتے ہوئے سبرینہ سے کہہ رہا تھا۔
 ”میں ڈاکٹرز سے بات کرتا ہوں، ابھی ڈسچارج کر دیں.... اسپتال میں بہت جرمنز (جراثیم) ہوتے ہیں، عدن جھوٹا سا ہے، کوئی مسئلہ نا بن جائے۔“ سبرینہ نے نگاہ اٹھا کر شہروز کو دیکھا، یعنی اس کا نام بھی شہروز نے عدن رکھ دیا۔ چلو، جو اس کی مرضی..... مگر وہ مزید ایک دو دن اسپتال رہنا چاہتی تھی اس کا سیزرین ہوا تھا، ڈرپس انجکشن چل رہے تھے، لیکن شہروز نہیں مانا ”میں نرس اربخ کر دوں گا.... پھر کیا مسئلہ ہے۔“

☆☆☆

پیزا ہٹ کے باہر حسب معمول بہت رش تھا۔ تمام ٹیکلو بھرتے، خالی ہوتے، پھر اور لوگ ان پر آ کر آرڈر دینے لگتے۔ پچھلے کئی ویک اینڈ کی طرح یہ ویک اینڈ بھی بہت اچھا گیا تھا۔ آمدن کے حساب سے وہ ڈش میں رکھ کر پیزا، کولڈڈرنک اور سائپرز لے کر جاتی، گاؤں کو دینے کے بعد پلٹ آتی۔ کاؤنٹر پر کھڑا اسمتھ اسے مسلسل گھور رہا تھا آج اس کی نگاہوں میں سچ والا غصہ تھا۔ وہ ہٹ کی ٹائمنگ ختم ہونے کے انتظار میں تھا۔ آج اس نے میرڈین کی اچھی خاصی کلاس لینا تھی۔ اس کی نگاہوں کی تندگی سے اسے بھی اندازہ ہو چکا تھا اور وہ بہت سے جملے ترتیب دے چکی تھی جو اسے یکے بعد دیگرے اپنے دفاع میں بولنے ہیں۔ شولڈر کٹ گولڈن بالوں کو چوڑی پٹی بینڈ میں جکڑے، گرے شارٹ اسکرٹ، چوڑی ہیل کا سینڈل پہننے وہ پیشہ وارانہ انداز میں پوری لگن سے کام کرتی رہی تھی، لیکن جیسے جیسے آف کی ٹائمنگ قریب آ رہی تھی اسمتھ نے محسوس کیا اس کے چہرے پر نفابت اتر آئی اور چال ڈھیلی، باہر کلوز کا سان لگا کر اس نے ٹرے بہت زور سے کاؤنٹر پر رکھی تھکاؤت بھری سانس کھینچتے ہوئے اپنر کی ڈوری کھینچی۔ پٹی بینڈ اتارتے بے زاریت سے بولی تھی۔

بیارے بچوں کے لئے

چھوٹی چھوٹی کہانیاں



بچوں کے مشہور مصنف

محمود خاور

کی لکھی ہوئی بہترین کہانیوں پر مشتمل ایک ایسی خوبصورت کتاب جسے آپ اپنے بچوں کو تحفہ دینا چاہیں گے۔

ہر کتاب کے ساتھ 1 مارک مفت

قیمت - 300/- روپے
 ڈاک خرچ - 50/- روپے

بند بید ڈاک منگوانے کے لئے
 مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار کراچی۔ فون: 32216361

”اسمٹھ میں بہت تھک گئی، میں جاری ہوں، کل ملیں گے۔“ وہ اس کی ساری ادائیں دیکھ رہا تھا۔ لمحے میں اس کی کلائی پکڑ کر زور سے اپنی جانب کھینچی ”کدھر جاری ہو، ذرا یہاں بیٹھ کر حساب دو۔۔۔۔۔ کیا حساب.....؟“ اس نے اتنے تعجب سے دیکھا تھا جیسے اس نے کوئی انوکھی بات کردی ہو حالانکہ آج اسے ہٹ آتے ہی اندازہ ہو چکا تھا۔ اسمٹھ خاصا برہم ہے۔ اسمٹھ کے ڈاکٹر والد نے اس کے تعلیمی اخراجات مزید اٹھانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اگر وہ اپنے اخراجات اٹھا سکتا ہے تو جتنا چاہے پڑھے اور اگر نہیں تو مرضی ہے اسے زندہ رہنے کے لیے اپنے ہاتھ پاؤں جلانا ہوں گے۔ وہ چند دن پریشان ہوا تھا۔ اچھی بھلی عیش کی زندگی میں مزدوری خاصا مشکل لگ رہا تھا۔ جناب سے مشورہ کیا اس نے اپنی فیکٹری میں آنے کا کیا تھا۔ دوسرے دن ہی اس کی فیکٹری منیجر سے لڑائی ہوئی۔ تب میر ڈین نے مشورہ دیا تھا۔

”تم کسی کے انڈر کام نہیں کر سکتے، اپنا بزنس کرو۔۔۔۔۔“ اس نے چند ماہ کا شیف کورس کیا اور میر ڈین سے اتنی سی مدد مانگی۔ ”تم صرف سرو کر دینا میٹرل لانا، بنانا، کاؤنٹر سنبھالنا میرا کام۔۔۔۔۔“ اس مدد پر وہ آدھے منافع کی شریک بنی گئی۔ اسمٹھ کو قبول تھا۔ آدھے تک تو ٹھیک تھا مگر پورے کا پورا۔ اسمٹھ اس کی جان لے لیتا۔ اپنا بجٹ خراب ہوتا دیکھ کر رات وہ بہت دیر تک لیٹ ٹاپ پر اپنا حساب لگاتا الجھا رہا۔ صبح بلی پھلکی باز پرس کی، مگر وہ جلد ہی وہاں سے کھسک کر باہر ٹیبلز اور پیئرز سیٹ کرنے لگ گئی۔ وہ بچن میں جت گیا، مگر گامے بگا ہے آکر اسکرین پر پھر سے نگاہ ڈالتا اسے پورا یقین تھا میر ڈین نے کڑبڑ کر رکھی ہے، کیوں کہ اس کی شکل اور حرکیں چوروں سے مل رہی تھیں۔ اس کی استغیابہ پھٹی آنکھوں میں اس نے اپنی آنکھیں گاڑھ کر کہا ”وہی حساب جو تم چوری سے خود لگا رہی ہو۔“ کیا.....؟ وہ بہت زور سے بولی ”تم مجھ پر الزام لگا رہے ہو، میں نے کوئی

چوری نہیں کی.... بلکہ معمولی سی سیلری پر تمہاری مدد کر رہی ہوں اور تم مجھ پر شک کر رہے ہو۔“ اپنی کلائی چھڑوا کر امپرن اس کے منہ پر مارا۔ ”پکڑو اسے اور کوئی مدد نہیں کرنا تمہاری، تم ایسے دوست ہی نہیں ہو، جس کی خاطر میں اپنا وقت برباد کروں.....“ اس نے آواز میں خود ساختہ کمی پیدا کی۔

”مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت تھی، کیا ہوا اگر میں نے چند گاہکوں کی پے منٹ رکھ لی.... تم تو حساب لینے پر آگئے.... ایسے ہوتے ہیں دوست، یہی تمہاری محبت.....“ وہ آنکھیں پھاڑے اسے تنکے جا رہا تھا۔

”صرف چند گاہکوں کی....! وہ حیرانگی سے بولا“ تمیں گاہکوں کی پے منٹ میڈم..... تمیں اور ٹوٹل پچاس تھے آج.....“ میر ڈین نے خفگی سے گردن جھنجھکی، ہنوز ناراضی کا اظہار کرتی رہی۔ ”اور کون سی محبت..... مانی ڈیر! پیزا ہٹ میں صرف برنس ہے، محبت اس سے باہر ہے..... سمجھیں۔ تم نے پچھلے ہفتے بھی یہ حرکت کی تھی.... تب معاف کر دیتا تھا، اب نہیں کروں گا..... نکالو پیسے.....“ اس کے قطعیت سے کہنے پر اس کی آنکھیں پھیل گئیں یعنی کہ اب تم مجھ سے پیسے نکلواؤ گے.... میں نے تین دن سے کھانا نہیں کھایا، جوتے ٹوٹ گئے تمہارے گاہکوں کے آگے پیچھے پھرنے سے، کپڑے پھٹ رہے ہیں اگر اس سب کے لیے کچھ رکھ لیا تو تم.....“

”اوہ جھوٹی....“ اس نے امپرن اسی کے منہ پر مارا۔ ”سہلا چیز! ہمیشہ تم کھاتی ہو اور آج بھی کھایا تھا۔“ شیشے کے دروازے پر ’کلوڑ کا سائن دیکھ کر دروازہ کھول کر سائن پلٹ کر جناب اندر داخل ہو گیا تھا ان دونوں کو بچوں کی طرح دھواں دھار لٹا دیکھ کر کچھ دیر تو لطف اندوز ہوتا رہا پھر سینے پر لپٹے ہاتھ کھول کر پینٹ کی جیب میں ڈالتا ان کی جانب بڑھا۔ اسمٹھ اسے دیکھ چکا تھا اس کے دیکھنے کو ہی محسوس کرتے میر ڈین نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اسے نجات کا ذریعہ ملا اس نے فوراً بات بدلی ”تم.... تم

کیوں اندر آئے.... باہر کلوزنگ کا سائن نہیں دیکھا۔“

”دیکھا تھا.... اسی لیے اسے پلٹ کر اندر آیا ہوں... اس کے مکرانے پر وہ چڑکائی۔“

”اچھا.... تو تم ہمارے بزنس میں دخل اندازی کر رہے ہو۔“ فوراً اسے اسمتھ کی جانب مڑی۔ ”دیکھو اسمتھ یہ شخص خواہ مخواہ فری ہو رہا ہے.... یہ صرف تمہارا اور میرا بزنس ہے.... یہ کون....“ وہ بات کاٹ کر بولا تھا۔

”یہ کچھ ہوتا ہے یا نہیں.... بات مت بدلو پہلے پیسے نکالو....“

”یارتو لوگ کب تک بچوں کی طرح لڑتے رہو گے، چھوٹی چھوٹی باتوں پر بے مروئی کی انتہا کر دیتے ہو۔“

”چھوٹی چھوٹی باتیں....“ اسمتھ رو دینے کی حد تک زچ ہوتا قدرے آگے ہوا۔ ”ہر ویک اینڈ پر یہ میڈیم تیس، بیٹیس گاہکوں کی پے منٹ کھاجانی ہے.... تم اسے چھوٹی بات سمجھ رہے ہو اور پھر اگلے دن فضول شاپنگ کر کے مجھے مزید چڑانی ہے.... میں نے اپنی فیس دینے کے لیے یہ شاپ بنائی ہے، اس کی فضول خواہشوں کے لیے نہیں۔“

”ایک منٹ، ایک منٹ....“ میرڈین نے اسے درمیان میں روکا تھا۔ ”اگر میں پیسے رکھ کر جھوٹ بول رہی ہوں، تو تم بھی جھوٹے ہو، تم نے کہا تھا، تمہاری ہر چیز میری ہے، تم میری ہر خواہش پوری کرو گے....“ دماغ خراب تھا میرا....“ اسمتھ

کی سیاہ رنگت غصے سے مزید سیاہ پڑ گئی البتہ میرڈین کی کھلی رنگت برنڈامت کے ذرا آثار نہیں تھے۔ کیوں کہ اسے یقین تھا ہمیشہ کی طرح اسمتھ اب بھی کچھ نہیں کہے گا، دوپٹیں اٹھا کر زمین میں مارے گا، پھر کہے گا نکل جاؤ، آئندہ شکل مت دکھانا اور پھر کل کال کر کے خود ہی پوچھے گا چوڑی کہاں مر گئی ہو.... ابھی تک شاپ پر نہیں آئیں۔ ایسا ہی ہوا اس نے گلاس سلیب سے اٹھا کر زور سے بچا ”سب

بکواس کرتا ہوں میں.... زبان ہے ناں پلٹی رہتی ہے.... دل سے نہیں کہتا جو یقین کر کے تھماتا شروع کر دیتی ہو.... نکلو یہاں سے....“ جناب نے اس کے شانے پر ہتھی لگاتے محبت سے کہا تھا۔

”میرا خیال ہے تم دونوں کو بیٹھ کر یہ فیصلہ کر لیتا چاہیے، کون سی بات دل سے کر رہے، کون سی دماغ سے.... تاکہ مستقبل کے فیصلے تکلیف دہ نہ ہوں....“ آخری جملہ اس کی آواز میں بہت ٹھکن بھر گیا تھا۔ جناب جب سے پاکستان سے آیا تھا کچھ بدلا بدلا لگا تھا۔ نا تو پہلے کی طرح بہت جلا کنار ہتا تھا نا ہی خوش باش عجیب سا سنجیدہ، سو برہو گیا تھا، روائیہ کو خوش دیکھ کر وہ فیصلہ نہیں کر پار ہتا تھا اسے خوشی ہے یا کسک البتہ اتنا ضرور تھا وہ اللہ سے لمبی دعاؤں میں اپنے لیے سکون اور اس کی خوشی مانگتا تھا۔ جب دل بے حد بے چین ہوتا کبھی اسے فون کر لیتا یا اسمتھ اور میرڈین کے پاس چلا آتا۔ اس کی یہ حالت میرڈین اور اسمتھ سے چھپی نہیں تھی۔ وہ اس کے جذبات سے بہت اچھی طرح واقف تھے اور اسی لیے اسمتھ نے آج پھر میرڈین کو یہ کہہ کر معاف کیا۔

”مہیں آج صرف جناب سے اپنی دوستی کی وجہ سے معاف کر رہا ہوں.... اگر آئندہ یہ حرکت کی، تو میں وارن کر رہا ہوں، پیزا میں چکن کی جگہ تمہارا گوشت ڈالوں گا۔“ وہ ڈھیٹوں کے سابقہ ریکارڈ توڑتے زور زور سے ہنسی ”اچھا.... پھر سوز کی جگہ اپنا خون بھی چھڑک دیتا۔“

☆☆☆

عدن زندگی میں آجانے سے جیسے سب کچھ بدل سا گیا تھا۔ شہر ذکال اسے خود سے لمحہ بھر کو بھی الگ نہیں کرتا تھا۔ اس کے ہونے کو چھو کر محسوس کرتا۔ کتنے دن تو وہ آفس نہیں گیا۔ اسے چھینک بھینکی آنے پر بھی اٹھ کر بیٹھ جاتا۔ سبرینہ نے جتنی منت مرادوں سے بیٹا لیا تھا اس کا خیال تھا شاید وہ اس کو پونے لگے گی، اس کے ہونے سے پہلے جتنی وہ دینی طور پر خطی سی ہوئی تھی، لیکن اب اس کی پیدائش کے

کوٹھی اور نئی خریدی گئی جس فیکٹری عدن کے نام کر دی تھی۔ وہ اسی طرح کا تھا خوشی میں فراخ دلی سے کام لینے والا اور کچھ عرصہ پاکستان رہنے کے بعد اپنی تمام پمپلی کو لے کر دہی شفٹ ہو گیا۔ اسے پاکستان میں آئے روز دہشت گردی کی فضا سے خوف آنے لگا تھا اسے ڈر تھا کہیں عدن کو کچھ ہونہ جائے۔ ہرینہ کسی صورت پاکستان چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ دبا دبا احتجاج کیا، مگر وہ شہر وز تھا۔ اپنی منوانے والا۔ اس نے دہی میں ہرینہ کے نام سے فلیٹ خریدا تھا۔ یہ ایک تھکھا عدن دینے کے بدلے میں۔

☆☆☆

بردگی دو پٹاسر پر نکائے وہ ہنڈیپ سے پانی بھرے جارہی تھی بالئی کب کی بھر چکی تھی، لیکن اس کا دھیان پانی کی بھرنے پر نہیں پانی کے بہنے پر تھا۔ جا بجا پھٹا دو پٹا مسلسل ہلنے کی وجہ سے سر سے پھسل کر کندھوں سے نیچے سرک رہا تھا۔ کنارے کیلے فرش پر لگنے سے بھاری ہوئے دو بٹے کو مزید نیچے کی جانب کھینچ رہے تھے۔ اس کی سر د آنکھوں میں ملال کا پانی سوکھ چکا تھا۔ کچھ فاصلے پر بیٹھی گلزاری گا ہے بگا ہے زینب پر نگاہ ڈال دیتی۔ پھر بالکل ایسے انجان بن جاتی جیسے دیکھا ہی نہیں۔ مگر اس ایک نگاہ سے اس کا دل کیسے کٹ کر رہ جاتا تھا، وہ صرف اس کی مٹا ہی جاتی تھی۔ اچھی بھلی اس کی تاریخ رکھی جا چکی تھی۔ اپنی حیثیت کے مطابق گلزاری نے تیاری بھی شروع کر دی۔ میر ذکا نے اسلم کو اچھے خاصے پیسے دیتے کہا تھا۔

”زینب کی شادی سے پتا چلنا چاہیے، ہماری ملازمہ کی شادی ہوئی ہے۔“ اسلم بہت خوش تھا اور شہر سے اس کے لیے فریچر اور کپڑوں کا بندوبست کیا تھا۔ آئمہ بیگم کو جب خالہ گلزاری نے آ کر بتایا کہ اس چاند کی چودہ تاریخ طے کر دی۔ آئمہ کو اچھا خاصا غصہ آیا تھا۔

”خالہ یہ کیا کیا..... ہماری اتنی پرانی ملازمہ ہے اور تاریخ تو نے اکیلے ہی طے کر دی..... پوچھا تو ہوتا۔“

”بس بی بی موقع ہی نہیں ملا..... رچی آگئی تھی

بعد سے خوش تو تھی اور نظر آنے کی بھرپور کوشش بھی کرتی تھی، مگر شہر وز کمال کا حد سے زیادہ عدن کے لیے احتیاط پسندی چڑھی پیدا کرنے لگا تھا اور جس دن وہ آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ چھوٹی سی چار سالہ دعا بھائی کو گود میں لیے بیٹھ گئی۔ جانے اسے کیا سوچھی اس سے باتیں کرتے کرتے اسے احتیاط سے بیڈ پر لٹایا اور بھاگتی اپنے کمرے میں گئی، ایک چاکلیٹ کا رپر اتار کر وجے ہی بھاگتی ہوئی آئی ایک چھوٹا سا ٹکڑا عدن کے منہ میں ڈال دیا۔ ہنسا ہوا عدن بیک لخت گھرے سانس لینے لگا تھا۔ ٹائی ٹاٹ لگاتے شہر وز کے ہاتھ ہم گئے۔ پلٹ کر اسے اٹھایا۔ اس کے منہ سے چاکلیٹ نکالی۔ جب تک ہرینہ بھی کمرے میں آگئی تھی۔ شہر وز نے بے طرح سے دعا کو ڈھپٹے ہوئے پختے کے انداز میں بیڈ سے اٹھا کر نیچے کھڑا کیا تھا اور دھاڑ کر ہرینہ سے بولا۔

”اگر اللہ نے دے ہی دیا، تمہاری لا پرواہی اسے مار دے گی.....“ دعا کے رونے کی وجہ سے اسے غصہ تو بہت آ رہا تھا، مگر برداشت کرتے ہوئے بولی تھی۔

”آپ کا لٹچ بکس تیار کرنے گئی تھی.... دعا بچی ہے، اسے کیا پتا کہ وہ چھوٹا ہے، چاکلیٹ نہیں کھا سکتا۔“

”لیکن اب پتا چل گیا ہے..... تو دھیان رکھنا اور تمہیں کوئی بھی کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور ملازمہ کا بندوبست کروں گا، مگر میرے بیٹے کا خیال رکھنا..... ورنہ..... اس نے نخوت سے دونوں کو دیکھتے چابیاں اٹھائیں اور باہر نکل گیا۔ وہ بے رحمان ہاتھوں سے عدن کو اٹھائے دعا کو روٹے ہوئے دیکھتی رہی۔ پھر اپنے پاس بٹھا کر پیار سے سمجھایا تھا کہ آئندہ ایسے نہ کرے۔

شہر وز کمال نے ایک ماہ کے عدن کا عقیدہ بہت زبردست طریقے سے کیا تھا۔ اپنے تمام جاننے والوں اور رشتہ داروں کو اس پر مدعو کیا۔ ہرینہ کے میکے سے سب آئے تھے سوائے چیمہ حویلی والوں کے۔ اپنی خوشی میں شہر وز نے یہ محسوس نہیں کیا تھا بلکہ اپنی قیمتی

..... بڑا چلا چلا کر بولتی تھی، آج تیری زبان کہاں گئی
 ہے۔“ اس نے کالی پلٹیں اٹھا کر اسے دیکھا قمر الدین کی
 آنکھوں میں کروفر بھرا تھا۔ اس کا لب و لہجہ بدلتے پر
 وہ حیران بھی اور وہ مسلسل حذا اٹھا رہا تھا۔

”مجھے چہرے پر لگے داغ سے تجھے بڑی
 گھن آتی تھی.....“ مکھیوں کا چھتا کہہ رہی تھی نا اس
 دن تو.....“ زینب کی آنکھوں میں خوف تیرے لگا۔
 ”ایمان سے میرا دل کر رہا ہے، تجھے ایک داغ لگا
 کر، داغوں داغ کر دوں.....“ لیکن مجھے حرام کاری
 کرتے اللہ سے بڑا ڈر لگتا ہے..... چل آج کی
 رات معاف کیا، طلاق پھر سہی.....“ طلاق کا سنتے
 ہی زینب کی پوری آنکھیں پھیلیں، سانس رک
 گئیں۔ سرخ سنہری چوڑیوں سے بھری کلاں ایک
 لخت انھیں مہندی سے بھرے ہاتھ اس کے سامنے جڑ
 گئے۔

”خدا کے واسطے قمر الدین..... یہ تو کیا کہہ رہا
 ہے.....“ نہ کہہ نہیں رہا..... طلاق کا سوچ رہا ہوں
“ زینب کا سر نیلی میں ہل رہا تھا۔ آنکھوں کا پانی
 کا جل کو بہا کر خساروں کا میک اپ دھونے لگا۔
 ”تو ایسا نہیں کر سکتا.....“ تو مجھے طلاق نہیں
 دے سکتا.....“ اس کی بے بسی پر وہ خباثت بھرا تہقہ
 لگا کر پنڈلی سے شلوار کا پانچہ اوپر کیے اپنی ٹانگ
 کھجائے لگا

”واہ، واہ، واہ..... ہوگئی ناسیدھی
 بڑا میرے داغ کا مذاق اڑاتی تھی، میرا داغ تو
 صرف نظر آتا ہے، جو تجھے لگاؤں گا نا وہ بولے گا بھی
 ، تجھے سنائی بھی دے گا“ اور پھر اس نے یہی کیا تھا۔
 علی الصباح جس وقت زینب نہا دھو کر جی کے ساتھ
 دوبارہ سے کمرے میں آئی۔ اس کے سر ہانے ایک
 طلاق نامہ رکھا تھا۔ رچی کی تو جھٹکا ڈنگلی سو نکلی تھی
 زینب کا کھڑے کھڑے سر چکرا گیا تھا۔ کیلے بالوں
 سے چپکا دوپٹا ایک لخت پھسل کر نیچے گرا۔ زردہ
 ، تورمہ کی خوشبو سے مہکتے کچے درود پوار مھسان سے
 بھر گئے۔ لڑائی جھگڑا، مار پٹائی سب ہو رہا تھا۔ گلزاری

تاریخ لے کر ہی اٹھی.....“ ٹھیک ہے، لیکن تاریخ
 بدلی بھی جاسکتی ہے..... تمہیں بتاتا ہے جھیل کی
 بیوی کا حال..... اسپتال جانا ہوگا، گھر میں کام بڑھ
 جائے گا..... میں تمہارے اور زینب کے علاوہ کسی پر
 اعتبار کر ہی نہیں سکتی..... دس پندرہ دن تک ٹھہر جاؤ
 اس کام سے فارغ ہو جائیں پھر تم رہتی رہنا
 تاریخ.....“ جہاں خالہ گلزاری کا منہ بن گیا تھا وہاں
 زینب صفائی کرتے کرتے مسکرائے لگی۔
 ”دس پندرہ دن بعد تو چاند اترنے لگے گا۔“ رچی

نے تو پورا چاند مانگا تھا۔

”اپنا پورا چاند دیکھا ہے، اس نے“ گلزاری
 کے منہ نے پر آنرہ بڑبڑائی، ”اور اترتے چاند سے
 نصیب تھوڑا اتر جاتے ہیں..... خیر اگلے مہینے کا پورا
 چاند رکھ لینا..... دو چار دنوں میں مجھے اسپتال جانا
 ہوگا..... تم زینب کی چھٹی مانگ رہی ہو.....“

آنرہ حکم کہہ کر سامنے سے ہٹ گئیں چارو
 ناچار اسے زینب کی تاریخ ایک مہینہ بعد کی رہتی
 پڑی۔ ڈھول بینڈ باجا اپنی حیثیت کے مطابق رچی
 نے ہر طرح سے بارات سجا لی تھی۔ جب تک نکاح
 نامے پر اپنا نام نہیں لکھا تھا زینب کا چہرہ لے تاثر سرد سا
 تھا، کوئی امنگ، کوئی جذبہ آنکھوں میں نہیں جھلکا
 ، لیکن قمر الدین کے نام کا سرخ گوٹے کناری سے سجا
 لباس بدن کو ڈھانپتے ہی اک تحفظ میں لپیٹ گیا۔
 لب اسنگ زدہ سرخ ہونٹ آہستہ آہستہ پھیلنے لگے۔
 دل کی تیز ہوتی دھڑکن آہستہ آہستہ خون کو گرماتی اس
 کے سانوے پن کو مزید دھانے لگی۔ وہ ماں باپ
 کے آنسوؤں میں رخصت ہو کر قمر الدین کے پہلو
 میں بیٹھی تھی۔ پتلا لمبا تڑکا قمر الدین موتیا رنگ کی
 قمیص، سفید شلوار پہنے زینب کے سامنے بیٹھا مسلسل
 اسے تند نگاہ سے گھور رہا تھا۔ سرخ پاؤ ڈر سے ڈھکے
 ، زینب کے پوٹے جھکے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں
 کی تیزی اس کے وجود میں غمی بھر رہی تھی۔ وہ چبا چبا
 کر کر خلی سے بولنے لگا تھا۔
 ”بڑا غرور تھا تجھے اپنے کالے نین نقش پر

جب گلزاری نے لگاٹ سے کہا تھا۔

”حویلی چکر لگالیتی.... اذلان صاحب کی شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں.... خاص طور پر بڑی بی بی نے تجھے بلایا ہے۔“ اذلان کا نام لیتے ہی اسے بدن میں سنسناہٹ سی محسوس ہوئی۔ غصے سے بولی تھی ”تو کہہ دے بی بی سے نہ بندھ اندھی ہو گئی ہے.... اس سے کام نہیں ہوتا.....“ گلزاری نے نخوت سے اسے ”دفع دور“ کہتے پنچہ دکھایا.... وہ گردن جھڑک کر معمول کے کاموں میں لگ گئی۔

☆☆☆

وقت کے ساتھ شہر و زکمال کے مزاج میں اچھی خاصی تبدیلی آ گئی تھی۔ عدن نے جب چلنا ہی شروع کیا تھا تب شہر و زکمال نے اپنی فیملی مستقل دینی میں شفٹ کر لی تھی۔ کاروبار آہستہ آہستہ منتقل کر رہا تھا۔ کاروباری سلسلے میں پندرہ بیس دن بعد پاکستان اک چکر لگاتا باقی چیزیں میٹجمنٹ دیکھ لیتی۔ مزاج بدلنے سے انداز میں بھی فرق آیا۔ اب سبرینہ اور بچیوں پر بے جا سختی نہیں برتا تھا۔ سبرینہ کے ساتھ جس چیز کے طعنے جڑے تھے وہ عدن نے سب دھو دیے تھے۔ تا صرف دیکھنے میں اس پر پیارا آتا حرکتیں بھی اس کی بہت معصوم سی تھیں یا شاید شہر و زکمال نے پہلی بار کسی بچے کی حرکتیں اتنی قریب سے دیکھی تھیں۔ بیٹیوں نے کب چلنا شروع کیا، کب دانت نکلے، بولنے، کھانے پینے لگیں کسی چیز سے نہ دلچسپی تھی نہ یاد تھا۔ البتہ عدن کی ایک ایک حرکت نظر میں ہوتی تھی۔ اس کے والہانہ پن پر بھی اگر سبرینہ کہہ دیتی۔

”بچیوں اور عدن میں تمہارے سلوک کا واضح فرق، بچیوں کے دلوں میں عدن کے لیے فرق ڈال دے گا.....“

”مجھے تو محسوس ہوتا ہے، تمہارے دل میں بھی فرق آ جاتا ہے.....“ کارپٹ پر بیٹھے ڈرائنگ بناتے عدن کو گود میں بٹھاتے ہوئے شہر و زکمال نے سبرینہ پر طنز کیا۔ وہ پھیکا سا مسکرائی ”ممتا کو پہنچ مت کیا کرو.....“ شہر و زکمال بہت زور کا ہتھبل لگایا تھا۔ عدن کے ریکی چھوٹے چھوٹے کٹے

اور اسلم نے مل کر رچی اور اس کے میاں کی بے عزتی کرتے ہاتھ پائی تک اتر آئے۔ قمر الدین جانے کون سے کھیتوں میں جا چھپا تھا اگر سامنے ہوتا تو یقیناً ”سب اس کی بونی بونی کر دیتے.... سہاگ کی خوشبو کو چھو کر اجڑی بیٹی کو جس دل سے گھولائے وہ ان کے روتے چہروں سے دکھائی دے رہا تھا۔ بہت سے مناظر آنکھوں میں آتے نہ بندھ کو اپنی بے بسی پر رونا آیا۔ اگر اس وقت حبیل ذکا یہاں ہوتا وہ قمر الدین کا بھر کس نکال دیتا جیسے اس کی ملازمہ کی اس نے بے حرمتی کی تھی، مگر وہ ہوتا تب ناں.... مہینہ پہلے ہی وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ جا چکا تھا۔

پانی بالٹی کے کناروں سے اٹھا جا رہا تھا اور وہ کسی روباٹ کی طرح ہنڈ پمپ چلائے جا رہی تھی۔ چار سال سے زیادہ عرصہ بیت چکا تھا اسے کم سم ہوئے آئمہ بیگم نے کئی بار اسے حویلی بلایا کہ کام پر آئے، صرف ایک بار گئی تھی اور جاتے ہی اس کا دل اٹنے لگا۔

”یہاں سے مجھے ارنائون کی خون کی بو آتی ہے.... میرے سے کام نہیں ہوتا۔“ پھر وہ مڑ کر نہیں گئی تھی۔ اس کی گوگو کیفیت پر کوئی کہتا اس پر آ سیب ہے یا کسی نے جادو کروادیا ہے۔ البتہ گلزاری کا دماغ یہی کہتا تھا۔ اس کی شادی ہو جائے گی تو ٹھیک ہو جائے گی۔ نذیر (میر ذکا کا مزارعہ) کے بیٹے اصغر کا نہ بند کے لیے رشتہ آیا ہوا تھا، مگر وہ خاموش تھی۔ اسے اب شادی نہیں کرنا تھی۔ گلزاری جلتی کستری اکثر رقیہ سے کہتی ”دیکھ لے پورے چاند بھی داغ لگ گیا، ناں۔“ پاس سے گزرتے گزرتے خاموش نہ بند نے آہستگی سے کہا تھا۔

”داغ تو لگتا ہی پورے چاند کو ہے، کبھی پہلی کے چاند کو مگر بن سنا تو نے.....“ اس طرح کی بات کر کے پھر کتنے دن چپ رہتی تھی۔ بہت دیر پانی بہتا دیکھ کر گلزاری ڈپٹ کر بولی۔

”اے بس کر جا، بھر گئی بالٹی.... اٹھا کر غسل خانے میں رکھ آ.... تیرا ابا آتا ہوگا... نہالے گا۔“ بالٹی غسل خانے میں رکھ کر وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ رہی تھی

بالوں پر بوسا لیتے سبرینہ کو مطلع کرتے ہوئے کہا تھا۔
 ”میں کل اپنے بیٹے کا ایڈمیشن کروانے جا رہا ہوں، دینی کے سب سے بڑے اسکول۔“ ابھی جملہ مکمل بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ چھلانگ مار کر باپ کی گود سے اترا بانٹیں پھیلاتا ہوا سبرینہ سے چلا پٹا تھا۔

”میں ماما کے ساتھ جاؤں گا، جیسے آپاں جاتی ہیں۔“ وہ استہزائیہ مسکراتے ہوئے شہروز کو دیکھ رہی تھی۔ عدین کی ننھے بازوؤں میں محبت اور تحفظ کی اتنی گرمائش تھی لیجے میں وہ خود کو دنیا کی سب سے محفوظ عورت سمجھنے لگی تھی۔ شہروز جس قدر عدین پر محبت لٹاتا تھا اس سے کئی گنا زیادہ عدین سبرینہ اور بہنوں سے کرتا تھا۔ شہروز کے ساتھ لیٹے لیٹے ایک لخت چھلانگ مار کر اتر جاتا۔

”مجھے آپوں کے ساتھ سونا ہے جبہ آپ کی گود میں بیٹھنا ہے، عشا آپی سے کھانا کھانا ہے، سوہا آپی کے ساتھ کھیلتا ہے۔“ دعا میں تو اس کی جان بھی اپنا ہر آنے والا نیا کھلونا سب سے پہلے اسے دکھاتا تھا۔ یہ بھی ایک بہت بڑی وجہ تھی کہ شہروز کے دل میں بیٹیاں بھی کچھ قریب ہونے لگی تھیں۔ عدین کی ضد پر اس کا ایڈمیشن دعا کے ساتھ کروایا تھا۔ شہروز بہت خوش تھا۔ بدل تو وہ بہت گیا تھا، مگر اسے ایک خاص رٹین زندگی کی بری طرح لت پڑی ہوئی تھی اور رٹین عادتیں آسانی سے بدل نہیں جاتیں، نفس کو باندھ کر دھلیتے ہوئے واپس لانا پڑتا ہے، بہت بدل جانے کے باوجود شہروز کمال کو نفس پر اتنا کمال نہیں ہوا تھا کہ اسے جملہ کر دھکیل سکتا۔ ہاں اگر عدین جوان ہوتا اور اسے روکتا تو یقیناً اس کی محبت میں وہ اپنے نفس کو چل بھی دیتا۔ جتنی وہ عدین سے محبت کرتا تھا اور عدین اس کی محبت کو محسوس بھی کرتا تھا، لیکن چار سالہ عدین اس کی باتوں کو کیا سمجھتا۔ شہروز کمال ڈرینک ٹیبل کے آگے تقریباً ”میں منٹ سے کھڑا تیار ہو رہا تھا۔ بیڈ پر بیٹھا عدین ہاتھوں کو جوڑ کر پیالہ بنائے چہرہ اس پیالے میں سجا کر پوری محویت سے شہروز کو دیکھ رہا تھا

”کیا دیکھ رہے ہو، میری جان.....“ اس نے آئینے میں ہی اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ مسکرا دیا۔ آپ اتنا تیار ہو کر کہاں جا رہے ہیں..... مجھے بھی جانا ہے۔“

”نہو نہ.....“ خود پر اس پر بے چھڑک کر بند کر کے رکھا پیار سے عدین کے ریشمی بال بکھرتے ہوئے کہا تھا ”ابھی تم بہت چھوٹے ہو.....“ تب ہی سبرینہ کمرے میں آئی تھی۔ شہروز کی تیاری پر چونکی نہیں۔ اسے بہت اچھی طرح پتا تھا شام کے اس پہر اس کی خاص تیاری کہاں کی ہو سکتی ہے، سبرینہ کے لیے اتنا ہی بہت تھا۔ وہ بھی ہفتوں گھر سے باہر رہا کرتا تھا اور جو چند دن گھر میں گزارنا ذلیل کر کے رکھ دیتا تھا۔ وہ سب ختم ہو گیا تھا، اگر مہینے دو کے بعد اس کی فطرت ابدی ہے تو ٹھیک ہے، ہر روز کی ذلت سے یہ بھی کبھی کی تکلیف بہتر تھی۔

”جب میں بڑا ہوں گا، میں بھی آپ کو نہیں لے کر جاؤں گا.....“ اس کے نروٹھے پن پر سبرینہ جتنا تے ہوئے بولی تھی۔

”سن لیا یہ کیا کہہ رہا ہے.....“ شہروز کمال نے ’قبضہ لگاتے چایاں اور مو بائل جب میں رکھے۔‘ بیٹا کس کا ہے آخر.....“ تقاخر سے اسے دیکھتا ’او کے بار..... نہ لے کر جانا.....“ وہ باہر نکل گیا تھا سبرینہ کی نگاہیں اس کی پشت کے ساتھ ساتھ گئی تھیں۔

”بیٹا ہونے سے تو شاید فرق پڑے یا نہ پڑے..... تم ماحول کیا دے رہے ہو اسے.....“ وہ اٹھ کر عدین کے پاس بیٹھ گئی اسے رساں سے سمجھا رہی تھی۔ ”اچھے مرد تیار ہو کر، اکیلے تھوڑا باہر جاتے ہیں..... فیملی کے ساتھ جاتے ہیں۔“

”ڈیڈی اچھے نہیں ہیں.....؟“ اس کے سوال پر وہ گڑ بڑاتی تھی۔

”نہیں میری جان، وہ تو ایک آفس میننگ کے لیے گئے ہیں..... تفریحی کے لیے تھوڑا گئے..... چلو اٹھو..... ہوم ورک کمپلیٹ کرو..... میں دعا وغیرہ کو دیکھتی ہوں۔“ وہ کہہ کر باہر چلی گئی۔ وہ بیڈ پر لیٹا

باپ کے تیار ہو کر جانے کو مس کرتا رہا۔

☆☆☆

مشہور ترین شاہراہ پر ایک بڑے سے گول ستون نما عمارت کھڑی تھی۔ جس کی بیرونی سطح پر لگے آسانی شیشوں سے رملین لیزر لائٹس چھوٹ رہی تھیں۔ وہ دہی کا مشہور میوزک کلب ”بیت الیش“ تھا۔ ڈانس فلور سے کچھ فاصلے پر شہروز کمال اپنی ریزرو سیٹ پر بیٹھا دھکی کے پیگ کے پیگ چڑھا رہا تھا۔ اس کی نظر ہزارویں بار انٹرنس پر گئی۔ وہ ان گلاس ٹیبل پر رکھتے ہوئے ایک بیچ ٹیبل کی سطح پر مارا تھا۔ مہینے میں ایک آدھ بار وہ اس میوزیکل ٹائٹ کلب میں اپنی ماڈل گرل فرینڈ سے ملنے آتا تھا کچھ وقت اس کے ساتھ گزار کر اپنے اندر کے شیطان کو تسکین پہنچاتا۔ آج مقررہ وقت سے خاصی دیر ہو گئی تھی۔ وہ جھٹکی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا اتنی ہی بار اس کے ٹیبل پر کال ملتا رہا، مگر ہر بار لائن آف مل رہی تھی جس سے شہروز کا غصہ بتدریج اوپر جا رہا تھا۔ چمکتے کلب کی بھڑکتی لڑکیاں ڈانس فلور پر اپنے جوڑے بنائے محو رقص تھیں۔ درمیان میں لگے مختلف بار اسٹینڈز پر لڑکے لڑکیاں کھڑے حسب خواہش لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وہاں صرف شہروز کمال ہی ایسا جیسے اس وقت ہر چیز زہری کی مانند محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے لیے ایک اور پیگ تیار کیا۔ دو گھنٹہ ہی لیے تھے جب وہ کسی اور لڑکے کی بانہوں میں بائیں ڈالے بہت بے باکی سے ہنستے ہوئے گلاس ڈور سے اندر داخل ہوئی۔ شہروز کمال نے منہ میں دھت تھا اسے دیکھتے ہی گلاس ٹیبل پر پھٹتے جنونی انداز میں اٹھا تھا۔

”ہاؤ ڈو ریو“ (تمہاری جرات کیسے ہوئی) شہروز نے آگے بڑھ کر اس لڑکی کے منہ پر بہت زور سے طمانچہ مارا۔ یک دم تو وہ ٹپٹا گئی تھی۔ جب کہ اس کے سامنے نے ناک بھنوں میں چڑھاتے ہوئے شہروز کو کالر سے پکڑ کر گالیاں دینی شروع کر دیں۔ اس کے شور سے تمام ہال میں یک دم خاموشی چھا گئی تھی۔ صرف

ان دونوں کی آوازیں سنائی دی جا رہی تھیں۔ اکثر لڑکیاں سہم کر لڑکوں کے پیچھے چھپنے لگیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے گریبان پکڑے مقلقات بکنے لگے۔ شہروز چھٹ چھٹ اس ماڈل پر جا رہا تھا۔ اس کا اس سے معاہدہ تھا وہ کسی کے ساتھ بنا پوچھے شراکت نہیں کر سکتی تھی۔ شہروز کمال تو ایسے معاملے میں انتہا تک پہنچ جاتا تھا۔ اس نے گالیوں کے ساتھ اس لڑکے پر گھونٹوں کی بارش شروع کر دی اسے گریبان سے پکڑ کر اتنی زور سے بار اسٹینڈز پر پھینکا کہ بہت سے مشروب اور گلاس چھنکے سے گرے۔ اس لڑکے نے لڑکھڑا کر سنہلے ہوئے تنہا لگا ہی شہروز پر جمائیں۔ اس کی جیکٹ میں پھسل گئی۔ اس نے جڑے جماتے ہوئے آن واحد میں پھسل نکالا اور شہروز پر فائر کھول دیا۔ ٹھا، ٹھا، ٹھا.... کلب میں شہروز کمال کا خون اور سننا تھا۔ سڑک پر ایک ایسیوینس تیز بھاگتی اسپتال کی جانب بڑھ رہی تھی۔ شہروز کمال کا خون آلود جسم اسپتال لے جا جا رہا تھا۔ پولیس نے اس کے گھر اطلاع دے دی تھی۔ سہینہ اور شہروز کمال کی بڑی بیٹی جبہ جو تقریباً سولہ سالہ ایک نوجوان بچی تھی اپنے باپ کو زخمی حالت میں دیکھ کر چیخنے چلائی گئی۔

”ڈاکٹر پلیز میرے ڈیڈی کو بچالیں.... پلیز.... آپ میرا سارا خون لگا دیں مگر میرے ڈیڈی کو بچالیں.... پلیز.... میرے ڈیڈی....“ بھاگتے اسٹریچر کے ساتھ ساتھ روتی بکلتی جبہ کو سنبھالنا بے حد مشکل ہو رہا تھا۔ شہروز کی سانس اکھڑ رہی تھیں۔ اسے پہلی بار زندگی میں اپنی بیٹی پر بے طرح ترس اور پیار آیا تھا۔ وہ روتی ہوئی جبہ کو اپنے سینے میں دبوچ کر شفقت بھرا بوسہ دینا چاہتا تھا، مگر اس میں اتنی ہمت نہیں تھی اسے تسلی کا ایک لفظ کہہ سکے بہت ہمت جمع کر کے اسے ہاتھ سے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ اس کا ہاتھ بمشکل اوپر ہوا۔ جبہ کی آوازیں اس کے کانوں میں مدھم سے مدھم تر ہونے لگیں۔ شہروز کی انگلیاں ہلکی سی تھیں کہ گردن لڑھک کر پتلیاں اوپر کو اٹھ گئیں۔ جبہ بے طرح تڑپتے ہوئے چلا رہی

تھی۔

”ڈیڈی، ڈیڈی.....“ اس کا مردہ وجود بیٹی کے مین سے سج گیا تھا۔ سبرینہ کسی پتھر کی طرح گڑی اس کا واپس آتا اسٹریچر دیکھ رہی تھی۔

”کیسا شخص تھا یہ، جو مجھے سمجھ ہی نہ سکا، اس کی خاطر کیا؟ کیا نہیں کیا، کیا کیا نہیں چھوڑا اور وہ میری خاطر نشہ نہ چھوڑ سکا..... دنیا چھوڑ دی، اولاد چھوڑ دی..... وہ کاروبار جس کے لیے خاندان سے لڑتا پھرتا تھا وہ بیٹا جس کی خاطر دنیا ہلا رہی تھی اسے چھوڑ گیا، صرف ایک نشہ نہ چھوڑ سکا..... پتھر آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ جب کے بالوں میں گرتے رہے۔

☆☆☆

سر کو بہت اچھے سے ڈھانے وہ درمیان میں بیٹھی تھی دوسری جانب آئینہ ٹیکم۔ سلوئی چند دن پہلے ہی عمرہ کر کے آئی تھی تو آئینہ نے اس کی دعوت کر دی شادی کے بعد سلوئی کا یہ چوتھا عمرہ تھا۔ عمرہ کرنے کے بعد بہت دنوں تک اس پر وجد کی کیفیت طاری رہتی پھر آہستہ آہستہ زندگی کے معمول میں مگن ہو کر سب کچھ روٹین پر آ جاتا۔ جب بھی وہ اپنے میاں کے ساتھ عمرہ کر کے آتی سب کی زبانیں اس کی قسمت پر رشک کرتیں ”اللہ ہر سال اپنے گھر بلاتا ہے، اس سے بڑی بات کیا ہوگی..... جیسی نیک ہے، اللہ اپنا مہمان پسندیدہ بندوں کو ہی بناتا ہے.....“ نوکر تو اکثر یہی باتیں کرتے پائے جاتے اب بھی وہ پوری رغبت سے مکہ مدینہ کے دس بار سناٹے فیسے پھر یہ دہرا رہی تھی۔ تب آئینہ نے آہستگی سے تنبیہ کی بھی ”ہر کسی کو مت سنانے لگ جایا کرو..... نظر لگ جانی ہے..... آگے ہی جانے کس کی نظر لگی ہوئی ہے، ابھی تک اولاد نہیں ہوئی.....“ اوہو! آپ پریشان مت ہوں، ہو جائے گی.....“ اس نے مسکرا کر مالا..... ”اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے..... اب اگر بچے ہوتے تو ایسے ہر سال اللہ کے ہاں حاضری ہوتی بھلا.....“ بچے پالنا بھی حج سے کم نہیں ہے.....“ آئینہ نے

بات بدلی..... ”اور مجھے تو فکر ہو رہی تھی ادھر اذلان کی تاریخ طے ہے، اور تم ہنپائیں آؤ گی یا ویزا کی تاریخ بڑھوا لو گی۔“

”ایسے ہی نہ آتی اکلوتا بھانجا ہے میرا۔“ وہ بہت رسائیت سے بولی تھی جب کمرے سے نکل کر آتے اذلان پر نگاہ گئی اس کا باباں ہاتھ دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے اس کی نگاہ میں تاسف ابھرا۔

”میں نے اذلان کے لیے بہت دعا کی تھی آئی..... اللہ اس کے دائیں ہاتھ میں اتنی طاقت ڈال دے کہ کام کرتے اسے کوئی دقت پیش نہ آئے۔“ اذلان کے چہرے پر طرے لیے اپنا باباں ہاتھ کھول کر پھر زور سے بھی بند کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”مجھے کوئی دقت پیش نہیں آتی..... آپ سب خواہ مخواہ پریشان ہوتے ہیں.....“ آئینہ کے چہرے پر بھی تکلیف ابھر کر معدوم ہوئی۔ آج سے دو سال پہلے وہ چاولوں کی ٹل میں تھا۔ چھٹائی ہوئے چاولوں کو پالش کے لیے مشین سے گزارا جا رہا تھا۔ وہ مشین کے بالکل قریب کھڑا تھا۔ جب اچانک بجلی چلی گئی۔ بجلی کا دیدر تک جانا اس قدم معمول تھا بعض اوقات تو فوراً ”مشین بند کرنا بھی بھول جاتے تھے۔ اس وقت بھی مشین آن تھی اذلان نے بڑے سے گرا بنڈر نما مشین کے پٹے (بیلٹ) کو غور سے دیکھا وہ تقریباً ”ٹوٹنے کو تھا۔ تب وہ اس کا جوڑ چیک کرتے ہوئے ملازم کو سمجھا رہا تھا اگر یہ چلتے ہوئے ٹوٹ گیا تو مشین میں ڈالے گئے کتنے چاولوں کا نقصان ہو سکتا ہے، ان کی پالش اور خوب صورت کنائی لمحے میں ہی بے ترتیب ہو کر خسارے کا سبب بنے گی۔ اس نے سیاہ بیلٹ کو دو تین جگہ سے جانچا تب اچانک ہی لائٹ آنے سے مشین چل پڑی۔ اذلان کے بائیں ہاتھ کی پہلی دو انگلیاں اور انگوٹھے کی اوپر کی پورے طرح بیلٹ سے ٹکرا کر جسم سے ایسے الگ ہوئی جیسے اضافی ناخن کٹ کر گرا ہو، حج نکار اور خون اس میں سب کچھ ہوا۔ بہترین علاج بھی کروایا گیا مگر جو حصہ الگ ہو گیا سو ہو گیا۔ یہ بھی اللہ کا کرم تھا بازو اور ہاتھ بچا

حصہ کام کرتا تھا۔ ”میں نے چاچو کو قسم دی ہے، اگر وہ نہیں آئے تو میں بھی اذلان کی بارات میں نہیں جاؤں گی۔“ سلوی نے غصہ اٹھایا تھا۔

”اچھا.... تمہاری قسمیں ان پر بہت اثر کرتی ہیں.... چار سال پہلے دے دیتیں....“ ایک بار سب کی چوٹی نگاہ اس پر اٹھی پھر جلد ہی آئمہ اپنے معمول کے انداز میں لوٹیں.... اذلان کی شادی کے سلسلے میں بات چیت کرنے لگیں۔

☆☆☆

ضدی رابی اس کا کب اٹھا کر چسکی لیتی بہت معصومی ہنسی ہنسی اس کی سیاہ آنکھیں بھی مسکرا دیں۔ ہمیشہ اسے فور کرنے والے جندب انکل اسے بہت پسند تھے وہ کب سے چسکیاں لیتی اندر لاؤنج کی جانب بڑھ رہی تھی تاکہ جا کر اسکرین بیل سیٹ کرے اور انکل کو ہر ادے۔ روانیہ نے کچھ دیر اس کی پشت کو گھورا پھر نگاہ کی تنبیہ جندب کی جانب مڑی، اس نے کندھے ایسے اچکائے جیسے کہا ہو ”تو کیا ہوا“ روانیہ کی کوفت زدہ سی آنکھیں پل بھر کو بند ہو کر کھلیں بید کی کرسی پر پہلو بدل کر بیٹھے اس کا دھیان گیٹ کی جانب گیا تھا۔ شیر گل گیٹ کھولے کسی سے کچھ کہہ رہا تھا۔ اتنی دور سے ہی جندب نے شیر گل کو ہانک لگا کر کہا تھا

”آئے دو یا.....!“ جندب کے انداز پر وہ اچھی خاصی چونک گئی تھی۔ اور جب نگاہ آنے والے پر پڑی تن بدن میں آگ لگ گئی۔ انہما کے سر داورخ موسم میں اسے اپنے بدن سے شرارے نکلتے خود محسوس ہو رہے تھے۔

”اس کی اتنی جرات میرے گھر تک آ جائے دنیا میں بہت ڈھیٹ دیکھے تھے لیکن اس جتنا....“ اس دن آؤٹ لیٹ پر جس طرح سے یہ اس کی ہنک کر کے آئی تھی اس کا خیال تھا وہ عزت پرست شخص بھی مڑ کر اس کی جانب رخ نہیں کرے گا۔ اسی غصے میں کتنے دن وہ جندب سے نہیں بولی۔ بات بات پر اس سے گبڑی۔ اور اب اتنی ہمت کہ

دو سال گزر گئے تھے اب بھی برسات کے دنوں میں اس جگہ کی جلد نرم پڑ کر ایگزیمیا کی بیماری میں جکڑی لگتی تھی۔ اس حادثے نے اس پر بہت اثر ڈالا تھا۔ یہ تکلیف اسے اپنی سزا لگتی تھی۔ اس ہاتھ سے اس نے روانیہ کو بہت تنگ کیا تھا۔ سب سے پہلے یہی ہاتھ اس کے منہ پر رکھ کر اسے دیوار کے ساتھ لگایا تھا۔ اس کی کلائی کو پکڑ کر کئی بار دھمکایا.... اسے پورا یقین تھا یہ تکلیف اللہ کی طرف سے سزا ہے جو دنیا میں ہی دے دی گئی۔ شریعت میں چور کا پہلی چوری پر بایاں ہاتھ کاٹنے کا حکم ہے ناں اس نے وہ حبل کی پہلی چوری کی تھی۔ اس کی عزت کی چوری یقیناً ”وہ سزا اللہ کی جانب سے دی گئی۔ جو اسے اب قبول بھی تھی۔ شاید اس لیے اپنی اس محرومی کا احساس کم از کم گھروالوں کے سامنے اب بالکل نہیں کرتا تھا۔ اب بھی مسکرا کر سامنے بیٹھ گیا۔

”آپ میری طرف سے پریشان نہ ہوا کریں، بلکہ دعا کیا کریں کسی اور کے ساتھ ایسے حادثے پیش نہ آئیں۔“ اثبات میں سر ہلاتے باتوں کا رخ شہر و زکمال کے حادثے کی جانب مڑ گیا۔ دونوں کو سبرینہ کی بیوگی کا بے حد افسوس تھا۔ ”شادی پر تو، وہ نہیں آ سکے گی.... عدت پوری تو نہیں ہوتی ہوگی اس کی۔“ آئمہ کی بات کے جواب میں سلوی نے اندازہ لگا کر بتایا تھا۔ ”نہیں پوری ہو جائے گی.... میرا خیال سے اگلے ہفتے۔“

”ہوں....“ آئمہ کچھ سوچ کر بولیں۔ ”جنبل بھی آ رہا ہے.... سلوی کچھ سوچ کر بولی۔

”کب....“

”یہ تو نہیں اس نے بتایا....“ آئمہ کے لہجے میں دیور کے لیے ساری محبت اُٹائی تھی۔ بہت منتیں کی ہیں، میں نے اس کی، اکلوتا بھتیجا ہے.... کیا اس کی شادی میں شرکت کے لیے بھی نہیں آ سکتا۔“ اذلان کی نگاہیں کسی سوچ میں ڈوب گئی تھیں البتہ اعشال کے لہجے میں بھی افسردگی جھلک پڑی۔

میرے گھر تک لے آئے۔ وہ نخت سے اسے گھورتی جھٹکتے سے اٹھی۔ جناب نے اسے روکنا چاہا۔

”کبھی کچھ آرام سے سن بھی لیا کرو۔۔۔۔۔ پانچ سال ہونے والے ہیں اس نے دوسری شادی نہیں کی، تمہیں ڈیوارس نہیں دی۔۔۔۔۔ آخر کوئی تو وجہ ہوگی۔۔۔۔۔ سمجھو، سنو تو سکی۔۔۔۔۔“ وہ دانت جما کر بولی تھی۔

”شادی تو تم نے بھی نہیں کی۔۔۔۔۔ اس کی کیا وجہ ہے۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔“ وہ گیٹ سے اندر داخل ہو کر ان ہی کی جانب قدم اٹھا رہا تھا۔ روانیہ جان کر اونچا بولی تاکہ وہ سن لے۔

”روانیہ وہ انسان ہے، فرشتہ نہیں۔ غلطی نہ ہو۔“ جناب آج اس کا وکیل بناروانیہ کو اپنا دشمن لگ رہا تھا

”اچھا۔۔۔۔۔ وہ استہزائیہ میں ہنسی ”میرا خیال ہے عمل کے لیے عقل صرف انسانوں کو ہی دی گئی فرشتوں کو صرف حکم ہوتا ہے۔ عقل نہیں۔۔۔۔۔ تم اس سے کہو یہ چلا جائے۔۔۔۔۔ نہیں تو جناب میں کچھ بہت غلط گردوں کی۔“ وہ بہت آہستہ قدموں سے ان کی جانب آ رہا تھا۔ جناب کرسی سے ٹیک لگائے بہت ٹھنڈے انداز میں بیٹھا رہا۔

”صرف ایک بار اس کی پوری بات سن لو۔ اعتبار کرو یا ر۔۔۔۔۔ پھر جو چاہے فیصلہ کرنا۔“

”اعتبار۔۔۔۔۔“ اسے یہ لفظ بے حد مضحکہ خیز لگا تھا۔ کس کا اعتبار، ان لفظوں کا جو اس نے کہے۔۔۔۔۔ جن پر ناخن، چھریاں، بلڈ کچھ بھی نہ رکھے تھے اور میں پھر بھی زخمی ہوگی۔۔۔۔۔ ان زخموں کو دھوتے دھوتے میں خود بہہ گئی۔۔۔۔۔ لیکن وہ بھرے ہی نہیں۔۔۔۔۔ ان کا اعتبار کروں۔“ وہ کچھ فاصلے پر آ کھڑا ہوا تھا۔ بے بس اک ہارے ہوئے جواری کی مانند ”جو لفظ مجھے لباس کہتے تھے، چیونٹی کی آہٹ، باد نسیم۔۔۔۔۔ ہونہ پھر میں برہنہ کیسے ہوئی۔۔۔۔۔ آہٹ دھاڑ میں کیسے بدلی، اس باد نسیم نے مجھے جھلسا دیا تھا۔ جناب!“ اس نے جناب کو مخاطب کرتے ہوئے اس تھکے شخص پر نگاہ اٹھائی وہ ہنسنے

اچکائے اس کے غصے سے سرخ پڑتے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ ان گرے آنکھوں میں آج یلا کا اعتقاد تھا۔ جو بھی کانپتی ہلکوں میں بھولین ٹکانی تھیں اس وقت قطعیت سے بھری تھیں۔ حکمیہ جبری گری آنکھیں، تھکی بھوری آنکھوں نے جی تھیں روانیہ دانت جما کر بہت ٹھوس انداز میں بولی۔

”آسمان اور زمین کا اگر فاصلہ یاد ہے، تو سنو۔۔۔۔۔ مجھے اس فاصلے سے کئی گنا زیادہ تم سے نفرت ہے۔“ نفرت لفظ کہتے اس کی آواز میں یک دم کمی ابھری تھی۔ تمہارے وجود سے، تمہارے سائے سے۔۔۔۔۔ یہ تمہارے باپ کی حویلی نہیں ہے، اور تا ہی میرے باپ کی نام نہاد جائیداد۔۔۔۔۔ جہاں تم جیسے لوگوں کی حکومت ہو۔۔۔۔۔ یہ میرا ذاتی گھر ہے۔۔۔۔۔ اور یہاں سے ابھی، اسی وقت نکل جاؤ۔۔۔۔۔ سمجھے۔۔۔۔۔“ اس کا اٹل لہجہ اس کے لیے حیرانگی کا سبب نہیں بنا۔ اس نے جو کچھ کہا تھا وہ اس کا مستحق تھا یا شاید اس سے بھی زیادہ۔۔۔۔۔ مگر اسے اپنی ایک بات اسے سنانا تھی اور ہر صورت سنانا تھی ”روانیہ، میں تم سے معافی مانگتی نہیں آیا۔“

”میرا نام اپنی زبان سے مت لو۔۔۔۔۔“ وہ ذرا سا چونکا درو کی لہر ابھری اور فوراً بولا۔

”نہیں لیتا۔۔۔۔۔ شاید اب مجھے یہ حق نہیں ہے، یا میں اس قابل نہیں رہا، میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔۔۔۔۔ میری فلائٹ نزدیک ہے۔ پھر بھی جی اپنی قابل نفرت صورت نہیں دیکھاؤں گا۔۔۔۔۔ مگر پلیر میری ایک بات، صرف ایک بات سن لو۔“ سینے پر ہاتھ لپیٹے دوسری جانب دیکھتے ہوئے اس نے معمولی سی گردن پھیر کر اسے ایسے دیکھا۔

”ہونہ ایک بات۔۔۔۔۔ اب برسوں بعد کیا سنانے آ گیا۔۔۔۔۔ اور جب میں متیں کر رہی تھی جنبل جنبل میری بات سنو۔۔۔۔۔ تب۔۔۔۔۔ تب وہ صرف کروفر سے دھاڑتا رہا۔ اس کا چہرہ سرخ تھا جب وہ کمرے میں داخل ہوا۔ اور چنگاڑی صورت لفظ نکلے تھے۔“ کیا ہے یہ؟“ وہ اس کے لہجے سے سہم سی گئی

تھی بشکل کہہ پائی۔
 ”بیٹی... بیٹی ہے۔“ بیٹی..... اس لفظ کا مطلب جانتی ہوں۔“ وہ تعجب سے کہتا اسے کھانے کو دوڑا۔

☆☆☆

جیسے جیسے سفر سٹ رہا تھا ویسے ویسے روائیہ کی یاد اٹھ کر آ رہی تھی۔ ان نو دس ماہ میں اس کی یاد اس شدت سے نہیں آئی تھی جتنا یہ چند گھنٹوں کا فاصلہ طے کرنا مشکل بنا تھا اور اس سفر کے دوران حبل ذکا پر واضح ہو چکا تھا وہ واقعی روائیہ سے حد درجہ محبت کرنے لگا ہے، وہ اس کے بغیر زندگی کا تصور نہیں کر سکتا، اس کے مسکراتے چمکتے رخسار، گرے آنکھوں کا بھولپن فضا میں اس کے ساتھ اڑ رہا تھا۔ اس کے پاکستان آنے سے لے کر اب تک کی جتنی باتیں تھیں سب باری باری سماعتوں میں گونجنے لگیں اور خاص طور پر ان چند ماہ کی جب وہ خواہ مخواہ کا مجسم پھیلانے کے لیے فون پر اوٹ پٹا تک باتیں کرتی تھی۔

”آسٹریلیا، آسٹریلیا والے اور وہ پاکستانی جو مجھے بھول کر جرمنی جا کر بیٹھ گیا.....“ سوچتے ہوئے حبل کے لبوں پر مسکراہٹ آنی ”میرے پاس بھی ایک سر پرانز ہے، آؤ گے تو بتاؤں گی“ خوش کن خیال سے اس کی آنکھیں خود بخود موند گئیں اور سرایت بیک پر نکالیا۔ اس وقت وہ کسی مسافر کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا صرف اور صرف روائیہ کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔ ”میرا اس سے بھڑکنا ہو گیا تھا۔“ اس کی آواز گونجی۔ حبل نے ذرا کی ذرا پلکیں اٹھا کر جہاز کی چھت کو دیکھا پھر آنکھیں موند لیں۔ ”حبل میں بہت تنہا فیل کر رہی ہوں، کب آؤ گے.... حبل اگر کوئی اپنی غلطی کی معافی مانگے، کیا اسے معاف کر دینا چاہیے۔“ گہرے گہرے تیرتے سانسوں کے درمیان وہ اپنی روائیہ کو سمجھ رہا تھا ”تم یہی کہو گے، پہلے کیوں نہیں بتایا، اب بتا رہی ہو.... غصے کے سوا تمہیں آتا ہی کیا ہے....“ اس کے

خوب صورت چہرے پر پراسرار پھیلی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ دوسرے آلات کی طرح یادیں ناپنے کا بھی اگر آلہ ہوتا، پھر میں بتاتی کون، کب کتنا یاد آتا ہے۔“ محبت میں اس کی ڈوبی آواز حبل کے اندر سکون بھر رہی تھی۔ ”مجھے بہت کچھ بتانا ہے، جو تم جانتے ہو، وہ بھی.... جو نہیں جانتے وہ بھی.... شروع شروع میں تم مجھے بہت برے لگتے تھے، میں سوچتی تھی یہ اس لھر میں کیوں رہتا ہے۔“ خیالوں میں بے ساختہ اس کی روشن پیشانی چوم لینے پر اس کی آنکھیں پٹ سے کھل گئیں۔

”روائیہ بی بی، کیا چیز ہو تم....“ ہر طرف اس کے دھڑکتے احساس پر وہ اچھا خاصا کھانا بھی ہوا۔ اور ٹھیک ہو کر بیٹھا۔ وہ چند دن کے لیے پاکستان آ رہا تھا۔ جرمنی میں ابھی اس کا بہت سا کام اتوار میں پڑا تھا۔ اس نے بیٹھے بیٹھے تہیہ کیا اب وہ اسے اپنے ساتھ لے کر آئے گا.... جانے وہاں کون کون سی حرکتیں کر کے بیٹھی ہے۔ پھر اس کی تمام بونگیاں درختوں پر چڑھنے کی فرمائش، ٹریکٹر، کرکٹ، بکھار کا چاک، ٹیوب ویل سب باری باری آنکھوں کے سامنے آ کر رکتی رہیں۔ ایئر پورٹ سے باہر نکلتے ہوئے اس نے پہلے روائیہ کا نمبر ملایا وہ بند جا رہا تھا۔ پھر میرڈ کا کالامایا۔ انہوں نے دوسری ٹون پر ہی ریسو کر لیا۔ اور یہ سنتے ہی کہ وہ پاکستان پہنچ چکا ہے انہیں بے انتہا حیرت ہوئی تھی۔

”اچھا.... چلو ٹھیک ہے، تم گھر پہنچو، میں ایک دو روز میں آ رہا ہوں۔“

”کیا مطلب آپ گھر پر نہیں ہیں.... کہاں ہیں آپ....“ اس کے استعجابیہ لہجے پر وہ کھل کر بنے۔ ”تین چار دن ہو گئے میں تو اسلام آباد میں ہوں، کچھ اجلاس چل رہے ہیں ان کے سلسلے میں۔“ میرڈ کا کی شدید خواہش تھی وہ منٹر کی سیٹ تک جائیں۔ اور قومی الیکشن قریب ہونے کے سبب ان کی پارٹی آئے روز مختلف جگہ جلسے اور ریلیاں کر رہی تھی۔ وہ چار باغ دن سے گئے ہوئے تھے اور مزید دو

چاردن لازمی لگ جانے تھے۔ ان کے بتانے پر جنبل
کو ذرا حیرت نہیں ہوئی تھی کیوں کہ انہیں اپنی
سیاست سے زیادہ کچھ عزیز بھی نہیں تھا۔
”پھلےں پھر ٹھیک ہے۔“ وہ فون بند کرنے لگا
تب وہ شام کا استفسار کر رہے تھے۔

”خیام ٹھیک تھا، کب آ رہا ہے....“
”ہاں جی ٹھیک تھے.... اگلے ماہ شاید آئیں
.... تب تک میں چلا جاؤں گا۔“
”کیوں؟“ وہ تحیر سے بولے۔ ”کام ختم
نہیں ہوا۔“

”مائی ڈیئر بابا، ہم وہاں کام ختم نہیں شروع
کرنے گئے ہیں.... بزنس ہے مستقبل آنا جانا لگا
رہے گا.... آپ بے فکر رہیں.... آپ کی
دو ٹنگ کے لیے ہم آجائیں گے....“ اس نے
طنزاً کہا تھا اور وہ مذاق سمجھ کر قہقہہ لگاتے رہے۔ اس
نے دوسری کال گھر کی تھی جو اذلان نے ریسیو کی
.... جنبل کے آنے کا سن کر وہ اچھا خاصا بکھلا گیا
تھا۔ آئندہ یہ تو بتا چکا تھیں ایک دور ورننگ وہ آ رہا ہے
لیکن آچکا ہے، کا سنتے ہی گڑبڑا گیا۔ اسے سب
سے پہلا خوف روانیہ کی طرف سے ہوا تھا اگر اس
نے بتا دیا کم از کم اس بات پر وہ جھنجھکے مار جن نہیں
دیں گے.... اسے اب خود کو محفوظ کرنے کے لیے
بہت سی پلاننگ کرنا تھی لیکن فی الوقت روانیہ اس
حالت میں نہیں تھی کہ فورا“ بتا سکے۔ تب ہی اس نے
آواز میں خوشگواریت پیدا کرتے پوچھا۔

”آپ ویٹ کر ہیں میں لینے آتا ہوں۔“
”نہیں یار ہمیں پہنچنے میں تھنہ دو لگ جائیں گے
.... میں کب سے آ جاتا ہوں۔“ وہ چلتا ہوا ٹیکسی اسٹینڈ
پر پہنچ گیا تھا۔ جرمنی کی صاف ستھری ہوائے سے زیادہ اسے
یہاں کی گرد آلود فضا بھی بہت اپنی لگی تھی۔ چہرے پر
انہایت کا احساس جھا گیا۔ جیسے ہی حویلی میں داخل ہوا
لازم بھاگ بھاگ کر ملنے آئے تھے۔

گود پیل لیب ٹاپ رکھے وہ صوفے کے
درمیان میں بیٹھی تھی۔ اس کی نحویت سے لگتا تھا وہ کوئی

ضروری چیز سرچ کر رہی ہے، جنبل سامنے کھڑا ہو کر
کھنکارا چند تلوے اعشال کو یقین ہی نہیں آیا تھا آہستہ
آہستہ آنکھیں خوشگواریت سے پھیلیں لیب ٹاپ
ایک جانب رکھ کر دونوں ہاتھیں کھولے بھاگ کر
لپٹ مٹتی تھی۔ ”آپ.... آپ کب آئے
چاچو....!“ اس کے سر پر ہلکی سی چیت لگاتے مصنوعی
خفگی سے دیکھا۔

”لگتا ہے کسی کو میرے آنے کی خوشی نہیں ہے
تب ہی کوئی نظر نہیں آ رہا....“ وہ آپ کے انتظار میں تو
خیر سے دیکھیں رکی ہوئی ہیں....“ اس کے دو معنی لہجے
پر اسے قدرے اچنبھا ہوا اور سامنے صوفے پر پھیل کر
بیٹھ گیا تھا۔ ملازمہ نے سلام کرتے ہوئے پانی لا کر دیا
اس نے چند گھنٹ بھر کر اعشال کو دیکھا تھا۔

”سب لوگ کہاں ہیں.... کوئی نظر نہیں
آ رہا.... بھر جانی.... تمہاری چاچی.... اذلان
سے تو ابھی بات ہوئی تھی، وہ کہاں غائب ہو گیا؟“
”مسٹر اذلان تو کچھ دیر پہلے ڈیرے کی جانب
نکلے، امی اور چاچی صاحبہ کے لیے آپ ایک ٹنگ
نہ کر لیں، آپ کو سب پتا ہے....“ وہ انہجے سے
اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

”کیا پتا ہے؟“ اود صوفے پر پھیل کر بیٹھ
گیا آنکھیں جمائی روکنے سے بھاری ہو رہی تھیں
دیکھنے سے لگتا تھا اسے شدید تھکاوٹ ہے وہ سوتا
چاہتا ہے

”کچھ نہیں....“ اس نے منہ بتاتے ہوئے کہا
تھا پھر توقف سے بولی۔ ”کھانا لگواؤں آپ کے
لیے یا پہلے آرام کریں گے؟“

”میں واقعی آرام کرنا چاہ رہا ہوں....“ وہ
بھاری ہوئی آنکھوں کو رولیکس کرتا ہوا اٹھا چند قدم
آگے بڑھا تھا جب اعشال نے پیچھے سے ہانک
لگائی تھی۔

”جب اسپتال جائیں، مجھے بھی لے کر
جائے گا۔ میں ابھی تک نہیں مٹتی؟“ جنبل ذکا میکانیکی
انداز میں پلپاتا تھا۔

والی۔ یہ تو کوئی اور ہی تھی۔ روکھی پھکی نقاہت زدہ سی۔ پل بھر ٹھک کر جس تیزی سے وہ اس کی جانب بڑھا تھا۔ اگر لابی میں لوگوں کا خیال نہ ہوتا وہ اسے خود میں سمیٹ لیتا۔ روانیہ کی حبل سے نگاہ ملتے ہی سارا بدن یک لخت ڈھلا پڑ گیا۔ چہرے کی سرخی ابھرتے ہی کمی میں گھل گئی۔ رخسار مسکراہٹ میں پھیلانے کے باوجود گمان ہوتا تھا وہ شدت سے رونا چاہ رہی ہے۔ وہ جیسے ہی پاس آ کر رکا اس نے اس کی بازو زور سے دبوچ لیا حبل نے ترم بھری نگاہ سے اسے دیکھتے ہوئے دوسری بازو اس کے گرد پھیلاتے اسے سہارا دیا اور ٹرانس کی کیفیت میں بولا تھا۔

”تم..... تم ٹھیک تو ہو.....؟ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا رکھا تھا۔ کمی سے بھری گری آنکھیں اٹھا کر صرف اثبات میں سر ہلایا تھا۔ اور بہت مشکل آواز نکلی۔

”مگر وہ ٹھیک نہیں ہے.....“ اس کی بیٹی کو آج دنیا میں آئے چوتھا دن ہو چکا تھا مگر انتہائی کمزور ہونے کے سبب وہ مستقل انکوبیٹر میں تھی۔ آج صبح ڈاکٹر نے کہا تھا اسے انکوبیٹر سے ہیئر بیڈ پر شفٹ کر دیا گیا ہے۔ شعاعیں لگا کر چند گھنٹے بعد اسے ڈسچارج کر دیا جائے گا۔ اب کچی خطرے سے باہر ہے مگر چند گھنٹے کیا زیادہ دیر ہو چکی تھی وہ یہی سن رہی تھی۔ ”ڈسچارج شیٹ تیار ہو رہی ہے۔“ ابھی بچی اسے دے دی جائے گی مگر کوئی اسے لایا نہیں تھا۔

چار دن گزر چکے تھے روانیہ نے اپنی بیٹی کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔ صرف پیدائش کے وقت کسی بلی کے بچے نما آواز سن کے کان تک گئی ضرور تھی لیکن نقاہت کے سبب اس سے ہلنا جلنا دشوار تھا۔ اس کی ڈاکٹر کا ایک جملہ ”اسے فوراً لے جاؤ“ خطرے میں ڈوبی آواز کانوں کے پردے سے ٹکرانی شاید وہ بچی کی حالت دیکھ کر نرس سے کہہ رہی تھیں۔ مگر روانیہ کو فوراً نیند کا انجکشن لگا دیا گیا۔ غنودگی اترنے کے بعد چار دن گزر گئے اسے اپنی بیٹی کی پل پل کی کنڈیشن آئندہ اور نرسیں بتاتی رہیں۔ دوبارہ وہ ضد کر کے

”اسپتال..... کون سے اسپتال.....؟“
 ”چاچو آپ کو واقعی نہیں پتا..... یا جرمون سے اداکاری سیکھ کر آئیں ہیں.....“ وہ قدم قدم اس کی جانب بڑھتے اچھی خاصی کڑھکی سے بولا تھا
 ”اعمال مجھے آپ بتانا پسند کریں گی..... یا میں کسی اور سے پوچھوں۔ بات کیا ہے آخر؟“ اب حیران ہونے کی باری اعمال کی تھی۔ حبل مذاق میں اتنا کڑھ نہیں ہوتا تھا اور اگر انہیں نہیں پتا، تو ابھی تک کیوں نہیں بتایا گیا۔ وہ الجھتے ہوئے بولی تھی۔
 ”امی اور چاچی اسپتال میں ہیں ناں..... گزرا آئی ہے۔“
 ”گزرا..... حبل کے استعجابیہ کہنے پر وہ

وضاحت دے رہی تھی۔
 ”آپ کو نہیں پتا۔ ننھی..... میری بہن۔ آپ کی بیٹی.....“ پل بھر کے لیے وہ ہونٹ زدہ احق لگا تھا۔ اس کی دونوں بھنوں کے کونے سسٹے ہوئے تھے۔ لب ہلکے سے وا تھے۔ تھکاوٹ اور جمائی تو کہیں غائب ہو گئی تھی نا مجھی سے اعمال کو دیکھتے ہوئے۔ آہستگی سے پوچھ رہا تھا۔

”تم کیا کہہ رہی ہو..... مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی۔“ پھر جب اس نے وضاحت سے بتایا وہ الٹے قدموں باہر کی جانب مڑا تھا۔ آئندہ کے نرس پر کال کر کے اسپتال کا پوچھا۔ وہ خود حیران رہ گئی تھیں حبل پہنچ چکا ہے اور یہاں اسپتال آ رہا ہے۔ انہوں نے اسے پیار سے کہا تھا۔

”تم آرام کرو..... ہم تھوڑی دیر تک آنے والے ہیں..... شام تک ڈاکٹر ڈسچارج کر دے گی۔“
 یہ سب سننے کے بعد اس کا آرام سکون تو بھاڑ میں گیا۔ وہ تیز ڈرائیو کرتا اسپتال پہنچا تھا۔ اس اوسط درجے کے اسپتال کی انٹرنس پارکر کے وہ تیزی سے لابی کی جانب بڑھا تھا۔ ایک کمرے سے وہ نرس کے ساتھ آہستہ آہستہ باہر آ رہی تھی۔ اس کے بچھے چہرے پر جو انحلال گھلا تھا۔ حبل کے دل کو دھکا سا لگا تھا۔ وہ، وہ روانیہ نہیں تھی شوخ چمکتی رنگت

نرسری تک گئی۔

گلاس ڈور سے انکجو بیٹر کی جانب اشارہ کر کے بتایا تھا ”گڑیا وہ ہے۔“ مگر وہاں سے اسے نا شکل نظر آئی تھی، نا آواز صرف مختلف پائیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ وجود دکھائی دیتا تھا۔ اس نے پل پل اپنی بیٹی کے ٹھیک ہونے کی دعا کی، آئندہ بیگم کے اسے کئی بار کہنے کے باوجود۔

”تم اب ٹھیک ہو، گھر پر آرام کرو۔ یہاں میں ہوں ناں۔“ مگر وہ بہت ہمت حوصلے سے اسپتال میں رہی۔

”نہیں میں اسے لے کر جاؤں گی۔۔۔“ اب حنبل کو سامنے دیکھ کر یک لحظ ہی ساری ہمت ٹوٹ گئی اس کی چھوٹی چھوٹی سسکیاں ہچکیوں میں بدلتی باہر نکل رہی تھیں۔ حنبل نے اسے پیار سے پھٹکتے ہوئے کہا تھا۔

”تم آرام کرو، میں دیکھتا ہوں۔“

”انہیں ڈسپارچ کر دیا گیا ہے۔“ نرس حنبل کو بتا رہی تھی۔ ”بہتر ہے یہ گھر پر جائیں، شام تک بے لی کو بھی فارغ کر دیا جائے گا۔“ حنبل نے ”اوکے“ کے انداز میں گردن ہلاتی تھی تب ہی خالہ گلزاری ان کی جانب بڑھی تھی۔ حنبل نے نگاہ ملتے ہی پہلے تھوڑا سا ٹھٹھکی پھر خوشگوار ہٹ پھیلاتے ہوئے اسے مبارک باد دی، اس نے نرسی سے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے خالہ گلزاری سے استفسار کیا تھا۔

”آپ لوگ کس کے ساتھ آئیں ہیں۔ مطلب باہر کون سے گاڑی میں.....؟“ گلزاری نے دو ہٹا اچھی طرح جما کر انگلی سے ایک کان کے پیچھے کرتے ہوئے کہا تھا۔

”نہیب کا ابا۔۔۔ ہم چار دن سے ادھر ہی ہیں۔۔۔“

”ہوں۔۔۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگا۔

”ایسا ہے، آپ روانہ ہو گھر لے جائیں، بانی سب میرے ساتھ آ جائیں گے۔“

گلزاری نے چند چیزیں اٹھاتے ہوئے روانہ ہوا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پاس سے گزرتے گزرتے اس نے حنبل کی شرٹ پشت سے پکڑ کر دکھا اس نے گردن پھیری پھر سارا اس کی جانب مڑ گیا۔

”ہوں۔۔۔؟“

”تم ناراض تو نہیں ہو۔۔۔؟ اس کی معصومیت سے پوچھنے پر حنبل کی ہنسیوں استفسار میں جیش کرنے لگیں۔ وہ فوراً سے بولی۔

”سوری۔۔۔ تم گھر آؤ گے، میں سب بتا دوں گی۔“ اس کا استفسار مسکراہٹ میں بدل گیا تھا۔

”میں بھی گھر آ کر بتاؤں گا۔“ پھر وہ گلزاری سے مخاطب ہوا تھا۔ ”اسلم سے کہنا گاڑی احتیاط سے چلائے۔“ انہیں آہستہ آہستہ لابی عبور کرتا دیکھ کر خود بھی پیچھے چلا اور روانہ ہو گیا ہاتھ پکڑ کر باہر گاڑی تک بیٹھا کر آیا تھا۔ اسلم کو خود نصیحت کی تھی۔

”احتیاط سے چلانا۔۔۔ جب وغیرہ دیکھ کر۔“

جب تک گاڑی نظروں سے اوجھل نہیں ہوئی وہ وہاں کھڑا رہتا تھا پھر اندر نرسری کی جانب بڑھا تھا۔ انہیں لابی کو عبور کر کے چھوٹا سا لاؤنج تھا جس کے دائیں جانب بے بی نرسری کا سائن لگا تھا۔ شیشے کے دروازے کے ساتھ لگے پتھروں پر آئندہ اور سلوٹی بیٹھی تھیں۔ کچھ فاصلے پر نہیب بھی بیٹھی ایک قہر موس سے دو کپوں میں چائے اٹل کر اٹھنے لگی۔ سامنے بیٹھوں پر چند اور خواتین بھی بیٹھی تھیں۔

سلوٹی کی باتوں کے انداز سے لگتا تھا وہ آئندہ سے کچھ پوچھ رہی ہے شاید وہ ابھی آئی تھی۔ بے بی اور روانہ کی خیر خیریت پوچھ رہی تھی۔ حنبل نے نگاہ ملتے ہی اس کا چہرہ سر ہو گیا تھا۔ البتہ آئندہ مسکراتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھی تھیں اور والہانہ پن سے ملی تھیں۔ سلوٹی نے اس کے سلام کے جواب میں سر کے خم سے جواب دیا اور پھر شیشے کے پار نرسری کے بچوں کو دیکھنے لگی اور چائے لاتے ہوئے نہیب کے ہاتھ کانے۔ دھڑکن غیر معمولی ہو گئی تھی۔

”آپ نے مجھے بتایا تک نہیں۔۔۔“ وہ حال

احوال کے بعد اب شکوے شکایتوں پر اتر آیا تھا۔

”پہلے وہاں کم پریشان تھا، مزید کر دیتی۔۔۔“
آئمہ کا جواب اسے مطمئن نہیں کر سکا۔ اس کے
چہرے پر ناراضی ہنوز تھی۔

”کون سا بے بی ہے۔۔۔؟“ اس نے گلاس
دور سے اندر دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ آئمہ نے ایک
جانب اشارہ کیا۔

”مسئلہ کیا ہے۔۔۔؟“ لہجے میں تفکر تھا۔

”تجھے کئی مسئلے۔۔۔ لیکن اب ٹھیک ہے۔۔۔“
”لیکن آپ چہرے سے بہت تنہی ہوئی لگ

رہی ہیں۔۔۔ خیریت ہے ناں۔۔۔؟“

”جھیل میں چار دن سے یہاں ہوں، مسلسل
رات دن۔۔۔ تھکاؤ تو ہوئی ہے۔“ آئمہ کی بات
پر جہاں جھیل تشکر آمیز شرمندہ سا ہوا تھا وہاں نینب
نے دل میں ”استغفار“ پڑھی تھی۔ کیوں کہ زسری کے
سامنے ایک بہترین کمرہ آئمہ کے لیے ریزرو تھا۔
ہاں وہ آرام کرنے کے ساتھ چکر لگا لیتی تھیں مگر
مسلسل تو صرف نینب بیٹھی رہی تھی جس کا نام ہی
نہیں۔ آئمہ اور سلوی تو کچھ دیر پہلے ہی یہاں آ کر
نینب تھیں۔ نینب نے کڑوا سامنہ بناتے جائے کے
ڈسپوزیبل کپ ان کی جانب بڑھائے جھیل نے
”نہیں شکریہ“ کہہ کر انکار کر دیا۔ وہ ڈاکٹر سے ملنے کی
بات کر رہا تھا۔ جب کچھ فاصلے پر بیٹھی خواتین سے
پہلے ایک بوڑھی اماں اٹھ کر آئیں اور آئمہ سے پوچھا تھا۔

”اے بیو اے“ (یہ باپ ہے) آئمہ کے
اثبات میں سر ہلانے پر وہ دعائیں دیتیں۔ ”مثلاً
جیددی روے تیری دھی، نصیب بھلے ہوں۔۔۔
وقتوں پیلاں ہوئی ناں۔۔۔ کوئی نہیں رب حیاتی
دین آلا۔۔۔“ (زندہ رہے تیری بیٹی، نصیب اچھے
ہوں، وقت سے پہلے ہوئی تو کیا ہوا، اللہ زندگی دینے
والا ہے) بڑھیا اس کی پشت پر ہاتھ پھیر واپس بیٹھ گئی
تھی۔ جھیل کے چہرے پر کچھ ناگوار سی ابھری کچھ
الفاظ بے حد عجیب لگے تھے وہ شکوہ کنناں انداز میں
دیکھتا آئمہ سے پوچھ رہا تھا۔

”ڈاکٹر اسما کے پاس کیوں نہیں گئیں۔۔۔“
کہاں لے آئیں۔۔۔“ وہاں پر بیٹھیں خواتین اور
ایک دوسرے جس طرح سے اسے دیکھ رہے تھے جھیل کو
بے حد عجیب لگ رہا تھا۔ ڈاکٹر اسما کا اچھا بھلاوی آئی
بی اسپتال تھا، لیکن فی الوقت سب لوگوں کی نگاہیں چہ
گوئیوں برداشت کرنا تھیں۔

”یہاں آنے کی بھی وجہ تھی اور ویسے بھی
روانجیہ خود بھی یہاں آنا جاہ۔۔۔“ آئمہ کے الفاظ
ابھی منہ میں تھے سفید قمیص شلواری پہنے دوزنیں تیزی
سے زسری کی جانب بڑھتی آرہی تھیں۔ زسوں کو دیکھ
کر معمول کی طرح مائیں دادیاں بے چین ہوئیں ان
کی طرف بڑھیں اور سب اپنی ہانک رہی تھیں۔

”ساڈھے بچے دا خیال رکھیں۔۔۔ میرے
بچے کو کب فارغ کرو گے۔۔۔ میں نے تو اپنا پوتا
دیکھا بھی نہیں، ذرا ساد کھا دو۔۔۔“

ایک عورت تو خوب ہی پیچھے بڑھ گئی تھی ”میرے
نواسے کے تو ابھی اذان بھی نہیں دی گئی۔ وہی
دلوادو۔۔۔“ انہوں نے پیچھے کودھلیتے زسرتی سے
بولی تھی۔

”سب کے بچوں کے کان میں اذان دے دی
ہے، اگر چاہتی ہو ناں“ بچے بیچ جائیں تو اطمینان
سے بیٹھو، نہیں تو خالی کرو یہ لائی اور اپنے اپنے کمروں
میں جاؤ۔۔۔“ وہ دروازہ دھکیل کر اندر چلی گئی۔ کچھ
اتاولی بڑھیاں کا بچے کے دروازے سے چپک کر اندر
کے نظارے کرنے لگیں۔ جھیل کا بہت دل تھا وہ اس
زسرتی سے اپنی بچی کی کنڈیشن پوچھے، مگر جس طرح
سے وہ سب کو ہنجر کر اندر داخل ہوئی تھی اسے غیر مناسب
ہی لگا۔ اس سے کہیں بہتر تھا وہ ڈاکٹر سے مل لے۔

”میں ابھی آیا۔“ کہہ کر ڈاکٹر کے کمرے کی
جانب بڑھا تھا۔ مریضوں کی بھرمار چپک کرنے
کے دوران ڈاکٹر لبتی نے جھیل کے لیے کچھ وقت
نکالا۔ چھوٹے سے کمرے میں شیشے کی میز کے پیچھے
ریو لوگ چیئر پر بیٹھی ڈاکٹر لبتی نے جھیل کو پیشہ وارانہ
انداز میں مسکرا کر دیکھا تھا۔ وہ کرسی بچھ کر سامنے

بیٹھ گیا بچی اور روائیہ کے بارے میں معلومات لینے لگا۔ ڈاکٹر لینی کالب ولجہ خاصا غلٹ آئیز تھا۔ اس نے چند جملوں میں اس کی مناسب نسی کرنا چاہی تھی۔ ”بچی میں آسجین کا کچھ مسئلہ تھا، اب ٹھیک ہے، ڈسچارج شیٹ تیار ہو چکی ہے آپ نرس سے ریسو کر گئے سائن کر دیں اور آپ کی سزا الحمد للہ ٹھیک ہیں۔۔۔ ہفتے بعد ماں بچی کا چیک اپ کروالیں تو مناسب رہے گا۔ باقی سب ٹھیک ہے۔“ اس نے مزید کچھ پوچھنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا۔ وہ فوراً بولی پڑی۔

”دیکھیں سر میں اس وقت بڑی ہوں، باہر پشٹ انتظار کر رہے ہیں۔۔۔ ایک کیس بھی ہینڈل کر رہی ہوں۔۔۔ آپ شام میں تفصیل بتا کرنے آسکتے ہیں۔ ویسے زچہ بچہ دونوں خطرے سے باہر اور اب فٹ ہیں۔“ وہ شکر یہ ادا کرتا اٹھا تھا۔ اسے وہاں زیادہ سے زیادہ دس پندرہ منٹ لگے تھے، لیکن جب لابی میں پہنچا وہاں کا مظہر نامہ یکسر بدل چکا تھا۔ دو تین خواتین ایک نرس پر بے طرح سے چھپ رہی تھیں۔

”میں آپ دیکھیا انے بچاں دے ناں بدلے۔۔۔ ہائے ساڈے بچے نوں بدل دیتا۔“ (میں نے خود دیکھا اس نے بچوں کے نام بدلے، ہائے ہمارا بچہ بدل دیا) خود کو بچاتے ہوئے نرس اسے سمجھا سمجھا کر تنگ آ گئی تھی، مگر اس بوہیا کی ایک ہی رٹ تھی اس نے شور ڈال کر اپنے مردانہ ربل لیے تھے۔

”ہائے ساڈی چاؤ ایکڑ زمین دا وارث انے بدل دیتا۔۔۔ میں آپ دیکھیا۔“ (ہائے ہماری چار ایکڑ زمین کا وارث اس نے بدل دیا۔۔۔ میں نے خود دیکھا) مائی دہائیاں ڈال رہی تھی۔

معاملہ یوں تھا جب نرسیں اندر داخل ہوئیں دو بچوں کو انکیو بیئر سے نکال کر ہیئر بیڈ پر شفٹ کیا تھا۔ نرسیں میں بچوں کی شناخت کے لیے ان کی کلائیوں یا پاؤں پر برتھ بینڈ باندھ دیے جاتے ہیں جن پر ان کے والد کا نام اور علاقہ لکھا ہوتا ہے۔ ایک بہت کمزور بچے کا برتھ بینڈ انکیو بیئر سے ہیئر بیڈ تک لے جانے میں پھسل کر نکل گیا۔ ہیئر بیڈ کی کمی کے سبب کاٹ نما

ایک ہیئر بیڈ پر دو بچوں کو لٹا دیا۔ بچے کا بینڈ گرنا تو دادی نے نہیں دیکھا تھا البتہ باندھتے ہوئے جیسے ہی دیکھا اس نے زور زور سے کلاس ڈور بجانا شروع کر دیا تھا۔ وہ کسی صورت یہ ماننے پر راضی نہیں تھی کہ بینڈ دوبارہ باندھا گیا ہے۔ وہ یہی کہہ رہی تھی۔

”پہلوں تھاں بدلی۔۔۔ فیر پئی۔۔۔ میں آئے دیکھیا۔۔۔ (پہلے جگہ بدلی، پھر بینڈ۔۔۔ میں نے خود دیکھا ہے)

سب والدین اکٹھے اور فکر مند تھے کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ بس ایک ہی رٹ کہ بچے بدلے گئے جب ہنگامہ لڑائی میں بدلنے لگا۔ ڈاکٹر لینی کو اپنے مریض چھوڑ کر آتا پڑا تھا۔ بچہ بدلے جانے کی خبر جس طرح ان تک پہنچی تھی اس کا رنگ اڑا ہوا تھا سب سے پہلے اس کی نظر صبل ڈکا پر گئی تھی۔ پھر اس شور مچائی بڑھیا۔۔۔ اس نے معاملے کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی تھی، مگر جب سب والدین ایک ہی بات

”ہمیں کیا معلوم، ہمارے ہی بچے سے بدل دیا ہو۔“ سنتے ہی ڈاکٹر لینی نے غصے سے نرس کو کہا تھا۔ ”بچوں اور والدین کا ڈی این اے کرواؤ۔“ وہ کہہ کر تیزی سے اپنے کمرے کی جانب بڑھی تھی جہاں مریض اس کا انتظار کر رہے تھے۔ بوڑھی دادی کو جراثیم کے اس شیٹ کی خاموشی دیر سے سمجھ آئی، مگر والدین جلد سمجھ گئے۔ نرس نے لیبارٹیرین کو بلا کر بچوں اور باپ کے خون کے نمونے لینے شروع کر دیے۔ اس کام میں اچھا خاصا وقت لگ جاتا تھا۔ آئندہ تھکاوٹ سے بے حال ہو رہی تھیں۔ انہوں نے ہی نرس سے کہا تھا۔

”لڑکی تو ایک ہی تھی اندر۔۔۔ وہ ہماری ہے۔۔۔ ڈسچارج فائل تیار ہے، اسے ہمیں دیں اور فارغ کریں۔“ صبل خود اس الجھاؤ میں پڑنا نہیں چاہ رہا تھا۔ اسے رہہ کر اسپتال کی کارکردگی پر غصہ آ رہا تھا۔ ”یہ کیا طریقہ کار ہے، بچوں کی پیدائش کے بعد۔۔۔ اب ڈی این اے ہو رہا ہے، اتنا غیر ذمہ دار

عملہ، بچوں کی شناخت نہیں رکھ سکتا۔“ وہ گھر جانے کے لیے پید اصرار تھے چونکہ نرس کی اچھی خاصی اسلٹ ہو چکی تھی۔ اب وہ بھی قدرے سختی سے بولی تھی۔

”آپ کے سامنے میڈم کہہ کر گئی ہیں، بچوں کے ڈی این اے کرواؤ۔۔۔ تو سب بچوں کا ہوگا۔۔۔ ہمیں کیا پتا کچھ دیر میں آپ لوگ شور ڈال دیں ہمارا بچہ بدل دیا۔“ سلوئی ڈاکٹر لٹی کی دوست تھی۔ اس کی بہن کی بات رد ہونے پر اچھی خاصی سکی محسوس ہوئی پھر جس طرح بے صبر بار بار چہرے کے زاویوں سے اسپتال کی ناقص کارکردگی بتا رہا تھا۔ وہ ذرا رعب سے بولی تھی۔

”ڈاکٹر لٹی کو میرا بتاؤ۔۔۔ انہیں جلدی ہے، وہ جانا چاہ رہے ہیں۔“ نرس نے لیبارٹیرین کو صبر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

”بہلے ذرا ان کا لے لیں، انہیں جلدی ہے۔“ پھر سلوئی کی جانب ہلکا سا رخ پھیر کر کہا تھا۔

”میڈم اس وقت لیبر روم میں ہیں، فی الحال بات نہیں کر سکتیں، فارغ ہوں گی کر لیجئے گا۔“

☆☆☆

وہ بہت دیر سے ایک روم میں بیٹھے رپورٹس کا انتظار کر رہے تھے۔ بچی کو ڈسچارج کر کے ان کے پاس بے لی کاٹ میں سلا رکھا تھا۔ سلوئی اور آئمہ خاصی بے چین دکھائی دے رہی تھیں۔ اتنے دن بعد یہاں سے جان چھٹنے لگی، مگر ایک بڑھیا نے سب کو مصیبت میں ڈال دیا۔ سلوئی نے دوبار ڈاکٹر لٹی سے ملنے کی کوشش کی، لیکن اپنے کیس سے فارغ ہوتے ہی وہ قریبی اسپتال میں ایک ایمرجنسی کیس میں چلی گئی تھی۔ جس طرح ہر شعبہ زندگی میں تمام کو لیگز ایک دوسرے کو مشکل میں پکار لیتے ہیں ایسی طرح ڈاکٹر ز بھی اپنی عدم موجودگی میں اپنے ساتھی ڈاکٹر کی مدد لے لیتے ہیں کہ وہ ان کے مریض چیک کر لے۔

قریبی اسپتال کی ڈاکٹر کسی کام سے دوسرے شہر تھیں۔ ڈاکٹر لٹی اور ان میں یہی طے تھا کہ ان کی ایمرجنسی ڈاکٹر لٹی دیکھ لیں گی اور اس وقت وہ ان کی

ایمرجنسی کیس کو دیکھنے گئیں اور خاصا وقت لگ گیا۔ سلوئی نے لیبارٹری تک جانے کی کوشش کی کہ جلد فارغ ہوں۔ وہاں پہلے ہی صبریل موجود تھا۔ کچھ دم میں ایک فائل بے بی آف صبریل ڈکا کے نام سے اسے تنہائی گئی۔ اسے پڑھتے ہوئے اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا تھا۔

”یہ کیا بکواس ہے۔۔۔“ اس نے فائل لیبارٹری کے آگے پھینکی تھی اور تیزی سے اس نرس کی جانب بڑھا۔

”کس بچے کا سپیل دیا تھا میرے ساتھ۔“ نرس سنتے ہی ہڑبڑائی اور کاٹ میں لٹی بچی کو دیکھا تھا۔

”سراسر کا۔۔۔“

”کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں۔۔۔ ان میڈم ہے۔۔۔“ صبریل کا لہجہ کرخت تھا۔ آئمہ اور سلوئی کی ہونٹوں سے آنکھیں پھیل گئیں چہرے پر زلزلے کے آثار تھے۔

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔؟“ آئمہ اٹھ کر بچی کی جانب بڑھی تھیں۔ پھیلی آنکھوں کی پتلیاں بچی کا طواف کر رہی تھیں۔

”یہی بچی ہے سر آپ کی۔۔۔ اس بچی کا سپیل آپ کے ساتھ گیا تھا۔“ نرس کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کیسے یقین دلائے۔ آئمہ بھی گھبراہٹ سے بھی صبریل اور بھی بچی کو دیکھ رہی تھیں۔

”ہاں ہاں صبریل۔۔۔ یہی اپنی بچی ہے۔ میں یہی کپڑے اس کے لائی تھی۔“ وہ اکتاہٹ سے برداشت کر رہا تھا۔ آئمہ نے مزید وضاحت دی۔

”مشینری خراب ہوگی لیبارٹری کی۔۔۔ کیمیکل ایکساہٹ ہوئے گئے۔“

”آپ لوگوں کو ہی پسند آیا تھا یہ اسپتال۔۔۔ دیکھ لی کارکردگی۔۔۔“ صبریل کے طنز پر نرس کے چہرے پر نخوت بچھ گیا تھا۔

دیکھیں سر۔۔۔ نرسری میں پرلی میچور بچی صرف ایک اور آپ کی تھی اور چار دن سے تھی، باقی تو آکسیجن اور یرقان کے بچے تھے آج اور کل کے

آئمہ کو بتایا آئمہ بیگم کا جی چاہا زمین ابھی کھود کر نہ ب کو اس میں ڈال دیں۔ انتہائی غصے کو کنٹرول کرتے دانت جما کر بولی تھیں۔

”میرے بچے پر بہتان لگا رہی ہے، کمینی۔۔۔“
”میں سچ کہہ رہی ہوں بی بی۔۔۔“
صاحب کو گئے دو مہینے سے اوپر ہو گئے تھے۔ سردیوں کی راٹیں تھیں، میں نے خود دیکھا تھا، کھڑکی سے پردہ ہٹا ہوا تھا۔۔۔ بلکہ مجھ سے گملا گر گیا تھا۔ اس آواز پر ہی کوئی کمرے سے باہر نکلا۔۔۔ میں تو صرف کوریڈور کی بتیاں بند کرنے گئی، مگر۔۔۔“
”چپ کر جا۔۔۔“ آئمہ کی دبی دبی چیخ نکلی۔
نہ ب منمنائی تھی۔

”میں جھوٹ نہیں بول رہی۔ بلکہ کچھ دیر میں آپ بھی آگئیں تو میں پیچھے سے بھاگ گئی تھی۔ اس سرد رات میں ازلان کی ہوتی، کھڑکی سے سر کے پردے سے آتی روشنی اور گرا ہوا گلاسب کا سب آئمہ کی آنکھوں کے آگے پوری طرح آن موجود تھا۔ وہ تو آج تک بچتی رہیں صرف انہیں ایسا پتا تھا، مگر نہ ب گھر کی خادمہ؟ ایک دم سے آئمہ کا ہاتھ اٹھا اور چٹاخ سے نہ ب کے گال پر نشان چھوڑ گیا۔“
”آواز بند۔۔۔“ حبیل کمرے سے نکل کر جیسے ہی نرس کے پیچھے چلا تھا سامنے سے ڈاکٹر لینی تیز لابی میں داخل ہو رہی تھی حبیل نے اسے وہاں ہی جا پڑا۔
”کیا بکواس ہے یہ۔۔۔ میری بچی پری میچور کیسے ہو سکتی ہے۔۔۔ اس اسپتال میں ہو کیا رہا ہے۔“ ڈاکٹر لینی اپنا چشمہ جھٹکتے کچھ دیر اسے بغور دیکھتی رہی پھر قطعیت سے کہا تھا۔

”اس کا جواب بچی کی اینڈنٹ سے لیں۔“
پھر وہ الٹے پاؤں گھومی اور ایسی کمرے میں داخل ہو گئی جہاں آئمہ اور سلوی بیٹھی تھیں۔ وہ ٹھوس انداز میں کہتے ہوئے سلوی پر نگاہیں جمائے تھی۔

”اس بچی کی پیدائش آپ کے سامنے یہاں ہوئی ہے۔۔۔ یہ پری میچور کیوں ہے، آپ کو اچھی طرح پتا ہے میرے اسپتال کی رپو کا مسئلہ ہے،

۔۔۔ جو سب بیچ کر گئے۔“
حبیل کو کچھ سناٹی نہیں دیا سوائے ”پری میچور کے۔۔۔“ اس کی چوکتی نگاہ اسی گئی اور لابی میں حوصلہ دیتی بڑھایک لفظ کانوں میں گونجے۔
”دو توں پیلاں ہوئی ناں۔۔۔ کوئی نہیں رب جاتی دین آلا۔۔۔“ (وقت سے پہلے ہوتی ہے، کوئی نہیں اللہ زندگی دینے والا ہے) وہ استفسار کر رہا تھا۔
”پری میچور سے کیا مطلب ہے آپ کا۔۔۔“
آئمہ جلدی سے اٹھ کر سامنے آئیں۔
”حبیل چل چھوڑ، جانے کیا کہہ رہی ہے، گھر چلتے ہیں۔“

”ایسے ہی گھر چلتے ہیں۔“ اس کے لہجے میں آہستہ آہستہ غصہ بڑھنے لگا۔ ”پری میچور اور وقت سے پہلے کا کیا قصہ ہے، اس بچی کی فائل دلائیں مجھے دیکھنا ہے۔۔۔ میں دس باہ بعد پاکستان آیا ہوں، میری بچی پری میچور کیسے ہو سکتی ہے۔۔۔ کیا ہے آپ لوگوں نے۔۔۔“ اس کے آنکھوں کے غصے سے نرس ساری کانپ گئی۔ وہ گھبراہٹ میں بول رہی تھی۔
”سر ہم نے کیا کرنا ہے۔ یہی بچی۔“
”آپ فائل لائیں اس کی۔۔۔“ نرس کے لگتے ہی وہ خود بھی بولتا ہوا پیچھے پیچھے نکلا تھا۔

”مجھ سے ڈی این اے الے انچڈ ہے، پری میچور کیا بکواس ہے یہ، میں بات کرتا ہوں ڈاکٹر سے۔۔۔“ آئمہ بھی پیچھے ہونے لگیں۔ سلوی نے روک لیا تھا۔ نہ ب جو بہت دیر سے معاملہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کچھ جھٹکتے ہوئے بولی تھی۔
”بے بی کا کی کا خون حبیل صاحب سے نہیں مل رہا۔۔۔؟“

”تم چپ کرو۔“ سلوی نے اسے ڈپٹا تب فلک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے آئمہ کے قریب ہوئی۔

”مجھے ایک بات پتا ہے۔۔۔“ اس کے یوں کہنے پر آئمہ کی ساری جان نکل گئی تھی بولی کچھ نہیں صرف نگاہیں اس پر جم رہی تھیں۔ جو کچھ نہ ب نے

بدلنے لگا۔

”اللہ کے واسطے جنبل۔۔۔ اس جو ملی کی عزت تیرے ہاتھ ہے۔۔۔ اگر میری زبان مٹلی باپ، دادا کی پڑیاں اچھل جائے گی۔“

”ایسی کیا بات ہے۔“ وہ ٹرانس کی کیفیت میں تھا۔
”ایسی ہی بات ہے۔۔۔ میرا حوصلہ دکھ میں نے یہ خبر بابا جان سے، تمہارے بھائی سے بھی چھپائی اب آنے سے چند دن پہلے بتایا ہے۔ تجھے کیا بتائی۔ یوں ہی تو چپ بھی تھی۔“

”بھر جائی کیا بات ہے۔۔۔“ جنبل کی سانسوں میں طوفان برپا تھا اس طوفان سے سوال ابھرنے بھی مشکل ہونے لگے۔ آئمہ کو اس کی کیفیت کا اندازہ ہو رہا تھا گلاس میں پانی انڈیل کر اس کی جانب بڑھایا اس نے نفی میں سر ہلاتے بمشکل کہا تھا۔ ”بات بتائیں۔۔۔؟“ آواز کسی پاتال میں اترتی محسوس ہوئی۔

”کیا بتاؤں۔۔۔“ انہوں نے گلاس سائڈ پر رکھ دیا۔ ”غیروں کی شادی میں تنہا جانے کی کیا ضرورت تھی، مانا میری طبیعت خراب تھی، اذلان تو جارہا تھا ناں۔۔۔ ضد کر کے اسے چھوڑ گئی۔۔۔ تیرا نام لے کر۔۔۔ بتا کیا کرتی میں۔۔۔“ جنبل کے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔
”اس بات کا اس سب سے کیا تعلق؟“

”میں بھی یہی سمجھتی رہی۔۔۔ وہ تو جب رضا حیات کا بیٹا آیا تھا معافی مانگنے، بتا ایسا کیا ہوا تھا وہاں، جس کی اسے معافی مانگی پڑی اور کس دیدہ دلیری سے یہ آدمی رات کو اس کے پاس چلی گئی، بابا جان نے اس رات سے روایتیہ سے بات نہیں کی اتنے ناراض ہیں۔“ جنبل نفی میں سر ہلاتا ایک لخت کھڑا ہو گیا تھا۔

”شادی پر ہفتے کا پروگرام بتا کر گئی تھی اگلے ہی دن آدمی رات کو بھاگتی واپس آئی، ایسا کیا ہوا جو دن چڑھنے کا انتظار نہ کیا، پھر وہ اس دن معافی مانگنے آیا تجھے پتا ہے تحفے میں کیا لایا تھا، سرخ رنگ کی لی

کنٹرول کریں انہیں۔“ بھنوں سے جنبل کی جانب اشارہ کرتی جیسے آئی تھی ویسے باہر نکل گئی۔ آئمہ کے ہوش زنب نے اڑا رکھے تھے۔ انہیں خوف تھا وہ کچھ بول نہ دے۔ گال پر ہاتھ رکھے ذمی نظروں سے دیکھتی زنب کو سلوی نے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔
”زنب تم میرے ساتھ گھر چلو۔۔۔“ اٹھتے اٹھتے سلوی نے جانے ایسا کیا لفظ بولا تھا آئمہ نے گہری سانس لیتے ہوئے جنبل کو روکا جو پھر غصے میں ڈاکٹر لہنی کے پیچھے جانے لگا تھا۔ آئمہ نے اس کی کلائی پکڑ لی۔

”میری بات سن۔۔۔“ اس نے گردن پھیر کر دیکھا آئمہ چپ کر گئی تھیں۔ سلوی اور زنب جانے کی تیاری میں سامان سمیٹ رہی تھیں اتنی دیر آئمہ چپ رہیں ان کے باہر نکلتے ہی انہوں نے اسے سامنے بیٹھنے کا کہا تھا، مگر وہ پلٹ کر بولا۔
”آپ بات بتائیں۔۔۔“

”جنبل یہ کوئی معمولی بات نہیں، جو تجھے کھڑے چڑھے سنا دوں۔۔۔ اسے سننے کے لیے بہت حوصلہ چاہیے، اسی لیے کہہ رہی ہوں بیٹھ جا۔۔۔“
”حوصلہ ہے مجھ میں۔۔۔ بتائیں آپ۔“ وہ منہ بند کیے گھر سے سانس لیتی رہیں وہ غلٹ آ میری بیچ نماصوفے پر آگے کو ہو کر نک گیا۔
”بتائیں۔۔۔“

”جنبل تجھے مجھ پر کتنا اعتبار ہے۔۔۔“ اس نے چند پل ان کی آنکھوں میں جھانکتے ٹھوس انداز میں کہا تھا۔

”جتنا اپنی ماں پر ہوتا ہے۔۔۔“ اک پھینکی مسکراہٹ آئمہ بیگم کے ایک گال پر رہتی تھی۔

”پھر تیری ماں کہہ رہی ہے، اس معاملے کو یہاں ہی دفن کر دے۔۔۔ کچھڑ کو جتنا کریدے گا ناں۔۔۔ وہ تجھ پر چھینٹے مارے گا۔۔۔ خدا کے واسطے۔۔۔“ انہوں نے دونوں ہاتھ اس کے آگے جوڑ دیے تھے۔ جنبل کے ماتھے پر یک دم پسینے کے قطرے پھوٹ پڑے اک نادیدہ خوف گرد تھیں

فرٹ جس پر آئی مس یو لکھا ہوا تھا۔۔۔ ابھی بھی رکھی ہے اس کی الماری میں۔“
 ”میں بھر جانی ایسا نہیں ہو سکتا۔۔۔ روائیہ ایسی نہیں ہے۔“ حبیل کی آواز صدمے اور خوف سے ٹوٹ رہی تھی۔

”کاش ایسا نہ ہوتا حبیل، ہم لٹ گئے، برباد ہو گئے۔۔۔ مجھے تو پتا ہی تب چلا جب دن بہت اوپر ہو گئے تھے، ورنہ اس بدنامی کو تب ہی دھو دیتی۔“
 آمنہ کی آواز رنہ رنہ کرنے لگی۔ ”شروع میں تو خود جانی رہی ڈاکٹر کے، پھر بھتی رہی حبیل ٹھوڑا غصہ کریں گے پھر معاف کر دیں گے۔۔۔ میں کیا کرتی ہوتا۔۔۔ میں تو اسے بھی سمجھا رہی جو ہوا سو ہوا کسی کو مت بتا۔۔۔ حبیل کو بھی نہیں۔۔۔“ اس نے تند نگاہ سے انہیں دیکھا تھا۔ وہ اٹھ کر اس کے پاس کھڑی ہوئیں اور پشت سپہلاتے نرمی سے بولی تھیں۔

”ذرا اٹل سے حبیل۔۔۔ چیخ پکار سے اپنی منہ پر کا لک آئے گی، میں گلزاری خالہ سے بات کروں گی وہ پال لے گی بچی کو۔۔۔ خدا کے واسطے حبیل تو مار پیٹ کر رہے گا، اگر گھر سے نکل گئی، کہاں کہاں بدنامی ہوگی حویلی کی۔“

”پلیز بھر جانی۔۔۔“ اس کے سننے کی طاقت جواب دے گئی۔ سارے بدن کے اعصاب بری طرح سے شل ہو رہے تھے۔ وہ منہ کھول کر سانس لیتے لٹی میں سر ہلار رہا تھا۔

”ایسا نہیں ہو سکتا۔۔۔ میں جانتا ہوں روائیہ کو، کوئی غلط فہمی ہے۔۔۔“ کہتے ہوئے وہ بھاری قدموں سے بے بی کاٹ کی جانب بڑھا۔ سانولی مٹی سی بچی چھوٹی چھوٹی آنکھیں سختی سے بند کیے بے سندھ بڑی تھی۔ اسے اٹھاتے ہوئے حبیل کو اپنے ہاتھ لرزاتے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔ وہ اب اس کے ہاتھوں میں تھی۔ اس کے جسم کی حرارت سے حبیل کو خود میں کوئی پدرانہ شفقت، محبت، ترس، ہمدردی کچھ بھی محسوس نہیں ہوا۔ وہ کڑوا ٹھونٹ نکلتے ہوئے بہت آہستگی سے بولا تھا۔

”ہو سکتا ہے لیبارٹری کی مشینری، کیمیکل خراب ہوں۔۔۔ روائیہ میرے ساتھ غلط نہیں کرے گی۔“
 وہ بچی کو اٹھائے باہر کی جانب نکلا تھا۔ بل پہلے ہی ادا ہو چکا تھا آئندہ اس کے ساتھ تھیں انہوں نے شکریا۔ کسی طرح حبیل نے خود پر قابو پالیا۔

ان کی گاڑی بڑک بردوز رہی تھی۔ بچی آمنہ بیگم کی گود میں تھی۔ حبیل بالکل کم صدمہ تھا نگاہیں پتھر کی طرح اسکرین پر جمی تھیں۔ آئندہ ٹھوڑی ٹھوڑی دیر بعد ماہم کی شادی اور اس کی بعد روائیہ کے رویے کے واضح بدلاؤ پر کوئی بات کر دیتیں۔ حبیل نے کئی بار کہا تھا۔

”پلیز چپ کر جائیں۔“ پھر جانے اس نے کیا سوچ کر اپنی گاڑی آغا خان لیبارٹری کی پارکنگ میں روک دی۔ بچی کو لے کر گیا۔ ٹیسٹ کے لیے بلڈ دے کر واپس آ بیٹھا۔ پھر تو اس نے نئی لہجہ کے آگے گاڑی روکی۔ آمنہ نے نوک بھی تھی۔

”تو پاگل تو نہیں ہو گیا حبیل۔۔۔ جگہ جگہ اپنا اور بچی کا خون دے رہا ہے۔۔۔ وہ پہلے ہی کمزور ہے، اس معصوم کا کیا قصور، کیوں اسے ایسے سزا دے رہا ہے۔ یہ یہ بچی پیدا ہوئی، میں اس کی گواہ ہوں اور مسلسل میں وہاں رہی کسی سے نہیں بدلی یہ بچی پھر کیا تصدیق کر رہا ہے، بتا تو دیا تجھے سب۔۔۔“ وہ چپ رہا۔ شام اتر چلی تھی وہ خود کھانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے اسلم کو فون کر کے گاڑی شہر منگوائی بچی اور آئینہ کو اس کے ساتھ حویلی بھجوا دیا۔ آمنہ کے پوچھنے پر بچی سے بولا تھا۔

”آ جاؤں گا۔۔۔ آپ جائیں۔“
 ”دیکھ حبیل میں نے تجھے بچوں کی طرح پالا ہے، خدا کے لیے کچھ اناسید حامت کرنا۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔۔۔ اگر تجھے کچھ ہو گیا کسی کو فرق نہیں پڑنے والا، میرا کلیجہ بچ جائے گا۔ چل تو بھی گھر۔۔۔ دفع کر۔۔۔ بات کرنا اس سے، مگر اپنا تو خیال کر۔“

”بھر جانی پلیز آپ جائیں میں آ جاؤں گا۔“
 وہ انہیں اسلم کی گاڑی میں بٹھا کر گاڑی اڑا لے گیا۔ آئندہ کادل مٹی میں مسلا گیا۔

اونگھتے جاگتے گزر رہی گئی۔ صبح وہاں کے چوکیدار نے چائے کا کپ لا کر اس کے سامنے رکھا۔ وہ خاموشی سے کپ پر تیرتی کتھتی رنگ کی سلوٹوں کو دیکھتا رہا۔ پیٹرول ڈلوانے کی وجہ سے کچھ جان بچان بھی چوکیدار نے خیر خیریت پوچھی تھی، مگر وہ چپ ہی رہا۔ ہر آنے والا لمحہ خوف کی صورت اس کے چہرے پر چمک جاتا سورج اوپر اٹھتے ہوئے باقاعدہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اپنی حدت اتارنے لگا۔ وہ چائے پی کر وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ واضح نہیں تھا اسے پہلے کہاں جانا ہے۔ ساری رات اس کے موبائل پر روانیہ اور بھر جانی کی کالز، میسجز آتے رہے۔ اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہی فون بند کر دیا۔ سڑک پر ریٹکتی گاڑی لینڈ کروزر خود بخود دھیرے کے آگے رکتی تھی۔

رپورٹس ہاتھ میں آنے پر اس کا شدت سے دل چاہا زمین آسمان پھٹ جائیں یا پھر سب رہیں صرف وہ اور روانیہ کہیں نہ ہوں۔ وہ بہت تیز ڈرائیو کرتا گاؤں کی جانب بڑھ رہا تھا گاؤں پہنچ کر گاڑی کا رخ خود بخود خود چوٹی کے بجائے ڈیرے کی جانب موڑ دیا۔ گاؤں میں دن خاصا روشن ہو چکا تھا۔ ڈیرے پر لوگوں کی چہل قدمی ضرور تھی، مگر اس طرح نہیں جس طرح اس کے یہاں سے جانے سے پہلے ڈیرہ آباد تھا۔ ایک وجہ میر ذکا بھی موجود نہیں تھے پھر خیام اور خلیل کے جانے سے بھی فرق پڑا تھا۔

اس کی گاڑی رکتے دیکھ کر دو مین لوگ محبت سے آگے بڑھے۔ وہ چہرے پر زبردستی مسکراہٹ سجائے حال احوال پوچھ اندر کی جانب بڑا۔ برگد کے درخت کے نیچے چار پائیاں پھٹی تھیں، حقہ بھی رکھا تھا، مگر لوگ نہیں تھے۔ وہ برآمدہ عبور کر کرے کی جانب بڑھا۔ بید سے بنی لکڑی کی کرسی پر رجسٹر پھیلائے اذلان بیٹھا کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس کے سائے کو دیکھ کر چونکا چند لمحوں کے لیے اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے میں۔ خوش کوار حیرت کا اظہار کرتے ہوئے دونوں ہاتھیں پھیلاتے ہوئے اٹھا۔

سورج ڈوب کر سارا فیصل آباد اپنی سیاہی دھونے کے لیے برقی قمقموں سے غسل لے رہا تھا۔ شہر کی رونقیں اسے فوج کنال لگ رہی تھیں۔ لیبارٹری سے اسے کال آچکی تھی اپنی رپورٹس لے جائیں، مگر اس میں اتنی سکت نہیں تھی وہ ان جگہوں پر جاتا جہاں شک کی دلیل موجود تھی۔ اس نے ساری رات ادھر ادھر گاڑی بھاگتے، پیٹرول ڈلواتے گزار دی اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کل کا سورج اس کے لیے کون سی اذیت لے کر چڑھنے والا ہے۔ دل کسی صورت ماننے پر آمادہ نہیں تھا اس کی معصوم سی بیوی اسے بھی دھوکا دے سکتی ہے۔ دھوکا بھی ایسا جو بھی مٹانے سے بھی نامٹ پائے۔ دس ماہ کے گزرے پل۔ باری باری دماغ میں کلبلانے لگے۔

روانیہ کا ادا کیا ایک ایک جملہ اب تھوڑوں کی طرح ساعتوں پر برس رہا تھا۔ ”اگر کوئی غلطی کر کے معافی مانگے، معاف کر دینا چاہیے؟ خواہ غلطی کتنی ہی بڑی ہو۔“ تم اکیلے کہیں بھی جاسکتے ہو، جتنے مرضی عرصہ کے لیے وہ اچھا لگتا ہے، میں کہیں چلی جاؤں وہ اچھا نہیں۔۔۔ کیوں؟ میں بھی انسان ہوں، کچھ خواہشیں ہیں، تنہائی بہت کچھ سکھا دیتی ہے، ”تم سے شادی کر کے بچھڑاؤں ہوں۔۔۔ وہ مجھ سے ناراض تھا۔۔۔ ہمارا جھگڑا ہو گیا تھا۔ تم آؤ گے پھر سب بتا دوں گی۔۔۔ مجھے اس سے ضروری بات کرنا تھی، وہ شادی سے منع کر رہا تھا، ناراض ہے مجھ سے، میرے پاس بھی ایک خبر ہے، لیکن تم غصہ کرو گے، اب بتا رہی ہو۔ تمہیں بہت کچھ بتانا ہے، جو تم جانتے ہو وہ بھی، جو نہیں جانتے وہ بھی۔“ خلیل کا دماغ پھٹنے کو تھا۔

☆☆☆

صبح کا سورج معمول کے مطابق اپنی تپتی کرنیں شہر کے درو دیوار پر گرا رہا تھا۔ رات کے جانے کس پہر اس نے اپنی گاڑی کسی پیٹرول پمپ پر ٹھکڑی کی اور سوچتے سوچتے وہاں ہی آنکھ لگ گئی۔ پمپ کے ورکر نے آ کر اسے جگا کر وجہ پوچھی وہ اٹھ کر ان کے بنے ویننگ پنج پر بیٹھ گیا۔ سیاہ رات

”شکر ہے آپ کو میری یاد آ رہی گئی۔۔۔“
منہل سے لپٹ کر کمر پر زور کی پھٹکی دیتے شکوہ کیا
”کل سے کہاں تھے آپ۔۔۔ سب پریشان
ہو رہے تھے۔“

”سب میں کون۔۔۔؟“ وہ اس سے الگ
ہوتے ہی سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

”سب میں سب۔۔۔ امی، میں، اعشال اور
آپ کی مسز۔۔۔“ منہل کے لیو کو زنجی مسکراہٹ
نے چھوڑا تھا۔ آنکھیں موندتے ہوئے کرسی کی پشت
سے سر نکالنا قدرے پھل کر آرام وہ انداز میں بیٹھ
گیا۔ اذلان حیرت سے دیکھتے ہوئے انہیں سمجھنے کی
کوشش کر رہا تھا۔ دل کا چور زور زور سے دھڑکنے لگا۔

اسے یقین سا ہو گیا تھا۔ چاچی نے انہیں سب بتا دیا
ہے تب ہی یہاں اکیلے میں ملنے آئے اور اب جانے
اس کے ساتھ کیا کرنے والے ہیں۔ اس نے اپنے
دفاع میں جیلے سوچنے شروع کیے نیا جملہ ذہن میں
آتے ہی پرانا نکل جاتا تھا۔ لٹنے اور لوٹنے والے میں
بہت فرق ہے، لٹے ہوئے شخص کا نقصان اس کا گزرا
کل ہے جو کبھی نہیں کی طرح سینے میں ابھرتا ہے، مگر
وقت بھول کا سر ہم رکھ دیتا ہے، جب کہ لوٹنے والے
نقص کا جرم اس کا ہر آنے والا کل بن کر کسی کام کا
نہیں چھوڑتا۔ اس کا جرم ظاہر ہو جانے کا خوف پوری
زندگی کی بے سکونی بن جاتا ہے اور یہی بے سکونی
اذلان کی زندگی کا ہر آنے والا بل بن گئی تھی۔

منہل نے بیک سے سر اٹھا کر جب اسے دیکھا
خوف بھری ہر اذلان کے سارے بدن میں تیری۔

”تم شادی پر کیوں نہیں گئے تھے؟“
اذلان کو یہ سوال بہت مختلف اور عجیب لگا تھا، مگر
اسے اندازہ تھا منہل سچ اگلوانے کے لیے ایسے کھما پھرا
کر باتیں کرتا ہے، بندہ اپنے دام میں خود آ جائے، مگر
اذلان کو پھنسا نہیں تھا۔ وہ انجان بن کر بولا۔

”کون سی شادی۔۔۔؟“

”میرے پیچھے کتنی شادیاں ہوئی ہیں۔“ منہل
کے لہجے میں کوفت بھری تھی۔ ”میں رضاحیات کی بیٹی

کی شادی کا پوچھ رہا ہوں۔۔۔؟“
”اوہ۔“ اس کے ہونٹ ”اوہ“ میں سکڑے پھر
یاد مل انداز میں بتاتا تھا۔ ”چاچی اکیلے جانا چاہ رہی
تھیں، پہلے مجھے آ کر سختی سے فتح کیا میں ناجاؤں، پھر
امی سے کہہ دیا، لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہیں۔“
اس نے جواباً لٹی میں سر ہلایا۔ ”ویسے ہی“ پھر
توقف سے پوچھا۔

”جب وہ آیا تھا۔ جنڈب، تم اس روز کہاں
تھے۔۔۔؟“

”بابا کے ساتھ ابھی تھا۔ مگر آپ۔۔۔؟“
اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی اس نے بات
کاٹ دی۔

”اس کا اور روانہ کس بات پر جھگڑا تھا۔۔۔“

کیوں معافی مانگنے آیا تھا۔۔۔ روتو ہوا ہوگا۔۔۔؟“
”اس بات کا مجھے بالکل علم نہیں۔۔۔“ آپ وہ
جان کر نہیں بلکہ سچ سچ حیران تھا۔ اسے حیرت تھی کہ
اگر انہیں اس رات کا پتا چل گیا تو اب تک تو میری
بونیال کر دیتے۔ لیکن وہ تو کچھ اور ہی پوچھ رہے ہیں،
جو وہ بھی نہیں جانتا۔

”تمہیں کسی بات کا علم نہیں۔“ وہ غصے میں کرسی
سے اٹھا تھا۔ ”جہاں تک مجھے علم ہے، تمہاری اور اس
کی بہت دوستی ہے، ہر وقت، ہر قسم کی، پھر تمہیں کیوں
نہیں پتا، اتنا سب کچھ ہو گیا میرے پیچھے اور تم لا علم
ہو۔“ منہل کے انٹنے پر وہ جھٹکے سے پیچھے ہوا، سانس
رک گئی۔ اسے لگا چند منٹ بعد وہ زندوں میں نہیں
ہوگا، مگر وہ ابھی کچھ اور بھی کہہ رہا تھا جس نے اذلان
کی رکی سانس بحال کی۔

”پہلے تو ہر وقت تم چاچی چاچی کے آگے پیچھے
گھومتے تھے، پھر تم نے کیوں نہیں پوچھا، کیا جھگڑا تھا
ان کے سچ۔“ چند لمبے لگے تھے اسے یہ سمجھنے میں مسئلہ
کچھ اور ہے اور یہی وہ وقت تھا جب وہ منہل کے سامنے
اپنا مکمل اعتماد ٹھاسکتا۔ وہ سنہیل سنہیل کر بولا تھا۔

”چاچو۔۔۔ دراصل آپ کے جانے کے بعد
۔۔۔ چاچی بہت عجیب ہو گئیں تھیں۔ خواہ مخواہ غصہ کرنے

والیس اور اس شادی پر سے آ کر تو میری بات کا جواب تو دور کی بات جہاں میں ہوتا وہاں بیٹھنا پسند نہیں تھا، کتنی بار پوچھا بس ایک ہی جواب، مجھے یہاں سے جانا ہے۔ پھر میں کیا پوچھتا۔۔۔ وہ اتنی معصومیت بھرے انداز سے کہہ رہا تھا۔ حبل کیا کوئی اور بھی دیکھتا تو اسے دنیا کا آخری معصوم کہہ کر مہر لگا دیتا۔ حبل کے خون کا درجہ حرارت آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔۔۔ اپنے جڑے سختی سے بھیج کر آواز کی کرختی کو کچھ قابو کیا۔

”میں ڈیرے پر بیٹھا تھا، گھر کی ایک ایک بات پتا ہوتی تھی مجھے۔۔۔ تم یہاں بیٹھ کر بھی حبل نہیں بن سکے۔“ وہ کہہ کر رکنا نہیں تیزی سے باہر کی جانب قدم بڑھائے عقب سے اس نے ہانک لگائی۔

”اب کدھر جا رہے ہیں، آپ؟“

”حبل کہہ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ اذلان کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ آخر بات کیا ہے۔ جنڈب والا کیا قصہ ہے۔۔۔ البتہ اتنا اندازہ ہو چکا تھا چچی نے اچھی اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا وہ خود کو مزید محفوظ کرنے کے لیے جلدی سے ان کے پیچھے ہوا تب تک حبل اپنی کاہی لینڈ کروڑاڑا تا نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا پیچھے صرف وہ گرد و غبار تھا جو نازروں اور سالنکس نے چھوڑا تھا۔ اذلان نے اپنی جیب نکالی اور اس رستے پر ڈال دی۔

☆☆☆

کاہی لینڈ کروڑاڑا اور جیب آگے پیچھے حویلی میں داخل ہوئی تھیں۔ اور وہ آسانی برق کی طرح گاڑی کا دروازہ بند کر عمارت کی جانب بڑھا تھا۔ ہاتھ میں چند فائلز پکڑ رکھی تھیں اس کے سفید چہرے سے نارنجی آگ جیسے شرارے نکل رہے تھے۔ بہت دیر ڈیرے پر بیٹھ کر وہ سمجھ رہا تھا اپنے غصے کو قابو کر لے گا۔ کسی طرح روانیہ کا سامنا نہ کرے، جانے غصے میں کیا سے کیا کر ڈالے۔ مگر جوں جوں وقت گزرا تھا اس کا خون ایسے ہی ابل رہا تھا۔ جیسے کوئی ہانڈی چولہے پر

رکھ کر بھول جاؤ جسے جسے وقت گزرے اس کے سڑنے کی بو اور دھواں بڑھنے لگے۔ ایسی ہی حالت اس وقت حبل کی تھی۔ اس نے دھاڑ سے اسے کمرے کا دروازہ کھولا تھا۔ لاؤنج میں آئینہ اور سلوکی کچھ بات کر رہی تھیں اس کی دھواں دھار آمد پر چونگی جیسے ہی وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھا آئینہ اور اس کے پیچھے پیچھے سلوکی اور اعشال گئی تھیں۔ سلوکی اور اعشال کھلے دوازے میں رک گئیں البتہ آئینہ تیزی سے اندر داخل ہوئیں وہ ستے چہرے اور کدھر بھرے انداز میں یک لخت دھاڑا۔

”کیا ہے یہ؟“

آنکھوں پر کپہنی رکھے وہ بیڈ پر لیٹی تھی۔ اور مسلسل حبل کو سوچ رہی تھی کہ آخر کہاں ہے فون بھی نہیں اٹھا رہا۔ تاکسی میج کا جواب بھر جانی سے کئی بار پوچھا انہوں نے ہوں ہاں کر کے ٹال دیا۔ پریشان وہ بھی بے حد تھیں۔ لیکن اب جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوا انہیں آنے والے طوفان کا بخونی اندازہ ہو گیا تھا۔ اب اس طوفان کی لپیٹ میں کون کون آتا ہے یہ اندازہ لگانا ہی الوقت ناممکن تھا۔ وہ اسی لیے پیچھے پیچھے آئی تھیں۔ حبل کی آواز پر روانیہ کے بری طرح چونکنے پر وہ خود بھی ڈگمگائیں۔

اس نے آنکھوں سے کپہنی ہٹاتے تعجب سے حبل کو دیکھا اس کا لب و لہجہ سمجھ سے باہر تھا۔ کل تک تو اسے سہارا دے کر کہہ رہا تھا ”گھر آ کر بتاؤں گا۔“ مگر یہ کیا۔ وہ کپہنی کے سہارے سے نقاہت زدہ سی لگی۔

”کیا مطلب کیا ہے۔۔۔۔۔ بیٹی ہے۔“ حبل کو اپنے اندر شعلہ بھڑکتا محسوس ہوا تھا۔

”مطلب جانتی ہو اس لفظ کا؟“ اس کا انداز، لفظ آواز کوئی ایک بات بھی تو اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ وہ بیڈ سے ٹیک چھوڑ کر آگے کو ہوئی۔ حبل جڑے سختی سے جمائے اسے کھا جانے کی حد تک گھور رہا تھا۔

”تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔“ وہ بیڈ سے پاؤں لٹکاتی اٹھنے لگی۔ ”مجھے سمجھ نہیں آیا۔“

”سمجھ تو میں نہیں سکا تمہیں۔“ وہ تند نگاہوں سے

نہیں آ رہا تھا۔ آئندہ بار بار ماتھے سے پسینہ پونچھتی آگے کو بڑھیں تیزی سے کمرے کی جانب بڑھتے اذلان کے قدم چوکھٹ پر رک گئے۔

☆☆
(باقی آئندہ)

”کرن کا دسترخوان“

اب ہر ماہ کرن کے ساتھ مفت حاصل کریں

کرن کا دسترخوان میں 6 رین کی حرکت کے لیے سلسلہ
”کچن اور آپ“ شروع کیا جا رہا ہے۔
آپ اس میں حصہ لیں اور تین ماہ کے لیے کرن (مفت) حاصل کریں

سوالات یہ ہیں

- 1- آپ کیا سمجھتی ہیں کمانے کے لیے جیا جاتا ہے یا جینے کے لیے کھایا جاتا ہے؟
- 2- گھر کے کام کا ج خصوصاً کچن میں آپ کی دلچسپی کس حد تک ہے یا پڑھنے کا شوق آپ کو ان تکھڑوں سے دور رکھتا ہے؟
- 3- ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا کہ کمانا حوصلے دار ہی کے، کبھی کبھی نتائج برعکس بھی ہوتے ہیں۔ ایسے میں کمانے والوں کے کیا تجربے ہوتے ہیں؟
- 4- کوئی راہنہ کو پڑھتے وقت کھانا دھواں ہوا۔ اس سے حلق کوئی یا دھار کا واقعہ؟
- 5- عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ”ان“ کے دل میں اترنے کا راستہ سادے سے ہو کر گزرتا ہے۔ آپ اس خیال سے کہاں تک اتفاق کرتی ہیں اس سلسلے میں کوئی تجربہ ہو تو ”تعمیر“ احوال لکھیں۔
- 6- لوگ آپ سے زیادہ تر کس دوش کی فرمائش کرتے ہیں؟ آپ ہمیں اس دوش کی ترکیب بتائیں۔
- 7- پہلی دوش کون سی بنائی اور گھر والوں کے کیا تجربے تھے اس دوش پر؟
- 8- کوئی دوش کو کچھ کرنا آپ کے والد، بھائی یا شوہر کو کھانا جاتا ہے اور پھر ان کا کیا رد عمل ہوتا ہے؟
- 9- گھر والوں کی پسند کی کوئی ایسی دوش جو آپ کو کھانا کو اکر گزرتی ہے؟
- 10- ایسے کون سے آپ کے کدھے دار یا پڑھنے کے دوست احباب ہیں جن کی خاطر موضوع کے لیے کچن میں جانا آپ کے لیے سخت نا پسندیدگی کا باعث ہوتا ہے؟
- 11- سرال میں کیا پہلی چیز بناتی؟
- 12- آپ کے خاندان کی کوئی انکس دوش؟

اسے گھورتا دو قدم آگے بڑھا۔ ”میں سمجھتا تھا دنیا کی معصوم، نیک، بے وقوف لڑکی میری بیوی ہے۔ یہ نہیں پتا تھا اتنا سب کچھ کس خاموشی سے کرے گی۔ وہ۔“
”جنبل۔! سبھی ہرئی کی طرح دیکھتے اس کی آواز لرز گئی۔ تھوک نکل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔
”ایم سوری جنبل۔۔۔ رینی، ویری سوری۔“

اس کا خجالت سے بھرا ”سوری، رینی ویری سوری“ جنبل کے چلتے بدن پر پیٹرول کی طرح آگرا تھا۔ روپورس لے کر ڈیرے اور ڈیرے سے گھر تک آنے کے دوران اسے مبہم سا گمان تھا شاید کہیں کوئی غلطی ہوئی ہو، شاید یہ خواب ہو کوئی جگا دے، کوئی کہہ دے یہ جھوٹ ہے، اذلان کوئی سرا ہاتھ دے دے یا روانیہ ہی کہہ دے ایسے نہیں ہے، اگر وہ کہہ بھی دے تو پھر کیا ہے۔ کیوں ہے، آخری اس کی بیٹی کا ڈی۔ این اسے سچ کیوں نہیں کر رہا، وہ پری پیچور کیوں ہے۔ شاید روانیہ ہی کہہ دے یہ اس نے جہنم نہیں دی۔ مگر وہ تو بہت آرام سے اپنی غلطی کا اعتراف کر رہی تھی۔

اتنا سب کچھ کر لینے کے بعد ”سوری۔“ اس کے اتنے بے باک سوری پر جنبل کے ہاتھوں کی ہڈیاں اکڑتے ہوئے مٹھی میں پیچھے گئیں جلد پر سبز روئیں کا تن کر جال ابھر آیا۔ پیچھے جبڑوں میں گہری ہوئی سانسوں نے خون میں شرارے دوڑا دیے اس کا جی چاہا ہاتھ بڑھا کر اس کی راج ہنس جیسی گردن دبوچ لے اور اتنا دبوچے کہ وہ اگلی سانس بھی نہ لے سکے۔ مٹھی ہنسنیں اچکا کر آکھیں پھاڑا وہ اس کے مقابل تنا تھا۔ شدید غصے سے جنبل کے گلے کی گٹھلی تیزی سے گردن میں تیرنے لگی۔

”یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی، مجھے بتایا ہوتا عزت سے چھوڑ دیتا۔ میرے منہ کو داغ دار کرنے کی جرات کیسے کی تم نے۔“

چپا چپا کر لفظ ادا کرتے آخر میں وہ اتنی زور سے دھاڑا کمرے اور کمرے سے باہر کھڑے نفوس ہی طرح سے لرز گئے، اب کیا ہو گا کسی کی سمجھ میں



بالکل پسند نہ آئی۔ انہوں نے بھائی کی پسند کو ہونانے سے انکار کر دیا۔ اور بھائی کی شادی اپنی بھانجی سے کروا دی۔ بھائی اپنی محبت کی ناکامی پر اس قدر دل برداشتہ ہوئے کہ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ نہ ہی ہوم یوشن لیں گے اور لڑکیوں کو تو ہرگز نہیں پڑھائیں گے! ”اب کے غم نے کھل کر وضاحت کی۔“ ”اوہ۔۔۔ اب میں کہاں سے نیچر تلاش کروں گی!“ فروا فکر مند لہجے میں بولی۔

تم پریشان نہ ہو، ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ تم بھی تلاش جاری رکھو کوئی نہ کوئی اچھا نیچر مل ہی جائے گا!“ غم پر اس کو حوصلہ دیتے ہوئے بولی۔ دین نے ہارن بجایا تو غمراٹھ کھڑی ہوئی۔ اچھا میں چلتی ہوں کل ملاقات ہو گی!“ وہ کہتے ہوئے کالج سے باہر نکل گئی۔



”واہ بھابھی! کھانا تو آپ نے لا جواب بنایا ہے۔“ حسن بھائی کھامیں گے تو انگلیاں چاٹتے رہ جائیں گے! ”غم غم تو صدفی انداز میں بولی۔

”کھانا واقعی اچھا بنا ہے؟“ سارہ بے یقینی سے پوچھ رہی تھی۔

”جی بھابھی! کھانا واقعی لذیذ ہے!“ غم پر زور انداز میں کہتے ہوئے مسکرائی۔

”ارے بھابھی کیا ہوا؟“ سارہ کو بے تحاشہ دے ہوئے دیکھ کر غمراٹھ اگر بولی۔

”ابھی حسن آئے تھے وہ تو کھانا کھائے بغیر ناراض

”کیا ہے یہ بی اے کی انگلش، نری مصیبت ہے ایک لفظ بھی پلے نہیں پڑ رہا۔ پیپرز سر پر ہیں اور کوئی نیچر ہوم یوشن کے لیے بھی نہیں مل رہا!“ غمراٹھ مسکراتے ہوئے فروا کی پریشانی سن رہی تھی۔

”تم مسکرا رہی ہو اور میری جان پر بنی ہے۔ تمہارے تو بھائی نیچر ہیں جو مشکل ہوتی ہو گی پلک جھپکتے میں دور کر دیتے ہوں گے!“ فروا رشک بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”ہاں یہ تو ہے!“ غمراٹھ کے لہجے میں اطمینان تھا۔ ”آئیڈیا۔۔۔ غمراٹھ کیا تمہارے بھائی مجھے ہوم یوشن دے سکتے ہیں!“ فروا چٹکی بجاتے ہوئے بولی۔ ”ارے نہیں یہ ممکن نہیں ہے!“ غمراٹھ نفی میں گردن ہلائی۔

”دیکھو میں تمہارے گھر آ جا کر سوں گی۔ زیادہ ٹائم بھی نہیں لوں۔“ صرف ایک گھنٹے کا سوال ہے بابا!“ فروا ہاتھ جوڑتے ہوئے منت بھرے انداز میں بولی۔

اس کے انداز پر غمراٹھ بمشکل اپنی ہنسی روک پائی۔ ”فروا بات آنے جانے کی نہیں ہے دراصل بھائی لڑکیوں کو یوشن نہیں پڑھاتے۔“ غمراٹھ نے مجبوری بتائی۔

”کیوں بھی یہ کون سا نیا اصول فیما غورث ایجاد ہو گیا ہے کہ لڑکیوں کو یوشن پڑھانے پر پابندی لگا رکھی ہے!“ فروا شور مچاتے ہوئے بولی۔

”اصل بات یہ ہے کہ بھائی کسی لڑکی کو پڑھانے اس کے گھر جاتے تھے۔ بھائی کو اس لڑکی سے محبت ہو گئی۔ وہ خاصی ماؤرن اور آزاد خیال تھی۔ اسی کو وہ لڑکی

ہو کر حلے گئے!“ سارہ روتے ہوئے بولی۔

”لیکن کیوں؟“ غبر سوالیہ انداز میں حیرت سے پوچھنے لگی۔

”وہ کہہ رہے تھے کہ کھانا بہت بد ذائقہ ہے اور
ہموں نے کھانے کے برتن بھی پھینک دیے۔ حسن
کو تو میری کوئی بات بھی اچھی نہیں لگتی۔ میری ذات
میں کیڑے نکالنا ان کی عادت بن گئی ہے۔ میری ذات
سے اعتماد تک ختم کر دیا ہے۔ اب تم خود ہی بتاؤ کہ
میں تمہاری تعریف کو حقیقت سمجھوں یا ان کی برائی کو

!“ وہ آبدیدہ ہو کر بولی اور اٹھ کر چلی گئی۔
”حسن بھائی بھی حد کر دیتے ہیں سارہ بھابھی کا دل
دکھانے کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔
ناجانے اپنی ناکام محبت کا بدلہ کب تک بھابھی سے لیتے
رہیں گے!“ غبر دھکی دل سے سوچ رہی تھی۔



”کیا بات ہے بہت خوش لگ رہی ہو؟“ فروا کو چمکتا



ہوا دیکھ کر غبرنے پوچھا۔

ایک بڑی اچھی خبر ہے۔ ابو کے جانے والے نے ایک ٹیکسار کا بتایا ہے۔ انگلش میں ایم فل کر رہے ہیں۔ بے حد گریس فل پر سنبھلی ہے۔ فرزا انگلش بولتے ہیں! ”فرزا خوشی سے دیوانی ہو رہی تھی۔ چلو بھئی تمہارا یہ مسئلہ تو حل ہوا!“ غبر مسکراتے ہوئے بولی۔

”غبر وہ اتنے سمارٹ ہیں کہ ٹین ایجر کو پیچھے چھوڑ رہے ہیں!“ فرزا راجوش لہجے میں بولی۔
 ”ویسے مجھے لگ رہا ہے کہ محترمہ کی ٹیچر میں زیادہ دلچسپی ہے اور پڑھائی میں کم۔ اگر کسی عالم رہا تو بی اے میں آپ کی سہلی سو فیصد کی ہے!“ غبر ہنسی۔
 ”ہائے اللہ نہ کرے!“ فرزا نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”اچھا اب یہ ٹیچر نامہ بند کر دو۔۔۔ جلوباب اگلی کلاس اشارت ہونے والی ہے۔“ غبر نے اسے بازو سے کھینچتے ہوئے کہا۔



”بھائی آپ لوگ کہیں جا رہے ہیں؟“ غبر نے حسن کو تیار ہونا دیکھ کر پوچھا۔

”ہاں ایک جگہ ڈنر ہے وہیں جا رہے ہیں۔۔۔ لوگوں کو بھی ناجائز کیا سو بھتی ہے بیگمات کو کبھی ساتھ مدعو کر لیتے ہیں!“ اس نے کہتے ہوئے غصے سے سر جھٹکا۔
 ”حسن بھائی یہ تو اچھی بات ہے کہ سارہ بھابھی بھی آپ کے ساتھ چلی جاتی ہیں ان کے اعتماد میں اضافہ ہوتا ہے!“ غبر نے قائل کرنے والے انداز میں بولی۔
 ”اعتماد۔۔۔ اس کے ساتھ تو میرا اعتماد ختم ہو جاتا ہے۔ ناجائز کس دل سے لوگوں سے اس کا تعارف کرواتا ہوں۔۔۔ امی نے پتا نہیں دنیا سے جاتے جاتے مجھ سے کس بات کا بدلہ لیا جو اس ایف اے پاس کو میرے پلے باندھ سکیں۔“ حسن کا ذہر اگلتا لہجہ غبر کو دکھی کر گیا۔
 ”حسن بھائی اب سارہ بھابھی اتنی بھی گزری

نہیں ہیں۔ بلکہ مجھے تو اکثر لگتا ہے کہ آپ کے رویے نے ان کی شخصیت کو بدسا دیا ہے کہ وہ خود کو جاہل سمجھنے لگی ہیں!“ غبر نے سارہ کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔

اسی دوران سارہ آگئی نیلے رنگ کی ساڑھی میں ہلکا سا میک اپ کیے وہ بے حد اچھی لگ رہی تھی۔
 ”بھابھی بہت اچھی لگ رہی ہیں!“ غبر نے دل سے تعریف کی۔ حسن نے سارہ کی سادہ سی تیاری پر تنقیدی نگاہوں سے گھورا تھا۔ سارہ اس کی نظروں کی رہی سمجھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی۔

”بھائی اگر آپ کا پیار اور تھوڑی سی توجہ انہیں مل جائے تو ان کی شخصیت کی یہ بے اعتمادی جو آپ کو تکلیف دیتی ہے ختم ہو سکتی ہے۔“ غبر نے ایک مرتبہ پھر اسے سمجھایا۔

”تم خواہ مخواہ اس جاہل کی وکالت کر رہی ہو۔ لکھو ایسی شکلیں بدلنے والی نہیں ہوتی۔“ حسن شعلہ ہار نگاہوں سے اسے دیکھتا ہوا ہر نکل گیا۔ تو سارہ بھی آنکھوں میں آنسو لیے خاموشی سے اس کے پیچھے چل پڑی۔



”کیا ہوا غبر کچھ اپ سیٹ لگ رہی ہو!“ فرزا سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔
 ”ہر روز ایک حوا کی بیٹی کی آدم کے بیٹے کا ہاتھوں توہین و تذلیل دیکھتی ہوں تو پھر اپ سیٹ تو ہونا ہی ہے۔“ غبر دکھ بھرے انداز میں بولی۔
 ”اوہ لودی تمہارے بھائی اور بھابھی کا مسئلہ؟“ لہا نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

”ہاں وہی مسئلہ۔۔۔ فرزا یہ مرد بھی کتنے عجیب ہوئے ہیں۔ زبردستی اپنی پسند کے خلاف شادی تو کر لیتے ہیں مگر پھر اس زبردستی کی سزا ساری زندگی اس لڑکی کو دیتے ہیں۔ جو بالکل بے تصور ہوتی ہے۔ ویسے بھی یہ مگون سا لڑکیوں کی طرح مجبور ہوتے ہیں جو بالکل

نے پوچھا۔
”نہیں وہ کہہ رہے تھے کہ ضروری کام ہے تم لوگ کھانے پر میرا انتظار نہ کرنا!“ سارہ نے کہا۔
”یہ بھائی کچھ زیادہ ہی باہر رہنے لگے ہیں!“ عنبر تشویش بھرے انداز میں بولی۔

”اچھا ہے باہر رہتے ہیں کم از کم خوش تو رہتے ہیں!“ سارہ نم لہجے میں بولی۔

ہائے ری حوا کی بیٹی تو کس مٹی کی بیٹی ہے کہ ہر حال میں اپنے مجازی خدا کی خوشی کی فکر ہوتی ہے۔ جب کہ تیرا مجازی خدا اس کو شش میں رہتا ہے کہ خوشی کو جتنا ہو سکے تیری زندگی سے دور کر دے!“ عنبر نے سوچا۔



”بہت خوش لگ رہی ہو؟ ہو گئی تمہارے نیچر کی برتھ ڈے!“ عنبر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”ہول بہت مزا آیا۔۔۔ وہ مجھے بعد میں آکس کریم کھلانے بھی لے کر گئے ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر لگ رہا تھا جیسے میں ہواؤں میں اڑ رہی ہوں۔ اس قدر خوش گوار لمحہ تھا جی چاہ رہا تھا کہ وہ یونسی سدا میرے ساتھ رہیں۔“ وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔

”اوہ! ایلو خیر تو ہے محترمہ آج تو بہت افسانوی باتیں ہو رہی ہیں!“ عنبر نے شرارت سے اسے چھیڑا۔
”نہیں عنبر میں کوئی افسانوی باتیں نہیں کر رہی۔“

مجھے لگنے لگا ہے کہ شاید مجھے اپنے نیچر سے محبت ہو گئی ہے۔ پہلے تو میں ان کی سحر انگیز شخصیت سے متاثر تھی مگر اب ان کی محبت میرے دل و دماغ پر قابض ہو گئی ہے۔“ فردا دیوانوں کی طرح دور خلاؤں میں گھورتی ہوئی بولی۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں! سنہا لو اپنے آپ کو اگر کسی لڑکی کی کان میں یہ خبر پڑ گئی تو خواہ خواہ پورے کان میں بات پھیل جائے گی۔“ عنبر نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”بھیلی ہے تو پھیلنے دو یہ خبر مجھے کوئی پروا نہیں ویسے بھی عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔“ فردا

کرے گے تو تمام عمر بد دعا میں اور سزا میں ان کا پیچھا کرتی ہیں۔۔۔ یہ تو بالکل ٹیٹ کی طرح ہوتے ہیں۔ پر جھاڑے اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ کسی کی بد دعا اور ناراضی ان کا کیا بگاڑ دیتی ہے!“ دکھ سے کہتے ہوئے عنبر کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

”عنبر ڈنٹ وری۔۔۔ بایوس نہ ہو اللہ ایک دن سب کچھ اچھا کر دے گا۔“ فردا نے اسے محبت سے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

اور تم سنناؤ! تمہارے وہ ہینڈ سم سے نیچر کیسے ہیں!“ عنبر نے تلخ موضوع سے اپنا دھیان ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

وہ بالکل فٹ فٹ۔۔۔ بے حد فرینڈلی ہیں۔۔۔ بہت خوش مزاج ہیں۔“ فردا جوش سے بولی۔

”یعنی خوب صورتی اور خوب سیرنی دونوں یکجا ہیں!“ عنبر ہنسی۔

”بالکل۔۔۔ تمہارے بھائی کا سنتی ہوں تو مردوں سے خوف آنے لگتا ہے اور جب اپنے نیچر کا سوجھی ہوں تو لگتا ہے سب مرد بڑے نہیں ہوتے۔۔۔ ہائے کاش! وہ میرے آج فیلو ہوتے۔“ فردا نے آہ بھرتے ہوئے عنبر کے کندھے پر سر رکھ دیا۔ ارے ارے خود کو سنہا لو۔۔۔ مجھے تو لگتا ہے انہوں نے تمہارے اوپر جادو کر دیا ہے۔“ عنبر کی دہائی پر فردا مسکراتے لگی تھی۔

”آج میں نے لاسٹ پیڑی تک کرنا ہے!“
”کیوں؟ آج تو بہت اہم لیکچر ہے!“ عنبر حیران ہوئی۔

”وہ اصل میں آج میرے نیچر کی برتھ ڈے ہے۔ میں نے ان کے لیے گفٹ لینے مارکیٹ جانا ہے تم چلو کی میرے ساتھ؟“ فردا نے بتایا۔

”نہیں فردا تم جلی جاؤ۔۔۔ میں پیڑی نہیں مس کر سکتی!“ عنبر نے مجبوری ظاہر کی۔ اور فردا نے اکیلے جانے کا ارادہ پختہ کر لیا۔



”سارہ بھابھی! بھائی ابھی تک نہیں آئے!“ عنبر

”لیکن فروا... میری جان یہ کہاں کی عقل مندی ہے۔ تمہارے بچہ تم سے عمر میں بڑے ہیں۔ مجھے تم سے اس بے وقوفی کی امید ہرگز نہیں تھی!“ غمزدہ افسوس بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”محبت کا عمر سے کیا تعلق ہے؟ یہ ان تمام باتوں سے بے نیاز ہوتی ہے!“ فروا نے اپنے موقف کی حمایت میں بولی۔

”محبت... یہ صرف پاگل پن ہے جسے تم محبت کہہ رہی ہو۔ باز آجاؤ ورنہ ساری عمر بچھٹاتا پڑے گا!“ غمزدہ نے محبت سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”سچی محبت انسان کو کبھی بچھٹاتے نہیں دیتی میرا ایمان ہے اس بات پر!“ فروا مضبوطی سے بولی۔

”فروا! کیا تمہاری محبت یکطرفہ تو نہیں؟“ انجان خدشے میں گھر کر غمزدہ بولی۔

”زبان سے تو انہوں نے مجھے اظہار نہیں کیا مگر غمزدہ ہر بات زبان سے تو نہیں کہی جاتی میں نے ان کی نگاہوں میں اپنے لیے پسندیدگی اور پیغام محبت دیکھا ہے۔ وہ صرف اپنے بچہ ہونے کی وجہ سے ابھی تک اظہار نہیں کر پار ہے، ورنہ ڈھکے چھپے الفاظ میں تو اکثر اپنی محبت کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔“

”سوچ لو فروا کل کو تمہیں اپنے اسی وقتی جذبے پر ہنسی آئے گی!“ غمزدہ غمزدہ ہو کر بولی۔

ایک دفعہ نہیں ہزار دفعہ سوچ چکی ہوں کہ میں صرف ان سے ہی شادی کروں گی!“ فروا نے فیصلہ کن انداز میں کہتے ہوئے منہ پھیر لیا۔



بھابھی! حسن بھائی ابھی تک نہیں آئے!“ غمزدہ پوچھا۔

”کافی دیر ہو گئی ہے۔“ سارہ پریشانی سے بولی۔

”بھائی اب بہت لیٹ آنے لگے ہیں۔ مجھے ٹیسٹ کے متعلق بہت ضروری بات کرنی تھی۔“ مہر بولی۔

”ہاں اب تو ان کا زیادہ وقت باہر ہی گزرتا ہے۔“

افسردگی سے بولتے ہوئے کلاس کی طرف چل پڑی۔

غمزدہ سارا دن غور کرتی رہی کہ فروا موجود تو کالج میں ہے مگر اس کا دل و دماغ کہیں اور ہی ہے۔ پورا دن اس نے بہت بے زاریت سے گزارا لیکن پھر کے دوران پھر بھی بہت دفعہ اس کو متوجہ کرنے کے لیے لگتی رہی۔

... سارا دن اس کے دل پر اداسی کا اثر رہا تھا۔

اگلے دو دن تک فروا کالج نہیں آئی تو غمزدہ کو فکر لاحق ہوئی۔ وہ غیر ذمہ دار تو بالکل نہیں تھی۔ کبھی اطلاع دیے بغیر چھٹی تو نہیں کرتی۔ غمزدہ نے بیگ سے موبائل نکالا اور فروا کا نمبر ملایا مگر اس کا فون آف جا رہا تھا۔ غمزدہ کی پریشانی دگنی ہو گئی۔ فروا کی فکر اتنی حاوی ہوئی کہ غمزدہ اس کے گھر پہنچ گئی۔ دروازہ اس کی امی نے کھولا۔

”السلام علیکم آئی۔ فروا کیسی ہے؟ خیریت تو ہے نا!“ وہ اندر آتے ہوئے بولی۔

”کیا باتوں بیٹا اس لڑکی نے تو ہمیں مصیبت میں ڈال دیا ہے!“ فروا کی امی بہت پریشانی سے بولیں۔

”کیا ہوا آئی!“ غمزدہ گھبرا گئی۔

”نیند کی گولیاں کھا کر خود کشی کی کوشش کی ہے اس لڑکی نے بہت مشکل سے اس کی جان بچی ہے!“ وہ کہہ کر زار و قطار رونے لگیں۔

”لیکن کیوں آئی؟ ایسا کیا ہو گیا ہے!“ غمزدہ حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

”خود ہی پوچھ لو اس سے اپنے کمرے میں ہے!“ فروا کی امی سنجیدگی سے بولیں۔

”فروا یہ آئی کیا کہہ رہی ہیں!“ غمزدہ اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔

”ٹھیک کہہ رہی ہیں!“ فروا نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

”لیکن فروا یہ بے وقوفی کس لیے کی ہے!“ اب کی بار غمزدہ کی آنکھوں میں برہمی نمایاں تھی۔

”غمزدہ تمہیں بتا ہے کہ میں اپنے بچہ سے محبت کرنے لگی ہوں۔ مگر امی اب ان کے ساتھ میری شادی پر تیار نہیں ہیں!“ فروا بھیکے لہجے میں بولی۔

دے دیتا۔ ”حسن غصے سے دھاڑتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔
کون سچا تھا اور کون جھوٹا۔ کیا سارہ بھابی ٹھیک کہہ رہی ہیں کہ بھائی کسی لڑکی میں انوالوہیں!“ غبر کا سوچ سوچ کر دل غم بند ہونے لگا تھا۔



رات دیر تک روتے رہنے کی وجہ غبر صبح بزمروہ سی تھی۔ مگر کالج جانا بھی ضروری تھا۔ کالج میں فروا کو مسکراتے ہوئے پایا۔

”شکر ہے فروا تمہارے چہرے پر مسکراہٹ تو لوٹ آئی!“ غبر اداسی سے مسکراتی ہوئی بولی۔
”مگر تم خاصی اپ سیٹ لگ رہی ہو!“ فروا فکر مندی سے بولی۔

”فروا! بھائی کسی لڑکی سے محبت کرنے لگے ہیں!“ غبر دکھ سے بولی۔

”کیا۔۔۔؟“ فروا حیرت سے اچھل پڑی۔ غبر کی نگاہوں میں غم کے بادل چھائے تھے۔
”ایسے مردوں کو تو کوڑے لگنے چاہئیں جو ایک وقت میں دو دو عورتوں کے جذبات سے کھیل رہے ہوں۔“ فروا غصے سے بولی۔

”کوڑے۔۔۔ ان کا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ یہ اتنے ڈھٹ ہوتے ہیں کہ کھال دوبارہ آتے ہی اسی ڈگر پر چلنے لگتے ہیں۔“ غبر بولی۔

”تمہارے بھائی جب اپنی بیوی کے جذبات نہیں سمجھ سکے تو اس لڑکی کو کیا خوش رکھ پائیں گے مانا کہ اسلام میں مردوں کو ایک سے زائد شادیوں کی اجازت ہے مگر بیویوں کے جذبات کا قتل تو نہ کریں۔ سارہ بھابی کے ساتھ اتنی بے رحمی کا سلوک کر کے خود پھولوں کی بیج سجانا چاہتے ہیں۔“ فروا نفرت سے بولی۔

”اور تم سناؤ۔۔۔ کچھ عقل ٹھکانے آئی۔“ غبر نے آنسو صاف کرتے ہوئے فروا سے پوچھا۔

”لو بھائی! کون سا کوئی بے وقوفی کا کام کر رہی ہوں۔ بس محبت تو کی ہے۔“ فروا مسکراتے ہوئے بولی۔

کھانا بھی نہیں کھاتے۔ اکثر رات کو دیر تک فون پر بات کرتے رہتے ہیں ناجائز کیا پریشانی چل رہی ہے۔ کسی سے شیر کرنے کی بھی تو عادت نہیں ہے۔“ سارہ مزید بولی۔

”چلیں ٹھیک ہے وہ جس وقت بھی آئیں آپ مجھے ضرور اٹھا دیجئے گا۔ صبح میرا بہت ضروری میٹ ہے اور اگر بھائی سے ڈسکس نہ کیا تو بہت مسئلہ ہو جائے گا۔“ غبر نے تاکید کرتے ہوئے کہا۔

باہر سے شور شرابے کی آوازیں سن کر غبر دھڑکتے دل کے ساتھ کمرے سے باہر بھاگی۔

بھائی اور بھابی دو نوں خوب غصے میں تھے۔
”کیا ہوا بھابی بھائی کیا بات ہے؟“ غبر بولی۔

”یہ کیا بتائیں گے جن کے دل میں چور ہو گا وہ بھلا سچ کب بول سکتے ہیں!“ سارہ جھڑک کر بولی۔

”تمہارے بھائی صاحب کسی لڑکی سے عشق فرما رہے ہیں۔ ساری ساری رات اس سے فون پر بات کرتے رہتے۔“ سارہ کالجی زہر اگل رہا تھا۔

”بند کرو اپنی بکواس شکی عورت۔“ حسن صبح برداشت نہ کر سکا تو سارہ کے منہ پر زور دار طمانچہ مار دیا۔

سارہ آنکھوں میں آنسو لیے حسن کے بے رحم چہرے کو تک رہی تھی۔

”جھوٹ ہے سراسر۔“ حسن کا کمزور لہجہ اس کی چغلی کھا رہا تھا۔

”یہ جھوٹ نہیں ہے غبر۔ ثبوت ہے میرے پاس یہ دیکھو ان کے محبت بھرے پیغامات۔ مجھ سے تو بھی انہوں نے سیدھے منہ بات تک نہیں کی۔“ سارہ نے کہتے ہوئے حسن کا فون غبر کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ حسن نے اسے دھکا دے کر فون اس سے چھین لیا۔

”مکن تو تمہارے اندر پہلے بھی کوئی نہیں تھا۔ بس لک کرنے کی کسر رہ گئی تھی وہ خوبی بھی آج تمہارے اندر آگئی۔ جاہل، شکی عورت، مرحومہ ماں سے وعدے کا لحاظ نہ ہوتا تو کھڑے کھڑے تمہیں طلاق

جذبات و احساسات کا خیال رکھا جاتا ہے۔۔۔ ”فروا مسکراتے ہوئے بولی۔

”لیکن فروا تم لوگوں نے اچھی طرح سے معلومات تو حاصل کر لی ہے نا!“ ”عنبر کے لہجے میں انجانا سا خوف تھا۔

”ہاں ہاں داوی اماں سب دیکھ لیا ہے۔ وہ دنیا میں بالکل اکیلے ہیں ماں باپ تو کافی سال پہلے وفات پا گئے تھے۔ غیر شادی شدہ ہیں۔“ ”فروا مطمئن انداز میں بولی ”اچھا اب فضول باتیں چھوڑو۔ میری مٹکئی پر آ رہی ہو نا؟“ ”فروا نے جھکتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔ ہاں ضرور آؤں گی۔“ ”عنبر نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔

”بھائی ایک بات کرنی تھی!“ ”عنبر نے حسن کو پکارا۔

”ہاں بولو!“ ”حسن نے مڑ کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”بھائی اس اتوار کو میری دوست کی مٹکئی ہے آپ مجھے لے جائیں گے!“ ”عنبر نے پوچھا۔

”اس اتوار میں مشکل ہے مجھے اس اتوار کو آؤٹ آف سٹی جانا ہے۔ ضروری میٹنگ ہے تم سارہ کے ساتھ چلی جانا!“ ”حسن نے مجبوری بتائی۔

”سارہ بھابھی۔۔۔ آپ کو پتا ہے کہ وہ کتنی اپ سیٹ ہیں ایسے میں انہیں ایسی کوئی بات کرنا مناسب نہیں لگتا۔“ ”عنبر ہچکچائی۔

”ہاں میں بھی کتنا بے وقوف ہوں جو اس کنویں کی مینڈک کے ساتھ تمہیں جانے کا کہہ رہا ہوں وہ تو خود اتنی بور شخصیت کی مالک ہے کہ اپنی یاسیت کا اثر دوسرے پر ڈال کر دوسرے کا موڈ بھی برباد کر دیتی ہے۔“

”حسن نے پھر سارہ کی ذات پر زہر میں ڈوبا طنز کا تیر چلایا۔

”تو ٹھیک ہے آپ مجھے کرائے اور گفٹ کے پیسے دے دیں۔“ ”عنبر بولی۔

اگلے دن عنبر کالج آئی تو اس کی نظر فروا پر پڑی جو مٹھائی کا ڈبا ہاتھ میں لیے لڑکیوں کو مٹھائی کھلا رہی تھی۔ اس کا چہرہ خوشی سے جگمگا رہا تھا۔

”سارا کالج مٹھائی کھا چکا ہے اور جسے کھلانے کی سب سے زیادہ بے چینی تھی وہ مختصر مدت میں دیر سے آئی ہیں!“ ”فروا نے کہتے ہوئے اس کے منہ میں گلاب جاسن ڈال دیا۔

”بھئی پتا تو چلے کس خوشی میں کھلائی جا رہی ہے!“ ”عنبر مٹھائی کھاتے ہوئے بولی۔

”عنبر! امی ابو ماں گئے میری محبت جیت گئی۔“ ”فروا خوشی سے نہال تھی۔

”کیا واقعی؟“ ”عنبر حیرت سے چلائی۔

”ہاں اور اس اتوار کو میری مٹکئی ہے۔“ ”فروا مسکرائی۔

”اور تمہارے بچہ وہ مان گئے۔“ ”عنبر بے یقینی سے بولی۔

”خود پر ہوز کیا ہے جناب نے مجھے۔۔۔!“ وہ ایک ادا سے بال جھٹکتے ہوئے بولی۔ ”عنبر کی آنکھوں میں حیرت ہلکورے لے رہی تھی۔

”دیکھو عنبر۔۔۔ سب مرد ایک جیسے نہیں ہوتے۔ جیسے سب کی شکلیں اور نام الگ ہوتے ہیں۔ ویسے ہی سب کی عادات بھی الگ ہوتی ہیں۔ تمہارے سامنے

تمہارے بھائی کی بے حد تلخ مثال ہے جس نے تمہاری سوچ اور رائے کو تلخ بنا دیا ہے۔ مگر میرے بچہ تو بالکل مختلف مرد ہیں بے حد کیرنگ، خوش مزاج

انہیں جب پتا چلا کہ میں نے خود کشی کی کوشش کی تو وہ بے حد بے چین رہنے لگے تھے۔ میرے ساتھ محبت بھری باتیں کرتے مجھے اپنے ہاتھ سے دوا کھلاتے پہلے تو

میں ان کی صورت کی دیوانی تھی مگر اب ان کی سیرت نے بھی میرا دل موہ لیا ہے۔۔۔ میرا دل چاہتا کہ تمہارے بھائی سے اپنے بچہ کی ملاقات کروا دوں تاکہ ان میں بھی وہ خصوصیات آجائیں کہ کیسے عورتوں کے

رہا تھا۔
 ”واہ حسن بھائی واہ! آپ نے دوسری شادی کرنے کے لیے بیوی کا تو کیا بتانا تھا جیتی جاگتی بہن کو بھی مردہ قرار دے دیا۔“ غمزدار کا دل غم سے بھر گیا تھا۔
 فروا حیرت کا مجسمہ بنی غمزدار کو حسن کو تک رہی تھی۔ آنسو پھیلنے کو بے تاب تھے فروا کا وجود ریت کی دیوار کی مانند کھرنے لگا تھا۔ ”دل بے رحم“ پھر چال چل گیا تھا۔ آدم کا بیٹا پھر حوا کی بیٹی کے ساتھ ہاتھ کر گیا تھا۔ منگنی کی انگوٹھی تو فروا کی انگلی سے اتر کرنا جانے کب کی گر چکی تھی۔ اپنے کرتے وجود کو سنبھالنے کے لیے حوا کی بیٹی نے دیوار کا سہارا لیا تھا۔
 کیا خوب ہی ہوتا اگر دکھ ریت کے ہوتے مٹی سے گرا دیتے پاؤں سے اڑا دیتے



”غمزدار کتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں اب آئی ہو اب تو منگنی کی رسم بھی ادا ہو چکی ہے۔“ فروا شکوہ کرتے ہوئے بولی۔

”بس وہ رکشا بہت مشکل سے ملا تھا اور بھائی بھی شہر سے باہر ہیں۔ لیکن تم شکر کرو میں انگی۔“ غمزدار کہتے ہوئے اسے گلے لگایا۔

”بہت پیاری لگ رہی ہو۔“ غمزدار نے اسے گفت دیتے تو صوفی انداز میں کہا۔

فروا کے حسین چہرے پر خوشیوں کی لکشاں جگمگا رہی تھی۔ محبت کو پالنے کا احساس اس کی نگاہوں سے عیاں تھا۔ غمزدار نے دل ہی دل میں اس کی دائمی خوشیوں کے لیے دعا مانگی۔

”بھئی کہاں ہیں آپ کے وہ ہیرو نما پنڈت سم سے منگیتے۔ آج میں بھی تو دیکھوں محترم میں کیا ہے ایسا کہ تم نے ان کی خاطر جان بھی داؤ پر لگا دی تھی۔“ غمزدار شرارت سے بولی۔

وہ اصل میں حسن ذرا مہمانوں کے پاس سے فارغ ہو جائیں تو تم سے ملواتی ہوں! فروا کے لبوں پر شرمیلیں مسکراہٹ تھیں۔

”حسن! برا حسن اتفاق ہے کہ میرے بھائی اور تمہارے منگیتے کا نام ایک ہے۔“ غمزدار مسکرائی۔
 ”نام ایک ہے مگر میرے حسن لاکھوں میں ایک ہیں بہت محبت کرنے والے انسان ہیں۔ تم ملو گی تو تم بھی بے حد متاثر ہو گی۔“ فروا کا رخسار مسکراتے ہوئے بولی۔

”اچھا تم بیٹھو۔ میں حسن کو لے کر آتی ہوں۔“
 فروا اپنا بھاری بھر کم لنگا سنبھالتی اندبھلی گئی۔
 ”حسن یہ میری فریڈ ہے غمزدار غمزدار! فروا آگے بولتے بولتے رک منگنی ایک منٹ فروا۔ آگے میں جتا جی ہوں ان سے ملو یہ ہیں میرے بھائی حسن۔ اور حسن بھائی دوسری بار منگنی پر بہت بہت مبارک باد ہو۔“ غمزدار بھرے لہجے میں بولی۔

غمزدار کی آنکھوں میں آنکھوں کا سیلاب اٹھ آیا تھا۔ گھبراہٹ اور شرمندگی کے مارے حسن نگاہیں چرا

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
 سبہنوں کے لیے خوبصورت ناول

لیکھی مشال

مکمل ناول کتابی شکل
 میں شائع ہو گیا ہے

تیت - 500 روپے

منگلے کا پتہ:

منگلہ عمران ڈائجسٹ
 37: اندولان کراچی

فون نمبر:
 32735021

میری نال چوٹی کھسکے

رکتے ہی انہوں نے اپنے مطلوبہ ڈبے کی طرف دوڑ لگا دی۔ عجیب آہ و بکا کا عالم تھا، لمبی ٹرین کے گرد لوگ یہاں سے وہاں ایسی دوڑیں لگا رہے تھے کہ قیامت کا منظر لگتا تھا، کسی کا بچہ پہلے چڑھ گیا، تو ٹرین کے اندر بچہ چنچ رہا ہے۔ ماں باہر چلا چلا کر تسلی دے رہی ہے۔

”آ رہی ہوں، گلد و فکر نہ کر، بس یہ مولیٰ تو ند والا چڑھ جائے تو پھر میری باری ہے۔“ کوئی خود چڑھ گیا تو سامان باہر رہ گیا۔ عجیب ہڑونگ مچی تھی۔ وہ تینوں باوجود کوشش کے گاڑی میں سوار ہونے میں ناکام

ہو رہی تھیں۔ سوار ہوتے ہی تو کیسے خالہ درباری کو اپنے قوی الجشہ کے ساتھ چڑھنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ آخر جب ٹرین نے وسل دی تو انہوں نے خالہ کو برے دھکیلا اور خود پھرتی سے اندر چڑھ گئیں۔ کھینچ گھانچ کر خالہ کو جیسے ہی اندر چڑھایا گاڑی نے اپنے قدم سر کرائے۔



دیبا اور شیدا جڑواں بہنیں تھیں۔ شفیق عالم کو اپنی بیوی عدیلہ سے ایسی محبت تھی جو کسی شاعر کو اپنے دیوان سے ہوتی ہے۔ عدیلہ، شفیق کے محلے میں اپنی بیوہ ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ شفیق کو عدیلہ کے حسن نے ایسا جکڑا کہ ہزار مخالفتیں مول لے کر اپنے گھر کی رانی بنالائے۔ ماں جیسے بیٹی کو اپنے گھر کا ہونٹے دیکھنے کی منتظر تھی، جوں ہی بیٹی اپنے گھر کو سدھاری ماں ملک عدم جا پہنچی۔ عدیلہ اپنے حسن سیرت و حسن

جوانوں پر نظر رکھنے کے بجائے سامان پر نظر رکھو۔ گاڑی کی روشنی سامنے سے نظر آ رہی ہے، دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر میری قیص کا پلو پکڑ لو، جیسے ہی ریل گاڑی میں چڑھوں تم بھی پائیدان پر پاؤں رکھ کر میرے پیچھے چلی آنا۔ سنبھل کر چڑھنا، ذرا جو تمہاری نظر پھسلی، پاؤں پھسل کر نیچے مردوں میں بڑی ہوں گی۔ یہ مت سوچنا کہ کوئی بانکا جیلا تمہیں اٹھانے کے لیے آگے بڑھے گا، سب کو اپنی اپنی بڑی ہوتی ہے۔ اللہ معاف کرے، مجھے تو گاڑی پر سوار ہوتے ہوئے حشر کا سامان محسوس ہوتا ہے۔ ہر کسی کو سوائے اپنی گاڑی میں چڑھنے اور سیٹ حاصل کرنے کے علاوہ کسی دوسرے کی کوئی پروا نہیں ہوتی کہ پاؤں کھلا جا رہا ہے یا اپنی کنبیوں سے دھکے دیتے کسی کی پسلیاں توڑی جا رہی ہیں۔ عجیب بھگدڑ مچی ہوتی ہے۔ خالہ درباری ان دونوں کے کانوں میں اپنی نصیحتیں پگھلے سسے کی مانند انڈیل رہی تھیں۔ انہوں نے شد و مد سے گردن ہلاتی اور ایک ہاتھ میں سامان اور دوسرے کو دونوں مضبوطی سے تھامے خالہ کے پیچھے ہو لیں۔ چنگلی سے خالہ کی قیص کا پلو بھی پکڑ لیا۔ ٹرین سے پہلے ایک ٹرین تیار ہو چکی تھی۔ عجب مضحکہ خیز نقشہ پیش کر رہی تھیں وہ تینوں، مگر یہاں پر کسی کو انہیں دیکھنے کی فرصت ہی کب تھی۔ خالہ صبح کہہ رہی تھیں۔ سب کو اپنی اپنی بڑی ہوتی ہے۔ جوں ہی گاڑی کی دھمک پلیٹ فارم پہ گونجی ان کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ ٹرین میں سفر کرنے کا یہ ان کا پہلا تجربہ تھا۔ ٹرین



صورت سے شفیق کے دل پہ حکمرانی کرنے لگیں۔ شفیق کا تو یہ عالم تھا کہ آنکھیں دن کا آغاز عدیلہ کے رخ روشن کو دیکھ کر کرتیں تو رات کو ماہتابی چہرہ سمو کر سوتیں۔ ایسی والہانہ محبت دیکھ کر دنیا (رشتہ دار) تو گیلی لکڑی کی طرح سلگ ہی رہی تھی۔ آسمان کو بھی شفیق کی بیوی سے الفت آنکھ میں کھٹکنے لگی۔ خیر سے عدیلہ امید سے ہوئیں تو وارفتگی میں مزنگائی کی طرح روز افزوں اضافہ ہونے لگا۔ ادھر دیا اور شیبائے دنیا کو دیکھنے کے لیے آنکھیں وا کیں، ادھر عدیلہ نے ہمیشہ کے لیے دنیا سے آنکھیں موند لیں۔ شفیق کی تو دنیا اندھیر ہو گئی۔ گرمی میں سورج کی تمازت بھی کیا تزیائے جو عدیلہ کی جدائی ان کے جسم و جاں کو دن رات جھلسا رہی تھی۔ ہن بھراشکوں کا سیلاب بہتا تو رات کو محبوب بیوی کی یاد میں پورا بدن سلگتا، کسی پل عدیلہ کی یاد دل کا دامن نہ چھوڑتی۔

دیا اور شیبائی جنت کھوجانے سے بے خبر تائی اور پھپھو کی گودوں کے آسیرے پر رہیں، ایسی صابر بیچیاں کہ نہ ماں کے چھڑنے کا غم کیا نہ باپ کے بے تو بھی پر

منہ بسورا۔ شفیق نے اپنے غم کا یہ حل نکالا کہ دیس نکالا ہو گئے، یہ سوچ کر کہ شاید عدیلہ کی جدائی کا درد ان فاصلوں سے ان تک پہنچنے میں ناکام رہے اور واقعی وہ اس کوشش میں کافی حد تک کامیاب بھی رہے، تھوڑی بہت جو بیوی کی شبیہ آنکھوں میں اتر کر گئی تھی، اس کی جگہ ان کی دوسری جرمن بیوی کی نیلی آنکھوں نے لے لی تھی۔

دیا اور شیبائے ان کا اتنا ہی واسطہ رہا کہ ایک کثیر رقم بن کے اکاؤنٹ میں جمع کروا دیتے جو پھپھوئیں بہ کم اپنی اولاد کو عیش کرانے میں زیادہ صرف ہوتی، آخر کو ان کا بھی اس روپے پر پورا حق تھا۔ گورنس کے فرائض پوری طرح سرانجام دے رہی تھیں۔ حالانکہ بھائی سال میں دو چار بار کسی آتے جاتے کے ہاتھ ڈھیروں تحائف ان کے اور بچوں کے لیے بھیجا کرتے۔ بڑی بھائی دیا، شیبائی کی تائی امی، مند کو اس

طرح اللہ تلے کرتے دیکھتیں تو ہو کے (آپیں) بھر کر رہ جاتیں۔ انہوں نے اپنے پاؤں پہ خود کھڑی ماری تھی۔ شفیق نے تو پہلے ان ہی سے اپنی بیٹیوں کو رکھنے کا کہا تھا، مگر انہوں نے کورا پڑا جواب دے دیا۔

”بھائی برا مت ماننا، میرے اپنے پانچ بچے مجھے ہلکان کیے رکھتے ہیں۔ میں کہاں اس جوڑی کی پرورش کر سکوں گی، جوڑوں کا درد مجھے چین ہی کب لینے دیتا ہے۔“ انہوں نے زمانے بھر کی تھکن لہجے میں سمو کر نند کی گود اس جوڑی سے بھردی۔ شاگرہ بچوں کو گود میں لیے چپ بیٹھی رہیں، نہ ہاں کی، نہ نا، بھائی نے ان کی خاموشی کو رضامندی سمجھ کر حب دیا، شیبائے ننھے بننے ہاتھوں میں ہزاروں کے نوٹ دیا، تو انہوں نے جھٹ اس جوڑی کو سینے سے لگایا۔ آنکھوں میں آنسو اُٹ اُٹے (بارے خوشی کے)۔

بھائی کو یقین دلایا کہ ان کی چنداں فکر نہ کرنا اپنی چنداں سے بھی زیادہ لاڈلیاں بنا کر رکھوں گی۔ تائی بشری نے جو ہرے ہرے نوٹوں کی ہمار دیکھی تو دل مسوس کر رہ گئیں۔ کاش ان نوٹوں کی جھلک شفیق عالم پہلے دکھا دیتے۔ تو وہ دیا، شیبائے اپنے کلیجے سے چٹا لیتیں۔ مگر

اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں جگ گئیں کھیت۔ نند کے حالات تو دونوں میں بدل گئے، گھر کی آرائش و گھڑیلو اشیا کی بے دریغ خریداری، دیکھ کر بشری کی رائیں ٹپکتی رہتیں جنہیں ان کا فریق پالوں والا بیٹا ان کے دوپٹے میں جلدی سے جذب کرتا مبادا پھپھو ان کا مذاق اڑانے لگیں۔

دیا اور شیبائی کو اپنی کی حدود کو چھونے لگیں تو پھپھو کا رویہ ان سے کشیدہ ہو گیا، بات بے بات روکنے لگے لگیں، پہلے پہل قہقہوں پر اعتراض ہوا، پھر دوپٹے گلے میں ڈالنے پر اور اس کے بعد اپنے فرزند ارجمند شعیب سے ٹھٹھوں بازی پر تو بیاں چڑھنے لگیں۔ بیٹے کو علیحدگی میں خوب لتاؤ کہ خبردار! ان سے یارانے کا سوچا بھی تو آنکھیں نکال کر پھیلی پر رکھ دوں گی۔ وہ بھس بھرے دماغ ڈرپوک دل کا دیک کر بیٹھ گیا۔ ماں

سے کچھ بعید نہ تھا کہ جو کہا تھا کر دکھائیں۔ وہ تو پھر بیٹا تھا، باپ کی مجال نہ تھی کہ ادھر ادھر جھانک لیتے، ہمیشہ ناک کی سیدھ میں چلا کرتے، چاہے تو دیوار سے ٹکرائیں یا کسی لاجپار سے۔ وہ اپنی سیدھ سیدھی رکھتے۔

شاکرہ کی بھتیجیوں سے کھنڈاؤ کی بھی ایک وجہ تھی۔ شفیق عالم نے کافی عمر سے انہیں پیسے بھیجنے سے ہاتھ پیچھے رکھا تھا اور جو کبھی تھوڑے بہت بھیجتے بھی تو وہ اتنی ناکالی رقم ہوتی کہ ببشکل دبا، شیبہ کی ضرورتوں کو ہی پورا کر پاتے اور اب ان بے چاری کی ضرورتیں رہی ہی منتی تھیں، پچھپھو نے میزک کروا کر گھر بٹھالیا کہ گھر داری سیکھو، انہیں بھی بڑھائی میں ایسی خاص دلچسپی نہ تھی، سو ایک بہن نے بچن سنبھالا تو دوسری کو گھر کی صفائی کی مہم پر لگا دیا۔ بچن سنبھالنے کا فائدہ یہ ہوا کہ دبا اپنے لیے بھنا بھنا گوشت نکال کر ساند پر رکھ دیتی، شاکرہ لاکھ ان پر نظر رکھتیں، مگر وہ بھی نظر بچا کر اپنا کام دکھا دیتی، جبکہ شیبہ صفائی کی مہم کے دوران ہر فرد کے بہت سے رازوں سے آشنا ہو چلی تھی۔ پچھپھو اگر ان سے خار کھانے لگی تھیں تو انہوں نے بھی انہیں زچ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا۔

اب تو گھر کا تقریباً ہر فرد ان سے ٹالنا رہنے لگا تھا۔ ان کی دودھت کی روٹی بوجھ لگنے لگی، بات بے بات طعنے ملنے لگے، دن بھر پچھپھو اور ان کی اولاد کا مقابلہ کرنے والی دبا اور شیبہ رات کی تنہائی میں ایک دوجے کے آنسو بونچھ کر آنے والے دنوں کے لیے ہمت باندھتی، کبھی کبھار باپ کی شکل نیٹ ربات کرنے سے جو نظر آجایا کرتی تھی، اس سے بھی گھٹیں۔ آنکھ کے ساتھ دل بھی روتا۔ اداسیوں کی آماجگاہ بنادل دوسروں کے سامنے کھوکھلے قہقہے لگا تاکہ ان کو یہ گوارا نہ تھا کہ ان پر ترس کھایا جائے اور وہ خامشی سے اپنیوں کے ظلم سہی رہیں۔ ٹائی، پچھپھو کے سپوت ماں کی نظروں سے بچ بچا کر ان کے گرد منڈلاتے تو وہ خاطر میں نہ لاتیں۔ انہیں اپنی کردار کشی ہرگز گوارا نہ تھی۔ بس وہ تو اس انتظار میں تھیں کہ جلد کوئی ان کو ان کی جچی

طلب کر کے لینے والا آجائے۔ پچھپھو کی بوئے قد اور سانپری رنگت والی چندا کے رشتے کی تلاش شروع ہو چکی تھی، مگر اس کا سانولا بن اور چھوٹا فائدہ ہر پار رشتے کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑا ہو جاتا۔ مزید ستم یہ ہوتا کہ دبا اور شیبہ مہمانوں کا پرتیاک استقبال کرتیں۔ بھدا اصرار نیل پر رکھے لو زانم موتیوں سے دانستوں کی پوری نمائش کر کے کھلائے جاتے کہ آنے والے مہمان اور مستقبل کے نوٹے میاں ان پر فریفتہ ہو جاتے، پچھپھو لاکھ گھوریں، انہیں وہاں سے اشاروں ہی اشاروں میں اٹھ جانے کا کہتیں، مگر وہ لاپرواہی ان کا دل جلاتی، لڑکے کے سامنے دلکش مسکراہٹ کے ساتھ براجمان رہتیں۔ بعد میں شاکرہ ان کے ایسے لتے لیتیں کہ کوئی حساس بندہ ہوتا تو ان کے زہریلے لہجے سے چار دن بستر سے نہ اٹھتا، مگر وہ دبا اور شیبہ تھیں، ان کے تن فن کرتے لہجے کے سامنے ان کی کھل کھل ہنسی شاکرہ کے وجود میں انگارے بھر دیتی۔ اگر بھی ان دونوں کو ان کی ٹائی بشری کے ہاں بھیجے کا ارادہ کرتیں تو وہ فون پر کورا جواب دے دیتیں۔

”بھی دیکھو، ان دونوں بہنوں کا میری طرف رخ نہ

خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول



مستی
گلچین

قیمت - 400 روپے

کتبہ میزان ڈائجسٹ - 37 - اردو بازار، کراچی - فون نمبر 32735021

مضبوطی سے تھام لیے۔

”ہائیں۔۔۔ کیسا درد؟“ وہ چونکیں۔

”نبی کے رشتہ نہ ہونے کا غم ماں کو کیسے رلاتا ہے۔

یہ میرا دل جانتا ہے۔ راتوں کو آپ کروٹیں بدل کر اپنا

وقت گزارتی ہیں۔ چاند کی مدھم روشنی میں آپ کے

دکھ بول چکے ہیں کہ ماروں کی چمک ان کے آگے پھینکی

پڑ جاتی ہے۔“

”اے زیادہ لفظوں کی مار نہ مار۔ دس جماعتیں کیا

بڑھ گئی چاند ماروں کی باتیں کرنی آگئیں۔ نہ مجھے یہ بتا

کہ میری کروٹیں تو کیسے بدلتے دیکھتی ہے۔“ انہوں

نے جھٹکے سے اپنے ہاتھ چھڑائے اور شمشلیں نگاہوں

سے گھورا تو شبیا یک ٹک ان کو دیکھنے لگی۔

”پچھو آئیے فکر چھوڑیں کہ میں آپ کو کیسے

کروٹیں بدلتے دیکھتی ہوں، بس میں تو آپ سے اتنا ہی

کہوں گی کہ چند اباجی کے رشتے کی فکر چھوڑیں۔“

”دماغ تو خراب نہیں ہو گیا تمہارا، نبی کے رشتے کی

فکر کیسے چھوڑوں کیا نبی نہیں بیاہنی مجھے اور تو یہ بتا تو

چند اباجی کہنا نہیں چھوڑے گی۔ سال دو سال بڑی

چھوٹی میں کیا فرق ہے اور میری چندا تو دیسے بھی تم

دونوں بہنوں سے چھوٹی لگتی ہے۔“

”صحیح کہہ رہی ہیں پچھو۔ چندا اباجی ہم سے کافی

چھوٹی لگتی ہیں۔ ہم دونوں ہمیں سرو قامت اور وہ بے

چاری فریزر میں سے برف کے کورے بھی اچک

اچک کر نکالتی ہیں۔“ شبیا اپنی کسی بات پہ خود ہی

مسکائی۔

”اچھا۔۔۔ اب اپنی اول فول بند کر، اٹھ یہاں سے،

نیچے جا کر دو دیکھ دینا، کھانا تیار کیا کہ نہیں۔“

”دوبانے کھانا تیار کیا یا نہیں، اس کا تو مجھے نہیں پتا،

ہاں البتہ چندا اباجی نے شادی کے لیے لڑکا تیار کر لیا

ہے۔“ اس نے آنکھیں منکا کر انکشاف کیا تو ان کے

تیور بدل گئے۔

”ابو اس بند کر، الزام لگا رہی ہے میری بیٹی پر۔ کہاں

سے کون سا لڑکا شادی کے لیے تیار کر لیا۔ ہر وقت تو

کمرے میں بند پڑی رہتی ہے۔ یہ تو تم ہی دونوں بہنیں

کرتا۔ میرے گھر میں تو ہیں سارے جوان لونڈے، کل

کلاں کو کوئی مسئلہ ہو گیا تو دنیا سارا الزام میرے بچوں

کے سر تھوپ دے گی اور یہ دودھ کی دھلی دو شیرا میں

صاف بیچ لگائیں گی۔“ بشری کا جواب سن کر وہ دل

مسوس کر رہ جاتی کہ کریں تو کیا کریں، عجیب ہڈی بنی

ہوئی تھیں وہ دونوں ان کے لیے، نہ کھائے بنے، نہ

اگلے۔



ہر بار مسترد ہونے کا دکھ سانولی چندا کے سانولے

پرن میں مزید اضافہ کیے جا رہا تھا۔ نبی کا دکھ شاکرہ کا دل

نرپاڑتا۔ اس دن بھی وہ چھت پر کونے میں بیٹھی وظیفہ

کر رہی تھیں۔ شبیا پچھو کو سارے گھر میں نہ پا کر

فورا“ اوپر چلی آئی۔ اس کا خیال صد فیصد درست

ثابت ہوا۔ وہ گڑگڑا کر اپنی بیٹی کے لیے اچھی جگہ پر

رشتہ ہونے کی دعا میں کر رہی تھیں۔ اچھی جگہ سے

ان کی مراد لڑکا ماں کے سایہ شفقت سے محروم ہو۔

باپ، ہٹا کٹا کھاتا، کھاتا ہوا، تاکہ بیٹے پر بوجھ نہ بنے اور

بہن، ایک دو ہوں تو اپنے سسرال کو پیاری ہو چکی ہوں،

آگے میری بیٹی کی زبان اور ادا میں سب سنبھال لیں

گی۔ شبیا نے جویوں انہیں رو کر دعا میں مانگتے دیکھا

تو دل میں ہوک سی اٹھی۔ کاش آج ہماری ماں زندہ

ہوتی تو ہمارے لیے بھی منتظر ہوتی۔ ماں کے خیال نے

آنکھ سے چند آنسو چپکے سے نیچے لڑھکا دیے۔

”پچھو۔“ وہ ان کے قریب آکر پکاری تو شاکرہ

اچھل پڑیں۔ انہوں نے کاٹ کھانے والی نگاہوں سے

اس کی طرف دیکھا اور جلدی سے دعا کے لیے

پھیلائے ہاتھ منہ پہ پھیرے۔

”کم بخت جو تک کی طرح چمٹ گئیں، کہیں بھی

چین نہیں لینے دیں گی۔“ وہ ہڑوا کر رہ گئیں۔ شبیا ان

کے قریب ہی پھسلا مار کر بیٹھ گئی۔ انہوں نے جلدی

سے جاء نماز سمیٹی۔

”پچھو۔ میں آپ کا درد جانتی ہوں۔“ رقت

آمینز لہجے میں کہتے ہوئے اس نے ان کے دونوں ہاتھ

پھلا وہ ہو جو کبھی چھت پر تو کبھی ساتھ والوں کے۔۔۔
 ”ہاں تو کمرے میں بند پڑی فیس بک پر جانے کتنے
 لڑکوں کو انہوں نے پٹا رکھا ہے، وہ تو میں اس دن ان
 کے کمرے کی ڈسٹنگ کر رہی تھی کہ موبائل پر لکھا
 دیکھا۔ چند اجابی وائس روم میں تھیں، وہ لڑکا تو ان کے
 عشق میں ٹخنوں ٹخنوں گرفتار ہو چکا ہے، بس آپ نیک
 کام میں دیر نہ کریں، جلدی سے ان سے معلومات لے
 کر لڑکے کو بلا کر رشتہ پکا کریں۔“ وہ ان کے بدن میں
 شرارہ چھوڑ کر سیڑھیاں پھلا نکلتی یہ جاؤ جا۔

”کم بخت ہر کسی کی ٹوہ میں لگی رہتی ہے۔ اللہ
 کرے یہ بات درست ہو میری چندا نے تو میری مشکل
 آسان کر دی۔ یا اللہ تو نے کتنی جلدی میری سن لی، یہ
 وظیفہ تو در سے والی ساجدہ بابی نے بالکل بیچ بتایا کہ
 مکمل ہوتے ہی خوش خبری ملے گی، ابھی دعا مکمل بھی
 نہ ہوئی کہ میرے رب نے رشتہ بھیج دیا۔ اے میرے
 پروردگار! اتیرا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔“ دل میں
 خوش ہوتے ہوئے وہ بھاری وجود کے ساتھ جو جلدی
 جلدی سیڑھیاں اترنے لگیں تو آخری سیڑھی پر ایسا
 پاؤں مڑا کہ وہیں فرش پر سجدہ ریز ہو گئیں۔ دبا، شیبائی
 دبی دبی ہسی انہیں اس وقت ایسی بری نہ لگی جو عام
 حالات میں لگا کرتی تھی۔ انہوں نے دبا کا خود کو
 اٹھانے کے لیے بڑھایا ہوا ہاتھ جھٹکا اور گرل کا سارا
 لے کر اٹھ گئیں، ان کا دھیان تو بس چندا کے پھنسائے
 لڑکے کی طرف تھا، شکر ہے کوئی کام تو اس نے ڈھنگ
 کا کیا۔ آئے دن موبائل پر ایزی لوڈ کرائے گئے پیسے
 جیسے آن جو وصول ہو گئے تھے۔

انہوں نے جو چندا سے استفسار کیا تو پہلے پہل تو وہ
 گھبرائی، مگر جب ماں نے جو صلہ دیا تو اس نے اعتراف
 کرنے میں ذرا تامل نہ کیا کہ ایک دو مرغوں کو اس نے
 پھانس رکھا ہے جو زیادہ سیریس تھا۔ اس نے اس کا
 قصہ بیان کر دیا۔ ماں نے فوراً ”لڑکے سے ملاقات کا
 ٹائم لینے کو کہا تو اس نے بھی بلیوں دل اچھلتے محبوب
 سے ملنے کا کہہ دیا۔ معلومات لینے پر پتا چلا کہ وہ بزنس
 میں ہے۔ بازار میں اپنی ذاتی دکان ہے۔ شاگرہ نے کہا۔

خواتین کے لیے خوبصورت تحفہ

خواتین کا گھریلو انسانیکہ بہتیا

کیا نا خزانہ

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف
 سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول



خواتین کا گھریلو انسانیکہ بہتیا

قیمت 300/- روپے

نحلیں جی بسق میں



فلخو جیجین

قیمت 400/- روپے

”بٹی تیرا بھی ملنا مناسب نہیں، پہلے مجھے چپ چاپ تحقیق کرنے دے۔“



”جادوئی گفت سینئر۔“ یہی نام بتایا تھا۔ شاگرہ نے دکان کا نام بڑھ کر اندر قدم رکھا۔
”جی آئی جی بتائیے کیا چاہا ہے۔ کسی پرانی سہیلی کو گفت دینا ہے، بڑھے شوہر کو یا بوائے فرزند کو۔“ کاؤنٹر پر بیٹھا لڑکا پیشہ ورانہ انداز میں تیز تیز بولا۔
”اے لڑکے! دماغ تو خراب نہیں ہے تیرا اس عمر میں، میں کیا بوائے فرزند بناؤں گی۔“ تیوری پر بل ڈالے وہ چادر سنبھالتے ہوئے بولیں۔

”اچھا۔ اچھا میں سمجھ گیا، آپ نے اپنے بڑھے شوہر کو شادی کی پچیسویں سالگرہ کا تحفہ دینا ہے، یہ دیکھیے یہ ان کے لیے کافی مناسب رہے گا۔ اللہ کے گھر کا دیدار بھی ہوتا رہے گا اور چاروں قل بھی یاد ہو جائیں گے کہ آج کل فرشتہ اجل کا کام زوروں پر ہے، دوست احباب، محلہ، رشتہ دار تیزی سے اس دار فانی سے کوچ کر رہے ہیں۔ سو قل شریف پڑھنے میں آسانی رہے گی۔“ اس نے ایک ڈیکوریشن پیس ان کے سامنے کیا۔

”حب کر بہت ہوتا ہے تو۔ یہ تو تو نے ٹھیک کہا کہ شادی کو پچیس برس گزر گئے، پر اتنے برسوں میں کیا میرا شوہر بڑھا ہو گیا۔! تیرے ساتھ لاکھ لاکھ کروڑوں تو لوگ تیری طرف کم، میرے شوہر کو زیادہ دیکھیں گے۔“
”جی۔۔۔ جی مجھے اندازہ ہو گیا، ہمیشہ مضحکہ خیز چیز کو ہی زیادہ دیکھا جاتا ہے۔“ روانی میں منہ سے جملہ نکلا اور شاگرہ کے گھورنے پر دانتوں میں زبان دبالی۔ وہ اس کی شرمندگی دیکھ کر اٹھنے کا ارادہ ملتوی کر گئیں۔
”بیٹا! اصل میں مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ یہ دکان کس کے نام ہے۔“ ان کا انداز سرکشانہ تھا۔

”نام تو جی بہ بڑے حاجی صاحب مرحوم کے ہے، مگر آج کل چھوٹے حاجی صاحب اس کو اپنے نام رجسٹری روانے کے چکر میں ہیں، کیونکہ ان کے مرنے کے

بعد تو وہی اس کے اصل مالک ہیں۔“
”ماشاء اللہ۔ نو جوانی میں حج بھی کر رکھا ہے، کوئی بہت ہی نیک گھرانے کا نیک صفت بچہ ہے۔ یہ حاجی صاحب اس وقت کہاں پر ہیں۔“

”آج تو جی ان کا بیٹا دینی سے آ رہا ہے، اسی کو لینے اور پورٹ گئے ہیں، کوئی کام تھا ان سے تو مجھے بتائیں۔“ شاگرہ سوچ میں پڑ گئیں کہ یہ حاجی صاحب تو اس عمر میں بھی لڑکیاں پھنسا رہے ہیں۔
”بیٹا مجھے کلیم نام کے بندے سے ملنا ہے، اسی دکان کا بتایا تھا اس نے کہ یہ میری ذاتی دکان ہے، کبھی کچھ خریدنا ہو تو آجانا۔“ کچھ ہچکچاتے ہوئے انہوں نے بات کی تو وہ لڑکا حیرت سے انہیں تنکے لگا۔

”آئی بہت افسوس ہوا جوان لڑکے لڑکیوں کو تو ایف بی پر عشق بگھارتے دیکھا تھا، آپ بھی ان چکروں میں پڑ گئیں۔“

”بیٹا جیسی تیری شکل ہے، ویسی ہی تیری عقل ہے۔ اس سفید ہوتے چوڑے کے ساتھ میں ایف بی بر لو نڈے پھنساؤں گی کیا۔“ انہوں نے اس کے سر پر ایک چمٹ لگا لی تو وہ لڑکا خاموش ہو گیا۔
”تو پھر کلیم سے کیوں ملنے آئی ہیں۔“

”بس تو مجھے کلیم کی شکل دکھا دے، کام تو میں اسی کو بتاؤں گی۔“

”آپ مانیں یا نہ مانیں کلیم نے پھر سے ایف بی پر کوئی چکر چلایا ہے۔ آئی جی اس کا تو سارا دن یہی کام ہے۔ ادھر گوشت بنا رہا ہوتا ہے اور ادھر فیس بک پر لڑکیوں کو پناہ رہا ہوتا ہے۔ حاجی صاحب نے کلیم کو اپنا منہ بولا بیٹا بنا رکھا ہے۔ اسے ذاتی کام بھی کروا کے دیا جب بھی کسی لڑکی کو ملنے کا نام دیتا ہے حاجی صاحب دکان کا ایڈریس بتا دیتا ہے، کتنی مرتبہ حاجی صاحب سے جوتے کھانچا، مگر انہی حرکتوں سے باز نہیں آتا۔ وہ بے چارہ بھی کیا کرے، دو بیویاں چھوڑ کر جا چلی ہیں، ایک مرغی، دوسری طلاق لے کر کسی دوسرے کی ہوئی، اب تیسری نہ کرے تو کیا تنہا مرے۔“ اس باتوں لڑکے نے ساری معلومات فراہم کیں۔ تو شاگرہ کا سر چکر اکر

رہ گیا۔
 ”کلیں اس وقت کہاں پر ہے۔“ مرے مرے لفظ
 نکلے وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر دکان سے باہر لے آیا۔ دو تین
 دکانیں چھوڑ کر ایک چھٹے کی طرف اس نے اشارہ کیا۔
 وہ رہا کلیم فیس بکا عرف کلو قصابی۔ لڑکا انہیں حیران
 چھوڑ دو بارہ دکان میں جا گھسا اور وہ مرے قدموں سے
 کلو قصابی کی طرف چل دیں، رشتہ نہ سہی دو کلو
 گوشت ہی خرید لیں۔ مطلوبہ جگہ پر وہ پہنچیں تو ایک
 مسٹرڈ انفرنی رنگت کے بدن میں چٹا سفید بنیان پہنے
 قہمہ بنانے میں مصروف تھا۔ دو چار باتوں سے تصدیق
 ہوئی کہ یہ ہی وہ لونڈا ہے جسے ان کی دختر بے وقوف
 نے اپنے چنگل میں پھنسا یا ہے، گھر آکر وہ اس پر برس
 پڑیں۔

”کم بخت یہ ہی ملا تھا تجھے بنانے کو۔“
 ”کیا ہوا امی، کیا پہلے سے شادی شدہ ہے۔“ وہ ماں
 کے اتنے شدید رد عمل پر یہ ہی نتیجہ اخذ کیا۔
 ”پہلے سے شادی شدہ ہو تا تو بھی گوارا تھا مگر وہ تو کم
 بخت کا قصابی نکلا۔“
 ”ہائے میں مر گئی۔“ چندا نے دل تھام لیا۔ ”جب
 ہی بد ذات مجھے میرا دل جگر کہا کرتا تھا۔“ روائی میں
 اس کے منہ سے پھسلا تو ماں کے گھورنے پر شرمندگی
 سے سر جھکا لیا۔

”دے ادھر، تو کسی کام کی نہیں، سارے پیسے
 پھونک ڈالے۔“ شاکر نے اس کا موبائل اپنے قابو
 میں کیا، ایسے تو سو رشتے بوائے مبین روز لے کر آتی
 ہے۔ موبائل چھن جانے پر چندا کے چہرے پر مردنی
 کی چھائی۔

”ہائے میں مر گئی۔“ چندا نے دل تھام لیا۔ ”جب
 ہی بد ذات مجھے میرا دل جگر کہا کرتا تھا۔“ روائی میں
 اس کے منہ سے پھسلا تو ماں کے گھورنے پر شرمندگی
 سے سر جھکا لیا۔

”دے ادھر، تو کسی کام کی نہیں، سارے پیسے
 پھونک ڈالے۔“ شاکر نے اس کا موبائل اپنے قابو
 میں کیا، ایسے تو سو رشتے بوائے مبین روز لے کر آتی
 ہے۔ موبائل چھن جانے پر چندا کے چہرے پر مردنی
 کی چھائی۔

”دے ادھر، تو کسی کام کی نہیں، سارے پیسے
 پھونک ڈالے۔“ شاکر نے اس کا موبائل اپنے قابو
 میں کیا، ایسے تو سو رشتے بوائے مبین روز لے کر آتی
 ہے۔ موبائل چھن جانے پر چندا کے چہرے پر مردنی
 کی چھائی۔

”دے ادھر، تو کسی کام کی نہیں، سارے پیسے
 پھونک ڈالے۔“ شاکر نے اس کا موبائل اپنے قابو
 میں کیا، ایسے تو سو رشتے بوائے مبین روز لے کر آتی
 ہے۔ موبائل چھن جانے پر چندا کے چہرے پر مردنی
 کی چھائی۔

مہمان تو ضرور بنی تھیں، مگر ان کے اپنے ساتھ لائے
 سازو سامان کو دیکھ کر چہرے پر پھلکی ہنسی اٹھ سجا
 لیتیں۔ دبی گھی کے ڈبے، دبی اٹلے اور دبی
 مرغیاں جب ان کے پیٹ میں پھنسیں تو ہر بندے
 کے منہ سے یہی فقرہ نکلتا۔
 گنتی سندر گنتی پیاری
 خالہ درباری، خالہ درباری
 شعیب تو باقاعدہ خالہ درباری کے گلے میں بازو ڈال
 کر لہک لہک کر گاتا اور پھوپھو اور چندا سردہنے
 جاتیں۔
 ”ایک نمبر کا چالوس ہے یہ خالہ درباری اس کی
 باتوں میں مت آئے گا، دبی گھی اور دبی مرغی کے
 لالچ میں آپ کی تعریفیں کرتا ہے، آپ کے پیٹھ پیچھے پتا
 ہے آپ کو کیا کہتا ہے؟“ خالہ درباری نے چونک کر دیا
 کی طرف دیکھا۔
 ”کیا کہتا ہے؟“ ان کے ہاتھ پر بل بڑنا شروع
 ہو گئے چندا کی کھکار پھوپھو کی گھورنی اور شعیب کے
 ہاتھ بچا کر جوڑے ہوئے ہاتھ اس کی زبان کو روکنے
 میں ناکام ہو رہے تھے۔
 ”بوڑھی گھوڑی لال لگام۔“
 ”کیا؟“ خالہ کی لمبی کی طرح چمکتی آنکھیں
 شعیب کو خوف زدہ کر گئیں۔
 ”ہائیں۔ ہائیں یہ کہا اس نے مجھے۔“ وہ یہ سن کر
 لال پیلی ہو گئیں۔ شعیب نے جھٹکا، کانوں کو ہاتھ
 لگائے۔
 ”ایک نمبر کی جھوٹی ہیں یہ دونوں بہنیں۔ میں نے
 یہ کب کہا۔ میں نے تو بس اتنا ہی کہا تھا کہ خالہ کو اب
 سفید رنگ سے انسیت ہونی چاہیے کہ کیا پتا کب پھنسا
 پڑ جائے۔“ اس کی بات سن کر جہاں دیا اور شیبانے
 قہقہہ لگایا وہیں خالہ درباری نے اپنے مکھن ملائی
 کھائے مضبوط ہاتھوں کا دھمو کا جڑا تو وہ ہائے کر کے
 اپنی کمر پکڑ کر دوہرا ہو گیا۔
 ”اے خالہ کس کی باتوں میں آ رہی ہیں یہ دونوں تو
 میرے جگر کے ٹکڑے کے پیچھے ہاتھ دھو کے پڑ گئی ہیں

درباری خالہ واوی کی سہیلی کی بیٹی تھیں۔ سرگودھا
 کے تقریباً ساڑھے تین گھنٹے کی مسافت پر کسی قہمے
 میں شادی ہوئی تھی۔ سال دو سال بعد وہ ملنے کے لیے
 چلی آئیں۔ پھوپھو انہیں دیکھ کر منہ ادھر ادھر کر کے
 ناک بھوں تو بہت چڑھائیں، کیونکہ وہ دس بارہ دن کی

درباری خالہ واوی کی سہیلی کی بیٹی تھیں۔ سرگودھا
 کے تقریباً ساڑھے تین گھنٹے کی مسافت پر کسی قہمے
 میں شادی ہوئی تھی۔ سال دو سال بعد وہ ملنے کے لیے
 چلی آئیں۔ پھوپھو انہیں دیکھ کر منہ ادھر ادھر کر کے
 ناک بھوں تو بہت چڑھائیں، کیونکہ وہ دس بارہ دن کی

درباری خالہ واوی کی سہیلی کی بیٹی تھیں۔ سرگودھا
 کے تقریباً ساڑھے تین گھنٹے کی مسافت پر کسی قہمے
 میں شادی ہوئی تھی۔ سال دو سال بعد وہ ملنے کے لیے
 چلی آئیں۔ پھوپھو انہیں دیکھ کر منہ ادھر ادھر کر کے
 ناک بھوں تو بہت چڑھائیں، کیونکہ وہ دس بارہ دن کی

درباری خالہ واوی کی سہیلی کی بیٹی تھیں۔ سرگودھا
 کے تقریباً ساڑھے تین گھنٹے کی مسافت پر کسی قہمے
 میں شادی ہوئی تھی۔ سال دو سال بعد وہ ملنے کے لیے
 چلی آئیں۔ پھوپھو انہیں دیکھ کر منہ ادھر ادھر کر کے
 ناک بھوں تو بہت چڑھائیں، کیونکہ وہ دس بارہ دن کی

درباری خالہ واوی کی سہیلی کی بیٹی تھیں۔ سرگودھا
 کے تقریباً ساڑھے تین گھنٹے کی مسافت پر کسی قہمے
 میں شادی ہوئی تھی۔ سال دو سال بعد وہ ملنے کے لیے
 چلی آئیں۔ پھوپھو انہیں دیکھ کر منہ ادھر ادھر کر کے
 ناک بھوں تو بہت چڑھائیں، کیونکہ وہ دس بارہ دن کی

”ہائے۔۔۔ سڑکوں پر کیوں رلیں ابھی خالہ درباری زندہ ہے۔“ انہوں نے اپنے سینے پہ ہاتھ مارا۔
 ”چلو لڑکیوں تیاری کرو فیصلہ ہو گیا تم دونوں اب میرے ساتھ چلو گی ایسے گھر میں رہنے کا کیا فائدہ جہاں خون ہی سفید ہوں۔“ خالہ درباری نے اپنا فیصلہ سنایا
 دیا اور شیا جیرانی سے ان کی طرف دیکھنے لگیں۔

”ہاں۔۔۔ ہاں لے جاؤ ان کو شوق سے مجھے بھی انہیں اپنے پاس رکھنے میں چنداں دلچسپی نہیں ہے جب سے پیدا ہوئی ہیں میرے سینے پر مونک دل رہی ہیں اچھا ہے ان بلاؤں سے میرا گھر پاک ہو جائے۔
 جانے کیا کیا بڑھ کر پھونکتی ہیں کہ میری بچی کا رشتہ ہی ہونے میں نہیں آ رہا، یہ نکلیں تو میری چندا کا نصیب جاگے۔“ شاگرہ اپنی جون میں آنکھیں شرافت و
 بشارت کا چولہا دھچکے پر سجا رکھا تھا ایک دم اتار کر پھینکا وہ دونوں بھی جھٹ پٹ تیار کر کے خالہ درباری کے ساتھ ان کے گاؤں جانے کی تیاری کرنے لگیں۔
 ”اچھا ہے اس گھر سے تو جان چھوٹے جہاں ہر وقت عزت نفس مجروح ہوتی ہے۔“ دونوں بہنیں ڈبڈبائی آنکھوں سے اپنی ضرورت کی چند اشیاء بیگ میں رشتی بڑھانے لگیں۔



گاڑی سبک رفتاری سے بڑھتی چلی جا رہی تھی یہ ان دونوں بہنوں کا ریل کا پہلا سفر تھا ہر اسٹیشن پر سواریوں کی آمد و رفت، سیٹ کے لیے لڑائی جھگڑا، تو تکار ان کے لیے انوکھی تھی۔ چیزیں بیچنے والے بار بار چکر لگا رہے تھے خالہ نے آواز دے کر نمکونی بیچنے والے کو اپنے پاس بلایا وہ دوڑا چلا آیا۔
 ”جی اماں۔“

”میرا بیٹا مجھے یہ بتا دے کہ تو یہ آواز حلق سے نکالتا ہے یا ناک سے“ وال اے اے کے کراری وال اے اے اے خالہ نے ہو ہو تھالی کی توڑے میں موند سب سے پہلے لگے وہ بے چارہ شرمندہ سا ہو گیا۔
 ”اماں یہ آواز پیٹ نکالتا ہے میرا۔ خالی پیٹ جب

ان کی اداؤں کے جال میں جو نہیں پھنستا۔ اب کسی نہ کسی طرح انتقام تو لینا ہے ناں ان کو۔“ شاگرہ بیٹے کی اس طرح دھنائی و بے عزتی پر مارے غصے کے الزام تراشی پر اتر آئیں۔

”خالہ درباری! سن رہی ہیں ناں آپ یہ پھپھو ہم پر کیسے گھنیا الزام لگا رہی ہیں حالانکہ آپ جب بھی آئی ہیں یہی گھونچو ہمیں آنکھوں ہی آنکھوں میں پٹانے کی کوشش کرتا ہے اگر ہم نے اس کو اپنے جال میں پھنسانا ہو تا تو کب کی کوئی سی بہن کو رٹ میرن کر کے اس چغد کو ماں باپ سے جدا کر کے کسی جھونپڑی میں چین کے گیت گارہی ہوتی۔ کتنی ہی مرتبہ اس نے مجھے قائل کرنے کی کوشش کی۔ گواہوں اور مولوی تک کا انتظام کر لیا مگر میں نے یہی سوچا کہ نہیں ماں کے کلیجے کو چھین کر بھلا میں کیسے سکون سے رہ سکتی ہوں۔“ دیہاتی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسوئے جنہیں شیا نے پچھے کرنے سے پہلے ہی اپنے ہاتھوں میں جذب کر لیے دونوں بہنیں غلے لگ کر خوب بین کر کے روئیں۔ وہ زار و زار روئیں تو خالہ درباری کا کلیجہ کٹ گیا جھٹ دونوں کو اپنی بانہوں میں پھر لیا۔

ادھر شعیب کی حالت دیدنی تھی جسے ماں کچا چبا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھی۔ بھری محفل میں ان دونوں بہنوں نے اس کا بھانڈا پھوڑ دیا تھا وہ دم دبا کر وہاں سے بھاگا چندا ابھی غصے کا اظہار کرتی وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چل دی۔

”ہائے میرے بچپوں! مجھے کیا پتا تھا کہ تم دونوں کے ساتھ اتنا برا سلوک ہو رہا ہے کچھ کچھ اندازہ تو ہو رہا تھا مجھے پر یہ علم نہ تھا کہ ایسی بد سلوکی سے پیش آرہی ہوگی یہ مولیٰ شاگرہ!“

”خالہ ان چیزیلوں کی باتوں پہ کان نہ دھرو میں بھلا اپنے خون کے ساتھ ایسی بد سلوکی کے بارے میں سوچ سکتی ہوں۔ انہوں نے ہی میرا ناک میں دم کر رکھا ہے جینا حرام کر دیا ہے مجھ سمیت میری اولاد کا۔ باپ تک شکل دیکھنا گوارا نہیں کرتا میرا دم نہ ہو تو سڑکوں پر رلیں دونوں بہنیں۔“

نہ تھی۔ ایک کوئی اپنی طرح سنجیدہ سی کتاب پڑھنے میں مشغول تھا تو دوسرا باہر کی جانب بھاگتے دوڑتے مناظر پر نظریں جمائے تھا۔

”ہائے کیسا بور سفر گزر رہا ہے سارے بڈھے کھوسٹ، چرسی، بھٹکی، نشئی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہمیں گھورے جارہے ہیں اور جن کو گھورتا چاہیے وہ آنکھوں پر شرافت کی پٹی باندھ کر بیٹھے ہیں۔“

شیبا نے اتنی زور سے دبا کے کان میں سرگوشی کی کہ سامنے بیٹھے وہ دونوں جوان سن لیں اور انہوں نے سن بھی لی تھی مگر شرافت کے دائرے میں سے انہوں نے نہ نکلنے کی قسم کھا رکھی تھی۔

”اھ۔۔۔ میں نے تو سنا تھا کہ کہ ریل کے سفر میں اکثر سیننگ ہو جاتی ہے رہائشی بے اور فون نمبرز کا بھی تبادلہ ہو جاتا ہے کئی کے رشتے آپس میں طے پا جاتے ہیں مگر یہاں تو رشتے چھوڑ فرشتے آنکھ تک مامانے نہیں دے رہے۔“ شیبا نے سرد آہ بھر کر اپنے دل کو سمجھا بھجا کر تھک تھک کر سلا دیا۔ ”خالہ آب کا گاؤں کب آئے گا۔“ شیبا نے جھنجھلا کر خالہ کو جھنجھوڑ دیا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔

”اکیلا اسٹیشن، چلو جلدی کرو، سامان پکٹو، گاڑی زیادہ دیر نہیں رکتی یہاں۔“ انہوں نے پاؤں میں چھپکھپھپک نہیں کر رہی تھیں۔ جنہیں ٹرین میں سوار ہوتے ہی اتار کر شاپر میں ڈال کر تکیے کا کام لے لیا تھا۔ دونوں بہنیں سر پیٹ رہ گئیں۔

”ابھی نہیں آیا ہم آپ سے پوچھ رہے ہیں کب آئے گا۔ تین گھنٹے ہو گئے ہمیں اس ٹرین میں پھنکولے کھاتے۔“ خالہ نے کھڑکی کھول کر باہر جھانکا، سورج دم دبا کر بھاگ چکا تھا۔ شام کے سرمئی اندھیرے نے باہر کا منظر بنا پر اسرار سا بنادیا تھا۔

”بس جوں ہی شام رات کے گھلے لگے گی، اپنے گاؤں کا قریبی اسٹیشن آجائے گا۔“ خالہ کا جاپنے کا اپنا ہی انداز تھا۔

”واہ! آسانوں کا تو ایک دوسرے سے گلے لگنے کا سنا۔“ دبا نے بھورے بالوں اور لمبی ناک والے لڑکے

بچے بھوکے گھر بیٹھے ہوں تو پیٹ سے خود بخود کراری آواز نکلتی ہے۔“

”میرے بچے کیسی سولہ آنے کھری بات کی ہے۔“ خالہ درباری نے اس کی بات سے متاثر ہو کر اسے بگڑے بالوں پر اپنا شفقت بھر رہا تھا پھر کر مزید بگاڑا۔

”اچھا یہ بتایہ تیری دکان کا سامان کتنے کا ہے۔“ انہوں نے اس کے سامان کا طائرانہ جائزہ لیا۔

”یہی کوئی چار ہزار کے لگ بھگ۔“

”تو بس پھر یہ سامان تو ہوا میرا۔ یہاں رکھ دے۔“

”اماں آپ مذاق تو نہیں کر رہیں۔“ وہ حیران پریشان تھا۔

”اے بیٹا مجھے یہ بتا میری عمر ہے تیرے سے مذاق کی۔“ انہوں نے اپنا بڑا کھولتے ہاتھ روک کر اسے دیکھا۔

”نہیں اماں وہ بس۔۔۔ میں تو ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔“

”لے بیٹا یہ تیرے چار ہزار روپے گھر پر پوری فوج تیار بیٹھی ہوگی کہ اماں ہمارے لیے چیزیں لے کر آئے گی ان ہی کے لیے لے جا رہی ہوں۔“ خالہ نے اس کے ہاتھ میں پیسے پکڑائے اور اپنا سامان سائڈ پر رکھا کچھ دال، بسکٹ اور ٹافیوں کے پیکٹ انہوں نے ڈبے میں موجود بچوں میں بانٹ دیے۔ بچے خوش اور دال والا بھائی شکر اوار کر تاجلا گیا۔

دبا اور شیبا خالہ کی دریا دلی اور رحم دلی کی قائل ہو گئیں دنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں جو نیکی کمانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔



تھوڑی دیر پہلے ان کے بالکل سامنے والی سیٹ پر دو گندی رنگت کے لڑکے آکے بیٹھے تھے سنجیدہ، بڑبڑار سے بجا رہے جو انہوں نے ایک بار بھی آنکھ اٹھا کر انہیں دیکھا ہو حالانکہ وہ دونوں ہمیں نظر انداز کرنے کی چیز تھیں کوئی ایک بار دیکھ لے تو نظریں پھل پھل جاتی ہیں مگر وہ بتا نہیں شرافت کی کسی مٹی سے بنے تھے جنہیں صف مخالف سے آنکھیں سیننے میں کوئی دلچسپی

کودیکھ کر حملہ کساتو وہ اس کی بات سن کر مسکرایا۔
 ”وہ مارا۔“ دینا نے شبیا کے ہاتھ پہ ہاتھ مارا۔
 ”آگیا بھی، آگیا لڑکلاسن پر آگیا۔“
 ”کہاں؟ کہاں؟“ زنجیر کھینچو جلدی سے، آئے
 کسی کے کلیجے کا ٹکڑا کٹ کر نہ گر پڑے۔ یہ موئے آج
 کل کے لڑکے بھی ناٹاں، باپ کی محبت تو بھاڑ میں
 جھونک کر نیلی پٹی آنکھوں والی کے عشق میں ناکام
 ہو کر اپنی جان ریلوے لائن پر دینے آجاتے ہیں۔
 خالہ کا داویلا شروع ہو گیا۔ تو کئی مسافر اٹھ کھڑے
 ہوئے اس سے پہلے کہ زنجیر کھینچنے دینا نے کھڑے ہو کر
 چلنا شروع کر دیا۔

”نہ کھینچو، نہ کھینچو جرمانہ ہو جائے گا“ میں تو ویسے ہی
 مذاق کر رہی تھی۔ ”اس کی بات سن کر کچھ نے ناک
 بھوں پڑھائی تو کچھ زیر لب مسکرایے۔“

ذرا دیر بعد ہی رات شام سے بعزل گیر ہوئی۔ خالہ
 نے اپنا سامان ہاتھ میں پکڑ کر ٹرین کے گیٹ کے قریب
 ہونا شروع کر دیا۔ وہ دونوں ہمیشہ بھی خالہ کے ساتھ
 کھنٹے لگیں۔ جاتے سے ایک بار بھی انہوں نے ان
 لڑکوں پر ایک اپنی نگاہ تک نہ ڈالی تھی۔ کیا فائدہ جس
 گلی کا راستہ ہی نظر نہ آئے، وہاں پر پاؤں رکھنا ہی
 حماقت ہے۔ وہ دونوں دکھی دل کے ساتھ ٹرین کے
 رکتے ہی نیچے چھلانگ لگا لگیں۔ خالہ کو بھی بازوؤں
 میں بھر کر نیچے اتارا۔

اسٹیشن سنسان پڑا تھا۔ اکا دکا مسافر بینچوں پر
 بیٹھے تھے۔ رات کا وقت پورے اسٹیشن پر سنائے گا
 راج تھا۔ ان کے دل کو خوف نے جکڑ لیا۔ وہ خالہ
 درباری کے ساتھ لگ گئیں۔

”گھبراؤ مت، یہ تمہارا گھر نہیں کہ چور اچکے، لپے،
 لفٹے تنہا عورتوں کو دیکھ کر گھیرے میں لے لیں گے۔ یہ
 تمہاری خالہ کا گاؤں ہے، سب ماں بیٹیوں کو عزت و
 احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ مجال ہے جو کوئی میلی
 آنکھ سے کسی خاتون کی طرف نظر بھی ڈالے۔“

”چھالید۔“ وہ حیران ہوئیں۔
 ”ہاں نہیں تو کیا۔ اس اسٹیشن کے آس پاس چار“

پانچ گاؤں ہیں، ویسے تو سب ہی گاؤں والے عورتوں کی
 عزت کرتے ہیں، پر تمہاری خالہ کے گاؤں کی بات ہی
 الگ ہے۔ گاؤں میں جو بھی کانا نظر آئے گا سمجھ لینا
 اسے آنکھیں سینکنے کی سزا آنکھ پھوڑ کر دی گئی ہے۔“

”کیا۔“ اس انکشاف پر ان کی آنکھیں پھٹ
 گئیں۔ ”صحیح کہہ رہی ہوں بڑا صاف ستھرا ماحول ہے
 میرے گاؤں کا۔ کسی نے ہاتھ سے چھیڑا تو ہاتھ توڑ دیا،
 آنکھ منکا کیا تو آنکھ کا ڈیلا پھوڑ دیا، کسی لڑکی کے پیچھے پڑا
 تو لنگڑا ہوا۔ یہاں تو اس ہاتھ دے، اس ہاتھ لے والا
 معاملہ ہے۔ سب لڑکیاں بالیاں بے خوف ہو کر گھر
 سے نکلتی ہیں۔“ خالہ درباری گاؤں کے اوصاف بیان
 کرتی جا رہی تھیں اور وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی
 اسٹیشن سے باہر ان کے ہمراہ چل رہی تھیں۔

”لے بھی شیا یہاں تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔
 میں یہاں سے کالی اور تو لنگڑی ہو کر نکلے گی۔ اس لیے
 اپنی حرکتوں پر کنٹرول کرنا پڑے گا۔ جب لڑکوں کے
 لیے یہ سزا ہے تو لڑکیاں بھی اس سے مستثنیٰ نہیں
 ہوں گی۔“ دینا نے خوف سے جھرجھری لی تو شبیا بھی
 سسم گئی۔

”سوچ لیں گے، فی الحال تو تیز تیز قدم اٹھاؤ، دیکھو تو
 خالہ درباری کے اپنے گاؤں میں آکر قدموں میں کیسی
 جان آگئی ہے۔“ وہ تیزی سے چلتی ہوئیں، خالہ کے
 برابر ہو گئیں۔

”سلام خالہ۔“ ایک کوجوان ان کی طرف بڑھا۔
 ”وعلیکم السلام۔“ خالہ نے اس کے آدھے منہ سر
 پر ہاتھ پھیرا تو اس نے مسکراتے ہوئے جلدی سے
 سامان ان کے ہاتھ سے لے لیا۔

”کیا بات ہے خالہ؟“ اس دفعہ واپسی جلدی ہو گئی۔
 ”بس بیٹا! جب بزرگوں کا ادب احترام دل سے
 رخصت ہو جائے تو اپنے گھر کی راہ لینی ہی پڑتی ہے۔“
 خالہ نے سر دھرتے ہوئے ان دونوں کے دوپٹوں کو
 آگے کی طرف کھٹکا کر گھونکھٹ کاڑھ دیے۔ ”یہ کیا
 تم مردوں کو پٹر پٹر دیکھ رہی ہو، آنکھیں پٹی کر کے
 دبے کو چہرے سے نہ ہٹانا۔“ خالہ نے سرگوشی میں

تنبیہ کی تو وہ دل موس کر رہ گئیں۔ وہ تانگے میں
چپکولے اور پیچ و تاب کھاتی خالہ کے گھر کی طرف
گامزن تھیں۔



ایک کنال کے رقبے پر پھیلی جویلی ان کی نظروں کو
حیران کر گئی۔ یہ بڑے بڑے کمرے برآمدے، بڑا سا
صحن سب جگہ جگہ رکھا تھا۔ ساتھ ہی دیوار کے بکریوں،
بھینسوں کا باڑہ تھا۔ اپنے گھر کا دودھ، مکھن ملائی سب
دستیاب تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک طرف مرغیوں
کے ڈبے تھے۔ مختلف رنگوں اور سائز کی مرغیاں
یہاں کٹاک کٹاک کرتی مڑگشت کر رہی
تھیں۔ صحن کے آخری حصے میں گیٹ کے پاس کچھ
زمین کچی تھی۔ جس کو لان کی شکل دے رکھی تھی۔
مختلف پودے اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ ایک سائڈر بنی
لبی سی کیاری میں ہر ادھیا نمٹا، پودہ آنکھوں اور دل
کو خوشی فراہم کر رہے تھے۔ ”لیموں“ انار اور امرود کے
درخت ہوا سے اٹھیلیاں کرتے، مسکرا مسکرا کر اپنا
پھل انہیں پیش کر رہے تھے۔ دیا اور شیا یہ سب دیکھ
دیکھ کر کھلی جا رہی تھیں۔ صاف ستھرا سکون ماحول
نے ان کے ذہن کی ساری بے چینیوں کو دھو کر جیسے
اجلا کر دیا تھا۔ وہ سرشار سی یہاں وہاں ہر چیز شوق سے
دیکھتی پھر رہی تھیں۔ خالہ درباری انہیں یوں خوش
دیکھ کر جیسے مطمئن سی ہو گئیں۔ ورنہ انہیں یہ ہی
دھڑکا لگا تھا کہ شہری ماحول کی پروردہ یہ لڑکیاں شاید
گاؤں کے ماحول کو پسند نہ کریں مگر وہ تو جب سے آئی
تھیں خوش باش چلتی پھلنے پھرنے پھر رہی تھیں۔

دیا اور شیا کو یہاں آکر پتا چلا کہ خالہ درباری کا نام
درباری کیوں رکھا گیا۔ صبح کالوں سے فارغ ہو کر گاؤں
کی خواتین اور لڑکیاں خالہ کے بڑے سے دالان میں
جمع ہو جاتیں۔ اپنی اپنی پریشانیوں کو خالہ کے سپرد
کرتیں، تو وہ منٹوں میں انہیں سکھا کر ان کے بوجھ کو
ہلکا کر دیتیں، سب کے منہ سے ان کے لیے دعاؤں کے
کلمے نکلتے، وہ چوڑے رنگین پایوں والے اونچے سے

موڑھے پر بیٹھی کوئی ملکہ لگا کرتیں کہ جن کے دربار
میں لوگ حاضرین دینے آتے اور اپنی الجھنوں کو
سکھا کر جاتے۔ بچن میں کھانے پک رہے ہوتے،
جس کا دل چاہے کھا کر جائے اور جس کا دل چاہے وہیں
شام تک قیام کرے۔ مائیں اپنی بچیوں کو بے فکر ہو کر
خالہ کے گھر بھیتیں صبح سے شام تک ان کے گھر میں
روٹ لگی رہتی۔ کوئی کڑکھائی کر رہی ہے، تو کوئی
سلائی۔ سارے گھر کا کام سنبھل رکھا تھا ان لڑکیوں
نے، صفائی ستھرائی، کھانا پکانا سب ان ہی کے ذمہ تھا۔
خالہ تو بس صبح سویرے اسی بلوتیں، مکھن نکالتیں اور
نما دھوا اپنے دربار میں بیٹھ جاتیں۔

خالہ بڑے درویش صفت بندے تھے۔ وہ صبح کا
ناشتا کر کے گھر سے نکلتے تو شام کو گھر کی راہ لیتے۔ ان
کے لیے کھانا، کسی چائے ہر چیز نہیں پہنچ جاتی۔

خالہ درباری کی کوئی اولاد نہ تھی، مگر گاؤں کی بچیاں
ان کی اولاد کی مانند تھیں۔ اپنی اولاد کا سکھ تو نصیب
سے ملتا ہے۔ یہاں خالہ بے اولاد ہو کر بھی اولاد والوں
سے زیادہ اولاد کا سکھ پارہی تھیں۔ بچے بڑے بوڑھے
سب ہی ان کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے، وہ دونوں
تو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتیں۔ خالہ نے کبھی اپنی زمینوں
اور امارات کے قصے انہیں نہ سناے وہ تو سمجھ رہی
تھیں کہ وہ عام سی گاؤں کی عورت ہوں گی جو بس اپنے
شوہر کی ہمراہی میں خوش حال زندگی گزار رہی ہیں۔
پھپھو اگر ان کے یہ ٹھاٹھ بٹا دیکھ لیں تو غش کھا کر گر
پڑیں۔



”چلو بھی کنواریوں، تیاری کرلو، آج سب نہر پر
چلیں گے۔ اچھا، اچھو اور شیدے کو چوان کو میں نے
کہہ دیا ہے کہ تانگا تیار رکھیں۔ تم بس جلدی سے
کھانے پینے کا سامان تیار کرو۔“ خالہ نے حکم دیا تو
سب لڑکیوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ جلدی جلدی
ہاتھ چلانے لگیں۔ کچھ ماؤں کو بتانے چل دیں اور کچھ
تیار ہونے۔ وہ دونوں بھی پرجوش ہوتی تیار ہونے

ہننے لگیں۔ تاکہ وقفے وقفے سے ایک بڑے پھل دار درختوں سے لدے پھندے باغ کے قریب رک گئے۔ وہ سب نیچے اتر گئیں اور باغ کے احاطے میں آ گئیں۔

دیا اور شیا ٹرانس کی سی کیفیت میں تھیں۔ ایسے گاؤں کا نقشہ انہوں نے صرف کتابوں میں پڑھا تھا۔ مگر آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں۔ بڑی لمبی اور چوڑی نہروں دوں تھیں۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے صنف نازک کے پیراہن سے انکھیلیاں کرنے لگے تاحہ نگاہ پھیلا سبزہ مندی کا دم شور ماحول کو بڑا خوف ناک بنا رہا تھا۔ وہ بے اختیار ہو کر خوشی سے بازو پھیلا کر گول گول گھومنے لگیں۔ خالہ درباری ان کو دیکھ کر مسکرا دیں۔

”وہ بھی میں تو یہاں آرام کروں گی، تم لوگ گھوم پھرو، کوئی ڈر خوف نہیں سارا علاقہ اپنا ہے۔“ ایک ادھیڑ عمر آدمی خالہ کے آرام کرنے کے لیے چارپائی لے آیا تھا۔ ان دونوں نے اپنے جسموں کو چادر کی قید سے آزاد کیا اور تہ کر کے خالہ کے سر کے نیچے رکھ دیں۔

”لیس خالہ آپ کا تکیہ اب ہمیں آزادی سے گھومنے دیں۔“ وہ کہہ کر تیزی سے نہر کی طرف چل دیں۔

”دھیان سے نہر کے زیادہ قریب نہ ہونا بڑا تیز بہاؤ ہے۔“ خالہ درباری زور سے بولیں تو انہوں نے دور سے ہی ہاتھ کے اشارے سے انہیں تسلی دی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے خالہ کو پل میں غنیمت کی واہیوں میں لے گئے۔ وہ دونوں اب آزاد تھیں۔ وہ نہر میں پاؤں ڈالے پانی اچھال رہی تھیں۔ لڑکیاں ان کا اس طرح سے دیوانہ پن دیکھ کر ہنس رہی تھیں۔

”باجی جی! کیا آپ کے شہر میں نہر نہیں ہوتیں۔“

”ہوتی ہیں رانی، پر ان نہروں کا یہ خواب ناک و سحر انگیز ماحول نہیں ہوتا۔ یہ باغات یہ سبزہ یہ پرنوئی سماں شہر میں کہاں دستیاب ہے۔“ وہ مسلسل پانی سے ٹھیل

لگیں۔ نہر کی سیر ان کے لیے ایڈونچر سے کم نہ تھی۔ ان دونوں نے ٹھیلے رنگوں کے سوٹ زیب تن کیے۔ لائٹ سائیک اب کر کے بالوں کو شانوں پہ کھلا چھوڑ دیا۔ پھیلا کر دوپٹا لیا اور باہر چلی آئیں۔ جہاں خالہ اور لڑکیاں ان کا انتظار کر رہی تھیں۔ وہ جیسے ہی باہر آئیں سب لڑکیوں کی سنسنی نظریں انہیں شرمندہ کر گئیں۔ وہ سب ان کو ایسے نکا کرتیں جیسے کوئی ماورائی مخلوق زمین پر اتر آئی ہو۔ سب لمبے لمبے رنگ برنگ پراندے ڈالے ہرے لال، پیلے رنگوں کے سوٹ پہنے تیار کھڑی تھیں۔ زیادہ تر کے لبوں پر سرخ لپ اسٹک تھی۔ لگتا تھا کہ ایک ہی لپ اسٹک سے سب نے استفادہ کیا تھا۔ بڑی بڑی چادروں سے انہوں نے اپنے آپ کو ڈھانپ لیا۔

”چلو کتواریوں! یہ دوپٹے تہ کر کے اس شاہر میں رکھو اور یہ چادریں اوڑھو۔“ خالہ نے دو بڑی بڑی کڑھائی والی چادریں ان کے سپرد کیں۔ ”مگر خالہ ہمارے دوپٹے کافی بڑے ہیں۔“ وہ منمنائیں۔

”شرم و حیا عورت کا زور ہے، مرد آدمی عورت کی عزت کرتا ہے جو اپنے جسم کی حفاظت کرتی ہے یہ جالی کا دوپٹا تمہاری نسوانیت چھپانے سے قاصر ہے۔ لہذا یہ چادریں لے کے نقاب کرو، تاکہ غیر محرم کی نظروں سے محفوظ رہو، گلے میں دوپٹا ڈالے منہ چمکائے خود مردوں کو دعوت نگارہ دیتی ہیں، پھر کہتی ہیں۔ فلاں ہمیں گھور رہا تھا۔ فلاں نے ہمیں دیکھ کر سینہ بجائی کسی نے جملہ کسا۔ جب خود نمائش کرواؤ گی تو مرد تو نظروں و زبان سے وار کر س گے ہی۔“ خالہ کی بات سن کر وہ دل موس کر رہ گئیں۔ باری باری سب تاگوں میں سوار ہو گئیں۔ وہ جان بوجھ کر اس ٹانگے میں بیٹھیں جس میں خالہ درباری نہیں تھیں۔ ورنہ سارے راستے ان کی چادر ہی درست کرائی رہتیں، انہیں تو ابھی سے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ خالہ کا تانگا پیچھے تھا اور وہ اگلے ٹانگے میں آگے بیٹھی تھیں۔ سوچر کے کوفرا ”ہی نقاب سے آزاد کیا۔ لڑکیاں ان کی اس حرکت پر دبی دبی ہنسی ہنس دیں تو وہ بھی خفت سے

ہیں، میں ان کو اچھی طرح جان گئی ہوں انہیں بھیجتیوں سے نہیں، پیسے سے محبت بھی جب تک بابا پیسے کی جھلک دکھاتے رہے، ہمیں برواشت کرتی رہیں جوں ہی پیسے کی شکل دکھائی نہ دی، ہماری شکلیں انہیں زہر لگنے لگیں۔ ہمارا وجود ان کی نظروں میں کھنک رہا تھا۔ ”شیانے تنخی سے کہتے ہوئے ایک جھوٹے سے پتھر کو ٹھوکر لگائی، جنہر میں جا کے گرا ذرا سا بلبلایا اور پھر نہر میں خامشی چھا گئی۔

”وہ تو پھر ہماری پھپھو ہیں، بابا کو دیکھو جن سے ہمارا قدرتی رشتہ ہے۔ انسان ہر رشتے کے بغیر رہ سکتا ہے، مگر اولاد کے بغیر نہیں۔ جب وہ ہمیں بھول سکتے ہیں۔ ہماری پروا انہیں ہے تو پھر بانی رشتوں سے شکوہ تو بے معنی ہے۔“ وہ چلتے چلتے کافی دور نکل آئیں۔ دونوں کے چہروں پر اداسی نے بال بکھیر دیے تھے۔ وہ تھک کر نہر کے کنارے بیٹھ گئیں۔ یہ دیکھ کر بغیر کہ یہاں ان کے علاوہ بھی کوئی ذی روح موجود ہے۔

”ہیلو۔۔۔ کوئی ان کے بے حد قریب سے پکارا۔ وہ اچھل پڑیں۔

”محترمہ سنبھل کے اگر میں ہاتھ نہ پکڑتا تو آپ نہر میں غوطے لگا رہی ہوتیں، ہمیں تو تیرا بھی نہیں آتا۔ دل پر پتھر رکھ کر حسین دو شیرازوں کو سفاک ننہوں کے سپرد کرنا پڑتا۔“

”آہ۔۔۔ آپ وہی ہیں نابوئین میں۔۔۔“

”جی۔۔۔ جی بالکل، ہم وہی ہیں جوئین میں شریف دو شیرہ کا روپ دھارے زبان پر ابلقی اور آنکھوں پر حیا کی چادر آنے بیٹھے تھے۔“ بھورے بالوں والے نے سر جھکا کر خوشی سے بولا۔ دوبا کا ہاتھ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔

”آپ یہاں کیسے۔۔۔ دبانے آنکھیں پھٹاؤں۔“

”آپ یہاں جیسے۔۔۔ اس نے بھی جواباً۔۔۔ آنکھوں کی ساری مستی دبا پے لٹائی۔

”جھاگ جا میں یہاں سے، آیا آپ کو اس گاؤں کے اصول معلوم نہیں ہیں۔“ اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔

”جی۔۔۔“ وہ ورطہ حیرت تھیں۔ ”کیا تم لوگ بھی شرمیں نہیں گئیں۔“

”میرے چاچے کے پتر شرمیں رہتے ہیں، یہ بڑی کوٹھی ہے۔ ایک داری میں گئی تھی۔ اس کے بعد نہ جانے کی قسم کھالی۔ چاچی کا تو مزاج ہی نہیں ملتا۔ باجی یہ شرم کے پڑھے لکھے لوگ اتنے روٹھے مجاز (مزاج) کے کیوں ہوتے ہیں، گاؤں والوں کو کج سمجھتے ہی نہیں۔“ بڑی بڑی آنکھوں والی نرگس نے دبا کی آنکھوں میں جھانک کر سوال کیا تو وہ ہنس پڑی۔

”ہم بھی تو شرم سے آئی ہیں، کیا تم لوگوں کو ہمارا مزاج روکھا لگتا ہے۔“

”نہ جی آپ دونوں تو اتنا مضطرب (مضبوط) بولتی ہو گزرو گنا (گڑجیسا) اوپر سے رنج کے سوہنی بندہ آپ کو دیکھ کر تو کھلا (پاگل) ہی ہو جائے۔“ وہ دونوں اپنی تعریف سن کر کھلکھلا دیں۔

”آپ سب کو خالہ درباری کھانے کے لیے بلارہی ہیں۔“ اسی آدمی نے جس نے خالہ کے لیے چارپائی بچھائی تھی۔ اس نے دور سے ہی نظریں نیچی کیے ہانک لگائی۔ سب لڑکیاں فوراً کھڑی ہو گئیں۔

”تم لوگ چلو، ہم ابھی آتے ہیں۔“

”نہیں بابی، خالہ ناراض ہوں گی، آپ ہمارے ساتھ ہی چلیں۔“

”اوہو کچھ نہیں کہتیں، بس ہم ابھی پانچ منٹ میں آتی ہیں، تم کھانا لگاؤ۔“ وہ انہیں چھوڑ آگے کی طرف چل دیں۔

”واؤ کتنا زبردست ماحول ہے دیا۔“

”واقعی بالکل جنت کا سا مائل ہوتا ہے۔“ خنک ہوا کا جھونکا شیا کے بدن سے ٹکرایا تو اس نے جھرجھری لی۔

”ویسے شیا، میں سوچ رہی تھی کہ شاید پھپھو ہمیں آتے وقت روک لیں یا اگر غصے میں اس وقت ہمیں جانے دے رہی ہیں تو چند دن بعد ہی ہمیں فون کر کے بلا لیں گی۔“

”تم نے ہی فضول میں یہ خوش فہمیاں پال رکھی

صبح سے رجم جھم ہو رہی تھی۔ موسم دیکھتے ہی لڑکیوں نے بیسن گھولنا شروع کر دیا۔

”میٹھے مال پورے بھی بنا لیتا۔ ایسے موسم میں بڑے سوادہ (خزندار) لگتے ہیں۔“ خالہ درباری نے کڑا ہی سائڈ پر رکھی اور اٹھ کھڑی ہوئیں دودھ کی بالائی اٹھنی کر کے انہوں نے کافی سارا دیکھی کھی نکال لیا تھا ہاتھ دھو کر وہ برآمدے میں بچے رنکین پلنگ پر بیٹھ گئیں جہاں دیا اور شیا سر جوڑے کسی بات میں مصروف تھیں۔

”کیا بات ہے کنواریوں! کوئی پریشانی ہے تو اپنی خالہ کو بتاؤ۔“
 ”پریشانی تو ہے خالہ۔“
 ”کیا ہے؟“

”ہم دونوں سوچ رہی تھیں کہ سارا دن پلنگ توڑتی ہیں یہ لڑکیاں اور آپ کسی کام کو ہاتھ ہی نہیں لگائے دیتیں تو پھر ہم کب تک ایسے فارغ نہیں کیں گی۔“
 ”تو پھر وہاں نہ دوں تمہارا ناکہ مصروفیت نکل آئے۔“ خالہ مسکرا کر بولیں تو دونوں نے دوپٹے مروڑ کر دانتوں میں انگلی دبا کر شرمائے کی بھرپور ایکٹنگ کی۔
 ”ہمارے ایسے نصیب کہاں۔“ سرد آہوں نے خالہ کو ہنسا دیا۔

”یہ کیا بات؟ کیا کمی ہے میری شہزادیوں میں۔“
 ”کمی تو ہے ناں خالہ! آج کل لوگ بڑھی لکھی لڑکیوں کو پسند کرتے ہیں آپ کو پتا ہے شہر میں دس جماعتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔“ شیا اٹھ کر ان کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ گئی خالہ نے اچنبھے سے ان کی طرف دیکھا۔

”شہر میں تو پچھپھونے اے گھر کے کاموں کی وجہ سے ہماری پرہیانی چھڑا دی تھی کچھ ہمیں بھی اس وقت عقل نہ تھی مگر اب ہم سوچ رہی ہیں فارغ رہنے سے بہتر ہے آگے پڑھ لیا جائے ہم پڑھ لکھ کر اپنے پاؤں پہ کھڑے ہونا چاہتے ہیں آخر کب تک ہم یوں دوسروں پر بوجھ بنے مفت کی روٹیاں توڑتے رہیں گے۔“ شیا کالج بھگ گیا۔

”اصول معلوم تھے جب ہی تو شریف برادران بن کر بیٹھے تھے۔ اگر خالہ درباری نہ ہوتیں تو آپ کی ہمارا ہی میں سفر کیسا خوش گوار گزرتا۔“ دوسرے نے آنکھیں بند کر کے حسین سفر کا تصور کیا۔
 ”آپ خالہ درباری کو جانتے تھے۔“ وہ حیران ہوئیں۔

”ہم تو خالہ درباری کو جانتے تھے۔ صد شکر وہ ہمیں نہیں پہچانتی تھیں۔ یہاں ہمارے تاجا جی رہتے ہیں ہمارا ان ہی کی طرف قیام ہے بابا یہاں پر فیکٹری لگا رہے ہیں۔ اسی سلسلے میں ہمارا آنا جانا لگا رہتا ہے۔“ لمبی ناک والے نے جلدی جلدی معلومات فراہم کیں۔ ویسے آپ کا اسم مبارک کیا ہے؟
 ”میں شیا۔“

”اور میں دیا۔“ وہ اٹھائیں۔
 ”میں احیان اور یہ شیطان۔“ احیان نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا تو جبران نے اس کے دھمو کا جڑا خاکسار کو جبران کہتے ہیں۔ ہم برادران توام ہیں۔“
 ”ہم خواہراں توام ہیں خالہ درباری کے گھر قیام ہے۔ اب آپ کو سلام ہے بندہ ہماری جانب آ رہا ہے ہمارا دل گھبرا رہا ہے۔“ دیا شیا نے گھبرا کر قدم بدھائے۔

”پلیز دوبارہ ملنے کی قسم کھائیے۔ جائے ملاقات بتائیے۔“ وہ دونوں شوخ ہوئے مگر انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔

”نرگس سے راہ و رسم بدھائیے گا۔ وہ ہمارے تائے کی بیٹی ہے۔ اس کے گھر آئیے گا۔ وہ پکارے ہم وہاں آجائیں گے۔“

نی الحال آپ یہاں سے جا لے۔ ورنہ آنکھ پھڑپھڑائیں گے۔ لوٹے، تلنگڑے ہو جائیں گے۔“
 وہ تیز تیز قدم اٹھاتی کھلکھلائی اس طرف جانے لگیں۔ جہاں سے وہ رکھوالی آ رہا تھا۔ یقیناً خالہ درباری کا پیغام لے کر آ رہا ہوگا۔ ان کے قدموں میں تیزی آگئی۔



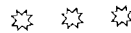
”آج تو یہ بات کر دی تھیں۔ آئندہ اگر کی تو گائے
بھینسوں کے گوبر کے ایلے تم سے ہی بنوایا کروں گی۔“
خالہ کی بات پر ان دونوں کے چہروں پر ہلکی سی
مسکراہٹ در آئی اور پاس کھڑی نرگس قہقہہ لگا کر ہنس
پڑی۔

”جب کوئی کسی کے گھر آتا ہے تو اللہ اس گھر میں
اس بندے کا رزق پہلے پہنچا دیتا ہے تو پھر بوجھ کیوں
ہو میں۔ تم دونوں جتنا بڑھتا ہے بڑھو اسٹیشن کے پاس
لڑکیوں کا کالج ہے آدھے گھنٹہ کی مسافت ہے اچھو
کو جوان کی ڈیوٹی لگا دوں گی چھوڑ بھی آیا کرے گا، لے
بھی آئے گا اب تم دونوں یہاں سے کہیں نہیں جاؤ گی
تمہارا ویاہ ہو گا تو اس گھر سے نکلو گی۔ ابھی تو تم یہ گرم
گرم پکڑے کھاؤ۔“ انہوں نے دونوں کے منہ میں
ایک ایک پکڑا رکھا جو نرگس لے کر آئی تھی۔ تو ان کا
ذہن جیسے ہلکا ہلکا ہو گیا وہ ان کی طرف سے محبت و
احساس تشکر سے دیکھنے لگیں دنیا میں ایسے لوگ بھی
ہیں جو ان کے کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی ان کے لگیں۔

”بائی میرے چاچے کے لڑکے آج کل شہر سے
آئے ہوئے ہیں اگر آپ کو کسی مدد کی ضرورت ہو تو
میرے ساتھ میرے گھر چلنا آپ کو ساری بات سمجھا
دیں گے بڑے بڑے لکھے ہیں۔“ نرگس نے آنکھیں
مٹکا میں تو دیبا شیشیا کے دلوں میں گھٹیاں بجتے لگیں لو
می ملاقات کی سبیل تو خود بخود نکلی آئی۔

”اگر خالہ اجازت دیں گی تو ہم تمہارے گھر
آجائیں گی۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں پر ایک بات کا خیال رکھنا ان
شہر کے لڑکوں سے زیادہ فری نہ ہونا آنکھ مٹکا کرنے میں
ماہر ہوتے ہیں ویسے تو تم بھی شہر کی ہو ان کی عشق
معشوقی کی عادت سے واقف ہو گی۔ پھر بھی خیال
رکھنا۔“ خالہ نے سمجھایا تو وہ مسکرا کر اثبات میں سر ہلا
کر رہ گئیں اس وقت ان کا پورا دھیان احیان اور
جہان کی طرف تھا۔



اگلے دن وہ وقت ضائع کیے بغیر خالو کے ساتھ بازار

چل دیں۔ چھوٹا سا بازار تھا کپڑوں کی جوتوں کی چند
دکانیں تھیں باقی کریمائی کی دکانیں۔ فروٹ کی ریڑھیاں
بھی لگی تھیں۔ یہ گاؤں سے کوئی پندرہ منٹ کی
مسافت پر تھا لوگ یہیں سے آکر خریداری کرتے۔
سادہ طبیعت لوگ تھے سادہ سی ہی چیزیں دکانوں پر سج
رہی تھیں جن لوگوں کو پہچنیں پسند نہ آتیں یا جن
کے پاس کچھ پیسے کی فراوانی تھی وہ قریب کے شہر جا کر
خریداری کر لیتے۔ دیبا اور شیشیا چادرلوں سے چہرے
کو ڈھانپ رکھا تھا وہ جس دکان کے سامنے سے
گزرتے لوگ خالو کو دور سے ہی سلام کرتے وہ ہاتھ
اٹھا کر لب پھیلا کر ان کے سلام کا جواب دیتے ایک
کتابوں کی دکان پر وہ انہیں لے کر اندر داخل ہو گئے
وہاں سے انہوں نے انٹرمیڈیٹ کی کتابیں خریدیں جو
نہیں ملیں دکان دار نے شہر سے منگوانے کا وعدہ کر لیا۔
واپسی پہ خالو نے انہیں گئے کارس بلایا۔ فروٹ چاٹ
کھلائی اور انہیں لیے گھر آ گئے وہ خوشی خوشی کتابیں
کھول کر دیکھنے لگیں۔

شام کو پنک اور فیوزی رنگوں کے سوٹ پہنے
چادریں اوڑھے کتابیں سنبھالے خالہ درباری سے
نرگس کے گھر جانے کی اجازت طلب کرنے آئیں
آنکھوں میں لگا کاجل کسی کو گھاسل کرنے کو کافی تھا۔
”لے جاؤں خالہ ان کو اپنے گھر“ نرگس نے ان کی
اجازت چاہی۔

”نہیں رہنے دے۔“ خالہ کے انکار پر وہ اچھیسے
سے انہیں دیکھنے لگیں کہ کل کو تو انہوں نے خود انہیں
جانے کی اجازت دی تھی پھر آج کیا ہو گیا تھا یہ خالہ بھی
نال ہمارے اربانوں پر پوری اوس ڈالنے کے چکر لوں
میں ہیں۔

”پر کیوں خالہ؟“

”تو ایسا کر اپنے تائے کے بیٹوں کو یہیں لے آ۔ جو
کچھ انہوں نے پوچھا ہو گا۔ یہیں پوچھ لیں گی۔ ان
کنواریوں کو میں لڑکوں سے اکیلے میں ملنے کی اجازت تو
نہیں دے سکتی ناں۔ میرے گھر امانت ہیں اور مجھے
امانت کی اچھی طرح حفاظت کرنی ہے۔“ خالہ نے ان

کی بات کا جواب دیے بغیر نرگس کی طرف دیکھ کر کما تو ان دونوں کا انکاس اس بحال ہوا۔
”خالہ اب میں پھر ان کو گھر سے بلانے جاؤں گا۔ مارا۔“

نرگس کی شکل بھیگی ہوئی تھی۔
”اتنی دور جانے کو کون کہہ رہا ہے موبائل لاندر سے میرا۔ فون کر کے بلا لے“ دیا دوڑ کر لاندر سے موجود موبائل اٹھالائی نرگس کا بتایا نمبر اور موبائل اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔
نرگس نے ہاں سے چھوٹے بھائی کے ساتھ احیان

جہان کو بھیجنے کا کہا خالہ نے اس سے موبائل لے کر سائڈ پر رکھا اور پھر سے گنے کے رس کی کھیر پنانے میں مشغول ہو گئیں جو کئی دروازے پر دستک ہوئی نرگس دوڑ کر گئی انہوں نے اپنی نگاہیں دروازے پر مرکوز کر دیں۔
”بیٹھک میں بیٹھا نرگس میں آ رہی ہوں تو چچہ چلا

شع دیکھ کھیر لگنے نہ پائے۔“ وہ ہاتھ صاف کرتی اٹھ کھڑی ہوئیں وہ دونوں بھی خالہ کے اطراف چلتی بیٹھک میں داخل ہوئیں۔
وہ دونوں سر پر ٹوپیاں جمائے شرافت کی اعلا مثال بنے نظریں جھکائے بیٹھے تھے۔

خالہ کی آمد پر کھڑے ہو کر جھک کر ادب سے سلام کیا تو خالہ نہال ہی ہو گئیں۔ ”انہوں نے شفقت سے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ان کی شکلوں کو جو غور سے دیکھا تو کچھ مانوس سی لگیں۔
”مجھے یوں لگتا ہے پتر کہ جیسے میں نے تمہیں پہلے کہیں دیکھا ہے۔“ وہ بھنوس سکیڑ کر ذہن پر زور ڈالنے لگیں۔

”ہمیں بھی آپ کی شکل جانی پہچانی محسوس ہو رہی ہے وہ انجان بننے کا ذرا مہر چھانے لگے۔
”یر کماں؟ یہ بھی تو سوچو میرا تو دماغ بڑھاپے نے کھوکھلا کر دیا پر تمہاری توجہ کی عمر سے تمہارا حافظہ اتنا کمزور کیوں ہے۔“ خالہ کی بات سن کر وہ شرمندہ سے ہو گئے۔

”آگیا خالہ۔ یاد آگیا۔ یہ وہی ہیں ناں جو اس دن ٹرین میں ہماری ٹافیاں چرانے کے چکروں میں تھے۔“ شیبہ جھٹ سے بولی تو خالہ نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔
”ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ یہ تو وہی ہانگے ہیں جنہوں نے سارے سفر میں تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ نرگس! یہ پتر کون سے شریف تائے کے پتر شہر سے آئے ہیں۔ تیرے تو اک وی چاچا تائے سے شرافت چھو کر نہیں گزری تھی یہ کہاں سے حاجی ٹپک پڑے۔“

”وہ خالہ تایا اکبر کے بیٹے ہیں یہ دونوں یاد نہیں اللہ بخشے آپ کو میری بے بے بتائی تھیں کہ شہر پڑھنے گئے تو شہر کے ہی ہو کر رہ گئے پڑھی لکھی کڑی پسند کر کے اس سے ویاہ کر لیا تھا یہ ان ہی کے پتر ہیں۔“

”جی!۔۔۔؟“ خالہ کی بات پر دونوں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ دیا شیبہ اور نرگس نے نگاہیں چرا کر زبان دانتوں میں دبائی۔
”برانہ ماننا پتر! تمہارا باب ایک نمبری عاشق تھا گاؤں کی کوئی لڑکی اس کی آنکھ کے سیکھے (گرمی) سے نہیں بچی تھی۔ اچھی بھلی آنکھوں کو سیر بھی کر کے لڑکیوں کو ناز آتا تھا تو ایک آنکھ میں اچھا خاصا فرق آ گیا تھا سب نے اس کا نام اکبر بھیجنا عاشق رکھ دیا تھا۔“

خالہ کی دی گئی معلومات پر وہ بخل سے ہو گئے۔
”اس کی آنکھ کا فرق اب ٹھیک ہوا کہ نہیں۔“

چچہ لفظوں میں خالہ نے ان عاشقانہ مزاج کا پوچھا۔
”جی۔۔۔ جی اب تو بالکل ٹھیک ہے۔ جب سے ماما سے شادی ہوئی ہے غور سے دیکھنے پر بھی آنکھ میں معمولی سا فرق بھی نظر نہیں آتا۔“ انہوں نے مسکرا کر خالہ کو مطلع کیا تو وہ سب بھی مسکرا دیں۔

”اچھا شہری منڈے اوتسی اس طرح کرو کہ میری ان شہر سے آئی سوہنیو کو تھوڑا بہت پڑھا لکھا ہو۔ ان کو پڑھنے کی بڑی چاہ ہے۔ ویسے تم لوگ یہاں پر کرنے کیا آئے ہو کتنے دن کا دانہ پانی ہے۔“ خالہ اردو اور پنجابی مکس کر کے بولیں تو ان کی ہنسی نکل گئی۔

شہر میں وہ خالص اردو زبان کا استعمال کرتیں اور یہاں صبح دہاتن بنی گاؤں کی بولی بولتیں۔

”بابائے اپنی زمینوں پر فیکٹری لگانے کا سوچا ہے تو اسی سلسلے میں ہمارا یہاں آنا جاننا لگتا ہے کام شروع ہو چکا ہے تھوڑے تھوڑے دن بعد آکر ہمیں چیک کرنا ہوتا ہے۔“ جبران نے بتایا تو وہ حیران ہوئیں۔

”تو تھوڑے تھوڑے دن بعد تم گڈی میں اس طرح ذیل ہو کے آتے ہو میں تو سال بعد گڈی میں بیٹھے کاموچوں تو میرا سا (سائس) رکنے لگتا ہے۔“

”نہیں خالہ ہم تو اپنی گاڑی میں آتے ہیں ہمارا شہر یہاں سے ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت پر ہے۔ ٹرین کا سفر تو ہم نے ایڈوخر کے طور پر کیا۔“ احیان مسکرا کر بولا وہ اچھا کہہ کر گھڑی ہو گئیں۔

”چلو اب تم کڑیوں کو پڑھاؤ میں تمہارے کھانے کے لیے کج (کچھ) بھیجتی ہوں آخر تم ہمارے مہمان ہو اور ہاں ایک بات یاد رکھنا اپنے اباے اکبر کا اثر نہیں آتا چاہے جیسی شرافت کا مظاہرہ ٹرین میں کیا تھا ویسے ہی پیسے (مقصوم) بن کر پڑھانا اور کڑیوں تم نے بھی ان شریف برادران کو تنگ نہیں کرنا۔“ خالہ انہیں تنبیہ کرتیں دروازے سے باہر نکلے لگیں۔

”نرگس تو بھی آجا میرے ساتھ یہاں بیٹھ کر کیا کرے گی تیری مولی عقل میں یہ پڑھائی کی باتیں کہاں سائیں گی۔“ وہ نرگس کا ہاتھ پکڑ کر باہر چل دیں اور ان چاروں کے چہروں پر ایک پرسکون و دلکش مسکراہٹ نے ڈیرا جمالیا۔ احیان اور جبران کے سینوں میں گھٹے سانس نے باہر کاراستہ دیکھا۔



وہ پوری دہائی سے پڑھ رہی تھیں خالو نے ان کا ایڈمیشن کروا دیا تھا اچھو کو جوان کو سختی سے آرڈر تھا کہ وقت پر کالج لے جایا کرے۔ احیان نے دیبا کے دل کے تاروں کو اپنی آنکھوں کی شوخی سے چھیڑا تھا جبکہ شیباکے دل کو جبران کے بھورے بالوں نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہ جب بھی گاؤں آتے خالہ درباری گھر پر

حاضری دیتے اپنے دل کے نہاں خانوں میں چھپی محبتوں کے راز ایک دوسرے پر منکشف کرتے اور پھر اپنے شہر کی راہ لیتے اور وہ دونوں آنکھوں میں سپنوں کی جوت جگائے کھوئی کھوئی اپنی پڑھائی میں مصروف ہو جاتیں اب تو وہ خالہ کے گھر کی فردن چلی گئیں۔ گاؤں کی عورتیں انہیں خالہ کی بیٹیوں کا سامان دیتیں خالو بھی شفقت سے پیش آتے ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھتے۔ دیبا شیباکے دم سے ان کے گھر میں روٹی بچگی تھی۔ جب سب چلی جاتیں تو ان دونوں کی ہنسی کی جھنکار حولی میں گونجتی تو خالہ درباری رب سوہنے کا شکر ادا کرتیں کہ ان کی گود سونی ہے تو کیا ہو اگر تو سونا نہیں ہے۔

ماں کی محبت اور باپ کی شفقت کیا ہوتی ہے ان دونوں بہنوں کو اس گھر سے محبت و شفقت کی چاشنی نصیب ہوئی اپنے سارے دکھ خالہ کی گود میں سر رکھ کر ان کے سینے میں منتقل کر دیے انہوں نے ان کے آنسو پونچھ کر جیسے ان کے زخموں پر پھانے رکھے تھے۔ انہوں نے ان دونوں کے جینز کی تیاری تک شروع کر دی تھی۔

”بس جیسے ہی کوئی اچھے لڑکے ملے تم دونوں کے ہاتھ پیلے کرنے میں ذرا دیر نہیں کروں گی۔“

”خالہ میرے ہاتھ تو پہلے ہی پیلے ہیں دیکھیں تو ذرا۔“ دیبا نے شرارت سے اپنی گوری ہتھیلیاں ان کے سامنے کیں۔

”یہ پیلے ہاتھ کچھ نہ کھانے کی وجہ سے ہیں۔ کھنکھن ملائی کھاؤ دودھ پو تاکہ ہاتھوں کی یہ پیلاہٹ ختم ہو۔“

خالہ نے محبت سے انہیں سینے سے لگایا تو وہ مسکرا دیں۔



صبح سے موسم ابر آلود تھا سردی اچھی خاصی بڑھ گئی تھی۔ وہ جرسیاں پہنے سر پر گرم ٹوپیاں لیے حولی کے لان میں چلی آئیں دونوں بہنوں کا دل اواس ہو رہا تھا۔

”شیبا! میرا پچھو سے بات کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔“

رندھ گئی۔

”شکر ہے اس مالک کا تمہارا سایہ اس گھر سے جدا ہوا تو میری چندا کا رشتہ طے ہوا بہت اچھے کھاتے پیتے لوگ ہیں ٹلکے کا اپنا بزنس ہے کروڑوں کماتا ہے میری چندا عیش کرے گی اگلے مہینے شادی کر رہی ہوں۔ کان کھول کر سن لو اب اس گھر میں تمہاری کوئی گنجائش نہیں ہے۔ تمہارا ٹھکانا اسی بڑھیا کا گھر ہے جو تمہیں یہاں سے نکال کر لے گئی اگر وہ تنگ آجائے تم سے تو باوا کو فون کر دینا آکر لے جائے گا پنی چہیتوں کو۔“ ان کا زہر خند لہجہ اسے تڑپا گیا پھپھو نے فون بند کر دیا تھا اور وہ بہتے اشکوں سے موبائل کو دیکھے جاری تھی۔ کتنی بے دردی سے انہوں نے زہر میں بجھے لفظوں سے اسے اذیت پہنچائی تھی۔ وہ بلبلاتا بھی تھی۔

”ہو گیا شوق پورا اپنی پھپھو سے بات کرنے کا۔“ شیدا صورت حال سمجھ گئی تھی دیبا زار دوڑا روئے لگی۔

”میری معصوم بہن اپنے دل سے ساری جھولی امیدوں کو نکال پھینکو کوئی ہمیں یاد کرنے والا نہیں۔ اللہ نے جس کے در کو ہمارا آسرا بنایا ہے بس اسی کو اب اپنا سب کچھ سمجھ لو۔“ شیدائے اسے ساتھ لگا کر تسلی دی تو اس نے اپنے سارے آنسو پونچھ ڈالے۔

”آج کے بعد ہمارے لبوں پر اپنوں کے کسی رشتے کا نام نہیں آئے گا۔“ انہوں نے دل مضبوط کیا۔

”چلو اب اندر چلتے ہیں خنکی خاصی بڑھ گئی ہے دیکھو تو ہاتھ کیسے ٹھنڈے رہے ہیں۔“ شیدائے اسے اپنے ٹھنڈے ہاتھ اس کے گال سے لگائے تو وہ دونوں اندر چل دیں۔



وہ اپنے فرسٹ سمسٹر کے رزلٹ کے انتظار میں تھیں عجیب بوریت ہو رہی تھی کالج جانے اور پڑھائی کی مصروفیت میں دن گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا تھا اور اب وقت کالے نہیں کھٹکتا تھا۔ خالہ نے کڑھائی سلائی سیکھنے کا کہا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا کہ اس کام میں انہیں بالکل بھی دلچسپی نہیں ہے سو وہ خاموش

کیا ہوا جو انہوں نے ہمارا حال نہیں پوچھا ہم پوچھ لیتے ہیں دیکھا ڈرتے ڈرتے بولی تو شیدا اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”اگر پھپھو کی یاد ایسی بے چین کر رہی ہے تو خالہ سے موبائل لے کر بات کر لو۔“ شیدائے اسے اجازت دی۔

”سچ۔۔۔؟“

”ہاں۔“ اس نے گردن ہلائی۔

”چند بابی کا بھی پوچھ لینا کہ ہماری خوشیت چھٹنے کے بعد ان کے نصیب کھلے کہ نہیں۔“ شیدا تلخی سے بولی تو شیدائے سر ہلایا۔ وہ پھپھو کا نمبر ملا رہی تھی نیل جا رہی تھی مگر فون کوئی انبند نہیں کر رہا تھا۔ آخر کار بار بار کی کوشش سے اس کا فون شعیب گھونچنے پر ریسو کر لیا وہ دیبا کی آواز سن کر چمک اٹھا۔

”بڑے بے وفا ہو تم۔ ایک بار بھی خبر نہ لی کہ ہم جیتی ہیں یا مر گئیں۔“

”میں تمہارے دشمن مت پوچھو کہ تمہارے بغیر گھر کیسا سونا اور ویران جنگل کا منظر پیش کر رہا ہے دل کی ویرانی اس سے سوا ہے۔“ گھونچو رومانیک ہونے لگا۔

”پھپھو کہاں ہیں؟“

”دے ادھر کس سے اتنا مسکرا مسکرا کر باتیں ہو رہی ہیں۔ ماں بہن سے بولتے ہوئے تو انگارے نکلتے ہیں۔“ اسے شہار کی آواز سنائی دی تو اس نے جھٹ سلام کیا۔ دیبا کی آواز سن کر ان کے حلق تک کڑواہٹ گھل گئی۔

”اچھا۔۔۔ تو یہ تم مہسنی ہو وہاں جا کر بھی میرے بچے کا پیچھا نہیں چھوڑا اب تو اس کی جان چھوڑ دو۔ وہیں خالہ درباری کے گاؤں کے لونڈوں کو پھنسا کر نکاح پڑھوا لیتا۔ خبردار! جو ادھر کا رخ بھی کیا تو۔“ ان کی زبان زہر اگلنے لگی۔ دیبا کی پلکوں کے گوشے بھیگنے لگے۔

”پھپھو میں نے تو آپ کی خیریت اور چند بابی کے رشتے کا پوچھنے کے لیے فون کیا تھا۔“ اس کی آواز

ہو رہیں۔ احیان اور جبران کو گاؤں آئے بہت دن ہو گئے تھے ان کی فیکٹری کا کام مکمل کے مراحل میں تھا فون پر اکثر بات چیت ہو جاتی تھی حالہ نے انہیں ضرورت کے تحت ایک موبائل لے کر دے دیا تھا کہ اپنی کسی دوست وغیرہ سے بڑھائی کے متعلق بات کرنی ہو تو کر لیا کرو۔ وہ صحن میں بیٹھی کیونکر کھا رہی تھیں جب اچانک یہاں بھاٹھ کھڑی ہوئی۔

”بور ہو رہی ہوں احیان کو فون کرتی ہوں۔“ اس نے شیا کے کان میں سرگوشی کی تو وہ مسکرا دی۔ کمرے میں آکر اس نے احیان کا نمبر ملایا اس نے جھٹ رلیو کیا۔

”زبے نصیب آج کیسے میری یاد نے تمہیں بے تاب کیا ورنہ جب تک میں فون نہ کروں تمہیں توفیق نہیں ہوتی۔“ وہ شکوہ کنال ہوا۔

”احیان مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔“ وہ بلا تمہید گویا ہوئی۔

”ضرور۔۔۔ کہو کیا کوئی خاص بات ہے؟“

”تم دونوں اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم دونوں بہنوں نے اپنیوں کی بے رخی و بے اعتنائی کے بڑے زخم سے ہیں ہم میں اب اور کسی دکھ کو جھیلنے کی ہمت نہیں۔“

”کیا مطلب۔۔۔!“

”مطلب یہ کہ یہ سلسلہ آخر کب تک چلے گا اگر تم دونوں بھائی ہمارے لیے سیریس ہو تو بات آگے بڑھاؤ۔“

”بات تو بہت آگے بڑھ چکی ہے۔“ وہ ذمہ داری بولا۔

”میرا مطلب ہے اپنے والدین سے بات کرو۔“

”کیا بات کروں۔۔۔؟“ وہ اسے زچ کرنے لگا۔

”احیان۔۔۔ آئی ایم سیریس۔“ وہ زور سے چیخی۔

”اوکے۔۔۔ اوکے دیکھو وقتی دل لگی کے بارے میں تو ہم نے کبھی سوچا نہیں، ٹھیک ہے ہم بھائی شرم و شریہ ضرور ہیں مگر عورت کی عزت و پاسداری کرنا جانتے ہیں۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ خالہ کے گھر کے علاوہ ہم نے تم بہنوں کو کبھی ادھر ادھر ملنے پر مجبور نہیں کیا کبھی ایسی کوئی بات یا حرکت نہیں کی جس سے

تمہاری عزت پر حرف آئے اور تم دونوں نے بھی ہمیشہ احتیاط کا دامن تھامے رکھا اگر تم نے میرے دل کو روشن کیا ہے تو میرے گھر میں بھی تمہارے وجود سے ہی روشنی ہوگی اسنے گھر کو اجالوں سے منور کرنے کے لیے ہم دونوں بھائی گھر کو اس قابل بنانے کے چکروں میں ہیں کہ تم روشن ستارہ بن کر چمکتی رہو۔ تمہارا یہ دلکش چہرہ ہمارے گھر آکر ماند نہ پڑے۔“

”کیا کتنا چاہ رہے ہو تم۔“ اس کی باتوں سے وہ الجھی۔

”دیکھو دیبا یا کاتویہ اپنا گاؤں ہے وہ اس سے چاہے جتنی بھی دور رہ لیں مگر ان کی جڑیں ہمیں سے ہیں اور وہ اپنوں سے ملنے ان میں رہنے بسنے میں خوش محسوس کریں گے مگر ماماں کے برعکس ہیں گاؤں اور گاؤں میں رہنے والوں سے سخت الہجہ ہیں“ احیان کی شرمندہ سی آواز زیریں میں ابھری۔

”اوہ تو اس کا مطلب ہے کہ ہماری راہیں جدا ہیں۔ تو ٹھیک ہے آج کے بعد ہمارا اتم لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہو گا جب تم ہمیں اپنا نام دے نہیں سکتے تو مزید تعلق رکھنا سراسر بے وقوفی ہے۔“ وہ مرہ لہجے میں بولی۔

”پوری بات تو سن لو یا باکو ہم نے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے بس اب ماما کو طریقے سے راہ پر لارہے ہیں۔ تھوڑا سا ویٹ کرو۔ ان شاء اللہ بہت جلد ہمارے خوابوں کی تعبیر بن کر ہمارے گھر کو رونق بخشوگی۔“ اس نے ویٹا کو لیل دی تو وہ سانس بھر کر وہ گئی پتا نہیں یہ جھوٹی تسلی تھی یا وہ واقعی سچ کہہ رہا تھا۔ بہر حال اس کی جوت جگائے انتظار کی راہوں پر قدم رکھ دیے۔

☆ ☆ ☆

زرگس کی شادی ہو رہی تھی سب لڑکیاں بڑی بوجوش تھیں وہ بیاہ کر ساتھ والے گاؤں میں اپنی خالہ کے گھر جا رہی تھی بچپن کی مگنی سے دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت نے ڈیرے ڈال رکھے تھے وہ

زرگس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتیں اور وہ شرم سے دہری ہو جاتی لڑکیاں اس کے چہرے پر حیا کی لالی دیکھ کر کھلکھلا اٹھتیں۔

”بس یہی تو فرق ہے شہر اور گاؤں کی لڑکیوں میں۔ شہر کی لڑکیاں دیا وہ والے دن بھی آنکھیں پھاڑے پیر پیر بولے جاتی ہیں۔ نہ باپ بھائی کی شرم نہ لحاظ۔ لڑکے کے ساتھ جڑ جڑ کے فوٹو کھنچوائی جاتی ہیں کہ غیرت مند بندہ شرم سے پانی پانی ہو جائے اور ہمارے گاؤں کی کنواریاں شادی کے نام پر ہی گنٹار ہو جاتی ہیں پلکیں شرم سے بوجھل اور دل متکبیر کے نام سن کر تیزی سے دھڑکنے لگتا ہے۔“ خالہ درباری بھی لڑکیوں کے پاس آ بیٹھیں تو دیا شباشبا شرمندہ سی ہو گئیں۔

”آپ کہہ تو ٹھیک رہی ہیں خالہ! پر کیا کریں شہر میں ہر طرف یہی ماحول ہے تو کسی کو معیوب نہیں لگتا۔“ انہوں نے شہر کی لڑکیوں کی طرف داری کی آخروہ بھی تو شہر سے آئی تھیں۔

”میری دھی ماحول بنانے سے بنتا ہے اور یہ فرض ماں باپ کا ہے کہ وہ اپنی بچیوں کو کھلی آزادی نہ دیں انہیں ڈھانپ کر رکھیں کہ کھلی بڑی شے پہ کھیاں جھنجھٹانے لگتی ہیں۔ حیا عورت کا زور ہے سنگھار ہے۔“ زرگس کی ماں جو اسے بلانے آئی تھی انہوں نے بھی گفتگو میں حصہ لینا ضروری سمجھا۔ دیا شباشبا نے بیوں سے مزید بحث مناسب نہ سمجھی کہہ تو وہ ٹھیک ہی رہی تھیں کہ شہر اور گاؤں کے ماحول سے کیا فرق پڑتا ہے اصل بات تو تربیت کی ہے اور سب سے بڑھ کر جب ہمارے مذہب نے عورت کو بردے میں چھپا کر رکھنے کا حکم دیا ہے تو پھر کیا گاؤں کیا شہر سب پر شرعی احکام لازم ہیں۔ جو لوگ عمل کر لیتے ہیں وہ پینڈو جاہل اور جو بے حجاب عریاں لباس میں مغرب کی تقلید کرتے ہیں وہ ماڈرن ٹبل۔ وہ سوچ کر رہ گئیں۔

”چل زرگس اٹھ احیان آیا ہوا ہے اس کے پاس گڈی ہے چل کر شہر سے جو چیزیں لینی ہے لے لے۔ چھوٹی بھی تیار بیٹھی ہے۔“ زرگس کی ماں نے بتایا تو احیان کا نام سن کر دیا کے دل میں مدھر ٹھنٹھانیں بجیں۔

”دیا شباشبا تم نے بھی زرگس کی شادی میں پہننے کے لیے جو کچھ لینا ہے جا کر لے آؤ۔“ خالہ نے محبت سے کہا تو وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر رہ گئیں۔

”نہیں خالہ ہمارے پاس کافی کپڑے ہیں ہم ان میں سے ہی پہن لیں گی۔“ دونوں نے صاف انکار کر دیا وہ نہیں چاہتی تھیں کہ وہ ان پر مزید بوجھ بنیں۔

”وہ پچھلے رنگوں کے کپڑے شادی میں پہننے کے قابل ہیں شادی میں تو چمکیلے بھڑکیلے کپڑے ہی اچھے لگتے ہیں۔ میں جو کہہ رہی ہوں کہ جا کے لے آؤ، پہلا اٹھو شاباش۔“ انہوں نے پچکارا۔

”ہاں ہاں اٹھ جاؤ دھی رانی زرگس بھی تمہارے پسند سے چیزیں خرید لے گی۔“ زرگس کی ماں نے بھی اصرار کیا۔

”ماں جی چلو ناں برا مزہ آئے گا شہر کے وہی بھلے اور گول گپے بھی کھائیں گے۔“ چٹوری زرگس ان کے سر ہو گئی۔

”تم چلی جاؤ دیا میرے سر میں درد ہے۔“ شباشبا نے انکار کیا تو دیا مسکراتے ہوئے تیار ہونے چل دی۔

احیان کی گاڑی کا ہارن سنا تو وہ باہر نکل آئی۔ زرگس اور اس کی چھوٹی بہن پیچھے بیٹھی تھیں احیان نے اس کے لیے فرنٹ ڈور کھول دیا تو وہ ہچکچاتے ہوئے بیٹھ گئی۔

”جانے کتنے دنوں کے بعد گلی میں آج چاند نکلا۔“

گانے کے بول اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑا گیا گاڑی میں بیٹھے ہی کلون کی دلفریب منک نے اس کے دل و دماغ پر نگہ اتار چھوڑا تھا اس پر مستزاد احیان کے لبوں پر دلکش مسکراہٹ نے اسے شہنشاہ پر مجبور کر دیا پہلا موقع تھا وہ اس کے اتنا قریب بیٹھی تھی دونوں کے دلوں کو محبت کے خوش کن احساس نے جکڑا ہوا تھا۔ زرگس اور اس کی بہن اپنی چیزوں کی خریداری کے بارے میں بات چیت میں مصروف تھیں اور وہ دونوں ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنوں کی صداؤں کو غلطے میں محو تھے۔ دلوں میں عشق و محبت کی دہکتی ہولی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ

دونوں خاموش تھے اور خامشی زبان بنی ان کے دلوں کے بیچ پیغام رسانی کر رہی تھی۔ سارا سفر خوشبوؤں میں بار بار دل عشق کی لے پر رقص کرتے رہے۔

اس نے اپنے اور شیبہ کے لیے دو دوڑے خریدے کہ زیادہ قیمتی بھی نہ ہوں اور خالہ کا دل بھی رہ جائے۔ ٹیکس اس کے ہمراہ بڑے شوق سے شاپنگ کر رہی تھی۔ احيان نے انہیں ایک اچھے سے ریسٹورنٹ میں کھانا کھلایا، "اُس کہ ہم سے لطف اندوز ہوئے اور واپسی کی راہ لی۔" ملگجانہ میرا پھیل چکا تھا۔ عالم کیف میں سفر کب گزرا انہیں کچھ پتہ نہ چلا دل یہی تمنا کر رہا تھا کہ یہ ساتھ طویل ہو جائے احيان نے پہلے ٹیکس اور اس کی بہن کو گھر چھوڑا اور مسکراتے ہوئے فرنٹ سیٹ پر آ بیٹھا۔

"ہوں... تو کیا رہا مہدولت کی ہمراہی میں آج کا یہ سحر انگیز سفر۔" وہ اس کی طرف دیکھ کر بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

دبا گاڑی میں اکیلی اس کی سنگت سے کنفیوژ ہو گئی۔

"کچھ باتیں بن جاتی ہیں اگر آپ کے لیے یہ سفر سحر انگیز تھا تو میرے لیے یہ نفسوں مگر تجھے یہ گھنٹوں کا ساتھ نہیں چاہیے عمر بھر کی رفاقت کا مان بخشیں گے تو یہ مل زندگی بھر ذہن میں خوش گوار یادیں کر مکا کریں گے۔" اس نے پراعتاد ہو کر اس کی آنکھوں میں بھانکا۔

"مما ٹیکس کی شادی میں شرکت کریں گی گو کہ وہ گاؤں کے فنکشن اینڈ نہیں کرتیں مگر بیاہی کی ضد پر آنے کی حامی بھری ہے بس تم بہت اچھا سا تیار ہونا کہ مماتہمارے حسن سے مرعوب ہو کر اپنے بیٹوں کے بارے میں سوچنے لگیں۔" وہ دھیرے دھیرے گاڑی چلا رہا تھا۔

"ایک بات یاد رکھنا احيان اگر آپ کی ممانے ہم بہنوں کو ریجیکٹ کر دیا تو ہمارے لیے کبھی بھی کوشش مت کرنا ہم ہمیں کبھی بھی اس گھر میں جانا پسند نہیں کریں گی جہاں ہمیں عزت اور چاہ سے نہ

لے جایا جائے۔ ہم اپنے جذبول کو گہری نیند سلا دیں گی۔

ہم اپنی زندگی میں مزید مشکلات کی گرہیں نہیں کھولنا چاہئیں اور نہ ہی کبھی یہ چاہیں گی کہ بیٹے ماں کے لیے آزار کا سبب بنیں۔ ماؤں کو بیٹوں پر بڑا مان ہوتا ہے ان کی زندگی کے جینے کا سبب ہوتے ہیں انہیں کسی امتحان میں مت ڈالنا۔"

"لیکچر اچھا دے لیتی ہو تم۔" دل سے خیالات جان کر خوشی ہوئی۔ "ترجیحی نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے گاڑی کا رخ نہروالی سائڈ پر کیا۔

"یہ آپ کہاں لے گئے جارہے ہیں رات کا اندھیرا پھیل رہا ہے۔"

"میں چاہتا ہوں تمہارے رخ تاباں کو دیر تک تکتا رہوں تم ہمیں جانتیں یہ لمحے میری زندگی کا حاصل ہیں۔ چاہا اور چاہے جانے کا احساس کس قدر خوش کن ہے اس کا اندازہ مجھے آج ہو رہا ہے۔ لوگ محبوب کی یادوں میں زندگی گزار دیتے ہیں اور یہاں تو محبوب رو برو ہے پھر کیسے وقت گزرنے کا پتا چلے میرا دل چاہ رہا ہے نہر کا کنارہ ہو، ہم دونوں کا ساتھ اور آوارہ ہوا کے جھونکوں پر ہماری دھڑکنوں کا شور۔" وہ بے خود ہونے لگا۔

"زیادہ رومانٹک ہیرو بننے کی ضرورت نہیں ہے آپ پہلے ہی چیٹنگ کر چکے ہیں خالہ درباری کا گھر پہلے آتا تھا۔ آپ کو مجھے پہلے اتارنا چاہیے تھا اور اب نہروالی بات تو بالکل ہی نا ممکن ہے سیدھے گھر چلیں کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کی اس حرکت پر آپ کو گاؤں بدر کر دیا جائے۔"

"دبا تمہیں میری محبت کا یقین ہے ناں۔ تمہاری محبت کی چنگاریاں میرے پورے وجود میں پھوٹ رہی ہیں۔ جب سے تمہاری چاہت دل میں سالی ہے زندگی دھنک رنگوں کی طرح بڑی پیاری لگنے لگی ہے کوئی لمحہ کوئی ساعت ایسی نہیں گزرتی کہ جس دم تمہارا امیکر نگاہوں سے ہٹا ہو تم میری زندگی کی امید ہو میرے دل کا روشن چراغ ہو میرے دل کا یہ دیا بھی بجھنے نہ دیتا

دبا۔“ حویلی کے سامنے پہنچ کر احیان نے جذبات کی شدت میں دُوب کر اظہار کیا احیان نے دبا کے ہاتھ میں ایک پیکٹ تھمایا۔ ”پنوں کی تو مجھے خوش ہوگی۔“ دبانے کچھ ہچکچاتے ہوئے پیکٹ تھام لیا الوداعی نظر اس پر ڈالی اور غمور جذبوں سے معمور دل لیے خالہ درباری کی حویلی میں داخل ہو گئی احیان وارفتہ نظروں سے اسے جاتا دیکھ رہا تھا۔



نرس کی شادی ان کے لیے بڑی انوکھی تھی یہ پہلا موقع تھا کہ وہ گاؤں کی شادی ائینڈ کر رہی تھیں ابن مہندی پر تاج گانا مختلف رسمیں سب ان کے لیے دلچسپی کا سامان بنی رہیں۔ شادی والے دن بڑے سے کھلے میدان میں شامیانے لگا کر ایک طرف عورتوں کا انتظام کیا گیا تھا اور تھوڑے فاصلے پر مردوں کا انتظام تھا بڑے بڑے رنگین پالیوں والے پلنگ شامیانوں سے باہر ترتیب سے بچھائے گئے تھے جن پر سفید چادریں بڑی اجلی اور نکھری لگ رہی تھیں۔ گاؤں کے ٹیک لگائے بزرگ حضرات حقہ پینے اور باتیں کرنے میں محو تھے میدان کے دوسرے احاطے میں دیکس پک رہی تھیں روایتی و سادہ کھانے زردہ پلاؤ، گوشت اور تندوری روٹی کا مینو تھا۔

لڑکیاں شامیانے میں زرق برق موتی ستاروں سے لیس گہرے میک اپ میں یہاں وہاں انڑاتی پھر رہی تھیں۔ جوان بیٹیوں کی ماؤں کے گال بھی گلال بنے تھے اور لب رنگین ہوئے ہوئے تھے۔

آج تو خالہ درباری نے گہرے آتش رنگ کی ساڑھی پہ اپنا تحیم وجود ڈھانپ رکھا تھا۔ گورے رنگ پر آتش رنگ الگ ہی چھب دکھا رہا تھا شبیانے زبردستی ساڑھی کے ہر رنگ لپ اسٹک بھی لگا دی تھی۔ کتنی دیر تک خالو کے سامنے جانے سے انہیں لالچ آتی رہی اور وہ اس عمر میں بھی خالو سے ایسے شرمانا دیکھ کر دلی دلی ہنسی ہنسی رہیں گاؤں کا کوئی گھر ایسا نہ ہوگا جہاں سے کسی کو مدعو نہ کیا گیا ہو لوگ اپنے کام چھوڑ

شادی میں شرکت کرنے آرہے تھے۔ انہیں گاؤں کی یہ بات بہت اچھی لگی کہ خوشی غمی میں یہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ بھی ہوتے ہیں۔ شہر میں تو ساتھ والے گھر میں میت پڑی ہو تو لوگ بے خبری کی نیند سو رہے ہوتے ہیں۔

بارات بینڈ باجے اور ڈھولک کی تھاپ پر آئی تھی۔ لڑکے کے دوست کزن اور منجھلے نوجوان رقص کرتے دولہا کو اپنے گھیرے میں لیے آرہے تھے۔ وہ دونوں بھی باقی سب خواتین کی طرح چہرہ چھپائے بارات کو دیکھنے میں مگن تھیں رخصتی تک وہ احیان، جبران کی ماما کی منتظر رہیں کہ وہ ان کو دیکھے، بات چیت کرنے کے لیے شاید ان کی طرف آئیں مگر وہ اکڑی ہوئی گردن والی خاتون اپنی جگہ سے نہ ہٹیں۔ نرس کی چھوٹی بہن سے تصدیق ہو گئی تھی کہ یہی اس کی چاچی ہیں۔ عورتیں ان کے گرد گھبرا ڈالے انہیں ستاسی نظروں سے دیکھ رہی تھیں جو کسی شوپیس کی طرح جی پیٹھی تھیں۔

”توبہ ہے گردن میں سر اٹھا کر آئی ہے یہ خاتون۔ ایسا بھی کیا غرور کہ انسان کے دل سے رشتوں کی مٹھاس ہی ختم ہو جائے۔“ انہوں نے ان کی طرف ایک نظر ڈال کر دوبارہ دیکھنا بھی گوارا نہ کیا وہ دونوں بہنیں سلگتی رہیں دبا اور شبیانے بھی ان کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔



شادی کے ہنگامے ختم ہوئے تو انہوں نے سکون کا سانس لیا۔ اب وہ ان دونوں بھائیوں کے فون کی منتظر تھیں کہ دیکھیں ان کی ماما جانی کیا فیصلہ کرنی ہیں گوکہ ان کو کسی مثبت جواب کی توقع نہیں تھی مگر پھر بھی ایک مبہوم سی امید تھی اور یہ امید بھی اس وقت ٹوٹ گئی جب ایک دن احیان کا فون آیا اس کی آواز اسی کا عنصر لیے ہوئے تھی۔

”بلا تمہد مجھے یہ بتاؤ احیان کہ آپ کی ممانے ہمارے بارے میں کیا رائے دی۔“ وہ دھڑکتے دل کے

ساتھ بولی۔

”کیا بتاؤں فیئر مجھے قطعاً“ امید نہ تھی کہ ماما ہمارے ساتھ ایسا کریں گی۔“ اس کا لہجہ افسردگی لیے ہوئے تھا۔

”ہمیں پہلے ہی اندازہ تھا مگر میں تمہارے منہ سے سننا چاہتی تھی۔ بعض لوگوں کی قسمت محبتوں سے تھی ہوتی ہے ان میں سے ایک ہم ہمیں ہیں نہ ماں کی محبت اور بس نصیب ہوا نہ باپ کی محبت کا ذائقہ چکھا، رشتہ داروں سے تو محبت کی امید رکھنا ہی عیب ہے ایک تمہاری صورت میں زندگی اجالوں کی طرف جانی دکھائی دی تھی مگر وہ بھی اندھیروں کی نذر ہو گئی۔“ اس کے لہجے میں دکھ ہلکورے لینے لگا تو احیان تڑپ اٹھا۔

”نہیں دیا ایسا نہیں سوچتے اللہ بہتر کرے گا جبران اور بابا ماما کو قائل کرنے میں لگے ہوئے ہیں میں بھی مجنوں کا روپ دھارے کمرے میں پڑا رہتا ہوں تم مایوس مت ہو اللہ نے ہماری قسمت میں ایک دوسرے کا ساتھ ضرور لکھا ہے بس تم ناامیدی کو اپنے دل سے اکھاڑ پھینکو۔“ وہ اسے تسلیاں دے رہا تھا اور اس کے آنسو تواتر اس کے گالوں کو چومتے وامن میں جذب ہو رہے تھے شیبانے اس کے ہاتھ سے موبائل پھین لیا۔

”اب تم دونوں بھائی ہم سے کبھی رابطہ کرنے کی کوشش مت کرنا کیونکہ جو رشتہ پروان چڑھتا دکھائی نہ دے اس سے تعلق رکھنا عیب ہے ہماری زندگی میں تم دونوں بھائی خواب کی صورت داخل ہوئے تھے اور خواب کی طرح ہی نکل گئے۔“ وہ تلخ لہجے میں بولتی جا رہی تھی۔

”میری بات سنو شیبانے۔“ اب کی بار جبران بولا۔

”جو بات سنائی تھی وہ احیان نے سنا دی ہے براہ کرم آپ زحمت نہ کریں ہم بہنوں نے زندگی میں تلخوں کے بہت گھونٹ پیے ہیں عادی ہو گئی ہیں۔ اس غم کو بھی تقدیر کا لکھا سمجھ کر خاموشی سے مسہد جا میں کی اور افسانہ بھی نہ کریں گی۔ میں نے تو دیے بھی اپنے دل میں

کسی امید کو جگہ ہی نہ دی تھی۔ یہ دبا بے وقوف احیان کی محبت کو سینے میں چھپائے بڑی چاہت سے پیچتی رہی ہے۔ سمجھا لوں گی میں اسے۔ چند دن کر لائے گی پھر سے اپنی قسمت سے سمجھو تاکہ لے گی بس آپ احیان سے نہیں کہ اس سے کبھی بھی رابطہ نہ کرے۔“

جبران بولنے کی کوشش ہی کرتا رہا مگر وہ نان اسٹاپ بولے چلی جا رہی تھی اور یکدم فون آف کر دیا مگر نکلے اور ڈسٹ بن میں اچھال دی۔

دیا زار و زار رو رہی تھی شیبانے اس کے دکھ پر کٹ کر رہ گیا اپنے دل کو تو اس نے شروع سے دلاسا دے رکھا تھا مگر دبا بے وقوف ہر رشتے سے اس لگا کر بیٹھ جاتی تھی اور پھر نامور ہو کر اشکوں سے رشتہ جوڑ کر بیٹھ جاتی۔

”دبا میری پیاری بہن زندگی احیان پر ختم نہیں ہو جاتی اور ہو سکتا ہے اللہ نے ہمارے لیے اس سے بہتر کوئی فیصلہ کیا ہو اور ویسے بھی ہم دونوں نے عہد کیا تھا کہ اگر ہمیں احیان جبران کے گھر سے عزت نہ ملی تو ہم اپنی محبت کا گلا گھونٹ دیں گی۔ ہماری پہلی ترجیح عزت ہے ان کی امی بیٹوں کے دباؤ میں آکر ہمیں بیاہ کر بھی لے جائیں تو کیا ہمیں وہ عزت اور مان دے سکتی تھیں، کبھی بھی نہیں اور جس گھر میں عزت ہی نہ ہو وہاں پہ رہنے کے خواب دیکھنا حماقت ہے۔ سواپنے ان خوابوں کو اپنی آنکھوں سے آج ہی نوچ ڈالو۔ محبتوں کے بغیر تو ہمیں جینے کا ہنر آ گیا ہے مگر عزت کے بغیر رہنے کا تصور بھی نہ کرنا۔ ہم اس گھر میں جائیں گے جہاں ہمیں پورے مان، عزت اور چاہ سے لے جایا جائے۔ تمہاری بھی تو یہی سوچ تھی ناں پھر یہ آنسو کس لیے؟“

شیبانے بڑے ضبط سے اپنے آنسوؤں کو پٹتے ہوئے دبا کے اشک صاف کیے جو قطار بنائے چلے ہی آ رہے تھے وہ اس کے پاس سے اٹھ کر بیاہ چلی آئی کہ کچھ دیر اسے اکیلا چھوڑ دیا جائے اس کا دل اپنی ماں جانی کے دکھ پر دکھی ہو رہا تھا۔ اسے نہ اپنے اللہ سے

ایک گاؤں میں لکھا تھا۔ وہ ان پڑھ لوگوں کے درمیان عجیب سوچ کے حامل لوگوں میں کیسے ایڈجسٹ کر پائیں گی۔ زبان، ماحول، رہن سہن سوچ سب کچھ مختلف تھا۔

”لیکن خالہ ہم ابھی شادی نہیں کرنا چاہتیں۔“ شیبابلی بلی آواز میں بولی دبانے بھی اس کی نائید میں گردن ہلاتی۔

”مگر کیوں...؟“ شادی کا یہی مناسب وقت ہے لڑکیوں کی عمر نکل جائے تو اچھے رشتے بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔“

”ایسے رشتے ہونے سے تو اچھا ہے کہ عمر ہی نکل جائے۔“ وہ سوچ کر رہ گئیں۔

”رنگ روپ، قد کاٹھ میں بالکل ماں بیو (ماں باپ) ور گے۔“

”کیا...؟ اتنے کالے۔“ دیا کادم خشک ہو گیا۔

”کالا رنگ ہے تو کیا ہوا، مرد کا کالا رنگ کس نے

دیکھا ہے۔ مرد کی شرافت اور کمائی اس کے کالے

رنگ پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ مرد وہی اچھا جو عزت کے

ساتھ عورت کو دو وقت کی روٹی کھلا سکے اور یہ سب

خوبیاں اس خاندان کے تمام مردوں میں پائی جاتی ہیں

عورت کی عزت اور قدر کرنا جانتے ہیں۔

تم دل چھوٹا نہ کرو۔ لڑکے اپنے باپ کی حسامت

کے نہیں ہیں وہ تو تیلے ور گے (تنگے جیسے) ان کا باپ تو

سارا دن گھر میں پڑا حقہ پیتا اور روٹیاں توڑتا ہے یا پھر

دیے (نہیم) ماشی سے ماش کروا تا رہتا ہے، وہ خود

(بے چارے) تو صبح کے زمینوں پہ گئے رات کو گھر کا

منہ دیکھتے ہیں۔“

خالہ بتاتی جا رہی تھیں اور وہ سگ رہی تھیں خالہ

نے ان پر اچھا حقہ جتایا تھا کہ ان سے ان کی مرضی تک

معلوم نہیں گی اور لڑکے والوں کو ہاں کہہ دی۔

”میں تو مر کر بھی یہ شادی نہ کروں، ہم اتنی گری

پڑی نہیں ہیں کہ جس کا دل چاہے کسی بھی کھوٹے

سے باندھ دے۔“ دیا سگ رہی تھی۔

”اذا کار کر کے کیا خالہ کا یہ ٹھکانا ہمیں نصیب نہ آ

شکوہ تھا۔ احیان، جبران سے اور نہ ان کی مہاسے۔ یہ تو تقدیر کے کھیل تھے اور تقدیر پر اس نے سر تسلیم خم کر دیا تھا۔



کہتے ہیں کہ وقت ہر دکھ کا مداوا کر دیتا ہے مگر کچھ دکھ ایسے ہوتے ہیں جو انسان کو اندر ہی اندر گھن کی طرح چاٹنے چلے جاتے ہیں۔ یہی حال دیا کا تھا بظاہر مضبوط نظر آنے والی دیا اندر سے جیسے ختم ہوتی جا رہی تھی۔ شیبابلی اسے دیکھ دیکھ کر کڑھتی رہتی۔ راتوں کو نیند کی جگہ رت جگھوں نے لے لی تھی۔ آنکھوں کے گرد بڑے حلقے، اواسی کی کیفیت کا غماز چہرہ لبوں پر پھینکی مسکان خالہ درباری کو بہت کچھ سمجھا رہی تھی عمروہ انجان بنی ان کے دکھ کو نظر انداز کیے ہوئے تھیں۔

دکھوں کی فصل کٹنے کٹنے ایک اور دکھ ان سے

آن ملا تھا۔ جب ایک شام خالہ درباری نے انہیں اچھا

ساتیار ہونے کو کہا۔ ان کا ہاتھ دکھا اور پھر شام کو آنے

والے مہمانوں سے یہ عقدہ بھی کھل گیا کہ نووارد اپنے

فرزندان کے رشتے کے لیے تشریف لائی تھیں وہ

دونوں بھونچکا رہ گئیں خالص پینڈولب و لہجہ لیے وہ

دونوں ادھیڑ عمر کے میاں بیوی خالو کے دور پر بے کے

رشتہ دار تھے ساتھ ہی کسی پنڈ میں رہتے تھے بقول خالہ

درباری کے مریعوں کے مالک تھے۔

”تو پھر یہ ان سے استفادہ کیوں نہیں کرتے۔“

”کیا مطلب...؟ خالہ نے چونک کر اس کی طرف

دیکھا۔

”یہ مرے کھا کر اپنی رنگت کیوں نہیں نکھار لیتے،

گاجر اور سیب کا مرہ کھائیں اور چہرہ چکا میں۔“ خالہ

اس کی بات سن کر مسکرا دیں۔

”میری بھولی دھی، میں ان مریعوں کی بات نہیں کر

رہی۔ مریعوں سے مراد زمینیں ہیں۔ یہ بڑی چوٹی، نوکر

چاکر۔ اللہ کا دیا سب بچ ہے، عیش کریں کی میری

سوہنئی کڑیاں۔“

یہ سب سن کر ان کے منہ لٹک گئے کیا ان کا نصیب

مگر وہ بدک کر ایسے پیچھے ہٹی تھیں جیسے کسی زہریلے ناگ کے دُش جانے کا اندیشہ ہو وہ خفیف سے ہو گئے۔
خالہ درباری نے ہنکارا بھرا۔
”میاں آ کے بیٹھو۔“ وہ غصے و نفرت کے جذبات لیے ان کے قریب بیٹھ گئے۔

”باپ سے تمہارا، یوں منہ پھیرنا اچھی بات نہیں۔“ ان کی ہتھیلی پر گرم ہلکا کر اٹھا، ٹیسسی اٹھنے لگیں۔

”اچھا تو پھر یہ باپ اتنا عرصہ اپنی اولاد سے کیسے بے خبر رہا، کیا یہ صرف نام کے باپ کہلانے کے حق دار ہیں باپ کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی۔ جب ہمیں گھر سے بے گھر کیا گیا، خونی رشتوں سے محبت کے بجائے زلت ملی تب یہ باپ کہاں تھا چند روپے دے کر کیا یہ اپنی ذمہ داریوں سے مبرا ہو گئے جس عمر میں بچوں کو ماں باپ کی محبت، توجہ، ہمدردی اور پار کی ضرورت ہوتی ہے اس وقت ہمیں دوسروں کے آسروں پر چھوڑ کر اپنی فکر کی ماں کی محبت سے تو قدرت نے محروم رکھا مگر اس باپ نے اپنی اولاد کو اپنی شفقت سے خود محروم کیا پھر کیسے آج یہ باپ بن کر ہمارے سر پر ہاتھ رکھنے آئے ہیں۔“
شبیہا کے حقیقت کے لہاوے میں لپٹے لفظوں سے شفیق عالم کی پیشانی پر عرقِ ندامت پھوٹ نکلا۔

”دکھ اس بات کا نہیں کہ ہم نے دوسروں کی دی گئی اقتدوں سے اپنا دامن بھرا دکھ تو اس بات کا ہے کہ ہم باپ کی چھتر چھایا ہوتے اس سے محروم ہو کر سورج کی نمازت برداشت کرتے رہے اگر آپ کی محبت کا احساس ہی ہمارے پاس ہوتا تو کسی کی کیا مجال تھی کہ ہم ٹھوکروں کی زد میں رہتے۔“ دونوں نے باپ کو شرمسار کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔

”بس بہت تقریر سن لی تم دونوں بہنوں کی، آج تم نے ثابت کر دیا کہ پڑھائی کچھ سکھائے نہ سکھائے، بیٹوں کے سامنے زبانِ درازی ضرور سکھا دیتی ہے۔“

”خالہ درباری یہ زبانِ درازی نہیں یہ تلخ حقائق ہیں جو آپ جانتے بوجھتے چشم پوشی سے کام لے رہی ہیں۔“ شبیہا کو ان کی بات ناگوار گزری۔

کہاں جائیں گی ہم دونوں۔ بس نصیب کا لکھا سمجھ کر چپ چاپ قبول کر لو۔ خالہ صبح کہہ رہی تھیں کہ مرد کی شکل و صورت سے کیا لینا اصل تو اس کی عورت کو دی گئی عزت ہے ہمیں عزت سے رہنے کا ٹھکانا مل جائے اس سے زیادہ کی تمنا بھی نہیں ہے۔“ شبیہا جیسے ہار مانے بیٹھی تھی۔

”تم کھو دو مانز (سمجھو تا) نہیں کو گی خالہ ہمیں میاں نہیں رہتیں تو نہ رہیں۔ اللہ کی زمین بہت بڑی ہے کہیں بھی چلی جائیں گے کسی دارالامان میں پناہ لے لیں گے مگر یوں اپنی ذات کو تمنا نہیں بننے دیں گے۔ ہماری بھی مرضی ہے، ہمارے بھی ارمان ہیں۔“

”ہمارے ارمان ہماری ماں کے مرنے اور باپ کے ہمیں دوسروں کے آسروں پر چھوڑ جانے پر ہی مر گئے تھے۔“ شبیہا درجہ بایوس تھی۔

”جو ہو رہا ہے جیسے ہو رہا ہے بس ٹھیک ہے تم ایسا کچھ نہیں کو گی کہ ہمیں دنیا کے مزید بھیڑے سنے پڑیں۔“ شبیہا کوٹ بدل کر لیٹ گئی اور دہانے بے بس ہو کر آنسوؤں سے نانا جو ڈایا۔



اس دن وہ آخری پیپر دے کر کالج سے لوٹ رہی تھیں۔ گھر جانے کو بالکل بھی دل نہیں کر رہا تھا کیونکہ خالہ درباری آج کل ان کے جینز کی تیار یوں میں مصروف تھیں ان کا ارادہ یہی تھا کہ جو کسی وہ پیپر دے کر فارغ ہوئی ان کی شادی کی تاریخ طے کر دیں دبا تیا ریاں دیکھ دیکھ کر کوڑھتی رہتی جبکہ شبیہا نے تقدیر کے سامنے سر ٹوں کر دیا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی دبا نے چادر سے اپنے آپ کو آزاد کیا۔ ان کے آگے بڑھتے قدم جیسے پتھر کے ہو گئے تھے۔ غصے سے تنفس پھولنے لگا، آنکھیں چنگاریاں برسانے لگیں۔ سامنے بیٹھی شخصیت نے ان کے دل میں دبی نفرت کی آگ کو ایک دم ہوا دے دی تھی۔

شفیق عالم بے تاب ہو کر ان کی طرف بڑھے تھے

سے مجھے تمام حالات کا پتا چل گیا تھا۔ جو کسی کی بیٹیوں پر ظلم کرتے ہیں ان کے ساتھ بھی کچھ اچھا نہیں ہوتا۔ چند اکی شادی کچھ عرصہ ہی چلی اس کے سسرال والے لاپچی لوگ تھے آئے دن کے روپے پیسوں کے تقاضوں اور باریٹ سے تنگ آکر وہ باپ کے گھر ایک بچی کو لیے بیٹھی ہے۔

شفیق عالم بتا رہے تھے اور چندا کے بارے میں جان کر انہیں حقیقتاً ”دھک“ ہوا کہ انہوں نے ان کے ساتھ لاکھ برا کیا مگر ان دونوں بہنوں نے کبھی ان کے بارے میں برا نہ سوچا کوئی بددعا نہ دی۔ باپ کی محبت نے انہیں چند دنوں میں ہی مرجھائے پھول سے ایک حسین و شگفتہ کلی میں بدل ڈالا تھا۔

”میں صرف چند دن کے لیے تمہارے ساتھ بھیج رہی ہوں مگر یہ بتا دوں کہ ان کی رخصتی اسی گھر سے ہو گی۔ یہ بات یاد رکھنا کبھی شر جا کر تو تے کی طرح آنکھیں پھیر لو۔“ خالہ درباری نے شفیق کو گھورتا وہ مسکرا دیے۔

”بے فکر رہیں جہاں سے میری بیٹیوں کو عزت اور مان ملا یہ وہیں سے رخصت ہوں گی۔“ انہوں نے تشکر نگاہوں سے خالو کی طرف دیکھا تو وہ بھی دھیمے سے مسکرا دیے۔

شادی کے ذکر پر دبا کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ شفیق عالم نے اسے اپنے ساتھ لگایا۔

”میں لڑکوں سے مل چکا ہوں ماشاء اللہ دونوں بچے بہت اچھی شخصیت کے مالک ہیں والدین بھی نائس ہیں مجھے امید ہے کہ میری بیٹیاں وہاں خوش رہیں گی۔“

”ہو نہ۔۔۔ ان کالے کوویں اور ان بڑھ زمینداروں کے ساتھ ہی تو ہم خوش رہیں گی خود تو تم (گوری) کر کے لے آئے اور ہمیں حبشیوں کے حوالے کر رہے ہیں۔“ دبا بڑبڑاتی۔

ٹیپانے اسے کہنی ماری تو وہ کلس کر رہ گئی۔



حفصہ اور عادل سے مل کر جیسے ان کے ہر دکھ کا

”بس گزرے وقت کی تلخیوں اب اپنے ذہن سے تھوک دو، صبح کا بھولا شام کو گھر آجائے تو اسے بھولا نہیں کتنے، کچھ حقائق اس ندامت میں ڈوبے شخص سے بھی سن لو۔ بعض اوقات حقیقت وہ نہیں ہوتی جو ہمیں دکھائی دے رہی ہوتی ہے، پتا بھی ہے کہ یہ کتنا عرصہ اسپتال میں زندگی و موت کی کشمکش میں پڑا رہا ہے یہ تم لوگوں کا نصیب ہی تھا کہ جو اس شخص کو تمہارے سامنے لا کر آیا۔“

شفیق عالم کی آنکھوں سے آنسو لڑیوں کی صورت پر رہے تھے۔ ضبط کا جیسے یا رانہ رہا تھا وہ تڑپ کر ان کی طرف بے اختیار بڑھے تھے انہیں بھیج کر لینے سے ایسے لگایا کہ برسوں کی تشنگی لمحوں میں مٹا لینا چاہتے ہوں۔ باپ کا مشفق و مضبوط سینہ دونوں بہنوں کے دل کی دنیا کو زیر کر گیا یوں لگا وہ کسی مضبوط ساسان تلے آگئی ہوں جہاں کوئی خوف و ڈر، اندیشہ نہ ہو، انگلیوں کا سیل رواں سب شکوؤں کو بہا لے گیا۔

”بس اب چلنے کی تیاری کرو تمہارا بھائی اور تمہاری ماں تم سے ملنے کے لیے بے قرار ہیں۔“ دونوں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا تھا۔

”سگی ماں کا پیا تو شاید ہی دنیا کی کوئی ہستی دے سکے مگر جینے جو کہ اب حفصہ ہے تمہارے دلوں کو ماں کی محبت سے بھر دے گی۔ میں اتنے دنوں اس سے خواہ مخواہ ہی بدگمان رہا کہ اسے جب تم لوگوں کا پتا چلے گا تو وہ بہت جھگڑا کرے گی مگر جب میرا ایکسپریمنٹ ہوا اور میں اسپتال میں پڑا رہا تو اسے میری ڈائری مل گئی کسی پاکستانی فیملی سے ڈائری پڑھوائی تو اسے میرے بارے میں جاننے کا موقع ملا۔ ایک باپ اپنی اولاد کی جدائی میں کیسے دن رات تڑپتا ہے اولاد بھی وہ جو ماں سے محروم ہو تو اس پر کیا گزرتی ہے وہ تمہارے بارے میں سب جان کر بہت روئی، مجھ سے بہت لڑی مگر اس بات پر کہ میں نے اسے اتنا عرصہ اس بات سے بے خبر کیوں رکھا۔ تمہارا بھائی عادل بھی تم لوگوں کے بارے میں جان کر خوش ہوا جیسے ہی میں چلنے کے قابل ہوا حفصہ مجھے لے کر یہاں آئی۔ فون پر خالہ درباری

ازالہ ہو گیا تھا، ایسی والہانہ محبت، بھائی کا پیار وہ اپنے آپ کو خوش قسمت ترین تصور کرنے لگیں۔
پچھو کے چہرے پر شرمندگی کے آثار دیکھ کر وہ بنا کسی فلفلے شکوے کے ان کے گلے لگ گئی تھیں انہیں ان کے رب نے بہت کچھ نوازا تھا پھر کسی رشتے سے شکوے کی منتخاش ہی نہ بنی تھی۔

وعدے کے مطابق شفیق عالم ان سب کو لے کر خالہ درباری کی حویلی میں حاضر ہو گئے تھے۔
حویلی میں رونقیں جاگ اٹھی تھیں مگر دبا کے چہرے پر مرونی چھائی ہوئی تھی۔ کتنی ہی مرتبہ اس نے اس رشتے سے انکار کا ارادہ باندھا مگر زبان پر انکار کا لفظ آتے آتے رک جاتا۔ آئندہ کی زندگی کے بارے میں سوچ کر وہ پریشان ہو جاتی۔ راتوں کی نیندیں ختم ہو چکی تھیں عجیب بے چینی بھی کوئی کسک بھی جو دل کو مضطرب کیے ہوئے تھی۔

اسی اضطراب اور ذہنی کشمکش میں مایوں اور مندی کی رسمیں بھی ہو گئیں۔ دبا کی آنکھوں سے موتی ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتے رہے۔

”تو احیان تمہارے جذبے اس قدر بوندے نکلے۔ سارے دعوے دھوے کے دھوے رہ گئے آج میرے ہاتھوں پر کسی دوسرے کے نام کی جنا بھی سج گئی اور تم میری زندگی سے کسی ہوا کے جھوکے کی مانند گزر گئے، وہ جھونکا جو مجھے ہمیشہ ہمار کی آمد کا یقین دلاتا تھا میرے قلب کو خزاں کی زردی کا پیرا بن اڑھا گیا۔ تمہاری آنکھوں میں چمکتی یقین کی ڈوری کیا کچی تھی یا میں نے ہی تمہارے جذلوں کے بانکھن میں سچائی کا عنصر تلاش کرنے میں غلطی کی۔“

”چلو بھی کڑو اب دو دنوں دو ہٹی کی جان چھڑ دو (چھوڑ دو) انہیں آرام کرنے دو، سویرے جہنچ نے بھی آنا ہے تم سب بھی اپنے گھروں کی راہ لو“ خالہ درباری کی آواز نے اس کی سوچوں کو پولی کو گرہ لگائی۔ کچھ خواتین اور لڑکیاں بالیاں انہیں ان کے کمرے میں چھوڑ گئیں۔ شاکرہ پچھو، تانی بشری، چندا سب گاؤں والوں کی طرف سے ان کو اتنی اپنائیت ملنے پر

حیران تھیں کہ کچھ ہی عرصہ میں انہیں محبتوں کا وسیع سمندر ان کے رب نے انہیں عطا کر دیا تھا۔
شعیب کبھی شیدا اور کبھی دبا کو دیکھ کر سرد آہ بھر کر رہ جاتا براؤن آنکھیں نمکین پانی سے بار بار بھر جاتیں۔
”آئے ہائے منڈے دی اکھال داتے تاس ہی مارا گیا۔“ (لڑکے کی آنکھوں کا تو برا حال ہو گیا)

میرا پتر آ میں تیری اکھال دی بینکائی کراں۔“ (میرا بیٹا تیری آنکھوں کی بینکائی کراں)

خالہ برکتے اس کی آنکھوں سے نمکتے پانی اور سرخی کو دیکھ کر اپنا تجربہ آزمائے برآوہ ہوئیں۔

دبا اور شیباس کی طرف متوجہ ہو میں اور ان کی ہنسی نکل گئی وہ دونوں ان کے اطراف آ بیٹھیں۔

”خالہ برکتے آنکھوں کی یہ دکھن اور ٹپکتا پانی کسی بینکائی سے نہیں جائے گا ہمیں پتا ہے کہ اس بے چارے کو کیا دکھ ہے اور آنکھوں سے یہ برسات مسلسل کیوں ہو رہی ہے۔“

کمرے میں موجود سب کا ہاتھ اٹک گیا شاکرہ کے دل کی دھڑکن ست پڑ گئی کہ کوئی پتا نہیں دبا ان کے لخت جگر کے دل کا راز ظشت ازبام کروے۔

”شعیب میرے سوچنے غم نہ کر یہ وقت تو ہر ایک پر آتا ہوتا ہے اس موقع پر صبر سے کام لینا ہی پڑتا ہے یہ دنیا کا ستور ہے، ایک دن بہنوں کو بھائیوں سے جدا ہونا ہی پڑتا ہے، میرے بھائی جدائی کا یہ زہر بھائیوں کو پینا ہی پڑتا ہے۔“

دبا کی بات پر شعیب کے آنسو بھل بھل بننے لگے اور شاکرہ کا ان کا سانس بحال ہوا۔

”یہی بات تو میں اسے کتنے دنوں سے سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں پر اس کی مولیٰ عقل میں کہاں بات سمانی ہے۔“ شاکرہ پچھو اپنا پیٹ پکڑے لیٹے سے اٹھ کر بیٹھ گئیں کہ کئی دن سے مکھن ملائی سے بنی اشیاء اور رسیاں پی پی کر ان کا پیٹ دہائی دینے لگا تھا۔

”چل اب چپ کر جا۔ شیب تو ہی اسے چپ کرائے گی میری تو یہ سنے گا نہیں۔“ شیب بھی بھائی کی گردان کرتی اسے حوصلہ دینے لگی تو شعیب کا حوصلہ بالکل

ہی پست ہو گیا وہاں سے اٹھ کر شکستہ قدموں سے مردانے میں چل دیا۔



آج صبح کا دن ہزار سوز تھا شفیق بھیگی پلکوں سے انتظامات میں لگے تھے گو کہ خالہ درباری کے شوہر نے سب انتظام سنبھال رکھا تھا فنکشن بھی مختصر ہی تھا مگر باپ ہونے کے ناطے وہ اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے کی کوشش کر رہے تھے ساری عمر بیٹیوں سے دور رہے اور جب ملے تو بیٹیوں کو خود سے جدا کرنے کا وقت آگیا، مگر اس سب کے ساتھ ساتھ ان کے دل کو ایک سکون بھی محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنی بچیوں کو ان کے گھر بھیجنے کا فریضہ ادا کرنے خود موجود تھے۔

دیبا اور شبیا کی حالت بھی ان سے یکسر مختلف نہ تھی۔ ان چند دنوں میں باپ نے ان کے دل کو اپنی بے پناہ محبت سے بھر دیا تھا۔ ان کے دل سے ہر شکوہ چپ چاپ رخصت ہو گیا۔ ایک محبت ملی تو دوسری چھن گئی، دل آنے والے وقت سے لرز رہا تھا بظاہر وہ مطمئن تھیں مگر اندر سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھیں۔ دیبا تو آئندہ کی زندگی سے بالکل بھی مطمئن نظر نہ آتی تھی بتا نہیں آنے والا وقت ان دونوں کے نصیب کا کیا فیصلہ کرے، یہی خیال پریشان کیے دے رہا تھا اور پھر لمحے گزرتے چلے گئے ان کے نام کو ہمیشہ کے لیے کسی کا ساتھ نصیب ہو گیا اور وہ سوگوار فضا میں غم آنکھوں سے نصیب کے کیے گئے فیصلے پر سر غم کیے اپنے اصل گھر کو روانہ ہو گئیں ساری امیدوں و خواہشوں کا وقت تمام ہو چکا تھا۔

دو گھنٹے کے لیے سفر اور مختصر رسموں کے بعد انہیں اپنے اپنے حجرے میں پہنچا دیا گیا گنتی ہی مرتبہ اسے دیبا نے کن آنکھوں سے دولہا کو دیکھنے کی ناکام کوشش کی مگر وہ دونوں چروں پر پھولوں کا سر اڑالے ہوئے تھے۔

”جاہل پینڈو۔“ وہ بڑبڑا کر رہ گئی۔

”سارے ہمارے نصیب پر ایسے رشک کر رہے ہیں جیسے شزاروں سے بیانی جا رہی ہوں۔“ دیبا نے

جھنجھلاتے ہوئے اپنے کاندھ پر دوپٹے کو پیچھے کیا اور پاؤں پھیلائے کمرے پر طائرانہ نظر ڈالی تو مبہوت ہو گئی۔

اسے کمرے پر چہستان کا مکمل ہونے لگا کیوں لگا ہر شے نے گلوں کا غلاف پہنا ہوا ہے۔ کونا کونا مبارکی صدا لگا رہا تھا۔ کمرے کی فضا گلوں کی خوشبو سے مغط ہو گئی۔

صوفے پر دے، فرنیچر سب میں کلرا سکیم کا بے طرح خیال رکھا گیا تھا۔

”ہونہ۔۔۔ سارے پیسے کے کھیل ہیں پیسہ سے سب کچھ کروالو۔ انسان کی تعلیم اور شکل اچھی نہ ہو تو پیسہ کیا خوشی دے سکتا ہے۔“ اسے ان کے کمرے سانولے رنگ کا سوچ کر ہی ناؤ آگیا۔

حالانکہ خوب سمجھتی تھی کہ شکل رنگ روپ چند دن کی خوشی دے سکتے ہیں مگر کردار، شرافت اور عزت ہمیشہ انہیں معتبر کر دیتی ہے مگر پھر بھی وہ فضول باتوں کو ذہن میں جگہ دیے جا رہی تھی۔

دروازے کا ہینڈل گھومنے کی آواز سنائے میں ایسی گونجی کہ دیبا کا دل اچھل کر حلق میں آگیا، ہتھیلیاں پسینے سے نم ہوئیں وہ آنے والی شخصیت کا سامنا کرنے سے بے طرح گھبرا رہی تھی، وہ اس وقت سے خوف زدہ تھی جب اسے اپنے شریک سفر کو نہ چاہ کر بھی چاہے جانے کا ڈھونگ رچانا پڑے گا، وہ اپنے دل کو کسی بھی خوش کن خیال و احساس سے عاری بنا رہی تھی۔

چند گھنٹوں پہلے جس شخص کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کا اپنی رضا مندی کا عندیہ دیا تھا وہ پورے استحقاق سے اس کے سامنے براجمان تھا۔

”ماشاء اللہ بہت دنوں سے آپ کے حسن بلاغیر کے قصے سن سن کر دل دیدار شوق کا پتہ ہی ہوا تھا۔ آپ کو دیکھ کر لوگوں کی آنکھوں کی سچائی پر یقین لے آگیا ہوں کہ اس روئے زمین پر میرے گھر میں اک حسین پری نے رونق بخش کر میرے دل و نظر کے قرار کو چھین لیا ہے۔“ سامنے بیٹھا شخص چہرے پر پھولوں کے سرے میں سے جھری بنا کر اس کے حسن کے قصیدے پڑھنے میں مگن تھا۔

شاہینا حنا

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

لاہور

نمبر 017 شاہینا شاہینا شائع ہو گیا ہے

نومبر 2017 کے شمارہ کی ایک پبلک

☆ ”صراطِ مستقیم“ حنا مفر کا مکمل ناول،

☆ ”کسی ہمسفر کی تلاش میں“ عمار املا

کا مکمل ناول،

☆ ”ڈھل گیا ہجر“ ندائی عباس کا مکمل ناول،

☆ ”محبت مستنظر ہو گئی“ سونیا چوہدری کا ناول،

☆ ”میں رقص“ بشری سیال کا ناول،

☆ ”دل گزیدہ“ امیر مہم کا

مکمل ناول،

☆ ”پریت کے اس ہار کھیں“ تاباں جیلانی

کا سلسلہ وار ناول،

☆ ”وجہ بخاری، فیصہ بخاری، آسیہ منقر، انورین شاہد،

رابعد افتخار، اور کنول ریاض کے افسانے،



پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں، انشاء نامہ،

اور مستقل سلسلوں کے علاوہ وہ سب کچھ جو

آپ پڑھنا چاہتے ہیں

کا شائع ہونا آپ کی

پسندیدہ کتاب ہے

دینا ٹھنک گئی اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا
مگر وہ چہرہ پھر گلوں کے پیچھے چھپ گیا۔

”آپ کا چہرہ اداسی کا غماز ہے کہیں اس شادی پر
زبردستی تو نہیں راضی کیا آپ کو۔“ اس شخص کا سوال
اور آواز دونوں نے الجھا دیا۔

”دیکھیے زندگی کے اس سفر میں دونوں فرق کی
باہمی رضامندی ضروری ہے اگر آپ کو میرا ساتھ دل
سے قبول نہیں تو۔۔۔“ اس کی بات مکمل ہونے سے
قبل ہی دینا نے اس مانوس آواز پر دو لمبے میاں کا
پھولوں بھر اسرا تیزی سے نوج ڈالا۔

”ہائے میں مر گئی۔۔۔ احیان کو سامنے دیکھ کر بے
ساختہ اس کے لبوں سے نکلا۔

”مجھ پر۔۔۔؟“ وہ شرارت سے مسکرایا۔

”ویسے پہلی بار ایسا ہوا ہو گا کہ دلہن نے دولہا کا
گھونگھٹ کھولا۔ شوق دیدار کی بھی حد ہو گئی۔“

”دل تو چاہ رہا ہے کہ اتنے بڑے دھوکے پر گنجاکر
کے اپنے بالوں میں لگی ساری پنوں کو آپ کے سر میں
جھانڈوں۔“ وہ جو بیویشن کے بنائے گئے ہمنوا سا نکل
سے عاجز آئی ہوئی تھی دانت چبا کر بولی احیان نے
تقریب لگایا۔

”یہ دھوکا نہیں ہے میڈم سربرا انز ہے، مت پوچھو
کہ اس سربرا انز کے لیے ہم بھائیوں نے کتنے پیار
کیلے۔ وہ اسے ایک ایک بات بتاتا چلا گیا کہ اس کی ممانا کو
لا دونوں بہنیں نرگس کی شادی میں بے حد پسند آئی
تھیں۔ سدا کی حسن پرست ممانا نے انہیں فوراً ”او کے
کر دیا تھا بس ذرا گاؤں کی وجہ سے انچکا ہٹ کا شکار
تھیں جب ہم نے بتایا کہ تم لوگوں کا تعلق بھی شہر سے
ہے اور تمہارے بابا ملک سے باہر ہوتے ہیں تو پھر یہ
گھانچا ہٹ بھی ختم ہو گئی۔ ہم بھائیوں کو یقین نہ آتا تھا
کہ ممانا اتنی آسانی سے مان جائیں گی اس دن تمہیں
توڑنا تک کرنے کے لیے میں نے بات گھما پھرا کر کی
اور تم نے تو مزید میری کوئی بات سنی ہی نہیں خود سے
ہی سارے قیام لگائے پھر ہم نے بھی خاموشی اختیار
کر لی اور معاملات ہیوں کے سپرد کر دیے۔

میں نیک نیتی۔“ وہ سچ میں خالہ درباری کے خلوص سے متاثر ہوا تھا۔

”خالہ درباری جیسے فرشتہ صفت لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ اللہ انہیں ان نیکیوں کا اجر عظیم عطا کرے۔ ان دو سالوں میں ماں باپ، دوست، رشتہ دار سب رشتوں کا مان دیا۔ وہ ہمارا میکا ہے احیان، ہمیں کبھی اپنے میکے سے دور نہ کرنا۔“ اس کی آنکھیں

جھلما اٹیں تو احیان ان کنول میں ڈوب سا گیا۔

دبانے اس کی محسوس نظروں کی تاب نہ لا کر فوراً پکوں کی چلن کرانی دل کی دھڑکنوں نے تیز گام کی رفتار پکڑ لی تھی وہ واپس اپنی جون میں پڑی۔

”وہ سارے پاپڑم نے کہاں رکھے ہیں۔“

”کون سے۔۔۔؟“ احیان نے اجنبی سے پوچھا۔

”وہی جو تم دونوں بھائیوں نے نیلے تھے انہیں فرانی کر کے پاروں کی ریڑھی لگواؤں گی تمہیں، محنت سے نیلے گئے پاپڑ ایسے ضائع تھوڑی کریں گے۔“

”ہا ہا ہا۔۔۔“ ہنستے ہوئے اس نے دبا کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ دبانے اس بار کوئی مزاحمت نہ کی خود سپردگی کے عالم میں اس نے اسے اپنا آپ سوئپ دیا تھا۔

”سچ کہہ رہی ہو یا ان بیبیوں سے پھر ہم ہنی مون منانے چلیں گے کیا خیال ہے۔“ وہ شہنشاہ ہوا اور دبا نے شریک مسکراہٹ سجاتے ہوئے اس کے کندھے

پر سر رکھ دیا تھا کہ اس کے رب نے ان کے تمام دکھوں کا ازالہ کر دیا تھا شہنشاہ کے کمرے کا منظر بھی اس سے کچھ مختلف نہ تھا وہ وضو کیے اسے رب کے حضور سیدہ ریز

تھی کہ جن کو چاہنے والا شریک سفر، باپ کی شفقت، ماں کی چاہت، بھائی کا مان، ہر ایک چیز سے ان کے رب نے انہیں نوازا دیا تھا چوڑیوں کی کھنک کے ساتھ ان کی ہنسی کے جلت رنگ دلوں کو سرور بخش رہے تھے۔

قدرت ہم پر مہربان ہو رہی تھی سچی محبت کی طلب کرنے والوں کو منزل مل ہی جایا کرتی ہے۔ خالہ درباری تمہارے پایا اور میرے ماما بابا کے درمیان سب کچھ ملے ہو رہا تھا اس تم لوگوں کو بے خبر رکھا۔

اصل میں اسی دوران ماما بابا کا کسی فنکشن سے واپسی پر ایک سینڈٹ ہو گیا۔ بابا کو شدید چوٹیں لگیں مگر کسی بڑے حادثے سے بچ گئے لیکن ماما کی ٹانگ دو تین جگہ سے فریکچر ہو گئی۔ گھر میں کافی پریشانی تھی۔

ممانے خالہ درباری سے فون پر رشتے کی بات کی تو وہ بھی کچھ پس و پیش کے بعد مان گئیں۔ ابھی ماما مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہیں اس لیے مختصر سا فنکشن کرنے تمہیں اس گھر میں لے آئے جیسے ہی ماما مکمل طور پر تندرست ہوں گی۔ گرینڈ ویمہ کریں گے گاؤں سے بھی بہت سے لوگوں کو مدعو کریں گے اس واقعہ کے بعد ماما بہت حد تک چیخ چاٹ آیا ہے وہ اپنوں کی اپنائیت محسوس کرنے لگی ہیں۔“

احیان نے ساری بات بتا کر ہولے سے اس کی ناک کو دبایا جو اسے بڑے اٹھماک سے سن رہی تھی۔

”اور وہ تاریک رات کا حسن لیے ہمارے ساس سرسرس نے بھیجے تھے۔“ اس نے احیان کے ہاتھوں کو جھٹکا دیا جو اسے اپنے ساتھ لگانے کے لیے آگے بڑھے تھے۔

”اس کا انتظام خالہ درباری نے کیا تھا۔ ویسے یار خالہ درباری کیا دلچسپ خاتون ہیں ایسے منٹوں میں مسئلے سلجھاتی ہیں کہ بندہ حیران رہ جائے۔ انہیں تو ملک کی وزیراعظم ہونا چاہیے ہر کام میں سدھار، ہر کام

سرورق کی شخصیت

ماڈل عظیم طاہر

میک اپ روز بیوٹی پارلر

فوٹو گرافی موصیٰ رضا



نارنگی

نغم ملک

آوازِ دو



سڑک کی روشنیاں کسی معمول کی طرح ساٹ سی روشنی بکھیر رہی تھیں۔ شرفک کی مدھم سی آواز کبھی کانوں میں پڑ جاتی۔ مہر النساء کی آنکھوں کو آج سیاہ کاجل بھی روشن رکھنے میں ناکام رہا تھا۔ ابادیکہ رہے تھے۔ اور غور سے دیکھ رہے تھے۔

”معلوم نہیں لوگ ہنسی کو ہی خوشی کی علامت کیوں سمجھتے ہیں۔ حالانکہ خوش ہونے اور ہنسنے کے درمیان کا فاصلہ ہمیشہ واضح رہتا ہے۔“ ابا نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ مہر النساء چونکی، پھر بات سمجھتے ہوئے مسکراہٹ مزید گہری کر کے بولی۔

”معلوم تو یہ بھی نہیں کہ لوگ جانے کیوں ہمیشہ ہنسی اور خوشی کے درمیانی فاصلے میں الجھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ انہیں صرف مسکراہٹ کے جواب میں مسکراہٹیں ہی بنانی چاہیے۔ کیوں ڈیر ابا؟“ اس کے جانے پر اب ابا ہنسے۔

”کمال ہے۔ سنجیدہ باتوں پر ہنس پڑتے ہیں۔“ اس نے منہ بنا لیا۔

”ٹھیک ویسے جیسے تم مزاحیہ باتوں پر بھی نہیں ہنستی۔“ انہوں نے سر پر یار سے چیت لگائی۔ ابا کا بنایا کبے تیار تھا۔ مہر النساء بھی تیار۔ دلی باہر کسی سے کہہ رہا تھا کچھ۔ آواز آ رہی تھی۔

”سرسہ سرخ گلاب نہیں ملے گا۔“
”لیکن مجھے صرف سرخ گلاب ہی چاہیے۔“
”اصل میں وہ ختم ہیں۔ آپ یہ دیکھیں۔“
واٹ۔۔۔

”نونو نونو۔ اونٹلی ریڈ روز۔ (نہیں صرف سرخ گلاب)۔“

”اوکے ویٹ آمنٹ۔ آئی چیک۔“ (اوکے ایک منٹ۔ میں چیک کرتا ہوں) دلی میاں نے اپنے مخاطب پر انگلیں جھاڑی۔ اندر کھڑے ابا اور مہر النساء ایک ساتھ زور سے ہنس پڑے۔ مہر النساء کی صحبت کا اثر تھا۔ اچھا خاصا اثر۔

”دیکھ رہے ہیں ابا۔“
”سب دیکھ رہا ہوں۔“ ابا اچانک سے سنجیدہ

گلاب کی پتیوں کی خوشبو، سارے ماحول سے لپٹی پڑی تھی۔ اور فلادور شاپ میں چلتی روشنیوں کے نیچے کھڑی مہر النساء کا وجود وہاں بڑے سفید گلابوں کے ہر پھول سے بڑھ کر مکھ رہا تھا۔ ابا سستی ہی بار سنجیدگی سے اسے دیکھ چکے تھے۔ وہ بے نیازی سے شاپ کے آخری کونے میں کھڑی آئینے کو دیکھے جا رہی تھی۔ فلادور اسٹال سے گاہکوں کو ذیل کرتے دلی کا سارا دھیان بھی اوھر ہی اٹکا ہوا تھا۔!

”مہر النساء وقار احمد۔“ اس کے لبوں نے آہستگی سے ادائی کی۔ اور آئینے میں لہراتا عکس مسکرانے لگا۔ مس ورلڈ جیسے سبج سبج کر قدم اٹھاتی باہر آئی۔ ابا کی چہرے پر ناخوشی صاف پڑھی جاسکتی ہے۔ ”ڈیر ابا آئی ایم ریڈی۔“ مس ورلڈ نے سیاہ ریشمی ایئر لائن فرائڈ کا ٹونا پکڑ کر خود کو ہلکا سا گھمایا۔ ابا اس کی اس حرکت پر مسکرائے بنا نہیں رہ سکے۔ وہ شرارت میں ابا کی طرف انگریزی کا جملہ پھینکتی تھی۔ دلی یوں انجان کھڑا تھا جیسے اس کی طرف نہیں دیکھ رہا۔

”میں کیسی لگ رہی ہوں۔؟“ اس نے خود کی تعریف مانگی۔ وہ ہمیشہ کی نسبت آج لائٹ سا مگر اچھا سا تیار ہوئی تھی۔ آج سے قبل اسے کبھی تیار ہونے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اور ابا کی خوشی کی وجہ یہی آج کی ”ضرورت“ ہے۔ وہ روک چکے تھے۔ وہ نہیں رکی تھی۔

”نساء۔ نہیں کوئی تجھ سا۔“ پھولوں کا بکے تیار کرتے ہاتھ روک کر انہوں نے جواباً اتنی شرارت سے کہا اور ابا کی نساء زور سے ہنسی چلی گئی۔ وہ اندر سے کچھ اٹھانے گئے۔ غالباً۔۔۔ کاغذ۔ مہر النساء قل قل ہنسی ان کے پیچھے اندر چلی آئی۔

”پیارے ابا آپ بھی ناں کبھی بڑے رومانٹک موڈ میں آجاتے ہیں۔ دلی صحیح کتا ہے ہمیں سانس دینے کے لیے آپ کو ایسے موڈ میں آتے رہنا چاہیے۔“ وہ دھیرے دھیرے مسکراتے ہوئے کاؤنٹر پہ پڑے سفید گلابوں کے بکے پر ہاتھ پھر رہی تھی۔

”ایسے ہی دل میں گڑے کاٹنے نکلیں گے۔“ وہ ایک بار پھر مسکرا دی۔ ”اوکے ڈیر ابا۔۔۔ ہم جلدی آئیں گے۔“

وہ پھول اور لبا کا داگٹ اٹھاتی شاپ سے باہر نکل گئی۔ دلی پلاسٹک کی شفاف سطح میں لپٹا سرخ گلاب اپنے گلاب کو دے کر رخصت کر رہا تھا۔ وہ قدم قدم اٹھاتی دلی کے قریب آئی۔

”سو مسٹر ولید آریو ریڈی۔۔۔؟“ اس کے سوال پر چودہ سالہ لڑکے نے وانت نکالتے ہوئے سر ہلایا۔۔۔ مہر النساء کے ساتھ جانا اس کے لیے ہمیشہ سے باعث خوشی تھا۔ بلکہ باعث فخر۔ مہر النساء جو اچھی تھی۔ پوری دنیا میں سب سے اچھی لگتی تھی۔ تاریکی چاروں سمت پھیلی تھی اور سفید روشنیاں سیاہی میں بھلی لگ رہی تھی۔ ہاتھ میں سرخ گلاب پکڑے وہ لڑکا بالکل غیر ارادی طور پر مڑا۔ پھر جیسے اپنی اس حرکت پر خوش ہوتے ہوئے واپس آیا۔

”ہائے۔“ آواز وہ دونوں جو نکلنے والی نے چرائی سے اسے دیکھا۔ وہ اکثر یہاں پھول لینے آتا تھا مگر آج تو کچھ زیادہ ہی سرکھا رہا تھا۔

”ناؤ۔۔۔ واٹ پھینٹے۔۔۔؟“ (اب کیا ہوا ہے) دلی نے بہت سوچ کر سوال کیا۔ (اب جواب کیا ہو گا۔۔۔ خیر مرا آپنی ہیں ناں) اس نے اطمینان سے سوچا۔ مگر وہ لڑکا اسے نظر انداز کیے اسے دیکھ رہا تھا۔ مہر النساء کو۔۔۔ مہر النساء کی آنکھوں میں الجھن ابھری۔ ”وہ تم یہاں۔۔۔ آئی میں۔۔۔“ وہ خوشی سے بولتے ہوئے ایک پل کو چپ ہوا۔ پھر چمکتی آنکھوں سے پھول والا ہاتھ اس کے سامنے کر دیا۔ ”تم بہت اچھی لڑکی ہو۔۔۔ میں۔۔۔ تم یہ پھول لے سکتی ہو پلیز۔ میری طرف سے ایک پیاری سے لڑکی کے لیے پیارا سا تحفہ۔“ وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ آنکھوں میں ڈھیروں ستائش لیے اسے دیکھ رہا تھا۔ مہر النساء کی آنکھیں پھٹی اور پھولوں کا بکے ہاتھ سے چھوٹ کر قدموں میں جا گرا۔

”او۔۔۔“ وہ سٹپٹا گیا۔ ”سوری مجھے غلط مت

ہو گئے۔ مہر النساء نے اداسی بھری آنکھوں سے ان کے سرعت سے بدلتے رنگ دیکھے تھے۔ گلابوں کی خوشبو اداسی میں گھٹنے ملے لگی۔ اس منک سے مہر النساء کا دل بو بھل پن کا شکار ہوا۔

”بابا کیوں پور کرتے ہیں آپ۔۔۔“ ”مہمو۔۔۔ کیوں خود کو تکلیف دیتی ہو؟“ وہ شکوہ کیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔

”ابا اب ہی تو تکلیف نہیں ہوتی۔۔۔“ وہ اداسی سمیت مسکرائی۔ تاریکی دھیرے دھیرے اس کی آنکھوں میں بیٹھنے لگی۔

”کیا مجھے سزا دے رہی ہو؟“ ابا نے نظرس چراتے ہوئے کہا۔ مہر النساء کے دل کو دھکا لگا تھا۔

”ابا خدا کے واسطے میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔“ وہ گھٹی گھٹی آوازیں ناراضی سے بولی۔ ابا شرمندہ سے نظر آنے لگے۔

”مہمو تمہیں وہاں جا کر اذیت ہی ملے گی۔۔۔“ وہ جانتے تھے۔ اس نے نہیں مانا۔ اور وہ مانی بھی نہیں۔

”کیوں۔۔۔ کیا میں کوئی پری ہوں جو وہاں جا کے اپنے پر جلا آؤں گی؟“ ”مہر النساء تم جانتی ہو۔۔۔“

”ہاں ابا میں جانتی ہوں۔۔۔ کسی کو میری موجودگی سے فرق نہیں پڑے گا۔ تائی جان کی پرنسز کے سامنے میری کیا اوقات۔۔۔ مگر ابا میں انہیں بتانا چاہتی ہوں ہمیں نہیں پڑنا فرق۔ کوئی ہم سے ناتا تو ڈر کر ان سے جوڑ رہا ہے تو سوواٹ؟ میری طاقت آپ ہیں یہی طاقت انہیں دکھانا چاہتی ہوں کہ ہم آج بھی خوش ہیں۔ انہوں نے بلایا ہے مجھے جانا چاہیے۔۔۔ ہے ناں پیارے ابا۔۔۔“ وہ ان کے ہاتھ تھام کر مقبوض اپنے میں کہہ رہی تھی۔ ابا نے ایک کمری سانس اندر کو کھینچی تھی۔

”یہ اذیت پسندی ہی ہے۔۔۔“ وہ اسے سمجھانے کا ارادہ ترک کر کے بولے اور کاؤنٹر پر بکھر اسلامان سینے لگے۔

کانوں تک پہنچ رہی تھی۔۔۔ شہر مخلوط کن دھیمی دھیمی مسکان مسکاتا ہوا ان کے قریب آ بیٹھا۔ اس کی شفاف آنکھیں باہر دھلتے دن سے زیادہ روشن تھیں۔

”بالکل صوفیہ لی۔۔۔ لیس چائے۔۔۔ آپ سے پڑھ کر محبت کو بھلا کون سمجھ سکتا ہے۔“ وہ صوفے پر آرام وہ انداز میں بیٹھتے ہوئے بے تکلفی سے بولا۔ صوفیہ لی جی بھر کر بد مزہ ہو گئیں۔

”اے پرے کر اس جان کے گھانٹے کو۔۔۔ لڑکے جان چھڑواؤ اس کا لی دوا سے اتنی گرمی میں جان جلا کر رکھ دیتی ہے۔۔۔ اللہ جانے کیوں یہ جلے دودھ کا گھونٹ دنیا کی نعمت لگتی ہے تم لوگوں کو۔۔۔ تو بس۔۔۔“ ناگواری سے کپ ایک طرف کرتے ہوئے وہ ڈپٹ کر بول رہی تھیں۔۔۔ شہیر نے کان پکڑ کے دکھائے۔

”جب آپ کا دل ہو تب تو اچھی طرح“ اس جان کے گھانٹے کو بھول جاتی ہیں آپ۔۔۔ خود کی دفعہ تو نما دھو کر کچن میں جا گھسٹی ہیں۔۔۔ یوں کہیں کہ میرے جاگنے سے پہلے ہی یہ شعل فرمایا جا چکا ہو۔ آپ بھی نا صوفیہ لی۔۔۔“

”کمال ہوں نا۔۔۔“ وہ قہقہہ مار کر ہنسی چلی گئیں۔۔۔ ”بڑے چالاک ہو گئے ہو لڑکے۔۔۔ تمہارے حق میں یہ بہتر ہے۔۔۔“

”کیا چالاکی۔۔۔؟“ اس نے حیران ہو کر دیکھا۔۔۔ بالکل۔۔۔ جہاں چالاک لومڑیاں بہت ہوں نا۔۔۔ وہاں کوؤں کا ہوشیار ہونا نہایت ضروری ہو جاتا ہے۔۔۔ وہ سچی آواز کر کے رازداری سے بولیں۔۔۔ شہیر نے بڑی مشکل سے قہقہہ کا گلا دیا۔

”اچھا تو آپ کیا کہہ رہی تھیں۔۔۔“ وہ کپ سے اٹھتی بھاپ کو دیکھ کر بولا۔۔۔ چائے ایک طرف دھری تھی۔ وہ گرم چائے پسند نہیں کرتا تھا۔۔۔

”ہوں۔۔۔ میں نہیں بتا رہی تھی۔ لوائٹ فرسٹ سائٹ۔۔۔ وہ پار جو تمہارے دادا کو مجھ سے ہوا تھا۔۔۔ یو نو پکی نظر کی محبت۔۔۔“ وہ فخریہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے شہر نے لگیں۔۔۔ شہیر کے لبوں پر ایک محبت

سمجھو۔۔۔ مجھے اس کی ضرورت ہے مگر میں سفید گلاب پر سرخ اسپرے کروا لیتا ہوں۔۔۔ یہ تمہارا ہوا پلینز نو۔۔۔ گلابوں کی خوشبو اس کے آس پاس بکھر رہی تھی اور وہ بے یقینی سے اسے دیکھتی جا رہی تھی۔ مہر النساء نے آنکھیں کھول کر اس خواب سے نکلنا چاہتا۔۔۔ وہ ہمیشہ سے دیکھتی آئی تھی وہ عام سی لڑکی ہے۔۔۔ بہت عام سی شکل و صورت کی عام سی لڑکی۔۔۔ جس میں کچھ بھی خاص نہیں تھا تو پھر کیسے؟ وہ مسکراتا ہوا چمکتی آنکھوں میں التجا لیے اسے پھول پیش کر رہا تھا۔۔۔ اور وہ کسی گہری نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔!

”دل میں گڑے کاٹنے اس طرح نکلیں گے۔“ اس نے ابا سے کہا تھا۔ اسے خبر نہیں تھی کہ ایسے نکلیں گے۔۔۔ اسے کہاں جانا ہے اسے بھول گیا۔ اس رات پہلی بار شہیر نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

گلاب کے پھولوں پر روشنی پھینک دی گئی ہے۔۔۔ سفید گلابوں پر پکھلی چاندنی ہو رہی ہے۔۔۔ بہتی جا رہی ہے!



گلابی دھوپ اونچے مکانوں کی منڈیروں پر بڑی ستارہ بنی تھی۔۔۔ اسی باعث سارا دن بہت ساری گرمی سننے کے بعد اس وقت پرسکون سانس لینے میں دشواری کا سامنا نہیں تھا۔۔۔ صوفیہ لی عصر پڑھ کر فارغ ہوئیں تو شہیر چائے لے آیا۔۔۔ گرمی کچھ گری تھی مگر فضا میں ٹھنک کا احساس بدرجہ اتم موجود تھا۔۔۔ صوفیہ لی کہہ رہی تھیں۔!

”ٹھکرائے جانے کا دکھ دل پر اثر کرتا ہے۔۔۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ درد ختم بھی ہوتا جائے تو دماغ پر اس خوف کے سنجے ہمیشہ رہتے ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ایک نا ایک دن اس خوف کی جگہ ضرور محبت لے لیتی ہے۔۔۔ یو نو لو۔۔۔ سمجھتے ہو محبت کسے جو ایک زوال کے خدشے سے پرے کا جذبہ ہے۔“ چھوٹے مگر انتہائی نفاست سے سچائے گئے اس خوبصورت سے گھر میں ان کی میٹھی سی آواز گونجتی ہوئی شہیر کے

کر آئی تب بھی پورے وقار سے بات کرتی گئی۔ دل کرتا تھا ساری دنیا اسے سنے جائے کاش ایسی ایک اور سبب نہ اس گھر کے مقدر میں لکھی ہو۔ ”ایک گہری سانس لے کر انہوں نے چھکن کا اظہار کیا۔ وہ مزید بولنے کے موذ میں نہیں لگتی تھی۔ اب شبیر کو بولنا تھا۔ وہ ارادہ بھی کر رہا تھا۔“

”بتا ہے دادو۔ آج کل میری توجہ کامرکز ایک لڑکی بنی ہوئی ہے۔“ وہ عادت کے مطابق ہنسا ہوا آگے ہو کر بیٹھا۔ دادو بری طرح چونک گئیں۔

”کون سی لڑکی۔“

”یہ تو میں نہیں جانتا۔ مگر کل رات میں نے اسے پھول پیش کیا۔ یوٹو ریڈ رونس۔“ وہ صوفیہ بی کے انداز میں دانت نکالتے ہوئے بولا تھا۔ دادو بری طرح اچھل پڑیں۔

”ہیں یہ کیا چچھو رہا ہے۔ تالا ق۔۔۔“

”ارے نہیں یا۔۔۔ کیا آپ بھی ایسا کہیں گی۔“ وہ خفا خفا سا ہو کر بولا۔

”تو تمہاری اس حرکت پر۔۔۔ شاباشی دوں۔“ وہ ڈپٹ کر بولیں۔ ابھی تک ان کا گھورا بند نہیں ہوا تھا۔ آخر دو منٹ پہلے تک انہیں اپنے پوتے کی شرافت پر پورا بھروسہ تھا۔

”یار دادو سن تو لیں۔ میں نے صرف اسے بار بار دیکھا ہے۔ کبھی واک کرتے ہوئے، کبھی سائیکل پر جاتے، کبھی پرندوں کے ساتھ۔ آپ جانتی ہیں دادو اس کے بہت سے پرندے دوست ہیں۔“ شبیر کی آنکھوں کی چمک لوٹ رہی تھی۔ وہ پورے جوش سے بولتا ہوا دادو کو حیران کرتا جا رہا تھا۔ دادو حیرت سے اسی دیکھے گئیں۔

”کیا وہ سائیکل چلاتی ہے۔ یعنی کہ اتنی بڑی لڑکی۔“ وہ آخری بات فی الحال نظر انداز کیے آنکھیں پھاڑے پوچھ رہی تھیں۔ ”کیا اتنی بڑی لڑکی کو سائیکل چلانا سوت کرتا ہو گا۔؟“ بے اختیار انہیں جھرجھری آئی۔

”اوہو دادو۔۔۔ شاید اپنے ابا جی کے ساتھ۔“ اس

بھری مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔ اور وہ پوری توجہ سے انہیں سن رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح۔ ہمیشہ کی طرح اس کی آنکھیں چمک سے بھری ہوئی تھیں۔

”پھر تمہارے باپ کو ایسی محبت ہوئی مگر میرا بیٹا بہت شرم والا تھا۔“ ان کی آنکھوں میں نمی چپکنے لگی۔ شبیر نے کپلیوں سے لگا کر مٹایا۔

”یعنی صرف محبت دل میں رکھنے پر اکتفا کرنے والا۔۔۔“ اس نے آنکھ دبا کر ٹکرا لگایا۔ دھلتے دن میں دھوپ مدھم پڑتی جا رہی تھی۔

”ہاں نہیں بتا ہے۔ جیب بھی تمہارے باپ کو مجھ سے کوئی بات کرنی ہوئی تھی وہ اچانک سے بہت فرماں بردار اور سعادت مند بنا نظر آنے لگا تھا۔ بالکل تمہاری طرح۔“ پھر تو میں بھی دھیرے دھیرے اس کی عادت پہچاننے لگی۔ اور دل ہی دل میں بیٹھ کر سوچتی رہتی تھی کہ کب اگر اصل وجہ بتاتا ہے۔“ ان کے

نور برساتے چہرے پر ممتا کے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ دونوں کے درمیان ایک دم نامحسوس انداز میں اداسی پھیل رہی تھی۔ مگر وہ دونوں ہی او اس ہونا چاہتے تھے۔ شبیر کی نگاہیں صوفیہ بی پر ٹکی تھیں۔ اور صوفیہ بی کی دور بکھری سنہری دھوپ پر۔۔۔ دونوں ہی کی آنکھیں چمک کھو چکی تھیں۔

”اور آپ کو ان کے بتانے سے پہلے ہی وجہ معلوم ہو گئی۔“ وہ سوچ کر افسردگی سے مسکرایا۔ صوفیہ بی کی مسکراہٹ بھی ایسی ہی تھی۔

”بالکل۔۔۔ یہ تمہاری ماں کو چپکے چپکے دیکھا کرتا تھا۔ اور اس سے پہلے کے کچھ بتانا سبب نہ خودی ایک دن اس کے دوست کی مدد سے یہاں آپہنچی۔ تم دیکھتے کے ہوا یہاں اڑی ہوئی تھیں۔ تمہارے باپ کے چہرے کی۔“ صوفیہ بی نے شرارت سے بتاتے ہوئے ہاتھ اوچکا کیا۔ اور ایک تالی کی آواز کے ساتھ

قیمقوں کی آواز پورے گھر میں بکھر گئی۔ صوفیہ بی نے چپکے سے آنکھیں صاف کر لیں۔ ”تمہاری ماں تو تمہاری ماں تھی۔ خود اعتماد نہں کبھی، مخلص، اور خاص رکھ رکھاؤ والی۔ تمہارے باپ کی شکایت لے

خریداری کرنی ہے۔“
”جی دادو۔“ بات سمیٹنے پر وہ چائے کے برتن لیتا
ہوا یکن میں چلا گیا۔ سوچ کا پتھی دور کہیں اس
اداس لڑکی کے گرد چکر لٹ رہا تھا۔ اونٹنے مکانوں کی
مینڈیروں سے پھیکی دھوپ نیچے کو پھسکتی جا رہی
تھی۔!!



ناخوش گوار صبحیں۔ جلتی دوپہر۔ سلگتی
شامیں۔ اور گرم راتیں۔ فضاؤں میں ٹھن اور باسی
ہیں۔ جس کا ایک ناختم ہونے والا سلسلہ تھا۔ یہ
گرمیوں کے روٹھے اور خامے بے کیف دن تھے۔
ہوائیں جنگلوں میں کہیں پتے اوڑھے سوتی تھیں۔
اور گرم لووں کا ہمہ وقت راج تھا۔ شدید جس کا
غبار فضا میں اٹھ آتا دل وحشت کے مارے باہر آنے
کو بے قرار ہو جاتا تھا۔ ابا اور مہر النساء ہمیشہ ایسے
موسم میں محکمہ موسمیات کے فرائض سرانجام دینے
لگتے۔ اب تو آندھی آئے گی۔ نہیں آئے گی۔
بارش کے آثار لگتے ہیں۔ صرف آثار ہی لگتے تھے
کبھی آسمان صاف ہو جاتا۔ کبھی فضاؤں کا بوجھ ہٹ
جاتا۔ محکمہ موسمیات کھیانے نظر آنے لگتے۔
گرمیوں کا موسم یوں بھی بے اعتبار ہوتا ہے۔
میری مائیں تو کسی بھی موسم کا دین ایمان نہیں۔
آخر تیور ہوتے ہی بڑنے کے لیے ہیں۔ آج بنے۔
کل بگڑے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔! ان ہی گرمیوں کی یہ
ٹھنڈی صبح تھی۔ بھیکے پروں والے راج ہنس کے
جیسی سفید اور چمک دار۔

بھور سے باہل کھل کر پرے تھے۔ اسی کارن
ہوائیں ہلکی نمی لیے پھر رہی تھیں۔ سفید لباس میں
مہر النساء لمبے سے سفید دپے میں لمبی اس خوش گوار
موسم میں منحور ہوتی ہوئی ”کمپنی باغ“ کا آہنی دروازہ
پار کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا باکس تھا
جنسے وہ گمن انداز میں ہلکا سا ہلاتے ہوئے پتھر ٹلی روش پر
اتر رہی تھی۔ اور ساتھ میں دانت نکال کر کچھ کہتے

نے جھنجھلائے بغیر وضاحت کی۔ دادو ”اوہ“ والے
انداز میں سر ہلاتے ہوئے حیرت دیا گئیں۔
”اور پرندوں سے دوستی کیوں۔ انسان کیا کم بڑ
گئے ہیں۔“ انہوں نے دوسرا اعتراض اٹھایا۔ کوئی
عجیب سی لڑکی لگتی تھی۔

”معلوم نہیں۔ مکروہ ہر روز پرندوں کو خوراک
دینے جاتی ہے دادو۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتیں میں
کتنا متاثر ہوا ہوں اس سے۔“ شیر کا اشتیاق عروج
پر تھا اور ستائش چرے سے چھلک رہی تھی۔ دادو
سنجیدگی سے اس کے تاثرات جانچ رہی تھیں۔
”اور وہ پھول والا واقعہ۔“

”میں نے اسے اس کی پرندوں سے محبت کے لیے
پھول دیا دادو۔ مگر اس نے وہ پھول واپس کر دیا۔“
شیر کے چرے پر ماپوسی کی لہر دوڑی۔ اب کی بار دادو
نے تجسس کو اپنے اندر سر اٹھاتے پایا۔
”اس نے ایسا یوں کیا۔؟“

”اس نے کہا۔ ٹوٹے ہوئے پھول بہت جلد
مر جھانے لگتے ہیں۔ اور میں مر جھانے ہوئے پھول
نہیں دیکھ سکتی۔ اس پھول کی تمہیں زیادہ ضرورت
ہے۔“ شیر نے اس کی بات دہرا کر دادو کو دیکھا۔ جو
اس جواب پر پہلے بار مسکرائی تھیں۔
”بہت حساس لگتی ہے۔“

”اس بھی۔“ شیر نے جملہ مکمل کیا تو صوفیہ بی
سوچوں میں کھو گئیں۔ چند پل کے لیے سارے
ماحول میں سکوت چھایا رہا۔

”تم بھی فاروق بن رہے ہو۔“ دادو نے اپنے بیٹے
اور شیر کے باپ کا نام لیا۔ شیر کے سنجیدہ چرے پر
مسکراہٹ آئی۔ دادو کے ساتھ ہوتے ہوئے وہ
ایک کام کرتا تھا۔ اور بہت کرتا تھا۔ ”مسکراتے
رہنا“

”ایسی بات نہیں ہے۔ مگر کوئی بات ہے
ضرور۔“ وہ الجھ گیا۔
”چلو کبھی ملیں گے اس حساس لڑکی سے۔ تم بتاؤ
کب بازار چل رہے ہو۔ کل وقت نکالو۔ کچھ

”اتنا نہیں مت۔ منہ بند رکھیں۔“ وہ محبت سے پردوں کو ہل لبل کر زمین پر چون مارا دیکھ رہی تھی۔ دلی کی بات پر نا بھی سے اُسے دیکھنے لگی۔

”کیوں۔ ہنسنا بھی منع ہے؟“ وہ ناک چڑھا کر بولی۔ دن ہنوز سیدی میں ڈوبا ہوا تھا۔ امیر پر سفید بادلوں نے ڈیرے اجمار کھاتھا۔

”ہاں تو؟“ اس نے حیران سے ولید کو دیکھا۔

”تو نیولا دانت گن لیتا ہے۔ پھر دانت ایک ایک کر کے گرنا شروع ہو جاتے ہیں۔“

”ہاں۔ ارے واہ! تمہارے نیولے کو گنتی بھی آتی ہے۔ کون سے اسکول جاتا ہے؟“ مہر النساء کی گہری ہوتی ہنسی نے اسے خفا کر دیا۔

”مذاق اڑا رہی ہیں۔۔۔؟“

”نہیں جواب مانگ رہی ہوں۔۔۔“

”تو مذاق اڑانا ہی ہوا۔“ وہ برہان چکا تھا۔

”اچھا سو رہی۔ شاید تمہارے اسکول آتا ہوگا۔“ وہ کھی کھی کرتی آگے بڑھنے لگی۔ شیر کے لیے یہ منظر پوری دلچسپی لیے ہوئے تھا۔ اس نے پہلے بھی اسے یوں ہنستے نہیں دیکھا تھا۔

پرنے ایک ایک کر کے پرواز کرنے لگے تھے۔ شیر پھوٹے پھوٹے قدم بڑھاتا ان تک پہنچ چکا تھا۔ مہر النساء نے چاپ پر گردن گھمائی۔ شیر نے دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ فوراً ”ہاتھ ہلایا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ پاتی اس لمحے فضا میں ہلکی سی گونج پیدا ہوئی تھی۔ نینوں نے غیر ارادی طور پر گردنیں گھمائی۔ کمپنی بالغ کی دوسری دیوار کے پار سے شکاری نے کسی پرنے کو نشانہ بنایا تھا۔ شیر درخت سے زمین پر گرا اور گر کر پھڑپھڑاتے ہوئے تڑپ رہا تھا۔ مہر النساء کے دل کو دھکا لگا۔

بچپن میں وہ فزع ہوئی مرغی کو دیکھ کر کئی دن سہمی رہتی تھی اور اب۔۔۔

طیش کی شدید ترین لہر کے ساتھ وہ ایک جھٹکے سے اٹھی تھی۔ شیر نے پہلے اسے دیوانہ وار بھاگتے دیکھا تھا۔ پھر حواس باختہ دلی کو۔ شل چرے کے ساتھ

ہوئے وہ اچھلتا کودتا لڑکا۔ شیر دور سے دیکھ کر بے ساختہ مسکرائے۔ نا نہیں رہا تھا۔

پتھر ملی روش کے اطراف میں گھٹے سایہ دار قطار کی صورت میں سر اٹھائے کھڑے تھے۔ بارش کی وجہ سے سبزہ گھر کے سامنے آگیا تھا۔ روش کے درمیان میں گلی کیاریاں رنگ برنگی پھولوں سے بھری تھیں۔ سرخ، سفید، زرد، نارنجی، ہفتی، پھولوں کا ایک حسین منظر تھا۔ جس کی خوشبو مٹی کی سوندھی سوندھی مسک میں گھل کر سارے ماحول پر چھائی ہوئی تھی۔ دلی نے کیاریوں کے سامنے لگے بورڈ کو بد مزہ ہو کر دیکھا۔

”پھول توڑنا منع ہے۔“ دلی نے بلند آواز میں دہرایا۔ مہر النساء جانتی تھی یہی ہوگا۔ مسکراہٹ دیتے ہوئے وہ مخصوص جگہ رک کر باکس کھول رہی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا سے اس سے اپنا دوپٹا سنبھالا نہیں جا رہا تھا۔ شیر اسے پلکیں جھپکے بغیر دیکھنے لگا۔

”تم بڑے پھول توڑنے کے پیچھے ہو۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ باکس سے چاول اور بارہ نکال کر وہ درختوں کے تنے میں رہتی جارہی تھی۔ ٹہنیوں پر انتظار میں بیٹھے پرنے۔ دوسرے لمحے پھر پھڑپھڑاہٹ کی آواز فضاؤں میں بکھرتے ہوئے زمین پر اتر رہے تھے۔ مہر النساء دو قدم پیچھے کھڑی ہو کر بے تحاشا خوشی کے ساتھ پردوں کی ہمار کو دیکھ رہی تھی۔ یہ ایسا لمحہ تھا جب وہ ہر چیز کو بھول جاتی تھی۔ یاد رہتا تھا تو بس یہی کہ یہ سب اس کے دوست ہیں اور اسے پہچاننے لگے ہیں۔ ہاں یہ بہت مشکل رہا تھا۔ مگر اس نے یہ مشکل کام کر لیا تھا۔ اور اس سے کچھ فاصلے پر پنوینا کے پھولوں کے قریب کھڑا شیر اس کے سانولے چہرے پر چٹکی خوشی کو دیکھ رہا تھا۔ اور مبہوت ہو کر دیکھ رہا تھا۔ وہ بچوں کی سی معصوم مسکراہٹ لبوں پر سجائے دلی کو فخریہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ دلی کو

متاثر ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے لیے یہ نئی بات نہیں تھی۔ مہر النساء ہر کام کر سکتی ہے۔ وہ بھی جس کا تصور نہیں۔

مہر النساء چاہ کر بھی اس مسکراہٹ کو نظر انداز نہ کر سکی۔ کیسی عجیب سی تھی۔ نہیں عجیب ترین سی۔

”معلوم نہیں یہ ٹھیک بھی ہوگا۔“ وہ کوئی مایوس سا جملہ بولنے والی تھی۔ شیر نے فوراً روک دیا۔
”تم نے کہا تھا۔ تو بس کچھ نہیں ہوگا۔“
مہر النساء کو اسی تسلی کی ضرورت تھی۔ مگر وہ مطمئن پھر بھی نہیں ہوئی تھی۔

”مگر اس کا کھانا۔“ اس نے ہتھیلی آگے کر دی۔
”پلیز پیچھے کرو اسے۔“ وہ نظریں پھیرتے ہوئے دو قدم پیچھے گواہ۔ مہر النساء شرمندہ ہو گئی۔ لب بھینچتے ہوئے اس نے ہاتھ واپسی موڑ لیا۔ شیر نے اس کے چہرے پر پھیلی سنجیدگی کو دیکھا تو معذرت خواہانہ انداز میں آگے گواہ۔ وہ بالکل چپ سی ہو گئی تھی۔

”ایم سوری۔ کیا تم اسے وہاں رکھ سکتی ہو؟“ اس کے لہجے میں افسردگی تھی۔ مہر النساء نے فوراً محسوس کیا کہ وہ اس بل بہت مریضیا لگ رہا تھا۔ بنا کچھ کہے وہ زمین پر زور ڈال کر اٹھی اور جہاں تک ہاتھ جاسکتا تھا۔ شیر کو درخت کی تنہی پر بٹھا کر واپس آ گئی۔ شیر واقعی الجھا ہوا لگ رہا تھا۔

”کیا تم ٹھیک ہو۔؟“ اس نے تشویش سے سوال کیا۔ شیر ڈھیلے سے انداز میں ٹانگیں نیچے پھیلا کر سونگ کے کنارے بیٹھ رہا تھا۔ مہر النساء منتظر کھڑی تھی۔

”ہاں۔ کیا تم یہاں بیٹھ سکتی ہو۔“ سر اٹھا کر اسے دیکھتے ہوئے وہ امید سے پوچھ رہا تھا۔ مہر النساء اس کی سفید بڑتی رنگت کو دیکھ رہی تھی۔ پھر نرمی سے ذرا سا مسکرا کر کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی۔ وہ زمین پر لکیریں کھینچ رہا تھا۔

”تم برا مت ماننا۔ اصل میں میں خون نہیں دیکھ سکتا۔ دیکھ لوں تو وحشت سوار ہو جاتی ہے۔“ مہر النساء حیرت سے اسے دیکھ گئی۔ پھول والی شرارت کے بعد اس کا یہ روپ مہر النساء کے لیے

نہ نہن میں است پت شیر کو دیکھ رہا تھا۔ یا شاید نہیں۔ وہ ان اور کو دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں میں چلتی کوئی فلم یا تباہت۔ اس کے سامنے دور تک صرف خون اور ان بہہ رہا تھا۔ شور۔ تڑپ۔ کراہیں اور بس ان۔

مہر النساء پھولوں کی لمبی سی باڑ پھیلا لگ کر لال بھبھوکا چہرے لیے سخت تاثرات کے ساتھ کسی سے لڑ رہی تھی۔ شیر کی آنکھوں میں ابھری کرب کی لہروں نے ہر منظر دھندلا کر دیا تھا۔ وہی زمین پر بیٹھا ہوا تھا شاید۔ اور وہ۔ شیر کو۔ اس سے اس رویے کی توقع تھی یا اس سے بھی زیادہ۔ ہاں وہ چاہتی تو صیاد کا سر بھی پھاڑ دے۔ شیر نے آنکھیں بند کر کے آٹا فادہ یادوں سے پیچھا پھڑانا چاہا۔ وہ واپس آ رہی تھی۔ وہی یعنی مہر النساء۔ پرندے کا زخم صاف کرتی۔ وہ لی۔ شیر اس کی ہتھیلی پر بنا پھر پھرائے سکون بیٹھا تھا۔ زمین پر خوراک لیتے پرندے سمے سمے سے لٹاؤں کی وسعتوں میں چکر کاٹ رہے تھے۔ مہر النساء قریب آ رہی تھی۔ اور اس کی بردواہٹ شیر کو سنائی دے رہی تھی۔

”بہت بے رحم ہیں یہ۔ انسانیت نامی چیز تو ان کے اندر ہے ہی نہیں۔ مجھے زہر لگتے ہیں ایسے لوگ۔“ اس کا چہرہ ابھی تک اپنی اصلی حالت میں نہیں لوٹا تھا۔ وہ وہی سے شاید مرہم لانے کو کہہ رہی تھی۔ وہی چلا گیا۔ وہ اسے نظر انداز کیے کیے شیر کو زمین پر کھڑا کر رہی تھی۔ شاید دانہ دکھا کے تسلی دینے کی کوشش۔ شیر کا دل چاہا ایک بار تو مسکرا ہی دے۔

”یہ زندہ ہے۔!“ مہر النساء کو بے چین یا کروہ بے اختیار کہہ گیا۔ وہ شیر کی بوجھل آواز پر چونک گئی۔ صبح ہوئے کافی وقت بیت چکا تھا۔ اور صبح ہنوز خوشگوار تھی۔

”یہ زندہ ہے۔ مہر النساء کے ہوتے ہوئے انہیں کچھ ہو بھی نہیں سکتا۔“ اس نے خود اعتمادی سے جواب دیا۔ شیر اس انداز پر ہلکا سا مسکرایا۔ اور

جیران کن تھا۔
 ”کیوں؟“ وہ پوچھنے لگا۔
 ”کیوں ہی۔“ وہ افسردگی سے بولا۔
 والدین ایک روز ایکسپنڈنٹ میں انتقال کر گئے تھے۔ اسی حادثے کا مجھ پر بہت برا اثر پڑا ہے۔ میں خون دیکھ لوں تو سن ہو جاتا ہوں۔ اس پرندے کی طرح۔ وہ دونوں خون میں لت پت میری ہانپوں میں دم توڑ گئے۔ تب سے ہی۔ پتا نہیں کیوں۔ مگر۔ اور اسی وجہ سے میں نے میڈیکل فیلڈ کو بھی چھوڑ دیا ہے۔“

”اوہ۔“ وہ بالکل لاجواب ہو گئی تھی۔
 ”شیر۔“
 ابھی تک کمزور لمحے کی زد میں تھا۔ پلکیں ہلکی سی پھیل رہی تھیں۔
 ”مہر النساء کو اپنے دل میں بے پناہ ہمدردی کے جذبات اچھے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ چاہ رہی تھی کہ اس کی تکلیف کو اس کے جتنی نہیں محسوس کر سکتی تھی۔“

”تم؟“ وہ اسے پکارتے ہوئے رک گیا۔
 ”مہر النساء اس کی انجھن سمجھ گئی۔ اس لیے بغیر سوچے بولی تھی۔“

”مہر النساء۔“ وہ اس کا نام نہیں جانتا تھا۔ اس کے بتانے پر دھیرے سے مسکرایا۔
 ”دوستانہ مسکراہٹ۔“ وہ کہہ رہا تھا۔
 ”گڈ نیٹم۔“ بہت پیارا۔ جاؤ تمہیں دیر ہو رہی ہوگی۔“ اور مہر النساء نے خود کو کہتے سنا۔

”تم کو۔“ میں تمہیں سن سکتی ہوں۔“
 ”تم نے ابھی کہا کہ تمہارے ہوتے ہوئے ان پرندوں کو کچھ نہیں ہو سکتا۔ مجھ یہ خیال گزرا کہ میرے ہوتے ہوئے میری مٹی پیا میری نظروں کے سامنے سے چلے گئے اور میں کچھ نہیں کر سکا۔“ وہ زخمی لہجے میں کہہ رہا تھا۔
 ”مہر النساء کو فی الفور کہنا پڑا۔“
 ”میں نے ایک بات کی ہے۔ قسمت کے آگے تو سب ہی بے بسی ہوتے ہیں۔“ وہ سر ہلا کر قائل ہوا۔
 ”تم ٹھیک کہتی ہو۔“ مگر پھر بھی میں کئی راتیں سکون سے سو نہیں پاؤں گا۔“ وہ کسی معصوم بچے کی

مانند منہ پر ہاتھ پھیر کر خود کو بر سکون کر رہا تھا۔
 مہر النساء کو باہر سے ہنستے مسکراتے فکروں سے بظاہر آزاد لگتے اس لڑکے پر بہت ترس آ رہا تھا۔
 ”یہ واقعی بہت برا صدمہ ہے۔“ وہ کچھ بھی کہہ لیتی کم ہوتا۔ اسی لیے ہی کہہ پائی۔

”ہاں۔“ میں ابھی تک بے یقین ہوں کہ ایسا کیسے ہو گیا۔ مٹی کتنی تھیں شیر میں تمہارا گھر دیکھنا چاہتی ہوں۔ جس میں تم خوش باش رہتے ہو گے اور میں تمہاری خوشیاں دیکھ کر کئی سال مزید جی لوں گی۔ خوشی انسان کو کبھی بوڑھا نہیں ہونے دیتی۔ میں نے تو ہمیشہ انہیں خوش رکھا پھر بھی۔“ وہ سنبھل کر بول رہا تھا۔ مگر آواز بوجھل ہو رہی تھی اور چہرہ سرخ۔ مہر النساء صرف اسے سننے چاہتی تھی اور وہ بولنا چاہتا تھا۔

”میں انہیں بہت مس کرتا ہوں۔ اگر دادو کی والمانہ محبت اور سارا میرے ساتھ نہ ہو تو میرا معلوم نہیں کیا ہوتا۔“ اس کی بھرائی آواز خشک ہو چکی تھی۔ مہر النساء نے اپنی آنکھوں کے کونے انگلی کی پوروں سے صاف کر لیے۔

”تکلیف دہ باتوں کو بھولنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ تم ان کے سکون کے لیے دعا کرتے رہا کر۔“ مہر النساء نے اسے حوصلہ دیا تھا۔ اس کا اپنا دل بہت بوجھل ہو گیا تھا۔ طبیعت بھی۔

”تھنک یو مہر النساء۔“ مجھے سننے کے لیے۔“
 ”مہر النساء مسکرائی۔“ ”نہیں تمہارا شکر ہے۔“
 ”سننے کے لیے۔“ ورنہ کچھ لوگ دوسروں کو سنا پناہ نہ نہیں کرتے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے مبہم سا جملہ بولی تھی۔
 ”شیر کو دادو کی بات یاد آئی تو ماحول پر چھائی یاسیت دور کرنے کے لیے بول اٹھا۔“

”تم نے پرندوں کو دوست بنا رکھا ہے۔ کیا انسان کم ہیں؟“

”میں نے انسانوں کو دوست بنانا چھوڑ دیا ہے۔ وہ مجھے پسند نہیں کرتے تھے۔ یہ پرندے بہت محبت کرتے ہیں مجھ سے۔“ اس کا انداز بتاتا تھا کہ اسے

فرق نہیں پڑتا۔۔۔ شیر بہت لمبے سوچتا رہا۔

”تم بہت اچھی ہو مہر النساء۔۔۔ اور مجھے بہت پسند ہو۔“ شیر نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔۔۔ مہر النساء ششدر رہ گئی۔ اس نے عام سی بات کہی تھی اور اس عام سی بات سے کئی رنگ چمک رہے تھے۔۔۔ موتیے کی پاکیزہ خوشبو ان کو چھو کر گزر رہی تھی اور وہ مہر النساء کو دیکھ رہا تھا۔۔۔ پٹوئیا کے سرخ پھولوں کی ہتھیلی پھیل کر مزید کشادہ ہو گئی تھی۔۔۔ اور مہر النساء کچھ بھی کہنے کے قابل نہیں رہی تھی۔

”تم آج بھی مجھ سے پھول نہیں لوگی۔۔۔“ وہ لب و لہجہ مسکراتی آنکھوں سے تائید چاہ رہا تھا۔۔۔ اور مہر النساء کو اپنے بارے میں ہوئی غلط فہمی دور ہو گئی۔۔۔ کہ ہر صورت میں بنا وقت لیے صرف وہی نازل ہو سکتی ہے!

”پھول توڑنا منع ہے۔۔۔“ وہ جواب دیتی کھڑی ہو گئی۔۔۔ ولی آتا دکھائی دے رہا تھا۔۔۔ شیر بہت نا ہارتے ہوئے اسے شوخی سے کہہ رہا تھا۔

”لیکن تمہیں لینا ہو گا۔۔۔ میں انتظار کروں گا۔۔۔ تمہیں کبھی خوشبو چاہیے ہو تو مجھے آواز دینا مہر النساء۔۔۔ تم خوشبو کو دور تمہیں یاد دلاؤ گی۔۔۔“ خوشبو اس سے دور نہیں تھی۔۔۔ مگر وہ مڑنا نہیں چاہتی تھی کہ پتھر نہیں ہونا چاہتی تھی!



شیر نماز ادا کر کے مسجد سے باہر نکلا تو اندھیرے اجالے کا ملبہ جاری تھا۔۔۔ اندھیرے سے اجالے نے شکست کھائی تو شیر دکانوں سے جھانپتی روشنیوں میں سرخ گلاب ہاتھ میں پکڑے سڑک کنارے چلتا دیکھائی دے رہا تھا۔۔۔ مہر النساء شاپ پر شاید نہیں آتی تھی۔۔۔ کچھ دنوں سے شیر بھی مہر النساء کے پرندے دیکھنے نہیں گیا تھا۔۔۔ مغرب ڈوب چکی تھی۔۔۔ اس وقت دادو اور وہ کچھ دیر واک کرتے تھے۔۔۔!

”ڈیزر سوٹ ہارٹ لیڈی۔۔۔ محبت کی اگر کوئی حد ہے تو مجھے آپ سے اس حد سے بڑی ہوئی محبت

ہے۔۔۔ آپ یقین رکھتی ہیں؟“ ”بالکل۔۔۔“ دادو نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔۔۔ آسمان تاروں سے بھرا تھا اور وہ ہاتھ پکڑے سبز گھاس پر چل رہے تھے۔

”سی بات ہے۔۔۔ خادم کا حقیر سا تحفہ پیش خدمت ہے۔۔۔“ سر کو خم دیتے ہوئے شیر نے فلمی انداز میں نشی سے پکڑا پھول اٹھے کیا۔

”تھینک یو بیک بوائے۔۔۔ آئی لویو۔۔۔“ دادو نے بھی نزاکت دکھائی۔۔۔ ایک دادو اسے پھول لے کر انگلی میں اٹکاتے ہوئے مہین آواز میں بولی تھیں۔

”آئی لویو ٹو۔۔۔“ اس نے دادو کا ہاتھ چوم لیا۔۔۔ دادو منہل ہوتے ہوئے فوراً بولی تھیں۔

”اب بتاؤ۔۔۔ کیا بات کرنی ہے۔۔۔“ شیر ہنستا چلا گیا۔۔۔ دادو اس کی خوشی کو دل سے محسوس کر رہی تھیں۔۔۔ شیر ہنستا ہوا کہہ رہا تھا۔

”دادو مہر النساء سب سے الگ لڑکی ہے۔۔۔ اور مجھے بہت پسند ہے۔۔۔“ شیر نے شرافت سے وجہ بتادی۔۔۔ اپنے باپ کی طرح وہ کوئی بھی خاص بات کرنے سے پہلے دادو کو پھول دیا کرتا تھا۔۔۔ اور یہ کام اسے آئے روز کرنا پڑتا تھا۔۔۔ دادو ان قریب سوکھے پھولوں کی دکان کھولنے والی تھیں۔

”تمہیں وہ اچھی لگتی ہے۔۔۔ تو یقیناً وہ بہت اچھی ہے۔۔۔“ مہر النساء ٹانہ جو وہ چند بار پہلے بھی سن چکی تھیں۔۔۔ دوبارہ سن کر بولی تھیں۔۔۔ شیر نے بچوں کی طرح سر ہلا کر یقین دلایا گویا۔۔۔ ہمیشہ کی طرح آنکھیں چمک سی بھری ہوئی تھیں۔۔۔ سویت لیڈی اسے لاڈ بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔



سورج رزوال ٹوٹ رہا تھا۔۔۔ سرسئی شام دھیرے دھیرے پھوپھورنے لگی تھی۔۔۔ مہر النساء کمرے کا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئی تو کمرے میں پھیلا اندھیرا ڈرکے بل بھر میں غائب ہوا۔۔۔ اباسا نے پیڈر دروازے پر آج ان کی طبیعت صبح سے نامساں تھی۔

مہر النساء بنا چاہ پیدائش سے چلتی ہوئی ان کے سر پر بیٹھ گئی۔

”ابا!“ اس کی پکار پر ابا نے دھیرے سے آنکھیں وا کیں۔ آنکھوں سے جھلکتی سرخی مہر النساء کو مزید پریشان کرنے کے لیے کافی تھی۔ ابا نے اس کے چہرے پر اضطراب بکھرتا دیکھا۔ تو نقاہت سے مسکراتے کی کوشش کرنے لگے۔

”طبیعت کیسی ہے؟“

مہر النساء پیشانی چھو کر اندازہ لگاری تھی۔ ابا کو بہت اچھا لگتا تھا۔

”بگلی بڑی جلدی پریشان ہو جاتی ہو۔“

”پھر بھی کون سا میری بات مانتا ہے کوئی۔“ وہ خف سے جتا رہی تھی۔ ابا بھی ایسے معاملوں میں پیچھے نہیں رہتے تھے۔

”دیکھو مہر النساء ہم دونوں میں ایک بات مشترک ہے۔ چاہے ہم ہم کتنی محبت ہو، ہم ایک دوسرے کی کوئی بات نہیں مانتے۔“ ابا کی بات پر وہ مضطرب ہو کر بولیں۔

”ابا آپ بھی ناں۔“

”کل تو خیر شاہ سے ملاقات ہوئی۔“ ابا نے کہا۔ مہر النساء کی ہنسی غائب ہوئی۔ ”ساتھ ہانیہ تھی۔“ وہ مزید بولے تھے۔ مہر النساء شکوہ کنال لگا ہوں سے انہیں دیکھے گئی۔

”ابا!“ وہ بولی تو ابا کا دل دکھا۔ ”آپ جھوٹ پوچھتے ہیں ناں۔؟“ وہ ہلکی سی می کی کے ساتھ پوچھ رہی تھی۔ ابا کو دس سالہ مہر النساء یاد آگئی جو دروازے میں کھڑی روتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ ”مال کو کچھ نہیں ہو گا۔ آپ جھوٹ بولتے تھے ناں۔؟“ وہ تب نہیں بول سکے۔ آج چپ نہیں رہ سکے۔

”نہیں ساء میری جان۔“

”نہیں ابا آپ جھوٹ ہی بولتے ہیں۔ میں کوئی پرسن نہیں ہوں۔“ سچ کہا تھا تو خیر شاہ نے میں اس قابل ہوں کہ کوئی مجھ پر دوسری نظر نہ ڈالے۔ میری طرف بڑھنے سے پہلے لوگ سود فہ سوچیں۔ مگر ابا

میں نے تو کسی چیز کی چاہ نہیں کی۔ ناصح کی۔ ناولت کی ناکی کے ساتھ کی تو پھر کیوں آپ۔“ مہر النساء کی آواز رندہ گئی۔ ابا گھبرا س گئے اس کی سائولی رنگت پر خفگی اور صرف ناراضی کے شدید آثار تھے۔ وہ بری طرح ہرٹ تھی۔

”مہر النساء ایسی بات نہیں ہے۔ تم واقعی میری شہزادی ہو۔ اور وہ لوگ تمہارے قابل نہیں تھے۔“

”وی تو ابا۔ میں مان چکی تھی آپ کی بات۔ مجھے لوگوں کی پروا بھی نہیں رہی تھی۔ مگر آپ کو پروا ہے۔ تو خیر شاہ کا مجھے ٹھکانا آپ کے دل کی تہجین بن گیا ہے۔ آپ بھول نہیں سکتے ناں ابا۔“ وہ آنکھیں جھپکتے ہوئے انہیں دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔ ابا اٹھ کر بیٹھ گئے۔

”تم غلط سمجھ رہی ہو مہر النساء۔ تمہیں کیا لگتا ہے اسی لیے میری طبیعت بگڑی ہے۔“ وہ بڑبڑاتے تھے۔ اس کا منہ پھولا ہی رہا۔ ”میری غلطی تھی کہ میں نے تمہارے لیے ایک غلط شخص کا انتخاب کیا۔ مگر یہ کوئی ایسی بھی بڑی غلطی نہیں۔ کسی ایک انسان کی وجہ سے زندگی کا نظام رک نہیں جاتا ساء۔ میں یا گل نہیں ہوا جو دل میں حسرت جگائے رکھوں۔ تم دیکھنا تمہارے لیے اللہ تعالیٰ نے بہت اچھا سوچ رکھا ہو گا۔ کوئی ایسا جو تمہاری قدر کرنا جانتا ہو گا۔“

”چھوڑیں ابا۔“ وہ ناخوش سے دھیماسا مسکرائی۔

”میں نے خواب دیکھا چھوڑ دیے ہیں۔“

”تم نے چھوڑے ناں۔ میں نے نہیں۔ تو خیر کی لالچی فطرت دیکھ کر دے ہی مجھے یقین ہو گیا کہ وہ تمہیں خوش نہیں رکھ سکتا۔ لیکن اگر تمہاری اس کے ساتھ دل واپس لگتی تھی تو سوچا جاسکتا تھا۔ میرا جو کچھ ہے تمہارا ہی ہے۔ وہ رشتہ تم نے ختم کر دیا تھا۔ ابا بھی روٹھے لہجے میں کہہ رہے تھے۔ مہر النساء نے سر جھٹک دیا۔

”اور اب ان باتوں کا مطلب۔؟“

”میں نے انہیں کھانے پر انوائٹ کیا ہے۔ اگر تمہیں۔“ ابا کی بات اس نے درمیان میں کاٹ دی۔

”جھلی۔ کیوں جوڑ نہیں۔ تم کسی سے کم نہیں ہو، بہت اچھے لگو گے تم دونوں۔“ ابا اسے یقین دلا رہے تھے اور ابا کی مہر النساء کم صم سی کھڑی خواب دیکھ رہی تھی۔

یہ ہمار کا آغاز تھا۔ ایسی بیمار جو خزاں سے نا آشنا تھی۔ مہر النساء صاف دل کی تھی۔ اس کا دل تنویر شاہ نے تمام لیا تھا۔ کچھ لوگ بڑی خوش فہمی کا شکار ہوتے ہیں۔ تنویر شاہ ان ہی میں تھا۔ اپنی دانست میں ایسا ہیرو۔ جس کی جگہ گاہٹ دوسروں کو بھی منور کر دے۔ ایک فابریہر۔ ”تنویر شاہ“

”خاندان کی لڑکیاں جلتی ہوں گی تم سے۔“ تنویر شاہ نے اسے کہا تھا اور وہ عجیب نظروں سے اسے دیکھتی رہی تھی۔ یہ بھی کوئی بات ہے کرنے کی؟ اس نے بھی ایسا خواب نہیں دیکھا تھا۔ مگر یہ تعبیر بری بھی نہیں تھی۔ تنویر شاہ نے اسے کہا تھا۔

”تم میں بہت سادگی ہے۔ تم معصوم بھی ہو۔ جیسے اندر ویسی باہر۔ تم میں کچھ بھی بتائی نہیں۔“ مہر النساء سنا تو خود پر فخر محسوس کرتا پایا۔ رشک تو اسے پہلے بھی رہا تھا اپنی پاکیزہ سوچوں اور اپنی سیرت پر۔ تنویر شاہ نے اس کا دل چھو لیا تھا یا شاید دل پر قدم رکھ لیا تھا۔ اس نے تنویر شاہ کو، حقیقت قبول کر لیا تھا۔ پھر تنویر شاہ نے اسی حقیقت کو توڑا۔ دل بھی توڑا۔ اعتماد بھی۔ قدم جو دل پر تھا۔ ”تمہارے ابا کو مارکیٹ والی شاپس مجھے دے دینی چاہیے۔ میں بزنس کرنا چاہ رہا ہوں۔“ عام سالجہ تھا۔ ٹھنڈا سا۔ وہ حیران تو ہوئی، مگر تھوڑی۔

”مارکیٹ والی شاپس، گمرو تو۔ کرائے پر ہیں کیا وہ تم لینا چاہتے ہو؟“

”ہاں ان کا سب کچھ میرا تو ہے۔ پھر وہ آج لوں یا کل۔“ لہجہ اب بھی چاہے پر سکون ہو۔ مگر اسے دھچکا لگا تھا وہ بھی زور دلا۔

”وہ تمہارا کیوں ہے تنویر۔ وہ تو ابا کا ہے۔ یہی تو ان کا املا ہے اور ان کا ہے ہی کون۔؟“ مہر النساء کو برا لگا تھا اور بہت لگا تھا۔ وہ ہرگز ہرگز ابا سے یہ مطالبہ

”مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے ابا۔ جب دل پر گہری چوٹ لگے تو پھر باقی چوٹیں کچھ نہیں اثر کرتیں۔ میں نے دل پتھر کر لیا ہے۔ تنویر شاہ سے میری پہلے بھی کوئی وابستگی نہیں تھی۔ آپ ہانیہ اور اسے بلکہ تائی جان کو بھی بلائیے گا۔“ وہ کہہ کر وہاں سے اٹھ آئی تھی۔ دروازہ بند ہوا تو اندھیرا دوبارہ پھیل گیا۔ سورج پر زوال ٹوٹ رہا تھا۔ دھوپ، ہنوز سنہری تھی۔



اب اس دن بہت خوش تھے۔ دلی کی ماں مہر النساء کو ابھی ابھی پیار کر کے گئی تھیں۔ ان کا گھر دیوار پیار تھا۔ مگر گھر کے تعلقات کی بنا پر دونوں گھر برابر لگتے تھے۔ مہر النساء ابھی ابھی پھر رہی تھی۔

”نبیاء تنویر کیسا لگتا ہے تمہیں۔؟“

”باقی سب جیسا۔ انسان ہی۔“ اس نے حیرت کی انتہا پر پہنچ کر ابا کو جواب دیا تھا۔

”او نہیں لگی۔ اگر تم دل کی نگاہ سے دیکھو تو تمہیں کیسا لگے گا۔“ ابا بڑی مشکل سے بات کر پارے تھے۔ مہر النساء معاملہ سمجھی نہیں تھی۔

”ابا آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے۔ دل کی نگاہ سے بھی وہ انسان ہی رہے گا۔“ وہ برا مان کر بولی تھی۔ ابا برا مان گئے۔ دلی کی ماں نے کوشش کرنی چاہی تھی۔ مشکل آسان کرتے ہوئے گویا ہوئیں۔

”اگر وہ تمہیں مل جائے تو۔؟“ وہ اب کچھ سمجھی تھی۔ مگر اتنا اچانک تھا یہ۔ وہ سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔

”تنویر شاہ ہے وہ کوئی کانٹریکٹ نہیں۔ جو مجھے مل جائے۔“

”تمہاری پھپھو نے تمہارے رشتے کی بات کی۔ تمہارا اور تنویر کا۔“ ابا نے وہی کہہ دیا جو وہ سننا نہیں چاہتی تھی۔ وہ ششدر ہو گئی تھی۔

”ابا۔ میرا اور اس کا کیا جو۔؟“ وہ اچھلا چاہتی تھی۔ مگر سن رہ گئی تھی۔ ابا اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں کو دیکھ کر بزنس پر۔

پناہ مانگتی تھی ایسے حسن سے۔۔۔ جو تکبر میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اس نے دل سخت کر لیا۔۔۔ خود کو مضبوط کر لیا۔۔۔ پھر ایک لفظوں کا نوک دار تیر مہر النساء کے آر پار بہت اچانک سے گزر گیا تھا۔

”تم یہ پھول لے سکتی ہو پلینز میری طرف سے ایک پیاری سی لڑکی کے لیے پارا سا تحفہ۔“ یہ تیر شہیر فاروق کی طرف سے آیا تھا۔ داؤد کے شیر کی طرف سے۔ اس کے پار اتر گیا۔ مگر وہ چنچ نہیں چاہتی تھی۔

”تمہیں خوشبو چاہیے ہو تو مجھے آواز دے لینا مہر النساء۔ تم خوشبو کو خود سے دور نہیں پاؤ گی۔“ یہ ایک اور سنہری جال تھا۔ وہ اس سے نظرس چرا سکتی تھی۔ چرا بھی رہی تھی۔ تویر شاہ بھی تو پہلے برا نہیں تھا۔ اگر نہیں تھا تو شیر جیسا بھی نہیں تھا۔ سچے جذبے رکھ میں دے میوٹوں کی طرح ہوتے ہیں جو دور سے اپنے وجود کا پتا دے دیتے ہیں۔ مگر وہ سمجھتی ہے وہ کسی کے قابل نہیں۔ وہ پتھر کو نہیں کھانا چاہتی۔ یقین تو ہر گز بھی نہیں کرنا چاہتی۔ مگر وہ لڈی صوفیہ کا لاڈلا پوتا ہے۔ ٹھوکر پر سنبھانا جانتا ہے۔ محبت پر یقین دلانا جانتا ہے۔ تب ہی تو۔

گلابوں کے پھولوں پر روشنیاں پھینکی گئیں۔ تو گلاب میں ڈوبی محبت ملائمت پر بڑی مسکرا رہی تھی۔!



میں ہم ستاروں کی افشاں امبری مانگ میں بکھری ہوئی تھی۔ سرمئی سی تاریکی گہرے رنگوں میں چھپ کر پوری کائنات پر چھاری تھی۔ اور اس تاریکی میں گہرے سنائے تھے۔ مہر النساء کے گھر سے اٹھنا کالکا شور ان سناٹوں کا تو زہامت ہو رہا تھا۔ ابانے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی مہر النساء کی سالگرہ کا اہتمام کیا تھا۔ مہر النساء نے شیر کو بھی انوائٹ کیا تھا۔ داؤد خوش اخلاقی سے اندر سب کے ساتھ بیٹھیں باتوں میں مشغول تھیں۔

”ہیلو مہر النساء۔“ وہ کچن میں کھڑی فریق سے نکالی

نہیں کرے گی۔ اگر کوئی اور بھی کرے تو وہ اپنا کومانے نہیں دے گی۔ تویر کی لاپچی فطرت چھوٹی سی بات نہیں سمجھتی۔ پہلے دکائیں۔ اب اسے ادھار کا تقاضا پھر گھر۔ رات سے بنی رشتے کی عمارت زمین بوس ہوتی چلی گئی۔ پھپھو بیٹے کے ساتھ تھیں۔ شروع دن سے تھیں۔ آخر تک رہنے والی تھیں تو مہر النساء ہی پیچھے ہٹ گئی۔

”میں اب اسے کچھ نہیں لوں گی۔ وہ سب ان ہی کا ہے۔ ان کا جو دل چاہا دیں گے۔ مگر سب کچھ نہیں۔“

”ٹھیک ہے پھر وہ تمہیں بھی جس کو دل چاہے دیں۔ میں مزید برداشت نہیں کروں گا تمہیں۔“ یہ کیا تم میں۔ جو مفت میں مجھ پر مسلط کی جا رہی ہو۔ یہ میں ہوں جو تمہیں قبول کر رہا ہوں ورنہ کوئی اور تمہیں دیکھے بھی نہیں۔ ہزار لڑکیاں خواہش مند ہیں میرے ساتھ کی اور تم۔ جس سے بات کرنے کو بھی دل نہ چاہے۔ تم سے ملنے کا سوچ کر ہی میں بھر بھری لبتا تھا۔ ہونہ تر سوچی میرے لیے۔ اور دیکھنا

تمہارے سامنے میں تمہاری کسی عزیز کا ہاتھ تھاموں گا۔ تمہیں چکھتا تا دیکھ کر مجھے بہت مزا آنے والا ہے۔“ وہ پھٹکارتے ہوئے انگارے پھینکتا رہا۔ مہر النساء سستی رہی۔ سستی رہی۔ سیاہ پرگئی تو اٹھ کر وہیں جا کھڑی ہوئی۔ جہاں سے بھی چلی۔ کسی کو فرق نہیں پڑا۔ انسا کون ہی ملا۔ ابابا اور مہر النساء کا اپنے

خاندان سے رسمی سا تعلق تھا۔ بلکہ خاندان والوں کا ان سے۔ نساء کے پیدا ہونے سے بھی پہلے۔ ابابا کی او میں بھی تب سے ہی۔ یہ جو قریبی رشتے تھے ناں۔ باپ بیٹی کی محبت سے بھی جل جالتے۔ پھر ان کے بچے بھی۔ تویر شاہ نے ہانیہ سے دل لگایا۔ تائی جان بچے دل سے ایسی نہال ہوئیں کہ بس۔ اور یہ ہانیہ کہاں مہر النساء کی عزیز۔ بھی۔ یہ وہی تھی جو کتنی تھی۔ ”مہر ڈارلنگ تم کس پر چلی گئی ہو۔ شاید اپنی ماں پر۔ دیکھو تمہارے چہرے سے تو میں زیادہ میرے پیر سفید ہیں۔“ یہ غور کر حد تھی اور یقین جانیں نساء

گئی آئیں کریم کیوں میں ڈال رہی تھی۔ آواز پر پلٹی
اسے ہانیہ نے مخاطب کیا تھا۔
”ہو ہانیہ۔“ اس نے مسکرا کر کہا تو ہانیہ چلتی ہوئی
اندر آگئی۔

”گرمی ہے ناں۔؟“ ہانیہ نے پہلا تبصرہ یہی کیا
تھا۔ مہر النساء کو ہنسی آئی۔
”ظاہر ہے۔۔۔ بچن میں ٹھنڈک کہاں سے آئی۔۔۔“
”ہوں۔۔۔“ اچانک سے تنویر شاہ اندر آیا تھا اور
مہر النساء کی ہنسی کو چبھتی نظروں سے دیکھ کر ہنکارا بھرا۔
ہانیہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔

”کیسی ہو تم۔؟“ وہ کچھ استہزائیہ انداز میں بولا
تھا۔ مہر النساء نے مہارت سے نظر انداز کیا۔
”الحمد للہ۔۔۔ ہمیشہ جیسی۔۔۔“ وہ بشارت سے بولی۔
مہر النساء محسوس کر رہی تھی ہانیہ چپ سی ہو گئی تھی
اور یہ حیرت کی بات تھی۔

”لگ رہا ہے۔۔۔ ویسے یہ لڑکا کون ہے۔۔۔ شیر
صاحب۔۔۔ لگتا ہے تمہارے سجدے رائیگاں نہیں
گئے۔“ وہ قبقرہ مار کر ہنسا تھا۔ مہر النساء سکون سے
برداشت کر گئی۔ اصل وجہ سامنے آگئی تھی۔ وہ
مہر النساء کو جلن محسوس کرانے کے چکر میں خود حسد کا
شکار ہو رہا تھا۔ وہ مزید کیا کرتی سو خاموش رہی۔

”ہانیہ لو آئیں کریم۔“ ہانیہ خالی خالی نظروں سے
اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ کس اندر حسین تھی اور
مہر النساء۔۔۔ پھر بھی اس کے فیاسی کو قرار نہیں تھا۔ کیا
یہ کافی نہیں تھا کہ وہ ایک بہترین لڑکی کے ساتھ تھا۔
وہ کیوں کھینچتا تھا اس کی طرف۔۔۔ بھلے سے جلانے کے
لیے ہی، مگر آخر کب تک۔۔۔ وہ تو ٹھکرائی نہیں گئی پھر
بھی مہر النساء سبقت لے گئی۔ ہانیہ سوچے جا رہی
تھی۔

”میں نے کچھ پوچھا ہے۔۔۔“
”میرے سجدے اس لیے نہیں ہوتے مسٹر
تنویر۔ اور اس بارے میں میں آپ کو کچھ بولنے کی
اجازت نہیں دوں گی۔“ وہ کچھ سرد مری سے جھڑک
گئی تھی۔ تنویر شاہ نے طنزیہ سر جھٹکا۔

”اور میری پہلی بات کا جواب۔۔۔؟“
”مہر النساء۔۔۔ دادو بلار ہی ہیں۔ کہاں ہو۔۔۔“
سیرٹھیوں سے اتر کر صحن میں آکر اطلاع دیتی آواز شیر
اور ولی کی تھی۔ وہ آواز پتا چن کی طرف آیا۔ دادو
اس کی برجوشی پر مسکرائی تھیں۔ باقی سب کے ساتھ
ایا کی حیرانی بھی جائز تھی۔

”مہر النساء تم یہاں ہو۔۔۔“ وہ چپکتی آنکھوں سے
مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ تنویر شاہ کو اس کی بے تکلفی
بہت کھلی۔

”اسے دیکھ کر مہر النساء کے لبوں پر اپنائیت بھری
مسکراہٹ آئی تھی۔ تنویر شاہ کی سلگتی نگاہیں ان ہی پر
جبی تھیں۔

”ارے بار آؤ ناں۔۔۔“ وہ شاید کچھ زیادہ ہی خوش
تھا۔ اندازہ مشکل نہیں تھا۔

”شیر رکھ۔۔۔ میں یہ۔۔۔“ اس نے رُے میں رکھ
کیوں کی جانب اشارہ کیا۔ شیر نے سمجھ کر سر ہلایا۔
”اوہ اچھا۔۔۔ چلو پھر۔“ ایک رُے وہ خود اٹھاتا ہا ہر
نکل گیا۔ تنویر بے یقینی سے دروازے کو دیکھ رہا تھا۔
جہاں سے وہ گئے تھے۔

”یہ کچھ زیادہ ہی فری ہو رہا ہے۔۔۔“
”تنویر تو کیا فرق پڑتا ہے۔۔۔ وہ شاید پسند کرتا ہو مہر
کو۔ ہمیں۔۔۔“ ہانیہ کی آواز میں کوفت تھی۔ بے
زاری تھی۔

”ہانیہ شٹ اپ۔۔۔ وہ کیسے پسند کر سکتا ہے اس
کو۔ اسے کیا لڑکیوں کی کمی ہوگی اور اسے دیکھو اس کی
آنکھوں میں پچھتاوے کیوں نہیں۔۔۔ جو ہونے
چاہیے تھے۔“ وہ جھنجھلاہٹ اور اس سے کہیں بڑھ کر
ناگواری سے بولا تھا۔ ہانیہ نے دانت پیس لیے۔
(مہر النساء۔)

”یہ سب بے کار ہے۔۔۔ تم پہلے بھی دیکھ چکے ہو
اسے پروا نہیں۔۔۔“ ہانیہ نے جلیبی پر تیل چھڑک دیا۔
سلگ کر وہ کچھ کہتے کہتے ضبط کر گیا۔ وہ دونوں واپس
اندر آ رہے تھے۔

”تم لوگ باہر نہیں آئے۔“ ہانیہ کے چہرے پر

بے زاری دیکھ کر وہ پوچھ گئی۔ باقی بچی آئس کریم وہ
فریج میں ڈالنے لگی۔

”ہاں کچھ پوچھا تھا تم سے۔ سوچا اس کا جواب
شاید باہر نہ دے سکوں۔“ لفظ چبا چبا کر سننے پر شیر نے
چونک کر اس پر کشش پر سنائی والے شخص کو دیکھا۔
جانے کیوں اسے حیرت سی ہوئی تھی اس انداز پر۔
مہر النساء کے چہرے پر سایہ گزر گیا۔

”تویر چلیں۔“ ہانیہ حلق میں پھنسی آواز سے
بولی۔ مہر النساء نے محسوس کیا وہ خود کو نظر انداز کرتا
دیکھ کر گھل رہی تھی۔ وہ ہاتھ صاف کرتی ہوئی قریب
آئی۔

”شیر میرا دوست ہے تویر۔ اور مجھے باہر کیا کسی
کے سامنے بھی یہ بتانے میں عار محسوس کرنے کی
چنداں ضرورت نہیں۔“ وہ تویر شاہ کی آنکھوں میں
دیکھتی ہوئی کہہ رہی تھی۔ اور سکون سے کہہ رہی
تھی۔ شیر پہلے چونکا۔ پھر سادگی سے مسکرایا۔

”تم لوگ یہاں آئے میں تم لوگوں کا احترام کرتی
ہوں۔ مگر کچھ فرائض مہمانوں کے بھی ہوتے ہیں کہ
وہ اپنی حد کر اس نہ کریں۔ میں اس وقت کوئی کھانی
نہیں چاہتی۔ تویر شاہ ہانیہ بہت پیاری لڑکی ہے۔
تمہارے معیار سے بھی اونچی اس کی قدر کرنا سیکھو اور
جو کانہ حرکتوں کو چھوڑ دو۔ مجھے تم میں ذرا دلچسپی نہیں
ہم سے۔ یقیناً“ اضطراب میں تم خود ہو۔ جو لوگ
دوسروں کو نیچا دکھانے میں لگے رہتے ہیں ان کی زندگی
سے سارا سکون خود بخود روٹھ جاتا ہے۔ میرے دل
میں حسد ڈالنے کی کوشش ترک کر دو۔ جن لوگوں
کے دل پانی کے جیسے شفاف ہوں۔ وہاں آگ نہیں لگا
کرتی۔

اس نے تھل کی انتہا کر دی۔ شیر اور ہانیہ مہر النساء کا
چہرہ دیکھ رہے تھے اور تویر شاہ کے چہرے کی رنگت
متغیر ہو چکی تھی۔ اسے اس سے اس جواب کی ہرگز توقع
نہیں تھی۔ وہ تکلیف محسوس کر رہا تھا۔ بہت اور
بے حسد شیر اور مہر النساء باہر نکل گئے تو سپاٹ
چہرے کی نگاہیں زمین پر بکھرتی رہیں۔ اس گھر سے

بیارے بچوں کے لئے

قصص الانبیاء



تمام انبیاء علیہ السلام کے بارے میں مشتمل
ایک ایسی خوبصورت کتاب جسے آپ
اپنے بچوں کو پڑھانا چاہیں گے۔

کتاب کے ساتھ دست نمہ پیشکش
ڈاکٹر دست نمہ پیشکش۔

قیمت -/300 روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے پر ڈاک خرچ -/50 روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

جاتے وقت اس نے اپنے شک کو یقین میں بدلتا دیکھا۔
 ”مہر النساء! کل بانیہ اور میں شادی کی شاپنگ
 کرنے جائیں گے۔ تمہیں کچھ لینا ہے تو ہمارے
 ساتھ چلو۔“ تنویر شاہ نے شیر کو بغور دیکھا تھا۔ جس
 نے کسی کے بھی جواب سے پہلے کہا۔

”نہیں ایک چوٹی۔ یہ میرے ساتھ جائے گی۔“
 آخر کا شکریہ۔“ شیر نے خوش اخلاقی سے جواب دیا تو
 وہ بنا تاثرات نوٹ کیے فوراً سے پیسٹر گھر سے نکل گیا
 تھا۔



شیر مہر النساء کو شاپنگ کروانے آیا تھا۔
 ”نساء تمہیں چوڑیاں نہیں پہنیں مجھے چوڑیاں
 اچھی لگتی ہیں۔“ اس نے دھیمی سی آواز میں
 سرگوشی سی کی۔ مہر النساء نے کسی کی شرارت پر ہنستے
 ہنستے جواب دیا۔

”وہ ہوں۔ چوڑیاں میرے لیے ابالاتے ہیں۔“
 ”اور مندی؟“ حنا کی خوشبو ہوا کے رتھ پر سوار
 اس کے ارد گرد بکھرنے لگی۔ خوشبو کی رتھ سے نکلتی
 روشنیاں اس کی سمت لپکنے لگیں۔

”مندی لگو الو۔ وہ دیکھو وہ خاتون بہت پیاری
 مندی لگا رہی ہے۔“ وہ ہلکا سا مہر النساء کی سمت جھک
 کر ایک طرف اشارہ کر رہا تھا۔ مہر النساء نے اسی جانب
 نگاہیں گھمایں۔ وقت کی آنکھوں میں ایک مکمل سی
 تصویر بکھرنے لگی تھی۔ بازار سے اونچا اور اونچا۔ شور
 بلند ہو رہا تھا۔ نساء نے ذرا سانس دیکھا۔ پھر انکار کی
 ہمت خود میں ختم ہوتی پائی۔ مسکرا کر اس نے سر ہلا
 دیا۔ اس کی خواہش کو منظوری دے دی۔ محبت
 زاووں نے محبت زدہ لہو بلند کیا اور اس صدا نے دور
 تک کا سفر کر کے منزل کو پایا۔ وہ ہتھیلی سامنے کیے
 مسکرا رہی تھی۔ شیر اسے دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا۔
 نساء کی ہتھیلی سے ابھری نمی پر حنا کی لکیریں تیزی سے
 پھسلتی جا رہی تھیں۔

”مہر النساء آج تم اپنے سارے غم بھلا دو۔“ شیر نے

اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”تم مجھے سنا رہے ہو۔؟ میں تو غم زدہ نہیں
 ہوں۔“ وہ بھنویں اچکا کر پوچھنے لگی۔ شیر نے سر
 ہلایا۔

”نہیں ہو، مگر خوش ہونے سے بھی تو کتراتا
 ہوتا۔ دوسروں کے بد صورت رویوں سے خود پر
 خوشی کے دروازے بند کر لینا سب سے بڑی غلطی
 ہے۔“ وہ اسے کیا سمجھانا چاہ رہا تھا۔ وہ سمجھ کر
 نظر انداز کر گئی۔ مہر النساء اب اپنی تکلیف دہ کہانی کی
 ایکلی گواہ نہیں رہی تھی۔

”دادو کتنی ہیں ٹھکرائے جانے کا خوف جتنا بھی
 دماغ کو اکٹوپس کی مانند جکڑ لے نا۔ تب بھی ایک نا
 ایک دن محبت اپنی جگہ بنا ہی لیتی ہے۔“ وہ نرمی سے
 اسے بتا رہا تھا۔ اور مہر النساء کو اپنا دل جانے یوں ڈوبتا
 محسوس ہوا۔ وہ ڈوبا سمجھانا بھول گئی تھی۔

”تم بہت اچھی ہونساء۔ کچھ لوگ ہماری زندگی
 میں نہ رہیں تو اس کلیہ مطلب ہرگز نہ نکالو کہ ہم ان
 کے قابل نہیں تھے۔ بلکہ یہ سوچو کہ اللہ کو ہمارا ساتھ
 قبول نہیں تھا اور اس نے یقیناً ”کچھ تو سوچ ہی رکھا
 ہو گا اور۔“

”اور۔؟“ مہر النساء نے گہری نیند میں سوال کیا
 تھا۔ وہ کتنا مثبت سوچتا تھا اور وہ کبھی ایسا سوچ نہیں سکتی
 تھی۔

”اور میں۔۔۔ مہر النساء میں۔۔۔“ وہ گرم جوشی سے
 کچھ بولتے ہوئے رک گیا۔ مہر النساء بھی رک کر بے
 چین نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ”ایک منٹ۔۔۔
 جسٹ دن منٹ۔۔۔“ وہ اس کے کندھے کو چھو کر کہتا
 ہوا ایک شاپ کی طرف بھاگا۔

مہر النساء اسے سڑک پار جاتا دیکھتی رہی۔ وہ شاید
 کچھ لینے گیا تھا۔ جانے کیا۔۔۔ مہر النساء ٹرائس کی
 کیفیت میں تھی اور مجسمہ بنی کھڑی تھی۔ سڑک پر
 رش معمول سے بڑھ رہا تھا۔ تاریکی میں گاڑیوں کے
 بارن کا شور سماعتیں پھاڑنے جیسا تھا۔ بہت دور سے
 کچھ لڑکے تیز اسپید میں بائیک ڈرائیو کرتے مخالف

پیارے بچوں کے لئے
صلی اللہ
علیہ وسلم
سیرۃ نبوی



حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے بارے میں مشتمل
ایک ایسی خوبصورت کتاب جسے آپ
خود بھی پڑھنا چاہیں گے اور
اپنے بچوں کو پڑھانا چاہیں گے۔

ہر کتاب کے ساتھ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ
کا شجرہ و مفت حاصل کریں۔

قیمت - 250/- روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے پر ڈاک خرچ - 50/- روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

سمت سے آ رہے تھے۔ مہر النساء کا دھیان اس طرف
نہیں تھا۔ وہ سامنے شیشوں والی شاپ کو نکلے جا رہی
تھی۔ بایںک رفتار مزید تیز ہوئی اور مہر النساء کے
قریب آنے پر شرارت سے لڑکوں نے بایںک کو جھٹکے
مارنے چاہے۔ ایک بایںک اس حرکت پر بے قابو
ہوئی۔ سامنے سے کار بستی آ رہی تھی اور درمیان میں
مہر النساء شاپ سے باہر نکلتے شیر نے نظر میں اٹھا کر
اسے ڈھونڈا تھا اور۔ بایںک پھسلے ہوئے کاری سیدھ
میں گئی اور بایںک سے ٹکرانے سے بچنے کی کوشش
میں گاڑی ڈرائیو کرتے شخص نے تیزی سے موڑ کاٹا
تھا۔ شیر نے رک کر چلانا چاہا مگر۔ کاری زد میں آئی
مہر النساء دھکا کھا کر گری۔ سر کا پھیلا حصہ جانے کس
نوک دار چیز سے ٹکرایا تھا خون کی پتلی سی دھار پھواری
مانند نکلی تھی۔ شیر کے ہاتھ سے ڈبا کر۔ مہر النساء
زمین پر پڑی کر رہی تھی۔ اور خون۔

”مہر النساء۔“ وہ وہیں سے چیخا۔ بہت سے سر
اس کی طرف گھومے تھے۔ وہ ہواؤں پر قدم رکھ کر
مہر النساء تک پہنچا تھا۔

”نساء۔“ اس کا سر اٹھاتے ہوئے وہ دیوانہ وار پکار
کر بولا تھا۔ آنکھوں میں باضی کی کرچیاں ریزہ ریزہ
ہو کر آنکھوں میں سما رہی تھی۔ خون سے شیر کے
ہاتھ بھیک گئے۔ وہ شہر رسا دیکھ رہا تھا۔ مہر النساء
نڈھال پڑی تھی اور وہ زور پڑ رہا تھا۔

”خون دیکھ کر مجھ پر وحشت سوار ہو جاتی ہے۔“
بو جھل پڑتی آنکھوں کے ساتھ مہر النساء کو یاد آیا تھا۔
اس نے شیر کو پکارنا چاہا۔ مگر شیر کا دماغ سائیں
سائیں کر رہا تھا۔

”شیر اسپتال مت لے جاؤ۔ مجھ سے بات
کرو۔“ مٹی کی آواز اس کے بہت پاس گونجی تھی۔
شیر کی آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہو گئے۔

”مہر النساء کیا ہو رہا ہے تمہیں۔ مجھے دیکھو۔ پلیز
آنکھیں بند مت کرو۔ مجھے سنو نساء۔ پلیز مجھے آواز
دو۔“ وہ واقعی خون دیکھ کر سن ہو جاتا ہو گا۔ مہر النساء
کو یقین آ گیا۔ وہ پوری ہمت جمع کر کے آنکھوں سے

دھند پرے دھکیل رہی تھی۔ شیر پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

”شیر میری زندگی بس اتنی تھی۔ تم خوش رہنا۔“ مٹی کی آواز میں جیسے مہر النساء کہہ رہی تھی۔ وہ ہاتھ سے خون روکنا دیا نہ ہو رہا تھا۔

”مہر النساء مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔ ہر اہم موقعے نے مجھ سے کچھ نہ کچھ چھینا ہے۔ میں نہیں نہیں کھو سکتا۔ مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔ مجھے زندہ رہنے دو مت مارو۔“ مہر النساء کا چہرہ آنسو سے بھیک رہا تھا اور وہ معصوم بچے کی طرح ہلکے ہلکے کر رہا تھا۔ بہت سے لوگوں نے۔ بلکہ سب نے اسے حوصلہ دینا چاہا۔ مگر مٹی بلیا کی کراہیں۔ ٹوٹی سانسیں۔ مہر النساء کا درد سے بے حال وجود۔ اس کا دلیغ مآؤف ہو رہا تھا۔ مہر النساء کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ پھر کھل رہی تھیں۔ شیر کے لیے۔ صرف شیر کے لیے!

”شیر۔ میں ٹھیک ہوں۔ سنبھالو۔ ش۔“

مہر النساء آواز دے رہی تھی۔ شیر نے دیکھا وہ باری نہیں تھی وہ زندہ تھی۔ محبت کو بھی کبھی کسی نے مرتے دیکھا ہے؟ ہاں محبت نے اپنے وجود کو پایا تھا۔ خوف کی جگہ محبت نے لی۔ محبت وجود میں آئی۔ شیر کی زندگی ایک جملے میں سمٹ گئی۔

”شیر میں ٹھیک ہوں۔“ تو شیر نے سنبھال لیا خود کو۔ مہر النساء کے لیے۔ محبت سے خوف کھاتی لڑکی کے لیے!



دھوپ سے بھری فٹ ہاتھ پر زندگی رواں تھی۔ رخصت ہوتے جون کی ایک گرم جھمک چمکدار صبح طلوع تھی۔ ساکت کھڑے درختوں پر سناٹے اترے ہوئے تھے۔ پہاڑی کوے اور گہرے سبز لباس میں طوطے اکیلے ہی آسمان کی سیر کو نکلے ہوئے تھے۔ خاکستری چڑیاں شاخوں پر اداس بیٹھی تھیں۔ ہوائے اوڑھے سوتی تھی۔ مہر النساء تیز قدموں سے چلتی چلتی ایک دم

رک گئی۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی زردی تھی۔ کچھ فاصلے پر شیر کھڑا تھا۔ مگر پرندے نیچے نہیں اتر رہے تھے۔ اس کے لبوں پر دھیرے دھیرے مسکراہٹ اتر آئی تھی۔

”مہر النساء۔“ چپ پر شیر نے بنا مڑے اسے پکارا۔ یہ پکار جیسے درختوں کے سروں تک گئی تھی۔ مہر النساء نے دیکھا پرندے ہڑبڑائے تھے۔ پھر جیسے نام کو پل بھر پہچان گئے۔ درختوں کا سکوت ایک دم سہم کر زمین پر اوندھے منہ گرا تھا۔ اگلے لمحے اس کے ساتھ ریلے کی صورت بستے ہوئے اس کے ارد گرد اتر رہے تھے۔ محور ہوتی مہر النساء کی ساری تھکن پل بھر میں اڑ گئی تھی۔ شیر محفوظ ہوتے انداز میں اسے دیکھے جا رہا تھا۔

”یہ مجھ سے دوستی نہیں کرنا چاہتے۔ میرے ہوتے ہوئے بھی یہ تمہاری لیے اداس بیٹھے تھے۔ دانہ لینے بھی نہیں اترے۔ تم لیٹ کیوں آئیں مہر النساء۔“ شیر نے محبت سے اس کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے سوال کیا تھا۔ مہر النساء کے سر پر پیٹی لگی تھی۔ جو ہر اٹھاتے قدم پر درد کنی تھی۔

”ہاں آرام کرنے کی ضد کر رہے تھے۔“

”کیا بہت پریشان تھے؟“ مہر النساء نے شہزاد سے چھڑا۔

”تم سے کہ۔“

”تم مجھے شرمندہ کرنا چاہتی ہو تو ناکام رہو گی۔“

شیر نے ہنس کر کہا تھا۔ مہر النساء نے دیکھا اس کی آنکھوں کو۔ جورات بھر جا گا لگ رہا تھا یا شاید رویا۔ مگر جھائے چہرے کے باوجود وہ دل سے خوش ہو رہا تھا۔

”پھر بھی تمہیں سب کے سامنے ایسے۔“ وہ لب دبا کر خاموش ہوئی۔ پرندے ان کے قدموں کے پاس چل قدمی کر رہے تھے۔ آوازیں بکھر رہی تھیں۔

”میں جن کو عزیز رکھتا ہوں انہیں کھونے کا قصور بھی نہیں کر سکتا مہر النساء۔ ساری رات میں تمہارے ہوش میں آنے کی دعائیں کرتا رہا۔“ وہ احسان جتاتے ہوئے افسوس کر رہا تھا۔ مہر النساء نے

تفکر سے خود کو اسے دیکھتے پایا۔

”کچھ لوگ ہماری زندگی میں بہت خاص ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو بھی انتظار کے سفر پر نہیں چلانا چاہیے۔ انہیں خالی ہاتھ واپس نہیں لوٹانا چاہیے۔“ نیل کنٹھ اس کو سرگوشی میں کہہ رہے تھے۔ بونوں نے سنا تو مڑ کر تائید کرنے لگیں۔

”تم مجھے کل کچھ دینے والے تھے۔“ وہ ایک لذت ہر بوجھ سے آزاد ہو کر کہہ گئی۔ شیر رک کر اسے دیکھنے لگا۔

”کیا اب دوں۔؟“

”ہاں۔“ اس نے شیر کی آنکھوں میں جگنو جاگتے دیکھ لیے۔

”نہیں میں اب نہیں جاؤں گا۔ تم کبھی بھی مجھے آواز دے کر رک جانے کا نہیں کہیں۔ میں پھر بھی تمہیں اکیلا چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔“ وہ شاید خوف زدہ تھا اور سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ مہر النساء نے اس کا ہر خوف چن لینے کا فیصلہ کر لیا۔ شیر اس کا حق بھی رکھتا تھا۔

”شیر۔ تمہیں یاد ہے مجھے خوشبو دینے کا وعدہ کیا تھا تم نے۔“ اس نے آواز دی۔ شیر کی حسرت پوری ہو گئی تھی۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اپنی مہر النساء۔ اور داد کا شیر۔ پرندے ان کے گرد اچھل کود کر رہے تھے۔

”مہر النساء۔ میں تمہیں پھول دے سکتا ہوں۔“ وہ جگمگاتے چہرے سے کہہ رہا تھا۔ آنکھیں پر رونق۔ چمک سے بھری۔ مہر النساء کو پانا کیا اتنی خوشی کی بات بھی ہوگی۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

”پھول توڑنا منع ہے۔“

”دل توڑنا بھی۔“ سنہری کریمیں شاخوں سے گزر کر ان پر پڑیں۔ دونوں کو لندن کر رہی تھیں۔ زندگی مسکرا رہی تھی۔ زندگی مبارک ہو شیر کہہ رہا تھا۔

”نساء۔ زندگی مبارک۔“ نساء کے دوست کہہ

رہے تھے۔

”محبت مبارک۔“ پرندوں کے شور میں مہر النساء پر خدا ہوا شیر وقت کو گواہ بنا کر عہد کر رہا تھا۔ ”میں تمہاری زندگی کو خوشبو سے مرکا دینے کا وعدہ کرتا ہوں۔ مہر النساء۔ اور مہر النساء کو بغیر عہد کے بھی اس پر یقین تھا۔ خود سے بڑھ کر تھا۔ موقع کے پھول اسے چھو کر گزر رہے تھے۔ سبز نیل سرخ پھول برسا رہی تھی۔ سنہری پانیوں جیسی دھوپ سے بھری فٹ پاتھ پر زندگی رواں تھی۔ اور ایک زندگی یہاں تھی۔ ”محبت ہم سفر بن کر اس دن کو یادگار بنا رہی تھی۔ دو خاص لوگوں کے ایک خاص جذبے کے لیے۔“



خواتین ڈائجسٹ

ی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ماہی

مست کدوگر

فوزیہ یاسمین

قیمت - 750 روپے

37235021

میں اور کچھ کی ایک تہ نکالو

عباد گیلانی بلڈ کیئر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہے۔ وہ اپنی بیوی مومنہ کو طلاق دے کر اسے بیٹے حازم کو اپنے پاس رکھ لیتا ہے اور دوسری شادی عاظمہ سے کر لیتا ہے۔ حازم اپنی ماں عاظمہ اور بھائی بابر کے ساتھ اچھی زندگی گزار رہا ہوتا ہے، مگر اپنے چچا عباد گیلانی کی بیماری کی وجہ سے فکر مند رہتا ہے۔ جب کہ عاظمہ اور بابر اپنی سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ عباد گیلانی کو اپنی بیماری میں احساس ہوا ہے کہ اس نے حازم کی ماں مومنہ کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ عباد گیلانی مومنہ کے باپ یاد علی کو بلاتا ہے اور اپنی غلطیوں کی معافی مانگتا ہے اور حازم کو خاص طور سے اس کے نانا یاد علی سے ملواتا ہے، مگر حازم اپنے نانا سے مل کر اچھے تاثرات کا اظہار نہیں کرتا، مگر بعد میں اپنے باپ کی خواہش پر ان کے ساتھ اپنے نانا کے گھر جاتا ہے اور اپنی ماں مومنہ سے ملتا ہے۔ ماں سے مل کے تمام شکوے بھول جاتا ہے اور اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کے باپ نے اس کی ماں کے ساتھ زیادتی کی ہے۔

حوریہ مومنہ کی بیٹی تھی، بے حد محبت کرتی ہے اور مومنہ بھی اسے بے تحاشا چاہتی ہے، حازم جب حوریہ کو دیکھتا ہے تو اس کے دل میں حوریہ کے لیے پسندیدگی کے جذبات ابھرتے ہیں اور یہ ہی حال حوریہ کا بھی ہوتا ہے۔ عباد گیلانی حوریہ سے مل کر بہت خوش ہوتا ہے کیونکہ حوریہ میں اسے مومنہ کا عکس نظر آتا ہے اور حازم سے پوچھ کر اس کے نانا یاد علی سے دونوں کی شادی کی بات کرنا ہے۔

حوریہ اپنی دوست فضا سے بہت محبت کرتی ہے، فضا کی ایک امیر زادے سے دوستی ہے اور وہ گھروالوں سے چھپ کر اس سے ملتی ہے۔ حوریہ کو اس بات سے اختلاف ہے، وہ فضا کو بہت سمجھاتی ہے کہ اس راستے پر نہ چلے، مگر فضا نہ مانی اور آخر کار ایک دن محبت کے نام پر بربادی اپنی قسمت میں لکھوائیتی ہے اور اس بات کا پتا اس کی سوتیلی ماں جہاں آرا کو چل جاتا ہے اور وہ اپنے بھانجے نصیر سے اس کی شادی کرنے کا پروگرام بنالیتی ہے جبکہ فضا اس پر راضی نہیں ہوتی حوریہ کو جب پتا چلتا ہے تو وہ فضا کو سمجھاتی ہے اس امیر زادے کو کہے کہ وہ اس سے شادی کرے اور فضا اس کو مجبور کرتی ہے کہ یہ بات



وہ خود اس کو سمجھائے اور فضا کے مجبور کرنے پر جب وہ باہر سے ملتی ہے تو اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہر ناک سے باہر ہے
ہر گز نہیں ملنا چاہیے تھا اور اس بات پہ بھی افسوس ہوتا ہے کہ اس نے ایک غلط لڑکی کو دوست بنایا۔۔۔ (اب آگے)

ایکویں قسط



”ویری اسٹیرج۔ تم یہاں..... کہیں دھوکا تو نہیں کھا رہیں آنکھیں۔“

باہر اپنی حیرت سمیٹ کر خاصی خوش گواریت کے ساتھ فضا سے کہہ رہا تھا۔

فضا نے ایک ہلکی سی سانس پھینچی اور شولڈر بیگ کندھے سے اتار کر درمیانی تپائی..... پر رکھتے ہوئے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

”تمہیں برا تو نہیں لگا میرا یہاں آنا؟“

”ارے نہیں نہیں..... آؤ بیٹھو۔ بلکہ خوشی ہوئی۔“

”میں دراصل..... یہاں.....“ فضا وضاحت دیتے ہوئے ذرا سا ہچکچا گئی۔

”تم سے اس روز ملنے کے بعد میں نے بہت کوشش کی۔ تم سے کانٹیکٹ کروں مگر کوئی کانٹیکٹ نمبر بھی نہیں

تھا۔“ وہ ایک کشادہ اور گداز صوفے پر بیٹھ گئی۔

”پتا نہیں مجھے یہاں آنا چاہیے تھا یا نہیں۔ میں نے غلط کیا یا ٹھیک..... بس یہ ہے کہ اس روز ریسٹورنٹ

کے باہر ہماری مختصر ملاقات نے مجھے بہت ڈسٹرب کر دیا تھا۔“

”اوہ.....“ باہر ہلکی سی متاسفانہ سانس پھینچ کر رہ گیا پھر معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔ ”سوری۔ مجھے نہیں علم

تھا کہ تم میرڈ ہو اور میری وجہ سے تمہاری لائف میں پر اہم آجائیں گے۔ کیا تمہارا شو ہر!“

”ارے نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں۔“ فضا اس کا مطلب جان کر مسکرا دی۔ ”پھر وضاحت دیتے ہوئے

بولی۔ ”میرے پریزنٹ کے تو علم میں ہی نہیں ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے نظریں چرائیں۔ ”میں ان فیکٹ۔

پریشان اس لیے تھی کہ اس روز میں نے تم کو بہت ہرٹ کر دیا تھا مجھے تمہارے جانے کے بعد بہت افسوس ہوا کہ

مجھے تم سے اتنا روڈ لی (سختی سے) بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔“

”نہیں فضا۔ میں یہی رویہ ڈیز رو کرتا تھا۔“ باہر کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ گم ہو گئی۔ وہ صوفے کے ہتھ

پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

”میں نے تمہاری زندگی میں جو ہر گھولا اس کا احساس میرے اندر کانٹے کی طرح کھب کر رہ گیا ہے۔ بس

میں یہ کاٹنا کانٹے کی کوشش کر رہا تھا۔

دولت چب ایک کمزور نفس اور کم ایمان انسان کے پاس ہو تو پھر ایسے ہی افسوس ناک حادثے جنم لیتے

ہیں۔ اخلاق کا قتل ہو جاتا ہے..... میں بھی گمراہ ہو گیا تھا۔“

کمرے میں ایک مغموم سی فضا طاری گئی تھی۔ فضا کم صم سی ہو کر رہ گئی تھی۔

”میں نے بہت کچھ کھو کر زندگی کو سمجھا ہے۔ اور جب سمجھ آئی تو نفع و نقصان کا اندازہ لگا تو پتا چلا فقط

نقصان ہی نقصان اٹھایا ہے۔ کچھ نہیں پایا۔ سوائے کھونے کے۔ اعتبار رشتے، محبتیں..... سب کچھ کھویا میں

نے..... ایک خود رو جنگل آگ آیا میرے اطراف..... نفرتوں کا..... اور میں اس بنجر جنگل میں محبت کا پودا لگانے

کے جتن کر رہا ہوں۔ تو۔“ وہ ہلکے سے ہنس دیا۔ جیسے خود پر ہنس رہا ہوں۔ ”خیر تم ساؤ۔ بیلومی۔ (یقین کرنا

میرا) تمہیں یہاں دیکھ کر بہت اچھا لگا۔“

اس نے یکدم سر کو خفیف سی جنبش دے کر اس افسردہ ماحول سے خود کو نکالا۔ پھر کمرے میں داخل ہوئے

امیر علی سے بولا۔

”امیر علی یہ میری بہت خاص الخاص مہمان ہیں۔ ان کے لیے کچھ زبردست قسم کے کھانے کا اہتمام کرنا

بھی۔“ امیر علی نے فضا پر ایک نظر ڈال کر سر ہلا دیا۔

”علی شاہ کہاں چلا گیا۔“ باہر کا دھماکا دم علی شاہ کی طرف گیا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

”وہ تو اپنی داکر بھگاتا پھر رہا ہے باہر لانی میں جی۔“

”ارے۔ اسے اس طرح بھاگنے دوڑنے مت دو امیر علی۔ ابھی اس کا ذخم کچا ہے۔ اسے یہاں لے آؤ میرے پاس۔“

”جی بہتر۔“ امیر علی کمرے سے نکل گیا۔ باہر امیر علی کے جانے کے بعد فضا کی جانب متوجہ ہوا جو بالکل خاموش تھی۔ عجیب سے احساسات سے دوچار تھی۔ باہر کے اپنی طرف متوجہ ہونے پر ہلکے سے مسکراتے ہوئے بولی۔

”بہت پیارا گھر ہے تمہارا اور بہت بڑا بھی۔“ اس کے لہجے میں حقیقی ستائش تھی۔ جواباً باہر ہنکارا بھر کر ڈرائنگ روم کا طائرانہ جائزہ لیا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی بھلنے لگی۔

”پتا ہے کیا فضا! سکون اور خوشی حاصل کرنے کے لیے بڑے بڑے پرائسز گھر حاصل کرنا ضروری نہیں ہوتا۔ یہ ہمارے اندر ہوتا ہے۔ ہمارے اپنے ہی کردار اور رویوں سے جنم لیتا ہے۔“

”ہاں اس بات کی سمجھ مجھے آ تو تھی دیر سے ہی سہی۔“ فضا ہلکے سے بولی پھر کمرے میں داخل ہوتے امیر علی کی طرف اس کی ساری توجہ مبذول ہو گئی۔ اس کی گود میں ہمسکا بچہ باہر کی گود میں آنے کو چلتا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک بار پھر استفسار سا رہا ہوا تھا۔

یہ بچہ اس نے حور یہ کی گود میں دیکھا تھا۔ ہاں یقیناً یہ علی شاہ ہی تھا اسے بالکل بھی غلط فہمی نہیں ہو رہی تھی کہ یہ بچہ حور یہ کا ہے۔

باہر نے کسی قیمتی ستارے کی طرح اس بچے کو خود سے چمٹا لیا تھا اور بچہ بھی اس کے چوڑے سینے سے لگ کر بے حد مطمئن اور خوش دکھائی دینے لگا تھا۔ اس کی شہدریگ آنکھیں کندن کی طرح دک رہی تھیں۔

”دس از مائی سن۔ مائی پرنس۔“ باہر کے لہجے میں پیار کا دریا بہ رہا تھا۔

”تمہارا بیٹا؟“ فضا کے چہرے سے حیرت بھل گئی۔

”ہوں۔ کہہ سکتی ہو۔“ وہ ہم انداز سے مسکرایا۔ پھر ہنس دیا۔ ”الجبھاؤ مت خود کو۔ یہ میرا بھتیجا ہے۔ میرے بھائی حازم کا بیٹا۔“ اب کے فضا کے لیے یہ حیرت کا شدید حملہ ہی تھا۔ وہ میکا کی انداز میں صوفے سے اٹھی تھی۔ مگر کچھ کہنے کی خواہش میں لب فقط کھل کر رہ گئے۔ دوسرے بل وہ آہستگی سے صوفے پر بیٹھ گئی۔

”ہاں۔ یہ حازم اور حور یہ کا بیٹا ہے۔ حازم کی ڈیڑھ ہونچکی ہے۔ اور اب میں اس کا گارڈین ہوں۔“ باہر اس کے ننھے ننھے گداز ہتھیلیوں کو اپنے لبوں سے لگا کر چومتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ فضا کے لیے یہ انکشاف خاصا اعصاب شکن تھا گویا پتھر پڑا تھا کسی شیشے پر۔ اور ایک زوردار چھٹکا ہوا تھا۔ مگر صرف فضا کے دل کی سطح پر۔ اس کی نظریں جوں کی توں باہر پر جمی رہ گئیں۔

انفار چونیٹی (بد قسمتی) حور یہ کی شادی کے سال بھر بعد حازم کی ڈیڑھ ہونچکی تھی۔ ”پھر فضا کے چہرے کی طرف دیکھ کر چوتھے ہوئے بولا۔ تمہارے علم میں یہ باتیں نہیں ہیں کیا؟ تم الجھ گئی ہو۔“

”ہاں۔ میں صرف اتنا جانتی تھی کہ حور یہ کے ہزینڈ کی ڈیڑھ ہونچکی ہے مگر مجھے علم نہیں تھا کہ حازم تمہارا بھائی ہے، فضا حیرت کو سمیٹ کر با مشکل بولی۔ پھر ایک بل آنکھیں میچ کر کھولیں۔ اس پے در پے چٹکوں کے فشار سے وہ خود کو نکال پاتی تھی۔ یہی اس کے لیے بہت

تھا۔ تاہم وہ ایک اضطراب کا شکار دکھائی دے رہی تھی۔

”میرا خیال ہے مجھے اب چلنا چاہیے۔“ یک دم شولڈر بیگ درمیانی میز سے اٹھاتے ہوئے بولی۔

”ارے۔ اتنی جلدی بیٹھو ابھی حوریہ سے مل کر جانا۔“ بابر جلدی سے بولا۔ پھر اندر داخل ہوتے امیر علی سے بولا۔

”امیر علی! حوریہ بی بی سے کہوان کی بیسٹ فرینڈ آئی ہیں۔ ان سے ملنے۔“
”نہیں میرا خیال ہے میں اب چلوں گی۔ انکو ملنے کی بجائے میرے پاس آکر بیٹھوں گی۔“
”میرا تو خیال تھا تم یہ سب جان کر مجس کا شکار ہو جاؤ گی اور مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دو گی۔“ بابر بھی صوفے سے اٹھتے ہوئے بولا۔

”میرا تو خیال تھا تم یہ سب جان کر مجس کا شکار ہو جاؤ گی اور مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دو گی۔“ بابر بھی صوفے سے اٹھتے ہوئے بولا۔
”حیرت ہی اتنی زیادہ تھی کہ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کچھ پوچھوں۔“ پھر ہلکے سے ہنس دی۔ ”اب کچھ الجھن ہی نہیں رہی۔ سب کچھ واضح ہو گیا۔“ وہ بھی نہ چاہتے ہوئے اسے جتا گئی۔ بابر نے اسے دیکھا، پھر ہلکی سانس کھینچ کر بولا۔
”تم حوریہ کی شادی میں شامل نہ تھیں، ورنہ یہ بات اسی روز واضح ہو جاتی۔“
”کیا فرق پڑتا ہے۔ پہلے ہوئی یا اب ہو گئی۔“ پھر کسی احساس سے نکلنے ہوئے لہجے میں نرم تاثر سموتے ہوئے بولی۔

”میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے بابر۔ اور یہ ہی کہنے یہاں تک آئی تھی اور میرا خیال ہے یہ ہماری آخری ملاقات ہو گی۔“ وہ پارکنگ میں کھڑی اپنی گاڑی تک آتے ہوئے بولی۔
”کیوں؟ کیا میری شادی میں نہیں آؤ گی۔“ فضا چلتے چلتے یک دم یوں رک گئی جیسے یہ میں ٹھوکر لگی ہو اور آہستگی سے اس کی جانب گھوی۔

”شادی..... اچھا کب..... کب کر رہے ہو شادی..... کس سے کر رہے ہو۔“ اس کے لہجے میں تجسس تھا۔ بابر کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اس کی آنکھوں میں پل بھر جیسے کوئی دیپ جل کر بجھ سا گیا تھا۔

”کب ہو رہی ہے یا کس سے؟ یہ نہیں پوچھو، یہ پوچھو کہ کس سے کرنا چاہتا ہوں۔“
”اوہ..... یہ بھی تم ہی بتا دو۔“ وہ دونوں گاڑی کے نزدیک آ کر رک گئیں۔

بابر کی نظریں بے اختیار لان کے داہنے طرف نظر آتے میز کی جانب گئیں۔ پھر پلٹ آئیں۔ اس نے حوریہ کو میز پر کھڑے پلٹ کر اندر کی جانب جاتا دیکھ لیا تھا۔ وہ بھی غالباً ان دونوں کو دیکھ چکی تھی۔

”بتا بھی دو اب سسپنس میت پھیلاؤ۔ کس سے شادی خانہ آبادی کرنا چاہتے ہو۔“ لہا بے حد مضطرب دکھائی دے رہی تھی۔

بابر نے نہایت اطمینان سے اس کے لیے گاڑی کا بیک ڈور کھولا اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے دھیرے سے بولا ”حوریہ سے۔“

فضا کا سا راجو دایک لمحے کو پھر سا ہو گیا تھا۔

”دعا کرنا..... میں یہ مہم سر کر لوں۔ تمہاری یہ فرینڈ تو مان کے نہیں دے رہی ہے۔“ وہ آہستگی سے پیچھے ہٹا اور فضا کو گاڑی میں بیٹھنے کے لیے راستہ دیا۔

”فضا جیسے کسی ٹرانس سے باہر نکلی۔ اس نے باہر پر یوں نگاہ ڈالی جیسے اسے باہر کی دماغی حالت پر شک ہو رہا ہو۔

”او کے سی یو اگین۔“ (او کے پھر ملیں گے) باہر سر کو خم دے کر مسکرایا۔ فضا گاڑی کی سیٹ پر آہستگی سے بیٹھ گئی اور خوش ناروش کی طرف جاتے باہر پر ایک نظر ڈال کر رہ گئی۔ وہ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ کیا حوریہ بھی اس سے شادی کرے گی۔ وہ راضی نہیں ہے یا مان کر نہیں دے رہی ہے تو..... وہ کیسے شادی کر سکتا ہے اس سے۔ گاڑی آہستہ رومی سے آگے بڑھ گئی، مگر اس کا دھیان پیچھے ہی رہ گیا۔

”کیا حوریہ مان جائے گی۔“

کیا باہر کے جذبے صادق ہیں۔“

وہ خود کو عجیب احساس میں جکڑا ہوا محسوس کرنے لگی۔

☆☆☆

حوریہ کھانے کی میز پر آئی تو نفیسہ اس کے آگے کھانے کے لوازمات رکھتے ہوئے بولی۔

”آپ سو رہی تھیں شاید..... اس لیے میں نے دروازہ زیادہ بجایا نہیں۔ آپ کی کوئی مہمان آئی تھیں۔ باہر صاحب آپ کو بلارہے تھے۔“

”وہ مہمان میری نہیں باہر صاحب کی ہی تھیں۔“ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی اور پلیٹ پر رکھائیں اٹھایا۔

”وہ مہمان..... ہم دونوں کی مشترکہ تھی۔“ باہر کی آواز پشت سے ابھری۔ اس کا حرکت کرتا ہاتھ ایک پل کے لیے رک گیا۔ ”فضا تمہاری بھی بہت اچھی فرینڈ ہے۔“ وہ اس کے مقابل کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور آستین فولڈ کرتے ہوئے میز پر موجود لوازمات پر نظریں دوڑانے لگا۔ جیسے اپنے کیے ہوئے جملے پر اس کے ردعمل اور تاثرات کو جاننے کی ضرورت نہ ہو۔

”وہ گیلانی ہاؤس“ میں تم سے ملنے آئی تھی، مجھ سے نہیں۔“ اس کے لہجے میں بے نام سی پیش تھی۔ باہر نے ہنسیوں اچکائی۔

”اسی کی لگن تھی، اس نے تمہیں ڈھونڈ لیا۔“

”واٹ۔“ باہر کے اعصاب پر اس کا جملہ کسی پتھر کی طرح کھٹ سے لگا تھا۔ جیسے واکمن کے تنے ہوئے تاروں پر کھٹ سے کوئی بے سرائتہ ماروے۔ سارے تار جھنسا اٹھے ہوں۔ ”لگن سے تمہارا کیا مطلب ہے۔“

”وہی جو لگن کا مطلب ہوتا ہے۔“ وہ اطمینان سے بولی۔

”وہ اس سینس میں نہیں آئی تھی۔“ باہر کا لہجہ دفاعی تھا۔

”وہ جس سینس میں بھی آئی تھی، میں تو اس کی کجی لگن کو سراہ رہی ہوں۔“ باہر اس کا باریک بینی سے جائزہ لیتے ہوئے ایک دم ہنس پڑا۔ اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھر گئی۔

”تم کہیں اس کے آنے سے اور مجھ سے ملنے سے ڈسٹرب تو نہیں ہو گئیں، آئی مین کہ جلیس تو نہیں ہو رہی ہو، کوئی رقیبانہ جذبہ وغیرہ وغیرہ۔“

”ایکسکوز می! میرے لیے اس کا آنا اور تم سے ملنا ملنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔“

”تمہارے چہرے کے ایکسپریژن سے تو لگتا ہے یہ بات سیدھی تمہارے دل پر جا کر لگی ہے۔“

”میرا خیال ہے تمہارے پاس فضول سوچنے کے لیے فضول وقت بہت ہے۔“ وہ نیپکن سے ہاتھ پونٹے ہوئے کرسی سے اٹھ گئی۔

”ارے ارے سٹ ڈاؤن (بیٹھو) پلیز..... اطمینان سے کھانا کھا لو۔ میں تو یوں ہی تمہیں چھیڑ رہا تھا۔“
 ”یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہمارے درمیان ایسا کوئی رشتہ نہیں ہے۔“ وہ ناراضی سے کہتی دوبارہ بیٹھ گئی۔
 ”رشتہ تو ہے نا۔ نفرت کا ہی سہی۔“ وہ جواباً ہلکے سے ہنسا۔
 ”ضروری ہے ہمارا جب بھی سامنا ہو، ہم اسی طرح کے ٹاپک پر بات کریں۔“ وہ اس پر ملاحتی نگاہ ڈال کر رہ گئی۔

”سوری.....“ بائریک دم بخیدہ ہو گیا۔ اس کے لبوں پر کھلنے والی خوش گوار مسکراہٹ یکفخت گم ہو گئی۔
 ”تم ٹھیک کہتی ہو۔ ہمارے بیچ بے ارادہ اس طرح کی باتیں ہو جاتی ہیں اور میں تمہیں ہرٹ کر دیتا ہوں۔
 حالانکہ میں تمہیں بہت خوش دیکھنا چاہتا ہوں حوریہ۔“
 حوریہ بے اختیار لب دانتوں میں دبا کر نظریں چرا گئی۔ ایک لمحے اس کا دل چاہا وہ کہہ دے۔ ”خوش دیکھنا چاہتے ہو تو میری زندگی سے نکل جاؤ۔“ مگر وہ چاہنے کے باوجود نہ کہہ سکی۔ بائریک کہہ رہا تھا۔
 ”میں آج بہت خوش ہوں۔“ پھر چوتھتے ہوئے ابرو اچکا کر حوریہ کی آنکھوں والی نگاہ پر وضاحتی لہجے میں جلدی سے بولا۔

”فضا کے یہاں آنے سے نہیں بلکہ اس کے مجھے معاف کر دینے سے۔ حالانکہ میں شاید اس قابل نہیں تھا۔“

”ہاں..... معاف کر دینے کا حوصلہ کسی میں ہی ہوتا ہے۔ فضا کا ظرف بہت بڑا ہے۔“ وہ بولی، بائریک اس کے لہجے میں جتانے والا تاثر محسوس ہوا۔ وہ ایک گہری سانس بھر کر اس کے چہرے پر ایک نگاہ ڈال کر کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا۔

”میں فضا کا احسان عمر بھر یاد رکھوں گا۔“ وہ آہستگی سے بولا۔ ”غلطیاں انسان سے ہی ہوتی ہیں۔ فرشتگی کا دعوٰی تو۔ یہاں کوئی تھی نہیں کر سکتا۔“ اس کے لہجے میں کچھ تھا۔ حوریہ نے سر اٹھا دیا، مگر وہ یہ کہہ پلٹ گیا تھا۔ اس کی نظریں اس کی پشت پر ٹھہر گئیں۔ ایک بے نام سا بوجھل احساس دل کو چھوتا ہوا گزر گیا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔
 ”کچھ لوگ پیاز کے چھلکوں کی طرح پرت پرت اترتے ہیں، مگر کچھ لوگوں کا ظاہر باطن لحوں میں ہی واضح ہو جاتا ہے۔ بائریک ان ہی لوگوں میں تھا۔ وہ برا تھا تو اس کی ہر برائی ظاہر تھی۔ اس نے بھی خود کو اچھا بنا کر پیش کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اور اب اچھا بن رہا تھا، تب بھی خود ظاہر نہیں کر رہا تھا کہ وہ اچھا بننے کی کوشش میں ہے۔ عجیب بندہ تھا۔ ہر بار اسے جھنجھوڑ کر پراگندہ کر کے چلا جاتا تھا۔“ اس کا دل کھانے سے یکفخت اچاٹ ہو گیا تھا۔ وہ میز سے اٹھ گئی۔

☆☆☆

فضا کی بے چینی نصیر سے مخفی نہیں تھی۔ رات اس نے فضا کا ہاتھ پکڑ کر اپنے مد مقابل کھڑا کر دیا۔ فضا گڑ بڑا گئی۔
 ”کیا ہوا؟“

”یہ ہی تو میں پوچھ رہا ہوں کیا ہوا ہے؟“ جواباً نصیر نے اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ ”کیا پریشانی ہے تمہیں، کون سی سوچ تمہیں پریشان کر رہی ہے۔“ اس نے اس کے ہاتھ سے گرفت ہٹالی اور بیڈ پر جا کر بیٹھ گیا۔
 ”ایسا لگتا ہے میں تمہیں خوش رکھنے میں ناکام ہو گیا ہوں۔“ اس کا لہجہ پست تھا۔ فضا نے تعجب سے اس کی

طرف دیکھا، مگر وہ اس کی طرف نہیں دوسری طرف رخ کیے اپنا موبائل اٹھا کر اس میں مصروف تھا۔ ”میں تمہیں حال میں خوش اور مستقبل میں ممکن دیکھنا چاہتا تھا، مگر تم شاید اب بھی ماضی میں سانس لے رہی ہو۔“ یہ پہلا شتر تھا جو نصیر کی طرف سے اسے لگا۔ وہ گھبرا گئی۔

”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔“

”میں شاید تمہارے قابل نہیں تھا۔“ وہ خود آزاری کی کیفیت میں آ گیا۔ ”ٹھیک ہی ہے جو تعلق دل سے جڑا نہ ہو، وہاں محبت پیدا نہیں ہو سکتی۔ زبردستی کے رشتے عمر بھر سمجھوتے پر چلتے ہیں۔“

”آپ غلط سمجھ رہے ہیں نصیر۔“ فضا تڑپ گئی اور اس کے نزدیک آ کر بیٹھ گئی۔ میں ایسا کچھ نہیں سوچ رہی۔ نہ پریشان ہوں۔“ وہ اس کے پیروں پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ نصیر نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

”تم کل کہاں گئی تھیں گاڑی لے کر۔“ پہلی بار اس کی کھوج کر رہا تھا، اسے جانچتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ فضا نے رخ سے اسے دیکھا۔

”بے اعتبار ہو رہے ہیں آپ۔“

”اعتبار نہ ہوتا تو تمہیں یوں تنہا جانے نہیں دیتا۔ سو سو سوال اٹھاتا۔ مگر ایسا لگتا ہے تم مجھے اس طرح کے سوال اٹھانے پر مجبور کر رہی ہو۔ دیکھو فضا میں ایک سیدھا سادہ بندہ ہوں، روزی کمانا، اپنے بال بچوں کو خوش رکھنا اور اپنی تمام تر محبت اور توجہ ان کو دینا۔ بس یہ میرا نقطہ نظر ہے اور طریقہ زندگی رہا ہے۔ میں زندگی کو بہت سادہ سے انداز میں دیکھتا ہوں۔ یہ نہیں ہے کہ کچھ سمجھتا نہیں ہوں۔ مگر بے کار کے سوال جواب اور الجھنوں میں گھر کر زندگی کی کچی خوشیوں سے محروم نہیں ہونا چاہتا۔ میں نظر انداز کرنے کے مقولے پر عمل کرتا ہوں۔ جہاں تک ہو سکے ایک دوسرے کی خامیوں اور غلطیوں کو نظر انداز کر دو۔ ہمارے پیش امام صاحب حدیثیں سناتے رہتے ہیں ہمیں، کہ اپنے ملازموں کو بھی ستر بار معاف کیا کرو۔ تو پھر بیویوں کے لیے دل تنگ کیسے ہو سکتے ہیں۔ مگر اب سوچ رہا ہوں کہ ہر بار مردہ غلطی نہیں ہوتا۔“ اس نے آہستگی سے پیرسمیٹ کر موبائل ایک طرف رکھ کر بیڈ کراؤن سے ٹیک لگالی۔ اس کے لہجے میں اتاری سرد مہری فضا کے دل کو کاٹ کر رہ گئی۔

وہ اس کے نزدیک آ گئی اور بے اختیار اس کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ”اس کا یہ عمل اس قدر اچانک اور شدید تھا کہ نصیر ہڑبڑا کر رہ گیا۔

”آپ کے اعتبار نے ہی تو مجھے زندگی کی طرف کھینچا ہے نصیر، آپ کی عظمت روز بروز میرے دل میں بڑھتی جا رہی ہے۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”میرا مطلب تمہیں رلاتا نہیں تھا فضا۔“ وہ پریشان ہو کر بولا اور اسے کندھے سے تھام کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ ”بس یوں ہی وہم سا ہونے لگا کہ تم میرے ہمراہ خوش نہیں ہو۔ اچھا چلو..... چپ ہو جاؤ۔“ وہ اسے بہلانے لگا۔ فضا نے فرط جذبات سے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے لبوں سے لگایا اور چومتے ہوئے بولی۔

”آپ ایک عظیم انسان ہیں نصیر۔ میرے دل میں آپ کی عزت اور عظمت کئی گنا بڑھ گئی ہے۔“ وہ اسے عقیدت مندانہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”میں واقعی پریشان تھی، بہت زیادہ، میں سوچ رہی تھی کہ معاف کر دینا کتنا مشکل کام ہے۔ ہم زبان سے یہ الفاظ ادا تو کر دیتے ہیں، مگر دل کے کسی گوشے میں اپنے جرم کے اس کے جرم کے احساس کو مٹاتے نہیں ہیں۔ اسے سنبھال کر رکھتے ہیں، کسی تنہائی کی طرح۔ آپ جتنا بڑا دل کسی کسی کا ہوتا ہے نصیر! آپ جیسا انسان بہت خوش نصیب والی کو ملتا ہے۔“ وہ ممنونیت سے کبھی ایک بار پھر اس کے سینے سے لگ کر کب کا دبا دھواں نکالنے

گئی۔

”آپ کا یہ غلوں بھر احصار..... یہ مضبوط ڈھال میرے گرد نہ ہوتی تو میری منزل جانے کہاں ہوتی اور ہوتی بھی پانہیں..... بس بھٹکتی رہتی۔ وعدہ کریں مجھے اپنے اس حصار میں تا عمر قید رہیں گے۔ اپنی پناہوں میں چھپائے رہیں گے۔ آپ ہی میری منزل ہیں۔ مجھے بھٹکنے نہ دیں گے۔ بہت کمزور ہوں میں، بہت کمزور۔“

”کیا ہو گیا ہے فضا..... کیوں اس طرح کی باتیں کر رہی ہو۔“ نصیر کے بازوؤں کا حلقہ اس کے گرد بٹک ہو گیا۔ ”کوئی خوف ہے، کوئی دوسو سے ہیں تو انہیں دل سے نکال دو۔ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ تمہیں کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ تم میرے بچوں کی ماں ہو۔ میرے گھر کی چار دیواری ہو۔ جس میں آ کر میں سکون محسوس کرتا ہوں۔“ وہ اسے نبت سے دلا سا دے رہا تھا۔ اسے تسلی دے رہا تھا۔

”حور یہ سے ملنے گئی تھیں نا!“ وہ پوچھنے لگا۔ فضا نے اذیت سے لب بھینچ لیے اور آنسوؤں سے بھری آنکھیں جھپک کر سر ہلا دیا۔ اس کا دل پھر اس اذیت سے دوچار ہونے لگا، جسے وہ مسلسل تھکیاں دے کر سلا رہی تھی۔ اسے اپنا آپ نصیر کے آگے لے کر حد پست اور تہ محسوس ہونے لگا۔

”بس اب تم حور یہ سے نہیں ملو گی۔ تم ماضی کا ہر دروازہ بند کر دو گی۔ ہر کھڑکی پر تالا لگا دو گی۔ تمہیں پلٹ کر نہیں دیکھنا فضا۔ یوں سمجھو تم کسی کو نہیں جانتیں۔ بس مجھے، اپنے گھر کو اور اپنے بچوں کے علاوہ۔ بولو، اپنا کر دو گی۔“ وہ زنی سے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے کر اسے دیکھنے لگا، پھر اس کے رخساروں پر آئی بالوں کی لٹوں کو زنی سے کانٹوں کے پیچھے کیا۔

”جب یادیں خوش گوار نہ ہوں تو پلٹ کر نہیں دیکھتے۔ حال میں تمہیں کوئی تکلیف ہے، کوئی نا آسودگی ہے تو مجھے بتاؤ۔ مجھ سے سیر کر دو۔“

”نہیں..... بالکل بھی نہیں۔“ وہ تڑپ گئی۔ ”آپ ٹھیک کہتے ہیں مجھے ماضی میں نہیں دیکھنا چاہیے۔ بس آخری بار گئی تھی۔ سوچا جو تھوڑا بہت بوجھ ہے۔ وہ بھی اتار کر آ جاؤں۔ کوئی قرض نہ رہ جائے۔“ اس نے تھک کر اس کے کندھے پر سر ڈال دیا اور آنکھیں موند لیں۔

”اب تو حور یہ سے تعلق ختم کرنا ہی پڑے گا۔ اتنا حوصلہ نہیں ہے کہ ہر بار..... اس سے مل کر خود کو آزمائش میں ڈالوں۔“ نفس کی لگائے تھا سہ رکھنا۔ آسان تو نہیں ہوتا۔“ وہ سوچ کر رہ گئی۔

نصیر کی قربت اسے سکون بخشنے لگی۔ وہ آہستہ آہستہ سنبھلنے لگی۔ شاید آنسوؤں کا غبار نکال کر وہ پرسکون ہو گئی تھی۔

اس نے سوچا اچھا ہی ہوا آج نصیر نے اسے چھیڑ دیا اور وہ سارا غبار نکل گیا۔ باہر سے مل کر آنے کے بعد اس کے کمزور نفس نے پھر سے اسے بے سکونی میں ڈھیل دیا تھا۔ وہ شیطان کے جال میں پھنس کر پھر سے کمزور پڑنے لگی تھی۔ ماضی کی یادوں میں بٹک جاتی۔ پھر گمراہ ہو جاتی۔ نصیر کے غلوں اور اس کی بڑائی نے اسے اس شکل سے نکال دیا تھا۔ شیطان کے جال کو کاٹ دیا تھا۔ وہ سونے لگی۔

کاش..... ہر مرد نصیر کی طرح گرد زرد کرنے والا۔ کیفیات کو سمجھنے والا ہو جائے۔ ہر شوہر اپنی بیوی کو ستر ہار معاف کرنے والا بن جائے تو نور کتنی محفوظ اور کتنی آسودہ ہو جائے۔ کتنی عورتیں باغیانہ سوچوں اور گمراہ کن خیالات سے بچ جائیں۔ محفوظ ہو جائیں۔ ایسا سچا سا بھی ہی تو عورت کی چھت ہے۔ اس کا مان ہے۔ اس کے وجود کو ڈھانپ لینے والی چادر ہے۔

☆☆☆

عالم نے اچانک ہی پکنک کا پروگرام بنا ڈالا۔ باہر کو راضی کر لیا اور حور یہ کو بھی بے صبر اصرار ساتھ لے جا لے۔

لگیں۔

”علی شاہ کا زخم بھی بالکل ٹھیک ہو گیا ہے۔ وہ خوش ہو جائے گا اور یوں بھی ایک عرصہ ہو گیا۔ اپنی فیملی کے ساتھ اس طرح کے پروگرامز بنائے۔“ عاقلہ کی خواہش پر حوریہ انکار نہ کر سکی۔ اس کا خیال تھا وہ سب لاٹک ڈرائیو پر چلیں گے، مگر باری سائڈ لے آیا تھا۔

پرشور..... لاٹا تنہی سمندر کا ٹھاٹھیں مارنا پانی، حوریہ کی ساری توجہ اپنی جانب کھینچ گیا۔ کئی بیٹے منظر لہروں کی طرح اس کی آنکھوں کے سمندر میں اٹھنے لگے۔

حازم کا ہاتھ تھامے وہ کئی بار ان ساحلوں پر نئے پیر چلی تھی۔ بے اختیار ہی اس کی نظریں ساحل کی نرم گیلی ریت پر گردش کرنے لگیں۔ اس کے پیروں کے نقش کو تلاش کرنے لگیں۔ اسے لگا وہ اس کے پاس کھڑا ہو۔

”کم آن حازم.....“ دیکھیں کتنا خوب صورت لگ رہا ہے سمندر۔ اسے نزدیک سے دیکھتے ہیں۔“ وہ حازم کا ہاتھ کھینچنے لگی۔ ”ٹھنڈی ٹھنڈی لہریں ہمارے پیروں سے لپٹنے کو مچل رہی ہیں، آئیں نا۔“ وہ بھی لہروں کی طرح چلنے لگی تھی۔

”پاکل لڑکی! دیکھ نہیں رہیں، کتنا تیز ہے پانی۔“ اسے آگے بڑھتے دیکھ کر حازم نے اسے پکڑ کر اپنی جانب کھینچ لیا تھا۔ ”وہ لہرا کر اس سے آگلی۔

”تیز لہروں سے کھیلنے ہیں کبھی۔“ اس کا لہجہ دھیمہ تھا۔

”تیز لہروں سے کھیلنے کا ہی تو مزہ ہے۔“ وہ ہنسی۔

”آ..... چھا..... میری محبت کے سمندر میں اترتے ہوئے تو ڈر جاتی ہو۔ کہتی ہو طوفانی محبت ہے آپ کی۔“

”ذوب تو چکی ہوں۔“ وہ شرمیلیں پلکیں اوپر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”اور پار لگنے کی خواہش بھی نہیں۔“

”حازم نے اب واپس آ کر اسے دیکھا، پھر کوئی شرارت کرنی چاہی کہ وہ اس کی گرفت سے نکل گئی اور دور جا کر ساحل پر اٹھنی لہروں کو پیروں سے اچھالتے ہوئے مسکرانے لگی۔

آہ..... اس نے ایک گہری سانس کھینچ کر ایک پل کے لیے آنکھیں میچ لیں۔

کس طرح ختم کر سکتے ہیں تم کو یاد کرنا
کریم کو صرف محسوس کرنے سے ہم دنیا بھول جاتے ہیں

یہ ہی سمندر..... یہ ہی ساحل، مگر..... آج سب کتنا اجنبی اجنبی لگ رہا تھا۔ لہریں جیسے ماتم کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ ہر شے نا مانوس اور اجنبی محسوس ہو رہی تھی۔

”ساحل پر کھڑے ہو کر سمندر کی گہرائی ٹاپ رہی ہو کیا؟“ بابر کی آواز ابھری۔ وہ اس کی پشت کی طرف جانے کب سے کھڑا ہوا تھا۔ وہ اپنی سوچوں میں غرق تھی۔ اس کی غیر متوقع موجودگی پر اس کے بدن میں خفیف سا ارتعاش ہوا تھا۔ وہ ٹھنک گئی۔ مگر چہرہ ادا پر اٹھا کر پاپلٹ کر اس کی طرف دیکھنے پانی۔

ساحل سے کیا جان سکو گے
دریا کتنا گہرا ہے

وہ اپنی ٹراؤزر کے گیلے پانچے نیچے کرتا ہوا اس کے سامنے آ گیا۔

”گہرائی کا اندازہ ہے اسی لیے تو..... دور بیٹھ کر دیکھ رہی ہوں۔“

”یہاں سے گہرائی کا اندازہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا۔“ وہ اس کے سامنے آ گیا۔ اس کے لبوں کی تراش میں

مہم ہی مسکراہٹ تھی۔ ”اس کے لیے تو گہرائی میں اترتا پڑتا ہے۔“

حوریہ نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا اور مٹی ہاتھ سے جھاڑتی کھڑی ہو گئی۔ ایک پر شور لہران دونوں کے پیروں پر آ کر دم توڑ کر ریت میں جذب ہونے لگی۔

”بھئی ڈوب کر دیکھو۔ ہر گہرائی، موت کا پیغام نہیں ہوتی۔“ حوریہ کا دل سینے کی دیوار میں سکڑ کر پھیلا تھا۔ وہ نظریں اس کی طرف سے ہٹا گئی۔ بلیک پینٹ اور نیلی ٹی شرٹ میں وہ دھوپ کا چشمہ پیشانی پر ٹکائے اسے یک ٹک دیکھ رہا تھا۔

ایک پل اسے لگا یہ نظریں باہر کی نہیں، حازم کی ہیں۔ اس کے سامنے باہر نہیں حازم کھڑا ہے۔ اس روز اس نے بھی تو وہی ڈریس پہنا تھا۔ بلیک پینٹ اور نیلی ٹی شرٹ۔ پیشانی پر دھوپ کا چشمہ ٹکائے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اسے نگلی باندھے دیکھتے ہوئے کھہر ہاتھا۔

”میری محبت کے سمندر میں اتر کر تو دیکھو ڈیئر۔ ڈوب کر ابھرنے کی خواہش ختم ہو جائے گی۔“

”اف!“ وہ یکدم بے اختیاری کے جال سے نکل آئی اور اڑتے بالوں کو ہاتھ سے سمیٹتے ہوئے بولی۔

”میں ذرا علی شاہ کو دکھانوں۔ آئی کو ٹنگ کر رہا ہوگا۔“ وہ پلٹنے لگی۔ باہر ہلکے سے ہنکار ابھر کر پلٹ کر شور مچاتی لہروں کی جانب بڑھ گیا۔ حوریہ یک دم کسی خیال سے چونک کر اسی طرف مڑی۔

”سنو۔“ وہ اس کا ارادہ جان کر اسے پکار بیٹھی۔ ”زیادہ آگے مت جانا۔ پانی بہت تیز ہے۔“ باہر کدے اور رخ موڑنے پر وہ بولی۔ باہر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ متفکر سی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی نظریں اونچی اونچی لہروں کی جانب تھی۔ ”آج تو پانی بہت چڑھا ہوا ہے۔“ ایک حیرت آمیز خوش گواریت باہر کے دل کو چھو گئی۔ وہ ان لہروں پر نگاہ ڈال کر جیسے جھرجھری سی لے کر رہ گئی تھی۔

”مزا تو اسی تیزی میں ہے۔“ چیلنج کرتا ہوا۔ وہ ہلکے سے ہنس دیا اور آگے بڑھنے لگا کہ وہ گھبرا کر بے اختیار اس کا بازو پکڑ گئی۔

”پاگل ہو گئے ہو کیا۔ ذرا دیکھو لہروں کو کتنی اونچی اونچی ہیں۔“ ادھر باہر کو اپنا پورا جسم دل۔ بن کر دھڑکتا محسوس ہونے لگا اور دل خون بن کر گویا رنگوں میں دوڑنے لگا تھا۔ رگ رگ میں ہيجان پر رہا ہو گیا تھا۔

”اگر ڈوبنے کی خواہش ہو تو!“ وہ بے اختیاری کی لپیٹ میں آ گیا۔ وہ اس کے اتنے نزدیک تھی اس کا دھوپ کی تمازت سے سرخ ہوتا چہرہ، اس کی شہد رنگ آنکھیں جن میں ڈوب کر ابھرنے کی خواہش معدوم ہو جاتی ہے۔ اس کے لمس کی پیش۔ وہ کھڑے کھڑے کسی اور جہان میں پھلا گیا تھا۔

”ساحل منزل نہیں ہے میری۔ یہ ٹھنڈی ٹھنڈی موجیں تو نفسی اور بڑھادی ہیں۔“ باہر کا لہجہ دھیمہ اور سرسراتا ہوا تھا وہ اس کی طرف جھکا کھہر ہاتھا۔ حوریہ نے جھٹکے سے اس کا بازو چھوڑ دیا تھا اور پیچھے ہٹی تھی۔ باہر بھی اس سحر سے نکل آیا اور ہلکے سے ہنس کر بولا۔

”تم بھی کبھی یاد کرو گی کہ تھا کوئی نادان عشق کے سمندر میں ڈوب گیا تھا..... کیا خیال ہے کتنے رلکھ دو گی نا۔ ایک نامراد عاشق جو عشق کی گہرائیاں نا پتے نا پتے شہید ہو گیا۔“ وہ گیلی لکڑی کی طرح سسکی تھی اور سسکتی نظر اس پر ڈال کر پلٹ کر وہاں سے بھاگتی ہوئی چلی گئی۔

باہر نے اسے پکارنا چاہا، مگر پھر لب پہنچ گیا اور سر کو خفیف سا جھٹکا دیا اور پلٹ کر سمندر کی طرف بڑھ گیا۔ کچھ دور جا کر کڑاؤ زری جیبوں میں ہاتھ پھنسا کر اپنی نظریں پہاڑ بنائی لہروں پر جمادیں۔

واپسی کا سفر بڑی خامشی سے طے ہو رہا تھا گاڑی میں غیر معمولی خامشی عاظمہ کو بھی محسوس ہوئی۔ تاہم وہ علی شاہ کے ساتھ ہلکی پھلکی شرارت میں مصروف رہیں..... باہر کی نظریں وڈا اسکرین پر جبی ٹھیں گویا وہ گاڑی میں

کسی کی موجودگی سے بے نیاز ہو، مگر اس کے ذہن و دل میں ایک انتشار برپا تھا۔

تیرے حسن کی ہے جو دلکشی
تیرے لب کے جو یہ گلاب ہیں
میرے خواب ہیں میری زندگی
تیرے ساتھ ہیں جو یہ واہمہ
کئی دوسرے ہیں عذاب میں
میں جو آرزو کے سفر میں ہوں
نہ نظر میں ہوں نہ سفر میں ہوں
کئے نظر کس طرح یہ سفر میرا
میں ہوں منزلوں سے پرے کہیں

گاڑی آہستہ روی سے گیلانی ہاؤس کے پارنگ ایریا میں آ کر رک گئی تھی۔

میں ہوں منزلوں سے پرے کہیں
کسی دشت میں کسی درد میں
تیری راہ کی اڑی گرد میں
مجھے بخش دو وہ کرامتیں
جو ہیں منتظر، میرے خواب کی
تجھے جو آرزو ہے وصال کی
مجھے اپنے کل کی خبر کہاں
مجھے فکر ہے تیرے حال کی
تیرے حسن کو نہ کہن ملے
یہ دعا ہے دست سوال کی

اس نے چہرے کا رخ موڑ کر دیکھا۔ عاظمہ اتر چکی تھیں حوریہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اترنے لگی کہ باہر نے اس کی اٹھتی نظروں کو اپنی نگاہوں کی گرفت میں لیتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

”بھی نفرت کی یہ دیوار گرا کر دیکھنا۔ اس کے پیچھے محبت کا ایک سمندر موجزن ہے۔“

وہ غیر محسوس طور پر چونک گئی۔ وہ اپنے کہے ہوئے جملے پر اس کے تاثرات جانچ رہا تھا۔ نظریں ملتے ہی اس نے اپنی پلکوں کا جال گرا دیا تھا یہ اور بات کہ اس لمحاتی تصادم نے دونوں کے دل پر انتشار برپا کیا گیا۔ حوریہ کا دل بے بسی اور بے اختیاری سے چٹخا تھا باہر کا دل فطری خواہشوں کے تلاطم سے گزرا تھا۔ وہ کسی قسم کا رد عمل ظاہر کیے بنا چپ چاپ گاڑی سے اتر کر پلٹ گئی تھی..... عجیب سرد دھری چپ تھی..... شاید خود آزاری کی کوئی کیفیت تھی۔

☆☆☆

مومنہ تاشتے کے بعد یاد علی کے پاس بہت دیر تک بیٹھی رہی۔ یاد علی آدھے سے زیادہ وقت بس حوریہ کے متعلق ہی باتیں کرتے رہے۔ اس کی فکر میں کھلتے رہے۔

”وہ خوش تو ہے نا وہاں..... اسے کہو وہ مجھے معاف کر دے۔“
 ”وہ آپ سے ناراض کب ہے بھلا اور معافی کا کیا سوال.....“

وہ مجھ سے بات نہیں کر رہی ہے کتنے دن ہو گئے ہیں اسے یہاں سے گئے۔ پلٹ کر نہیں آئی، نہ فون کیا ہے اس نے۔ وہ روٹھ گئی ہے مومنہ۔“

ایسی بات نہیں ہے اباجی..... دراصل وہ مصروف ہے عاظمہ کی بھانجی کی شادی بھی ہے نا اس میں مصروف ہو گئی ہوگی۔“ مومنہ کا لہجہ تسلی دیتا ہوا تھا۔

”اچھا چلو خوش ہے اس کا دل لگ گیا ہے تو اچھی بات ہے۔“ یادر علی کے بار لیش چہرے پر ایک سکون اترنے لگا۔ پھر چوکتے ہوئے بولے۔

”بابر سے بات ہوئی تمہاری۔“

”نہیں۔“ مومنہ ہلکے سے سانس بھر کر سرفی میں ہلایا۔

”کیا کہو گی اسے..... اس نے تم سے کہا تھا ناں۔ تم حوریہ کو سمجھاؤ گی اور سچ تو یہ ہے مومنہ کہ مجھے بابر میں بظاہر کوئی خامی نظر نہیں آتی۔ عباد کے بعد تو وہ بہت بدل گیا ہے۔ خاصا ذمہ دار اور سنجیدہ ہو گیا ہے۔ مذہب کی طرف بھی اس کا رجحان ہو رہا ہے اور پھر سب سے بڑی بات وہ علی شاہ کے لیے تخلص دکھائی دیتا ہے۔“

مومنہ نے ان کے پاس سے اٹھ کر صوفے پر بکھرے کفن ترتیب سے رکھتے ہوئے سر اثبات میں ہلادیا۔ ”یہ تو ہے۔“
 ”علی شاہ کا سگا بچا ہونے کے ناطے اس کی انیسیت فطری بات ہے۔ حوریہ کو ہر پہلو پر سوچنا چاہیے۔ اتنی پہاڑ جتنی زندگی بھلا اکیلے کٹ سکتی ہے۔“

”میں اسے سمجھا ہی ہوں تو وہ برامان جاتی ہے۔“ وہ رنج سے بولی پھر سوچنے لگی کہ ”بابر بھی تو کہیں کہیں غلط ہے۔ بھلا محبت زور جبر سے حاصل ہو سکتی ہے۔“

”تمہاری بات ہو تو اس سے میرا ذکر ضرور کرنا اور ہاں بابر سے بھی کہنا کہ یادر علی یاد کر رہے ہیں اسے۔“
 اس نے آنا ہی چھوڑ دیا ہے۔“

”رقیہ بھابھی بتا رہی تھیں وہ آیا تھا، مگر آپ سو رہے تھے۔ وہ پلٹ گیا۔“ مومنہ چائے کے خالی برتن سمیٹ کر رے میں رکھ کر کمرے سے نکلتے ہوئے بولی۔

”اچھا.....“ یادر علی کو افسوس ہونے لگا۔ ”مجھے جگا ہی دیا ہوتا۔ چلو خیر..... اسے کہہ دینا وہ ضرور آئے میرے پاس..... اس کے آنے سے عجیب سا سکون ملتا ہے۔ حازم کی کمی کا جو خلا ہے وہ پر سا ہونے لگتا ہے۔“
 یادر علی نے بیچ تکیے کے نیچے سے نکالی اور تکیے پر سر ڈال دیا۔

”وہ تو پوری کائنات تھا۔ اس کی کمی کا جو خلا ہے وہ کہاں پورا ہو سکتا ہے۔“ مومنہ دل میں سوچ کر رہ گئی۔
 ”رشتوں کی اہمیت کا احساس اکثر ان کے جدا ہو جانے کے بعد ہوتا ہے درخت کٹ جاتا ہے تو دھوپ

آگن کو گھیر لیتی ہے تب درخت کی اہمیت کا احساس ہونے لگتا ہے شدت سے۔“ وہ افسردگی کے سحر میں تھے۔
 ان کی نظریں چھت پر مرکوز تھیں۔ مومنہ خامشی سے کمرے سے باہر آ گئی۔

کوئی ابر اڑے کسی قلم سے
 اور بڑے میرے دیرانے پر
 کوئی کڑھتا ہو، کوئی جلتا ہو
 میرے دیر سے واپس آنے پر
 کوئی بیٹھے میرے پہلو میں

کوئی ہاتھ دھرے میرے شانے پر
کوئی دبے دبے لہجے میں کہے
تم نے اب تک بڑے درد سے
چلو تنہا چلنا کھیل نہیں
چلو ساتھ تمہارے چلتے ہیں

وہ صحن میں چلی آئی۔ دھوپ ڈھل رہی تھی سمٹ کر دیواروں پر جا لگی تھی۔ وہ چمپا کے درخت کے نیچے بنی سینٹ کی کیاری پر بیٹھی تھی۔

☆☆☆

بابر کو لگ رہا تھا آسودگی، طمانیت دل کے ہر گوشے سے ہی نہیں شاید اس کی زندگی سے بھی نکل چکی ہے۔ ایک بے کلی اضطراب اور وحشت کا ایک کانٹا دار جنگل اکٹا جا رہا تھا جو رگ سے الھتا جا رہا ہو۔ عقل اور اعصاب دونوں ہی بے دم ہو گئے تھے۔

وہ آفس چیئر پر بیٹھا خود کو گیزرے لمحات کی اذیت آمیزی سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے اس کی مومنہ سے فون پر بات ہو رہی تھی۔ مومنہ نے اسے فون کیا تھا اور حور بے کے حوالے سے باتیں کی تھیں۔ مومنہ کے خیال میں ”وہ اپنے باپ عباد گیلانی کی طرح محبت کے غلط نظریے پر کار بند ہے۔“

”میں حور بے سے بہت محبت کرتا ہوں۔۔۔۔۔ اسے کھونا نہیں چاہتا۔“ اس نے مومنہ کے سامنے دل کھول کر رکھ دیا تھا۔

”تم نے بھی عباد کی طرح محبت کو فقط پالینے کا نام سمجھ لیا ہے بابر۔۔۔۔۔ چاہے زور سے بجز سے کسی بھی طریقے سے۔“

”ایسا نہیں ہے۔“ بابر نے احتجاج کیا تھا۔

”اگر ایسا نہیں ہے تو اسے ”گیلانی ہاؤس“ میں رکھنے کا کیا جواز۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی مومنہ تلخ ہو گئی۔

جیسے ماضی کا کوئی خیال کاٹنے کی طرح سینے میں کھب گیا تھا۔

”وہ گیلانی ہاؤس“ کو قید خانہ کیوں سمجھتی ہے۔ کیا آپ کو لگتا ہے میں یہ سب کسی انتقامی جذبے سے کر رہا ہوں۔“ بابر کا لہجہ پست تھا۔

”اگر کوئی انتقامی جذبہ نہیں ہے تو پھر یہ سب کیا ہے۔ یہ محبت تو نہیں ہے۔۔۔۔۔ محبت میں تو اپنی انا، ایگو اپنی ذات بھی نکل جائے درمیان سے تب وہ خالص ہوتی ہے۔ تب وہ مقابل کے دل پر اثر کرتی ہے۔“ بابر کے لہجے کا بکھراؤ مومنہ کے لہجے کو نرم کر گیا۔ بابر افسردہ سانس بھر کر رہ گیا۔

”اسے بہت چاہنے کے۔ اس سے مخلص ہونے کے باوجود مجھے ایسا کوئی ہنر نہیں آتا جس سے میں حور بے کے دل میں اتر سکوں۔“ چند لمحوں تو وقف کے بعد وہ بے بسی سے ہنستے ہوئے بولا۔ ”کیا آپ مجھے ایسا کوئی ہنر سکھا سکتی ہیں کہ میں اس کے دل میں اتر سکوں۔ اس کا دل جیت سکوں۔“ بابر نے کہا تو مومنہ کے دل کو تکلیف دہ احساس چھو گیا۔

”محبت ہنر نہیں خالص پن مانگتی ہے۔“ وہ آرزوئی سے گویا ہوئی۔

اسے بابر ایک ایسا اناڑی ڈرائیور محسوس ہوا جس کی نظر منزل پر جلد سے جلد پہنچنے کے لیے فقط اسپڈ پر تھی راستوں کے پیچ و خم پر نہیں۔۔۔۔۔ اسے بابر سے عجیب طرح کی ہمدردی محسوس ہونے لگی اسے لگا جیسے حازم ایک بار پھر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا ہوا التجا کرتا ہوا۔۔۔۔۔ عباد گیلانی کے لیے۔ سرتانا سوال بنا ہوا۔۔۔۔۔

”محبت اپنے راستے خود بناتی ہے بابر۔ یہ جبر کے راستوں سے گزر کر نہیں ملتی۔۔۔۔۔ پانی وہیں بہتا ہے جہاں نشیب ہوگا اور زمین جتنی نرم اور نشیبی ہوگی پانی اتنی ہی تیزی سے اس پر جائے گا مگر یہ بات عباد گیلانی کی سمجھ میں تھی

کبھی نہ آئی اور جب آئی تب وہ اپنی زندگی داؤ پر لگا چکا تھا۔ محبت ہنر نہیں مانتی۔ خالص پن مانتی ہے اور خالص پن کا دعوا تو کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ یہ تو وقت خود ثابت کرتا ہے۔ اس کے جذبے کی صداقت کو سچائی اور خالص پن کو۔
تم حور یہ کو آ زاد چھوڑ دو۔ اس پرندے کی طرح جو آسمان کی طرف دیکھتا رہتا ہے اور سوچتا رہتا ہے کہ کب وہ آزاد ہوا اور اپنے پر پھیلا کر اپنی مرضی سے اڑان بھر لے..... مگر کوئی عمر بھر نہیں اڑتا رہتا بابر..... گھونسلے میں واپس آتا ہے ہر پرندہ..... وہ بھی تھک جاتا ہے اڑان بھرتے بھرتے..... اسے بھی طلب ہوتی ہے پرسمیٹ کر بیٹھ جانے کی۔ وہ بھی گھونسلے بناتے ہیں، مگر یہ فیصلہ ہمیں اس کے ہاتھ میں دینا ہوگا۔ یہ جو ہمیں کھیلنا ہوگا بابر.....
”اور ہار گیا پھر۔“ بابر کے لہجے میں ہزار اندیشے تھے۔ امید اور ناامیدی کی پیہم یلغار سے گھبرایا ہوا بولا۔

مومنہ افسردگی سے ہنس دی۔
”ہار کے خوف سے ہی کہیں ”ہار“ نہ جانا بابر گیلانی۔“ اس نے اداسی کے جاں گسل احساس سے ہلکی سانس بھر کر لاشن منقطع کر دی۔

بابر نے تڑپ کر موبائل کو یوں دیکھا جیسے کوئی سلگتا انگارہ چٹخ کر اس کے کانوں میں پڑا ہو اور سینے سے لپٹ گیا ہو۔
اسے اپنی ہتھیلی ہی نہیں پورا وجود کسی ان دیکھی آگ میں سلگتا محسوس ہوتا رہا۔ اس نے موبائل میز کی چمکتی سطح پر پھینکنے کے انداز میں رکھ دیا اور کرسی پر خود کو ڈھیلا چھوڑ کر سیٹ سے سر نکا کر آ نکھیں بند کر لیں جیسے کسی احساس سے نجات پانے کی کوشش کر رہا ہو۔

☆☆☆

اک جنوں بے معنی اک یقین لا حاصل
کیا ملا ہمیں محسن اس کی آرزو کر کے

بابر آفس سے نکل کر بے مقصد سڑکوں پر گاڑی بھاگتا رہا۔ عجیب بے معنی سی زندگی ہو کر رہ گئی تھی۔ ایک افسردگی تھی کہ دل و جاں پر کوڑے کی طرح لگ رہی تھی۔ مومنہ کے الفاظ کی سچائی اس کی رگ رگ میں گرم سلاخوں کی طرح گھسی جا رہی تھی۔

اس نے سنٹل پر گاڑی روک کر سگریٹ جلائی اور دھیرے دھیرے کش لینے لگا، مگر یکدم اسے لگا سا رادھواں اس کے سینے میں موجود دل میں بھر رہا ہو۔ جس کا احساس ہونے لگا۔ اسے یوں لگنے لگا جیسے وہ کسی ڈھیر سارے اٹھتے دھوئیں کے پاس کھڑا ہو۔ سلگتا ہوا سیاہ دھواں اس کی رگوں میں بھرتا جا رہا ہو..... اس نے سگریٹ کو دیکھا پھر بجھا کر شیشے کے باہر یونہی پھینک دی۔

☆☆☆

عجیب موڑ پر ٹھہرا ہے قافلہ دل کا
سکون ڈھونڈنے نکلے تھے دشتیں بھی گئیں

حور یہ علی شاہ کو بامشکل سلا بانی تھی پھر عشا کی نماز پڑھ کر یوں ہی میسر میں چلی آئی۔ عاظمہ اسے دیکھ کر خود بھی روم سے نکل کر میسر میں آ گئیں۔ نیند تو انہیں بھی اب دیر دیر تک نہیں آتی تھی۔ وہ نفیسہ کو چائے لانے کو کہہ کر حور یہ کے پاس چلی آئیں۔ ان کے چہرے پر نظر تھا اور اضطرابی انداز میں اس کے ہمراہ میسر کی رینگ

کے پاس کھڑی ہو کر ڈرائیو کی طرف نگاہیں دوڑاتے ہوئے بولیں۔
 ”بہت رات ہو گئی ہے باہر نہیں آیا ابھی تک۔ حالانکہ اب تو وہ آفس سے سیدھا گھر ہی آ جاتا ہے۔
 دوستوں میں بھی جانا چھوڑ دیا ہے اس نے۔“ حوریہ اپنے خیالات سے چوکی۔
 ”اچھا.....“ ایک لمحے اس کا دل انجانے خوف سے گزرا۔ ”آپ نے فون کیا۔“
 ”کب سے کوشش تو کر رہی ہوں مگر بیل جا رہی ہے وہ ریسیو نہیں کر رہا ہے۔ شاید خود کہیں مصروف ہوگا
 اور اس کا سیل فون گاڑی واڑی میں پڑا ہوگا۔“ عاظمہ خود ہی سوال اور خود ہی جواب دیتے ہوئے بولیں۔
 ”آپ پریشان نہ ہوں۔ آ جائے گا۔ چلا گیا ہوگا دوستوں دوستوں میں۔“ وہ تسلی دیتے ہوئے بولی۔
 ”ہاں خدا کرے ایسا ہی ہو۔ علی شاہ سو گیا ہے کیا؟“

”جی۔ بہت مشکل سے سویا ہے۔ بہت تنگ کر رہا تھا آج تو۔“ حوریہ کرسی پر بیٹھ گئی۔
 ”پریشان تو کر کے گاناں۔ بابر کو جو نہیں دیکھا پورے دن اس نے۔“ عاظمہ ہنس دیں۔ ”عادی ہو گیا ہے تا
 اس کا جب تک گھنٹہ دو گھنٹہ باہر کے ساتھ وقت نہ گزار لے اسے چین نہیں پڑتا۔“ حوریہ کے دل پر چوٹی سی
 پڑی۔ ایک اضطراب اس کے دل پر ہلکورے لینے لگا۔

یہی بات تو اسے بھی پریشان کر رہی تھی کہ وہ بہت تیزی سے باہر سے مانوس ہوتا جا رہا تھا بلکہ اس کے بنا
 رہنے کو تیار نہیں تھا جب کہ وہ اسے سینت سینت کر خود تک محدود رکھنا چاہتی تھی۔ حازم کی نشانی کی طرح خود میں
 سیٹ کر رکھنا چاہتی تھی، مگر باہر اس کے لیے یہ سب مشکل بن رہا تھا۔ وہ تو بچہ تھا محبت کی طرف ہی لپکتا تھا۔ اسے
 غصہ باہر پر آتا تھا، مگر وہ باہر کی محبت اور خلوص کی دل سے قائل تھی۔ وہ جانتی تھی کہ باہر علی شاہ کے لیے بے حد
 مخلص تھا اور یہیں وہ بے بس ہو جاتی تھی..... یہ بے بسی اسے اور مشتعل کر دیتی تھی۔
 ”باہر بہت بدل گیا ہے ایجنک چنچ آیا ہے اس میں۔“ عاظمہ کرسی پر بیٹھ گئی تھیں اور نفیسہ کے ہاتھ سے
 چائے گالگ لیتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ حوریہ چپ رہی۔

”جانتی ہو یہ چنچ تمہاری وجہ سے آیا ہے اس میں۔“ عاظمہ نے کہا تو اس نے نظریں چائے کے کپ سے اٹھا کر
 ان کی طرف دیکھا۔ وہ عجیب محبت سے اسے تنگ رہی تھیں۔ پھر منموہمی مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔
 ”آہ۔ محبت بھی عجیب ناک ہے۔ بھی جان ڈال دیتی ہے مردہ جسم میں، بھی طوفانوں کا رخ بدل دیتی
 ہے۔ بندے کا دل اپنی سمجھی میں لے لیتی ہے۔“ عاظمہ نے ایک ہلکی سانس کھینچی۔

حوریہ نے اضطرابی انداز میں لب دانٹوں میں دبا کر نگاہوں کا زاویہ بدل لیا اور دوسری طرف دیکھنے لگی۔
 عاظمہ کے چہرے پر افسردگی جھلکے لگی۔ وہ حوریہ کو تنگ لگیں اور اداسی سے بولیں۔
 ”حوریہ۔ ایک بات کہوں مانو گی۔“ حوریہ نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

”تم باہر کو معاف کر دو۔“ وہ ایک لمحے توقف کے بعد بچی ہو کر بولیں۔ ”صرف ایک بار اسے معاف کر دو۔“
 حوریہ کا دل سینے کی چار دیواری میں جیسے لٹخا بھر کے لیے قہم سا گیا۔ وہ حیرت سے عاظمہ کو دیکھنے لگی تب
 عاظمہ دل گرفتگی سے بولیں۔

”میں سب کچھ جانتی ہوں حوریہ..... اس سے ماضی میں ایک نہیں بہت غلطیاں ہوئی ہیں اور تمہارے ساتھ
 بھی اس نے جو کچھ کیا اور کرتا ہے وہ یقیناً افسوس ناک تھا مگر اب وہ حقیقتاً نادم ہے اور میں بھی نادم ہوں یہ سب میری
 کوتاہیوں کا ہی نتیجہ تھا۔“ عاظمہ کے یہ الفاظ حوریہ کے اعصاب پر اثر انداز ہوئے تھے کسی پتھر کی طرح۔ گھٹ سے
 لگے تھے۔ ”وہ علی شاہ سے ہی نہیں تم سے بھی بہت محبت کرتا ہے حوریہ۔“ عاظمہ دل گرفتگی سے کہہ رہی تھیں۔

”تو آپ بھی یہ چاہتی ہیں میں بھی اس سے محبت کرنے لگوں۔“ وہ ہلکی ناگواری سے بولی۔
 ”معاف تو کر سکتی ہوں اسے۔“ عاظمہ پست سے لہجے میں بولیں۔ ”وہ تم سے محبت نہیں مانگ رہا، مگر تم اس کو محبت کرنے کے حق سے محروم تو مت کرو۔“ حور یہ کا چہرہ ہنسنے لگا۔ وہ احساس بے بسی سے سلگ کر رہ گئی۔
 ”ایسی محبت فقط اذیت دیتی ہے آنٹی جہاں کوئی منزل کا نام نشان نہ ہو۔“ وہ رنج سے بولی۔ ”یہ صحرا کا سفر ہے اور صحرا میں ٹھکناٹا نہیں آتے۔“ وہ کسر بے کیفیت لہجے میں کہہ کر کرسی سے اٹھنے لگی کہ عاظمہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
 ”حوریہ! یقین کرو۔ وہ بہت بدل گیا ہے۔ تم اسے آزما کر تو دیکھو۔ وہ تمہیں حازم کی طرح ہی چاہے گا۔“
 ”آنٹی پلیز۔“ حور یہ کا پورا وجود دھکنے لگا۔ ”سوری، مگر یہ سچ ہے وہ بہت سنسٹر (مخلص) ہے تمہارے لیے۔“ عاظمہ اپنی بات پر قائم رہیں۔ وہ بابر کے لیے ہر حال میں یہ جنگ لڑنا اور جیتنا چاہتی تھیں۔
 ”سنسٹر ہے۔“ حور یہ کے لبوں کی تراش میں ایک مجروح مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوئی تھی۔ ایک رنج نے اس کے چہرے کا احاطہ کر لیا۔ اس نے عاظمہ کی طرف دیکھا اور اسی سرد سر د کیفیت کے ساتھ بولی۔
 ”وہ اگر واقعی مجھ سے محبت کرتا ہے میرے لیے مخلص ہے تو۔ اسے کہیے وہ مجھے اس قید سے نکال دے۔ مجھے علی شاہ کے ہمراہ ”گیلانی ہاؤس“ سے جانے کی اجازت دے دے۔ مجھے آزاد کر دے۔ اپنی مرضی سے جینے کا حق دے دے۔“

”حور۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔ یہ کیا کہہ رہی ہو تم۔“ عاظمہ نے تڑپ کر اس کو دیکھا۔
 ”محبت میں انسان تمکیا کچھ نہیں کرتا۔“ وہ ہلکے سے ہنسی۔ اس کی ہنسی میں ایک افسردگی تھی، دل گرفتگی تھی ایک کاٹ تھی۔ عاظمہ کا چہرہ بھی کا پڑ گیا۔ جیسے یکنخت کسی نے سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ سارے رنگ نوج لیے ہوں۔
 ”ایسا مت کرو حوریہ۔“ ان کا ہاتھ حور یہ کے ہاتھ پر کانپ سا گیا۔ دوسرے پل وہ اس کا ہاتھ اپنے لہر زتے ہاتھ میں لے کر اضطرابی انداز میں دباتے ہوئے بولیں۔
 ”ایسا مت کرنا حوریہ۔۔۔۔۔ ایسا مت کرنا۔۔۔۔۔ میں۔ میں بابر کو ٹوٹتے بکھرتے نہیں دیکھ سکوں گی۔ پلیز حوریہ۔۔۔۔۔“ ان کی آنکھوں میں ایک وحشت بھر آئی۔ وہ خوف زدہ نظروں سے حور یہ کو یوں دیکھنے لگیں جیسے کوئی مقتول قاتل کو دیکھ رہا ہو۔ حور یہ کے لیے ان کا یہ رد عمل خاصا اعصاب شکن ثابت ہو رہا تھا۔ عاظمہ اس کا ہاتھ پکڑ کر رو پڑیں۔

”میرے پاس اب کچھ نہیں رہا حوریہ۔ حازم اور عباد بھی چلے گئے۔ سینہ اور لائے بھی مجھ سے خفا ہیں۔ تم اور علی شاہ چلے جاؤ گے تو میں اس کو بھی میں اس کیلئے مرجاؤں گی اور بابر۔۔۔۔۔ بابر تو اس دنیا سے ہی کٹ جائے گا۔ وہ کٹ جائے گا دنیا کی اس رونق سے حوریہ۔۔۔۔۔“ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپ کر رو پڑیں۔ کب کا دبلا واقعا جو یک دم بہ نکلا تھا۔

”بابر ٹوٹ جائے گا حوریہ۔۔۔۔۔ وہ ٹوٹ جائے گا۔ میں اسے جوڑ نہ پاؤں گی۔ میں عباد کو بھی عمر بھر مومنہ کے غم سے نہ نکال پائی۔۔۔۔۔ میں بابر کو بھی تمہارے غم سے نہیں نکال پاؤں گی۔“
 ”پلیز گاڈ سیک۔ چپ ہو جائیے۔“ حور یہ تکلیف سے کراہی اور وحشت زدہ نظروں سے عاظمہ کو دیکھا پھر نرمی سے ان کے ہاتھ کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑا کر پیچھے ہٹی۔

”آپ کیوں چاہتی ہیں کہ میں یہ سزا سہی رہوں۔ آخر کس بات کی سزا سہی رہی ہوں میں۔۔۔۔۔“ وہ دکھ اور اذیت سے پچھتے ہوئے بولی۔
 ”اسے کہیے مجھے اس زندان سے نکلنے کی اجازت دے دے اور میری یہ سزا ختم کرے۔ جو بلا فقیر میں سہی رہی ہوں۔“ وہ رنج سے بولی۔

”اور میری سزا..... وہ کب ختم ہوگی۔“ بابر کی آواز ابھری۔ وہ جانے کب ٹیرس کے دروازے پر کھڑا تھا۔
 حور یہ اور عاظمہ دونوں نے ہیک وقت رخ موڑا تھا۔

”اور میری یہ سزا کب ختم ہوگی حور یہ۔“ بابر اندر آ گیا اور چلتا ہوا حور یہ کے سامنے آ کر رک گیا۔ اس کے
 چہرے پر غیر معمولی سرخی تھی جو اندرونی خلفشار اور ضبط کی تھی۔

”میری پیشانی سے یہ داغ کب اور کسے دھلے گا۔ یہ تذلیل کا دھما کیسے مٹے گا اور کتنے برس لگیں گے خود کو ایک
 بہتر انسان ثابت کرنے میں۔ بتاؤ؟“ ایک پھٹکی سی ہنسی اس کے لبوں پر بکھر گئی۔ وہ مجروح نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔
 ”تمہارے دل تک پہنچنے کے لیے یقیناً میری اپروچ غلط تھی مگر میری محبت نہیں۔ میں فقط تمہیں نگاہوں
 کے سامنے دیکھنا چاہتا تھا کسی ہوس کے لیے نہیں تمہاری چاہ میں۔ غلط کیا میں نے..... مگر۔ وقت کے ساتھ
 احساسات بدلتے گئے تم ضرورت بنتی گئیں۔ پھر علی شاہ اور تمہیں خوش دیکھنے کی دھن ہونے لگی۔ شاید یہ محبت کی
 پہلی آنچ ہوئی ہوگی جب محبوب کا دل جیتنے کی کوشش کی جاتی ہے۔“ وہ دکھ کے گہرے احساس سے مسکرایا، مگر اس
 کی مسکراہٹ کا ساتھ اس کی آنکھیں نہیں دے پاسکیں۔ وہاں افسردگی کا دھواں اٹھ رہا تھا۔ عاظمہ کرب سے
 اپنی جگہ کھڑی باور دیکھتی رہ گئی تھیں۔

”اور محبت کی آخری آنچ کیا ہوتی ہے جانتی ہو۔“ بابر کی آنکھیں آہستہ آہستہ تمتانے لگی تھیں۔ ان کے
 زیریں کنارے سرخ ہو رہے تھے۔ اس کی ستواں ناک کے نتھنے ذرا سا پھول کر پھر سکڑے تھے۔ اس نے حور یہ
 کے پتھر ائے ہوئے وجود پر نگاہیں جماتے ہوئے دل گرفتگی سے کہا۔
 ”اپنی یہ خوشی، خواہش ہر آرزو کا گلا گھونٹ کر محبوب کی خوشی خود پر لازم کر لے۔ اس کی ہر قاتل خواہش
 بھی مان لی جائے۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے حور یہ کو یوں دیکھا جیسے کوئی اپنے ہاتھ سے بے حد قیمتی متاع کھونے جا رہا ہو اور اسی
 کھودنے کے احساس سے حور یہ کو اسے تک رہا ہو، مگر یہ ہیجان لمحہ بھر کے لیے تھا۔ وہ نظروں کا زاویہ بدل گیا۔
 احساس کی لو پیچ کر لی اور مستحکم لہجے میں بولا۔

”بولو حور یہ..... آج تمہاری خوشی سے میرا دل بندھا ہوا ہے..... تم جانا چاہتی ہو یہاں سے تو جاؤ.....
 جہاں رہنا چاہتی ہو رہو..... مجھ سے نفرت کر کے خوش ہونی ہو تو..... بہت نفرت کرو۔“
 حور یہ دنگ سی رہ گئی تھی۔ کسی بھی طرح کے رد عمل کے قابل نہ رہی تھی۔ بابر کے چہرے کی بڑھتی سرخی سے
 اسے خوف آنے لگا۔ اس کے الفاظ کسی تیر کی طرح اس کے سینے میں کھب گئے۔ وہ تڑپ بھی نہ سکی۔ ادھر عاظمہ
 دکھا اور صدمے سے بابر کی طرف بڑھنے کی کوشش میں ذرا سا لڑکھڑاکیں۔

”میں حازم تو نہیں ہوں کہ مجھ سے ملتے ہی محبت ہو جائے، میں اس جیسا نہیں ہوں۔ میں اس جیسا ہو ہی
 نہیں سکتا۔ اس کی فطرت میں پاکیزگی، سچائی اور محبت تھی۔ جب کہ میں نے اپنے اندر یہ ساری کوالیٹیز
 (خوبیاں) پیدا کرنے کی کوشش کی ہیں مسلسل ریاضت سے اور شاید تمہیں متاثر کرنے میں ناکام ہو گیا ہوں۔ پھر
 میں بھلا اس جیسا کیسے ہو سکتا ہوں۔“ یک دم پلٹا اور ٹیرس سے باہر نکل گیا۔ حور یہ پتھرائی نظروں سے اسے جاتا
 دیکھتی رہی۔

کچھ الفاظ بھی ایسے تیر ہوتے ہیں جو دل میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ تڑپ بھی نہیں سکتے۔ خون بھی نہیں
 رستا۔ بندہ مرتا بھی نہیں ہے اور مر بھی جاتا ہے
 اس میں پلٹ کر عاظمہ کی طرف دیکھنے کا بھی یارا نہیں تھا جو کرسی پر بیٹھ کر بے آواز رو رہی تھیں۔
 (باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)



ہیں۔“ دختر ہلا کو نے عالم کو اپنے سامنے لا حاضر کیا
تکبیا۔ شہزادی مسلمان عالم سے سوال کرنے لگی۔ ”کیا
تم لوگ اللہ پر ایمان نہیں رکھتے۔“
’عالم!“ یقیناً ہم ایمان رکھتے ہیں شہزادی۔“
شہزادی!“ کیا تمہارا ایمان نہیں اللہ جسے چاہے

غالب کرتا ہے؟“

عالم!“ یقیناً ہمارا اس پر ایمان ہے۔“
شہزادی!“ تو کیا اللہ نے آج ہمیں تم لوگوں پر
غالب نہیں کر دیا ہے؟“
عالم!“ یقیناً کر دیا ہے۔“
شہزادی!“ تو کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ خدا
ہمیں تم سے زیادہ چاہتا ہے؟“
عالم!“ نہیں۔“

شہزادی!“ کسے؟“

عالم!“ تم نے بھی چرواہے کو دیکھا ہے کہ ریوڑ
کے پیچھے چرواہے نے اپنے کچھ کتے بھی رکھ
چھوڑے ہوتے ہیں۔ اچھا تو اگر کچھ بھیڑیں
چرواہے کو چھوڑ کر کسی طرف کو نکل کھڑی ہوں اور
چرواہے کی سن کر دینے کو تیار ہی نہ ہوں، تو چرواہا کیا
کرتا ہے؟“

شہزادی!“ وہ ان کے پیچھے اپنے کتے دوڑاتا
ہے، تاکہ وہ ان کو واپس اس کی کمان میں لے
آئیں۔“

عالم!“ وہ کتے کب تک ان بھیڑوں کے پیچھے
پڑے رہتے ہیں؟“

شہزادی!“ جب تک وہ فرار رہیں اور چرواہے
کے اقتدار میں واپس نہ آجائیں۔“

عالم!“ تو آپ تاناری لوگ زمین میں ہم
مسلمانوں کے حق میں خدا کے چھوڑے ہوئے کتے

اللہ تعالیٰ کے جواب بذریعہ قرآن
میں نے کہا:۔ ”تیری مدد کیسے ملے گی یا رب!“
جواب ملا:۔ ”صبر اور نماز سے مدد لیا کرو۔“
(البقرہ، 45)

میں نے کہا:۔ ”میں بہت گناہ گار ہوں۔“
جواب ملا:۔ ”اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، اللہ
سب گناہ بخش دے گا۔“ (الزمر، 53)

میں نے کہا:۔ ”میرے دل کو سکون نہیں ہے۔“
جواب ملا:۔ ”اللہ کی یاد سے ہی دلوں کو سکون اور
اطمینان ملتا ہے۔“ (الرعد، 28)

میں نے کہا:۔ ”مجھے کوئی یاد نہیں کرتا۔“
جواب ملا:۔ ”تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد
کروں گا۔“ (المقرہ، 152)

پانچ سوال

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے
روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
”قیامت کے دن ابن آدم کے پاؤں (اپنی جگہ
سے) نہیں ٹلیں گے تاوقتیکہ اس سے پانچ چیزوں کے
بارے میں سوال نہ کیا جائے، اس کی عمر کے بارے
میں کہ اس کو کس چیز میں مگنویا؟ اور اس کی جوانی کے
بارے میں کہ کس چیز میں ضائع کیا؟ اور اس کے
مال کے بارے میں اسے کہاں سے کمایا اور کس چیز
میں خرچ کیا؟ اور یہ کہ اسے جو علم حاصل ہوا اس پر کیا
عمل کیا؟“

ہلا کو خان کی بیٹی

بغداد پر تاتاری فتح کے بعد، ہلا کو خان کی بیٹی
بغداد میں گشت کر رہی تھی کہ ایک ہجوم پر اس کی نظر
پڑی، پوچھا۔ ”لوگ یہاں کیوں اکٹھے ہیں؟“
جواب آیا۔ ”ایک عالم کے پاس کھڑے

آثار بڑھایا

1- جب آپ بالوں میں کھنٹی کرنے کے بجائے ان سے اپنا ج چھپانے لگتے ہیں۔

2- جب آپ کا بیٹا آپ کی تھوڑی بہت عزت کرنے لگتا ہے۔

3- جب آپ کے کپڑے آپ کو فٹ نہیں آتے اور تراش خراش کی ضرورت کپڑوں کو نہیں آپ کو ہوتی ہے۔

4- جب فون پر نسوانی آواز کہتی ہے، مجھے پہچانا اور آپ نہیں کہہ کر ریسور کھ دیتے ہیں۔

5- یہ خواہش کہ کاش ہم اسی سال پیدا ہوتے اور رفتہ رفتہ اٹھارہ سال کے ہو جاتے۔

6- جب آپ کو یہ پوچھنے سے پہلے کہ اپنی عینک کہاں بھول گئے۔ اپنی بیٹی اور آلہ سماعت کی ضرورت پڑتی ہے۔

7- جب آپ اپنے موزے کی ٹکٹیں درست کرنے کے لیے جھکتے ہیں اور آپ کو پتا چلتا ہے کہ موزے تو آپ نے پہنے ہی نہیں۔

فوزیر عمر بٹ، ہانیہ عمران..... سبکدات

پیار کی حقیقت

ایک لڑکی نے ایک بزرگ سے پوچھا۔ ”پیار کی حقیقت کیا ہے؟“

بزرگ نے کہا۔ ”باغ میں جاؤ اور جو سب سے خوب صورت پھول ہو وہ توڑ کر لاؤ۔“

لڑکی ایک دن بعد واپس آئی اور کہا۔ ”میں پھول دیکھتی رہی، ایک پھول سب سے خوب صورت تھا، مگر میں اس سے بہتر کی تلاش میں چل پڑی، مگر کوئی پیار نہیں لگا اور جب لوٹ کے آئی تو اسے کوئی اور توڑ چکا تھا۔“

بزرگ نے کہا۔ ”پیار کی یہی حقیقت ہے۔ جو سامنے ہو اس کی قدر نہیں کی جاتی اور جب واپس لوٹو تو وہ کسی اور کا ہو جاتا ہے۔“

شاہنواز..... کراچی

ہیں۔ جب تک ہم خدا کے در سے بھاگے رہیں گے اور اس کی اطاعت اور اس کے منج پر نہیں آجائیں گے، تب تک ہمارا امن، چین تم ہم پر حرام کر کے رکھو گے، ہاں جب ہم خدا کے در پر واپس آجائیں گے، اس دن کام ختم ہو جائے گا؟“

مسلمان عالم کے اس جواب میں آج ہمارے لیے غور و فکر کے لیے بہت کچھ پوشیدہ ہے۔

افشاں مسیح..... کراچی

بلیے شاہ

پتھر ذہن گلاب نہیں ہوندے
کورے کا غد کتاب نہیں ہوندے

جے کرنی یاری بھلیا
فریادیں نال حساب نہیں ہوندے

حافظ رملہ مشتاق..... حاصل پور

ابوالکلام آزاد

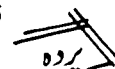
☆ انسان کی سب سے بڑی عقل مندی عبرت
بذیری ہے، مگر سب سے بڑی غلطی غفلت اور انماز ہے۔

☆ اگر سچائی کو اس کی اصل ضرورت کے وقت پیش نہ کیا جائے تو اس کے وجود کا اعتراف بے کار ہے اور چراغ جلانے کا اصلی وقت غروب آفتاب کے بعد آتا ہے، نہ کہ پچھلے پہ۔

☆ زبان کی پکار ضائع جاسکتی ہے، پر عمل کی صدا کبھی جواب لیے بغیر نہیں رہتی۔

☆ حسن، خوشبو، نغمہ اور زیب و آرائش الگ الگ نام ہیں، لیکن حقیقت صرف ایک ہی نغمہ ہے، یعنی عدل و اعتدال۔

فضانور..... روہڑی



ایک بیٹی نے اپنے والد سے پوچھا۔ ”ابا جان! میں جسم کے کتنے حصے کا پردہ کروں؟“

باپ نے بڑا اچھا جواب دیا۔ ”بیٹی! جسم کے جتنے حصے پر جہنم کی آگ برداشت کر سکتا تھا کھلا چھوڑ دو، باقی کا پردہ کرلو۔“

ریمانور رضوان..... کراچی

سائلگرہ

ایک صحافی شاہراہ عظیم الشان سے گزر رہا تھا کہ بیچ سڑک پر واقع ایک گڑھے کے گرد اس نے چند افراد کو پتے لگاتے دیکھا۔

”کیا ہو رہا ہے؟“ اس نے فوراً من سے پوچھا۔
”کس کی شادی کی خوشیاں منا رہے ہو؟“

”جی نہیں۔“ فوراً من نے جواب دیا۔ ”ہمارا تعلق کے ایم سی سے ہے اور ہم اس گڑھے کی ساتویں سالگرہ منا رہے ہیں۔“

اترا جٹ..... منجن آباد
دانائی کی باتیں //

مسجد میں رہ کر اپنی جوتیوں کی فکر میں رہنے سے گلیوں میں آوارہ پھرتے ہوئے خدا کو یاد رکھنا بہتر ہے

(ڈاکٹر علی شریعتی)
☆ بوجھ میں اگر محبت نہ ہو تو وہ بے شک ایک تیکے کا ہو، برداشت نہیں ہوتا۔

(مستنصر حسین تارڑ)
☆ ستار کا ایک تار ٹوٹ جائے تو راگ بے ہنگم ہو جاتا ہے اور جب تک ایک انسان بھی ناخوش ہے، سماج خوش نہیں ہو سکتا۔

(کرشن چندر)
☆ دنیا میں بھونکنے والے کتنے بہت ہیں۔ جینا چاہتے ہیں تو ان کی آواز نہ سننے کی صلاحیت پیدا کریں۔

(ممتاز مفتی)
☆ زندگی کے چشمے پر اپنی گاگر بھرنے کے لیے جھکنا پڑتا ہے۔ بعض اوقات کنارے پار زانو ٹکینے پڑتے ہیں۔ لیکن ہم اپنی گاگر بھرنے کے لیے جھکنے کا فن بھول گئے ہیں، ہماری انا ہمیں جھکنے نہیں دیتی۔

(اشفاق احمد)
☆ بیوی اور ڈاکٹر کی چپ اچھا شگون نہیں ہوتی۔
(ڈاکٹر یولس بٹ)

فاخرہ بتول اعوان..... موڑہ دھمال
اچھی نصیحت

ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی تو میں نے گزارش کی کہ ”کچھ نصیحت کیجیے۔“ انہوں نے عجیب سوال کیا۔ ”کبھی برتن دھوئے ہیں؟“

میں ان کے سوال پر حیران ہوا اور جواب دیا کہ ”جی دھوئے ہیں۔“

پوچھنے لگے۔ ”کیا سیکھا؟“
میں نے کہا۔ ”اس میں سیکھنے والی کیا بات ہے؟“

وہ مسکرائے اور کہنے لگے۔ ”برتن کو باہر سے کم اور اندر سے زیادہ دھونا پڑتا ہے۔“
عابدہ مغزل..... بھیر کنڈ مانسہرہ

محبت کیا ہے

وکیل نے کہا..... ہارا ہوا مقدمہ
ادیب نے کہا..... ادھوری کہانی
ڈاکٹر نے کہا..... روح کا کینسر

اداکار نے کہا..... محض ڈراما
طالب علم نے کہا..... ایک مشکل امتحان
مسافر نے کہا..... ایک لا حاصل سفر

فقیر نے کہا..... سوائے دکھوں کے کچھ بھی نہیں
مالی نے کہا..... مزا ہے زندگی کا محبت

اترا عزیز..... نامعلوم
الحسن

مجھے خوف ہے
وہ ناہ کے کسی مرحلے پہ
یہ آ کے کہہ دے اب نہیں
میرے دل کو تیری طلب نہیں
(نوشی گیلانی)

شازیہ اعجاز..... فیصل آباد
☆☆



وہ بے کیفی کا عالم ہے کہ دل یہ چاہتا ہے
کہیں روپوش ہو جاؤں اچانک خاموشی سے
سکون خانہ دل کے لیے کچھ گفتگو کر
عجیب ہنگامہ رہا ہے تری لب بستگی سے

کوئی خوش فکر سا تازہ سخن بھی درمیان رکھ
کہاں تک دل کو بہلاؤں میں تیری دکھتی سے
ابھی عرفان آنکھوں کو بہت کچھ دیکھتا ہے
تہیں بے رنگ کون گلد لگاہے سب ابھی سے

حافظہ ملکہ مشتاق، کی ڈائری میں تحریر
علامہ اقبال کی غزل
تیرے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
میری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

ستم ہو کہ ہو وعدہ بے جانی
کوئی بات صبر آزمایا چاہتا ہوں
یہ جنت مبارک رہے زائدوں کو
کہ میں آپ کا سنا چاہتا ہوں
درا سا تو دل ہوں مگر شوخ اتنا
وہی لن ترانی سنا چاہتا ہوں

نماور اطلحہ، کی ڈائری میں تحریر
معین مہویالی کی غزل
خیر کیا تھی نہ ملنے کے نئے اسباب کر دے گا
وہ کر کے خواب کا وعدہ مجھے بے خواب کر دے گا

کسی دن دیکھنا وہ آکے میری کشت ویراں پر
اچھتی سی نظر ڈالے گا اور شاداب کر دے گا
وہ اپنا حق سمجھ کر قبول جائے گا ہر احساں
پھر اس رسم انا کو داخل آداب کر دے گا
نہ کرنا زعم اس کا طرزا استدلال یہ ہے
کہ نقش سنگ کو تحریر موج آب کر دے گا

نمرہ، اقرا، کی ڈائری میں تحریر
عرفان ستار کی غزل
بتاتا ہے مجھے آئینہ کیسی بے رُخی سے
کہ میں محروم ہوتا جا رہا ہوں رفتی سے
کسے الزام دلوں میں راہیں گاہوں ہونے کا اپنے
کہ سامنے فیصلے میں نے کیے خود ہی خوشی سے
مجھے کل تک بہت خواہش تھی غصے گفتگو کی
میں چھپتا پھر رہا ہوں آج اپنے آپ ہی سے

کوئی دم کا مہاں ہوں اے اہل عقل
چراغِ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں

بھری بزم میں راز کی بات کہہ دوں
بڑے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

شبانہ الطاف، کی ڈاڑھی میں تحریر
نامر کاظمی کی نظم

اک بات کہوں گر سنتے ہو
تم مجھ کو اچھے لگتے ہو
کچھ پنچل سے
کچھ چب چب سے
کچھ پاتھل پاتھل لگتے ہو
میرے چاہنے والے اود بہت
پر غم میں ہے اک بات بہت
تم اپنے اپنے لگتے ہو
تم مجھ کو اچھے لگتے ہو
یوں بات بات پر کھوجانا
کچھ کہتے کہتے ترک جانا
تم کس اُلجھن میں رہتے ہو
اک بات کہوں گر سنتے ہو
تم مجھ کو اچھے لگتے ہو

سیدہ نسبت زہراء کی ڈاڑھی میں تحریر
منور جمیل کی نظم

خلش،

کبھی کبھی دل یہ چاہتا ہے
تمہاری شاموں کا احوال پوچھوں
سوال پوچھوں

کہ فکرِ دوا میں کیسی گزری
یونہی کبھی میرا نام آیا تمہارے ہونٹوں پہ اک پل کو
مری محنت کی یاد مہکی کبھی تمہارے بھی راستوں میں

کبھی کسی دلیں تمہاری صبح دہ پہ جاگی صدائے دستک
کبھی عبادت کی کیفیت میں نہیں میرا بھی گمان گزرا
تمہارے صحنِ دعا سے میرا بھی دھیان گزرا
کبھی تمہارے بدل پہ بھی شب، عذاب بن کر
کبھی کبھی ہے

مگر میں چپ ہوں

ہمارے ماں میں یہ جو دیوارِ اجنیت ہے یہ غنیمت
اسی میں تو غیر حرف و لب ہے
ہیں یہ ترک و طلب کی حد ہے

گر دیا شاہ، کی ڈاڑھی میں تحریر
احمد ندیم قاسمی کی غزل

اندھیری رات کو یہ معجزہ دکھائیں گے ہم
چراغ اگر نہ ملا، اپنا دل جلانیں گے ہم

تمہاری کوہ کنی کے ہیں مختلف معیار
بہاؤ کاٹ کے رستے بنائیں گے ہم

جو دل دکھا ہے تو یہ عزم بھی ملا ہے میں
تمام عمر کسی کا نہ دل دکھائیں گے ہم

بہت نڈھال ہیں تو ستا تو ہیں گے مل دوں
اُلجھ گیا ہیں دامن تو کیوں چھڑائیں گے تم

اگر ہے موت میں کچھ لطف پس تو اتنا ہے
کہ اس کے بعد خدا کا سراج پائیں گے ہم

ہیں تو قبر بھی تنہا نہ کر کے گی تدفین
کہ ہر طرف سے زمیں کو قریب پائیں گے



بچہ سیکرٹری

شاہزادہ احمد _____ وزیر آباد

آئے تو یوں کہ جسے ہمیشہ تھے مہربان

میرے نانہ _____ ساہیوال

یہ کیا نشہ ہے میں کس عجیب فخر میں ہوں

تو آ کے یا بھی چکا، میں انتظار میں ہوں

سونیا خان _____ ملتان

پرستش کی تمنا ہے مگر ہلے ری مجھوی

صنم جس سے تراش جائے وہ پتھر نہیں ملتا

لینی خانم _____ فیصل آباد

دل میں افسوس اکھوں میں غمی سی مانتی ہے

زندگی میں شاید کوئی کمی سی رہتی ہے

عجھ سے دودھ پالتے ہیں اکثر اپنے دفنی

شاید میرے غلوں میں کمی سی رہتی ہے

عذرا ناصر، اقصی ناصر _____ کراچی

کہہ رہا ہے خود دیلے سمندر کا سکوت

جس میں جتنا ظرافت ہے وہ اتنا ہی خاموش ہے

نمرہ، اقرا _____ کراچی

جو یقین کی راہ پر چل پڑے

انہیں منزلوں نے پناہ دی

جنہیں دوسروں نے قہر ڈرا دیا

وہ قدم قدم پر بہک گئے

نصرت نور _____ رولہ پری

وہ بے وفائے تھا اب بھی بدنام ہو گیا

ہزاروں جاہنے دلے تھے کس کس سے دفن کرتا

شہینہ اسلم _____ ہرنائی

روکھو اگر مجھ سے تو یہ ذہن میں رکھنا

منانا عادت نہیں ہماری اور جہلم رہ نہیں سکتے

زہرا اعجاز _____ خان پور

ایک ہی شخص پر لٹا دیتے ہیں جو زندگی اپنی

ایسے لوگ اب کتابوں میں ملا کرتے ہیں

درشا کرن _____ کوٹ چھٹہ

تڑپ رہی ہے ہر ایک تمنا

نہ تم سے ملنے نہ ایسا ہوتا

بجھی بجھی سی ہے دل کی دُنا

نہ تم سے ملنے نہ ایسا ہوتا

سونیا ربانی _____ موڈ ادھیال

مجھ سے بچھڑ کر اب وہ خوش رہتا ہے

افسوس کہ میں نے اس کی خوش چین مری مری

عذرا نور _____ کشمیر

جوات ہم کہہ نہیں سکتے اسے ہم فرم کر رہے ہیں

شنا شہزاد _____ کراچی

ہمیں نگاہ میں منزل تو جستجو ہی سہی

ہمیں وصال میسر تو آرزو ہی سہی

مہرین جاوید _____ لاہور

دشمنی میں کہاں وہ ہوتے ہیں

دوستی میں جو وار ممکن ہیں

فرزانہ سرور _____ راولپنڈی

کچھ تو ہوں گی محبت کی مجھو ہاں

کون سہتا ہے ور نہ کسی کے مستم

صباحت _____ ایبٹ آباد

لوگ کہتے ہیں کہ محبت ایک بار ہوئی ہے

میں جب جب اُسے دیکھتا ہوں مجھے یاد یاد ہوتی ہے

انیسلا تاہر _____ قصور
 میری منزل میں بھی عجیب محسوس، میرا فیض بھی کمال پر
 کبھی سب کچھ ملا بنا طلب، کبھی کچھ ملا سوال پر
 عذابا تاہر _____ کراچی
 کبھی حیات کی ضامن، کبھی وسیلہ موت
 نگاہ و یار تیرا بھی کوئی اعتبار نہیں
 اتھلی تاہر _____ کراچی
 اک جنوں بے معنی، اک یقین لا حاصل
 کیا ملا ہمیں محسن اس کی آرزو کر کے
 صدف عمران _____ کے ڈی، اے سوانی
 جانتے تھے دونوں ہم اس کو نکال سکتے نہیں
 اس سے وعدہ کر لیا، میں نے بھی وعدہ کر لیا
 شاکاشف _____ کراچی
 تو مجھے اپنے پاس رکھ لے
 مجھ سے رخصت نہیں ہوا جانا
 عابدہ نشار _____ کونڈگی
 تعلقی بعد میں تبدیل ہو کر جو بھی رہ جاتے
 محبت سے وہ پہلا مسکراتا یاد رہتا ہے
 کسی کی لاکھ باتیں ایک پل میں بھول جاتی ہیں
 کسی کا ایک جملہ بھی پرانا یاد رہتا ہے
 سیما کنول _____ راولپنڈی
 سنا ہے کوئی اد بھی چاہنے لگا ہے نہیں
 ہم سے بڑھ کر اگر چاہے تو اسی کا ہو جانا
 نادیر، عظمیٰ _____ فیصل آباد
 کچھ ایک تھا کہنے کا انداز ان کا
 کہ سنا بھی کچھ نہیں کہا بھی کچھ نہیں
 کچھ اس طرح بکھرے ان کے پیار میں ہم
 کہ تو نا بھی کچھ نہیں اد بجا بھی کچھ نہیں
 مسرت فاطمہ _____ کراچی
 زندگی کے سونے میں دیر کتنی لگتی ہے
 نجات کو بڑھنے میں دیر کتنی لگتی ہے
 اس کے بات بات پر روٹھ جاتے ہیں
 ہمیں آزمائے میں دیر کتنی لگتی ہے

قراۃ العین _____ لاہور
 وہ عمر جس میں ہمیں خود سے ملنا جلنا تھا
 وہ عمر صرف تری جستجو میں کر دی ہے
 ارم کمال _____ فیصل آباد
 راز دل نہ سنا نا کسی کو ساغر
 دنیا میں سب ہم راز بدل جاتے ہیں
 کسی سے پھر گئے سے کوئی مروت نہیں جاتا
 ہل مگر مینے کے انداز بدل جاتے ہیں
 مریم انیس _____ جہلم
 لہا دیر تجھے دیکھتے رہنے کی سزا ہے
 کنکر تو مری آکھ میں پہلے ہی پڑا ہے
 شانیزہ امجد _____ فیصل آباد
 اس قدر محسوس مسلسل شدتیں جدائی کی
 آج پہلی بار میں نے اس سے وفا کی
 ہم نفس میں شوق تھا قیدیوں کا ادھیاد
 دیکھنا آڑا دے گا پھر خبر رہائی کی
 سحر یاشاہ _____ کبہ وڑیچکا
 جو یقین کی ماہ پہ چل پڑے
 انہیں منزلوں نے پناہ دی
 جنہیں دوسروں نے آڑا دیا
 وہ قدم قدم پہ بہک گئے
 شفیق افتخار _____ سکس
 خاموش فضا تھی کہیں سایہ بھی نہیں تھا
 اس شہر میں ہم سا کوئی تنہا بھی نہیں تھا
 کس جرم میں چھٹی گئی مجھ سے میری ہنسی
 میں نے تو کسی نہ دل دکھایا بھی نہیں تھا
 سدہ بتول _____ ملتان
 میرا بازار رنگوں تو، آوارگی کی تہمت
 تنہائی میں بیٹھوں تو، الزام محبت

کچھ موتی چنے ہیں

ادار

نشیب و فراز

انسان کی زندگی میں بہت سے نشیب و فراز آتے ہیں اور انسان کو اس کا مقابلہ بہت سے کرنا چاہیے، لیکن افسوس کہ یہ انسان کی کم بہتی ہے کہ وہ آسودگی میں تو بہت اطمینان سے رہتا ہے، لیکن تھوڑی سی تکلیف آئے تو انسان کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں اور وہ ذہنی دباؤ کا شکار ہو کے ہاتھ پیر چھوڑ دیتا ہے۔

(صائمہ اکرم چوہدری، دیمک زدہ محبت)
فضہ نور، روہڑی

تلخ سچائی

زندگی کی بدترین صورت حال جانتے ہو کون سی ہوتی ہے۔ دو پیاروں میں سے ایک کو چننا۔ اور دو میں سے ایک کو چھوڑ دینا۔ ہاں اور اس سے بھی بدترین وہ سچائی ہے جس میں جسے چنا ہو اس کے ساتھ خوش نہ رہ پانا۔

(سمیرا حمید..... یارم)

بنت مشتاق۔ حاصل پور

استغفار

بنی اسرائیل کو شہر کے دروازے میں داخل ہونے سے قبل بخش مانگنے کا حکم ملا تھا وہ گندم مانگتے رہے بخش نہیں مانگی یہ بنی اسرائیل کی ریت تھی اور یہی ریت خود اس نے بھی دہرائی تھی۔ ہم زمانہ جاہلیت سے دور اسلام میں آ کر ایک ہی دفعہ توبہ کر لیتے ہیں ساری عمر پھر عمل صالح تو کرتے رہتے ہیں مگر بار بار کی توبہ بھول جاتے ہیں ہم ایک کھائی سے بچ کر سمجھتے ہیں کہ زندگی میں پھر بھی کھائی نہیں

آئے گی اور اگر آئی تو بھی ہم بچ جائیں گے ہم ہمیشہ نعمتوں کو اپنی نیکیوں کا انعام سمجھتے ہیں اور مصیبتوں کو گناہوں کی سزا۔ اس دنیا میں جزا بہت کم ملتی ہے اور اس میں امتحان بھی ہوتا ہے۔ نعمت شکر کا امتحان ہوتی ہے اور مصیبت صبر کا زندگی کے کسی نے امتحان میں داخل ہوتے ہی منہ سے پہلا کلمہ، حلیہ، کا نکلتا چاہیے مگر ہم وہاں بھی گندم مانگتے لگتے ہیں۔ اللہ اسے زندگی کے کسی مختلف فیئر میں لایا تو۔ اسے بخشش مانگنی چاہیے مگر وہ ”ہاپوں“ اور ”تیئرز“ کو مانگنے لگ گئی حلیہ منطیہ کہنے لگ گئی گندم مانگنا برا نہیں تھا مگر پہلے بخشش مانگنی تھی۔ وہ پہلا زینہ چڑھے بغیر دوسرے کو بھلا نکلتا چاہ رہی تھی اور ایسے مار کب لگا جاتا ہے؟

(نمرہ احمد۔ مصحف)

سدرہ بتول۔ ملتان

اللہ بہتر جانتا ہے

”ہمارے بھوکا رہنے سے جانے والے واپس نہیں آ سکتے۔ کیا بھوکا رہ کر تم اللہ سے اپنی ناراضی کا اظہار کر رہی ہو۔ چونکہ اس نے تمہاری دعائیں قبول نہیں کیں، اس لیے تم اب اس کے دیے کھانے کو ہاتھ نہیں لگاؤ گی۔ کیا ہمیں اللہ کے ساتھ ناراض ہونے اور ضد کرنے کا حق ہے؟ ہم نہیں جانتے ہمارے لیے کیا بہتر ہے جو کچھ بظاہر ہمیں غلط ہوتا ہوا لگ رہا ہوتا ہے وہی درحقیقت ہمارے حق میں بہتر ہوتا ہے۔“

(فرحت اشتیاق..... میرے ہمد میرے دوست)

اشاخیر..... شہد ادر

اندازِ بیاں اور

”تو گویا آپ شاعر ہیں، میرے دوست نے ان کا معائنہ کیا اور آخر ان سے کہا گیا۔

”صاحب آپ بالکل درست ہیں۔“

بولے۔ ”یہ کس طرح ہو سکتا ہے..... تو گویا ہم

یہاں تفریحا آئے ہیں۔“

آخر تک آ کر انہیں بتایا گیا کہ جو کچھ وہ محسوس کرتے ہیں، واقعی وہ ٹھیک ہے۔ ان کا دل گردوں کی جگہ رکھا ہے، گردے ٹکڑوں میں پڑے ہیں، جگر دماغ تک پہنچا چاہتا ہے اب علاج کا سوال تھا۔

یہ ایک ڈاکٹر کو کچھ سوجھ گیا۔ پوچھا۔ ”کیوں

صاحب! آخری غزل آپ نے کب لکھی تھی؟“

بولے ”دوڑھائی مہینے ہوئے۔“

پوچھا۔ ”اور بیمار کب سے ہیں؟“

بولے۔ ”بس یہی دوڑھائی ماہ سے۔“

پوچھا۔ ”یہ غزل آپ نے کسی کو سنائی تھی؟“

”گھنٹے گئے نہیں تو.....“

کہا۔ ”تو آپ سنا دیجیے۔“

بولے۔ ”نہیں صاحب! یہ کیا فرماتے ہیں

آپ۔ کہاں یہ ناچیز اور کہاں اس ناچیز کا کلام لیکن

آپ مصرع ہیں تو لیجیے۔“ انہوں نے آدھے گھنٹے میں

اپنی غزل گا کر بلکہ رو کر سنائی۔

ہم نے اچھی طرح داد دی۔ جب وہ غزل سنا

چکے تو ان سے کہا۔ ”جناب! فی الحال تو آپ کے

لیے علاج کی کوئی ضرورت نہیں، اگر پھر اس قسم کا دورہ

اٹھے تو تشریف لے آئیے گا۔“

وہ ہنسی خوشی چلے گئے۔ چند مہینوں بعد پھر

آئے۔ برا حال تھا، انتہائی بے زاری تھی، غزل سنائی

اور مسکراتے ہوئے تشریف لے گئے۔

(شفیق الرحمن..... لہریں)

افشاں سمیع..... کراچی

مجتب

مجتب میں ”اب“ اور ”پھر“ نہیں ہوتے اور نہ ہی ”یہاں“ ”وہاں“ ہی ہوتے ہیں سب ہی موسمِ محبت کے موسم ہیں۔ سب ہی جگہیں ”محبت کا موزوں مسکن ہیں۔“ ”محبت“ کوئی رکاوٹیں گوارہ نہیں کرتی، جس محبت کی راہ میں کوئی رکاوٹ حاصل ہو سکے لو کہ وہ ابھی ”محبت“ کہلائی جانے کی مستحق نہیں۔

(میخائیل میس..... کتاب میرداد)

صدف سمیع..... کراچی

بوڑھا

مما تمنا بدھ کہتا ہے ”اگر دنیا میں پیدا ہونے سے پہلے مجھ سے پوچھا جاتا اور مجھے چوالیس مٹی میں بوڑھا پیدا ہوتا اور بچہ ہو کر مرتا۔“ ہر آدمی چاہے وہ کتنا بھی جوان نظر آتا چاہے مگر وہ رہتا بوڑھے کی طرح چاہے گا۔

ہر پرانی چیز قیمتی ہوتی ہے۔ پرانا تو جھوٹ بھی نئے سچ سے زیادہ قابلِ اعتبار ہوتا ہے۔ انسان کی جتنی عزت بڑھاپے میں ہوتی ہے اتنی ساری زندگی نہیں ہوتی جس کی وجہ یہ ہے کہ بڑھاپے میں اس لیے عزت ہوتی ہے کہ اس وقت تک بندے کو جاننے والے ہم عمر بہت کم زندہ ہوتے ہیں، دنیا میں کوئی بوڑھا بے وقوف نہیں ہوتا، کیونکہ جو بے وقوف ہوتا ہے وہ بوڑھا نہیں ہوتا۔

دنیا میں تین قسم کے بوڑھے ہوتے ہیں، ایک وہ جو خود کو بوڑھا سمجھتے ہیں۔ دوسرے وہ جنہیں دوسرے بوڑھا سمجھتے ہیں اور تیسرے وہ جو واقعی بوڑھے ہوتے ہیں۔ دنیا میں سب سے زیادہ مخلص بوڑھا مخلص ہوتا ہے اور سب سے بڑا دشمن بوڑھا دشمن کیونکہ اس کا اپنا تو کوئی مستقبل نہیں لیکن وہ آپ کا مستقبل خراب کر سکتا ہے۔

بڑھاپے کی اس سے زیادہ برائی اور کیا ہوگی کہ آپ کو پاکستانی کا صدر بننے کے لیے جس کو الیفیشن کی ضرورت ہے وہ صرف بڑھا پایا ہے۔

(ڈاکٹر پولس بٹ..... شیطانیاں)

افراجٹ مجن آباد



”لوگ کہتے تھے کہ میں پاگل ہوں، جبکہ میری رائے یہ تھی کہ لوگ پاگل ہیں۔“ پاگل نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔
ڈاکٹر نے دلچسپی لیتے ہوئے دریافت کیا۔ ”پھر کیا ہوا۔“
”ان کے حق میں ووٹ زیادہ پڑ گئے۔“ پاگل نے منہ بسورتے ہوئے جواب دیا۔
غزل فاطمہ..... ملتان

انتخاب

ٹائپسٹ کی ملازمت کے لیے امیدواروں کا انتخاب ہو رہا تھا۔ ایک امیدوار سے انٹرویو کرنے والے نے پوچھا۔
”آپ ٹائپنگ کے علاوہ اور کیا جانتے ہیں؟“
امیدوار نے کہا۔ ”مذاق کرنا۔“ انٹرویو کرنے والے نے کہا۔
”کیا آپ اس کا عملی مظاہرہ کریں گے۔“
”کیوں نہیں۔“ یہ کہہ کر امیدوار نے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر بیٹھے ہوئے امیدواروں سے کہا۔
”آپ لوگ جاسکتے ہیں، کیونکہ میرا انتخاب کر لیا گیا ہے۔“

مفت مشورہ

ایک بیمار استانی سے اس کا شوہر بولا۔ ”تم اس بار کسی جانوروں کے ڈاکٹروں کو دکھاؤ، تب ہی تم ٹھیک ہوگی۔“
استانی نے پوچھا۔ ”وہ کیوں؟“
شوہر نے کہا۔ ”تم صبح مرغی کی طرح جلد اٹھ

نشر
غائب دماغ پروفیسر نے ایک دن بھنگ پی لی اور نشے میں کسی ٹوٹی قبر پر جا گرے۔ صبح آنکھ کھلی، نشہ اتر اتر دور سے بڑبڑائے۔
”غضب خدا کا یوم حشر آ گیا، میں واحد مردہ ہوں جو اپنی قبر سے نکل آیا، باقی نالائق سب ڈھیٹ بنے سو رہے ہیں۔“
آمنہ علی..... جہلم

گھڑی ساز

ایک گھڑی ساز نے اپنی روٹھی ہوئی بیوی کو کچھ اس طرح سے خط لکھا۔
میں نے ہمیشہ 13.7 دیا۔
تم بھی میرا 07.21 دو۔
ہم 02.90 کو ہمیشہ 01.07 رہنا ہے۔
اس لیے مجھ سے روٹھنے کی غلطی 02.12 مت کرنا۔

امن عامر..... کراچی

جمہوری نظام

ایک ڈاکٹر نے پاگل خانے کا معائنہ کرتے ہوئے پوچھا۔
”تم یہاں، کس وجہ سے لائے گئے ہو۔ مجھے تو تم صحت مند دکھائی دیتے ہو۔“
”اس جمہوری نظام کی وجہ سے۔“ پاگل نے جواب دیا۔
ڈاکٹر نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”وہ کیسے؟“

چراغوں میں روشنی نہ رہی

ایک صاحب آدمی رات کو اپنے دوست کے یہاں پہنچے اور بولے۔ ”یار! آج رات میں تمہارے یہاں سوؤں گا۔ تمہاری بھابی سے زبردست جھگڑا ہو گیا ہے۔“

”کس بات پر لڑائی ہو گئی۔“ دوست نے انہیں گھر کے اندر لاتے ہوئے پوچھا۔

”بس یار! سونے کے لیے لیٹ چکا تھا، مجھ پر غنودگی طاری ہو چکی تھی کہ اس وقت بیگم نے شاپنگ کے لیے دس ہزار روپے کی فرمائش کر دی۔ میں نے نیند کی سی حالت میں کہہ دیا کہ..... ٹھیک ہے، لے لینا، دس ہزار روپے، لیکن پہلے وہ خطوط ٹائپ کر کے لے آؤ جو میں نے ڈکلیٹ کرائے ہیں..... بس اس کے بعد.....!“

حنا کرن..... پتو کی

وعدے

بیوی نے روتے ہوئے کہا۔ ”شادی سے پہلے تم کہتے تھے کہ میں شادی کے بعد بھی تم سے اسی طرح پیار کرتا رہوں گا۔ اب تو تم مجھ سے ہر وقت لڑتے رہتے ہو۔“

شوہر نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ”اوئے بختا! مجھے کیا معلوم تھا کہ میری شادی تیرے ہی ساتھ ہو جائے گی۔“

اقرا جٹ..... منجن آباد

☆☆

کچن اور آپ

اس ماہ سدرہ بتول کو کچن اور آپ میں انعام کا حق دار قرار دیا گیا ہے۔ ادارے کی طرف سے سدرہ بتول کو تین ماہ کے لیے ”ماہنامہ کرن“ مفت دیا جا رہا ہے۔

جاتی ہو، گھوڑے کی طرح بھاگ کر ڈیوٹی پر جاتی ہو، گدھے کی طرح دن بھر کام کرتی ہو، لومڑی کی طرح ادھر ادھر کلاسیں لیتی رہتی ہو، بندر کی طرح پھیل کے اشارے پر ناپتی ہو، گھر آ کر فیملی پر کاٹ کھانے کو دوڑتی ہو۔“ اب بھلا بتاؤ انسانوں کا ڈاکٹر تمہیں کیا خاک ٹھیک کرے گا۔“

ارم کمال..... فیصل آباد

تجربہ

ایک پاگل سائنس دان نے کمبے کے دونوں پر کاٹ دیے اور کہا۔ ”اڑ، جا۔“ وہ نہیں اڑی۔ سائنس دان:- ”تجربے سے ثابت ہوا، اگر کمبے کے دونوں پر کاٹ دیے جائیں تو وہ سن بھی نہیں سکتی۔“

بدنامی

ایک پشمان سوکھے دریا میں کشتی چلا رہا تھا۔ دوسرا پشمان! ”ایسے پشمانوں نے ہمارا نام بدنام کیا ہے، اگر ہم کو تیرنا آتا تو جا کر اس کو بہت مارتا۔“

نشانی

”مس! گاندھی جی کے سر پہ بال کیوں نہیں تھے؟“
”مس!“ بیٹا یہ ذہین آدمی کی نشانی ہے۔“
بچہ! ”اچھا تب ہی لڑکیوں کے اتنے لمبے بال ہوتے ہیں۔“

خودکشی حرام

ایک سیاست دان خودکشی پر تقریر کر رہا تھا کہ ”خودکشی حرام ہے، ظلم ہے، گناہ ہے، بزدلی ہے، پاگل پن ہے۔“
”ایسی موت مرنے سے بہتر ہے کہ انسان اپنے آپ کو گولی مار دے۔“

مہرین جاوید..... لاہور



کا کردار بہت اشرارنگ تھا۔ دوسرا حصہ پڑھ کر پھر میں نے کہانی کا پہلا حصہ بھی پڑھا۔ قرۃ العین سکندر کا ناول ”شہر درد میں ڈوبی تنہائی“ بھی بہت اچھا تھا۔ افسانہ ”اک تمنا لا حاصل“ (ساجدہ حسین) پسند آیا۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہم کچھ انوکھے کام کر جاتے ہیں۔

”کرن کتاب“ ”کرن کا دسترخوان“ دن بہ دن نکھرتی جا رہی ہے۔ اس کے مفید سلسلے بھی مجھے بے حد پسند ہیں۔ بس وقت کی کمی کے باعث اس کے سلسلوں میں شرکت سے محروم ہوں۔

ج۔ پیاری بہن ثمنین! آپ کی کمی بہت محسوس ہوئی، مگر یہ سوچ کر چپ رہے کہ آپ اپنی مصروفیات کی وجہ سے کرن کی محفل میں شریک نہ ہوئیں۔ آپ کا کرن کی محفل میں شریک ہونا بہت اچھا لگتا ہے۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ آپ ہر دفعہ کرن پر تبصرہ کریں۔ آپ فرصت نکال کر ”کرن کتاب“ کے سلسلوں میں شامل ہوں، ہمیں بہت خوشی ہوگی۔

اقرا جٹ..... منجن آباد

”کرن“ سے ہمیں ڈھیر دل شکوے ہیں بھئی، ہر دفعہ ہمیں رد کر دیا جاتا ہے۔ مگر پھر بھی ہماری محبت دیکھیں، ہم باقاعدگی سے کرن پر مکتب دیتے ہیں۔ اکتوبر کا ٹاسٹل ٹاس تھا۔ ”کچھ لوگ جا کر بھی گیا کرتے ہیں“ مصباح علی سید ونڈر فل موتیوں کو قلمبند کیا آپ نے۔ انٹرویوز زبردست رہے۔ بات ہو جائے افسانوں کی، تو جی ”ایک سویرا تین رنگ“، عمارہ خان ونڈر فل، ملکی پھلکی تحریر میں اک میٹھا ساقی ”پڑکھ“ نازی جی آپ کے تو کیا کہنے۔ (ماشاء اللہ) ”بہار لسن“ شبنم شوکت جی ونڈر

ثمنین! اکرم..... بہار کا لونلی ملیر سب سے پہلے مجھے ”من مورکھ“ اور پھر ”مہجور نشمین“ پڑھنا ہوتا ہے۔ مگر اپنے سب روٹین کے کام ختم کر کے اطمینان سے ہی ڈائجسٹ لے کر بیٹھتی ہوں۔ ”بیاد محمود فیصل“ مصباح علی سید کے قلم سے ”کچھ لوگ گیا کرتے ہیں“ لفظ لفظ جیسے کہ آنسوؤں سے لکھا گیا ہو۔ جو لوگ دلوں میں زندہ ہوں وہ مر کر بھی نہیں مرتے، امر ہو جاتے ہیں۔ اللہ پاک ذوالقرنین جی کو جنت کے باغوں میں رکھے۔ (آمین) 11 نومبر کو شہید معیز اکرم کی بھی پانچویں برسی ہے۔ دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔ آپ سب لوگوں سے..... ”من مورکھ“ پسندیدگی کے لحاظ سے صف اول پر آتا ہے۔ پورے کرن میں اس کی کہانی بہت زیادہ دلچسپ موڑ پر آگئی ہے۔ باہر کی شخصیت میں آنے والی مثبت تبدیلی نے جیسے ”من مورکھ“ کی پوری کہانی کو ہی بدل کر رکھ دیا ہے۔ ”مہجور نشمین“ شکر ہے ضیل کی مشکلات آسان ہوئیں اور وہ بھی پردیس کا بن باس کاٹ کراپٹوں میں واپس لوٹ رہا ہے۔

روانیکہ کی نادانی دیکھیں کہ اتنی بڑی خبر اپنے شوہر سے چھپائے رکھی۔ اب ضیل کا ری ایکشن نہ جانے کیا ہو۔ مکمل ناول ”رمز حب“ مریم جہانگیر کا اپنے نام کی طرح منفرد اور اچھوتا لگا۔ اس ناول کی کہانی بہت جان دار اور مکالمہ بازی و جملہ نگاری غضب کی شان دار تھی۔ ”رہنزل“ کی آخری قسط کی خوش خبری ملی۔ عزت عباسی کا انٹرویو پڑھا۔ ”روشن چہرہ“ (عزیزین ولی) کا دوسرا حصہ ”موحد“ (نام کی وجہ سے) پڑھنا شروع کیا۔ موحد میرا فیورٹ نام ہے۔ پوری کہانی موحد کی وجہ سے پڑھی، مگر بعد میں پتا چلا کہ کالی دلچسپ اسٹوری ہے۔ اس میں مریم

کہانیوں کے بارے میں کوئی رائے نہیں دی۔ امید ہے کہ اگلے ماہ ان شاء اللہ آپ اپنے خط میں یہ کمی دور کر دیں گی۔

فضہ نور..... روہڑی

اس بار ہمیشہ کی طرح کرن 17 تاریخ کو ملا۔ جلدی سے ”تائے میرے نام“ کی طرف بڑھی، لیکن اپنا نام نہ پا کر افسردگی ہوئی۔ اس ماہ کا ٹائٹل بس ٹھیک تھا۔ انٹرویو میں میرا کبھی سے ملاقات اچھی رہی۔ مکمل ناول ”مہجور نشین“ مصباح جی شکر ہے جنبل کی ساری مشکلات کو دور کیا اور وہ واپس آ رہا ہے اور روانیہ کا انتظار ختم ہونے جا رہا ہے۔ جس طرح مصباح آپ نے جرنی کے قانون کے بارے میں بتایا ہے ہماری رائے کو کافی ناچ

کے بعد کہانی لکھتی ہیں۔ یہ بہت محنت کا کام ہے۔ سلسلے وار ناول ”رہنزل“ تنزیلہ جی نے جس طرح ماضی اور حال دونوں کو ساتھ بیان کیا، بہت زبردست تھا۔ ناولٹ ملیحہ راشد ”زندگی کے رنگ انوکھے“ وبری ٹائٹل پھوپھی انسان کے روپ میں شیطان تھیں۔ بے چاری یتیم بھتیجیوں پر ظلم کرتی رہیں۔ آپ نے مجھے پوچھا ہے کہ اپنی پیاری قارئین سسر کے نام پیغام بھیجتا ہے کرن کتاب میں طریقہ بتادیں۔

ج:- پیاری فضہ! آپ کے خط ہمیں مل جاتے ہیں، مگر دیر سے، مگر پڑھے ضرور جاتے ہیں۔ آپ پیغام لکھ کر پوسٹ کریں کرن کتاب میں لگا دیا جائے گا۔

عائشہ..... چٹوکی

سب سے پہلے تو میں آپ کو یہ بات بتا دوں کہ میں کرن میں پہلی دفعہ خط لکھ رہی ہوں اور اس امید کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ میرا خط آپ ضرور شائع کریں گی۔ میرا تعلق کرن کے ساتھ بہت پرانا اور گہرا ہے۔ دو تین ماہ بعد میری شادی ہے اور اب پتا نہیں کہ میں بعد میں بھی کرن پڑھ سکوں گی یا نہیں۔ ویسے ان لوگوں کو پہلے سے پتا ہے کہ میں ناول پڑھتی ہوں اور ان کو اعتراض بھی نہیں ہے۔ ویسے ان شاء اللہ میں پڑھوں گی، کیونکہ میرے ان

فل ”ایک تمنا لا حاصل“ تھوڑی عجیب اسٹوری تھی۔ ”من مورکھ“ آسیر مرزا خوب رنگ کھیر رہی ہیں۔ ”مہجور نشین“ مصباح جی جنبل کے ساتھ کچھ نہ ہو اس اسٹوری میں، بڑی شدت سے نیکسٹ قسط کا انتظار ہے۔ ”رہنزل“ تنزیلہ جی ادے کا بدعائیں دینا ایک آنکھ نہیں بھایا، ہم کو ”کونین اچھی ہے۔ ٹائٹل سی ہے۔“ شہر درد میں ڈوبی تہائی، ”قرۃ العین جی بہت اعلیٰ لکھا۔“ ”روشن چہرہ“ عزیزین ولی دوسرا اور آخری حصہ بھی شان دار تھا۔ ”زندگی کے انوکھے رنگ“ ملیحہ راشد موضوع زبردست چنا آپ نے۔ اور سب سے اینڈ پرچی پر بات ہو جائے رزح کی سب سے سہرنگی یہ اسٹوری موضوع بھی یونیک تھا۔ اسی طرح انٹری دیتی رہیں اور ہمیں اپنی تعریف کا موقع دیں جی۔

ج:- پیاری اقرا! ارے بھئی ایسے کیسے سوچ لیا کہ آپ کو رد کیا جائے گا۔ آپ کا یہ خط ہم کو ملا ہے اور شائع کر دیا گیا۔ کرن کی پسندیدگی کا شکریہ۔ آپ ہر دفعہ اس طرح خط لکھیے کہ ہم کو 26 تک بھی مل جائے گا تو شائع ضرور کیا جائے گا۔

یاسمین کنول..... پسرور

اکتوبر کی ماڈل جیسی مسکراہٹ کے ساتھ بری پیاری لگی۔ فیروزی بچ نے اس کی دلکشی کو مزید ابھارا۔ میرا کبھی کا انٹرویو اچھا لگا۔ ”رہنزل“ لگتا ہے آخری مراحل میں ہے، اللہ کرے انجام اچھا ہوا۔ افسانوں میں ”اک تمنا لا حاصل“ اچھا لگا۔ مستقل سلسلے تو ہوتے ہی اچھے ہیں۔ ”بیاد محمود بابر فیصل“ کے حوالے سے ”مصباح علی سید“ نے اچھا لکھا۔

انشاء جی جی بیگم ٹھیکہ انشاء اس جہان فانی سے کوچ کر گئیں۔ بے حد افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جو ار رحمت میں جگہ دے اور خاندان کو صبر جمیل بخشے۔ (آمین ثم آمین)

ج:- یاسمین کنول جی! واقعی میں جو لوگ دنیا میں اچھے کام کرتے ہیں، وہ ہمیشہ یاد رہتے ہیں اور لوگوں کے دلوں میں رہتے ہیں۔ اللہ سب کی مغفرت فرمائے۔ (آمین) آپ کا خط کچھ ادھورا سا لگا، آپ نے کرن کی

ٹھک ہی تھی۔ ”بہار نسرن“ نام تو بہت اچھا تھا، لیکن اسٹوری بالکل سیدھی ساٹ لوائسٹوری، لیکن بری نہیں تھی۔ باقی تمام سلسلے بھی اچھے تھے۔ ”مہجور نشین“ ابھی میں نے پڑھا نہیں، لیکن آئندہ ماہ پوری کوشش کروں گی اس پر تبصرہ لکھ سکوں۔

ج: ارم بشر! بار نے بے شک کہا تھا کہ وہ مومنہ کے سامنے نہیں آئے گا، لیکن محبت میں انسان کا دل و دماغ کہاں اپنے بس میں رہتا ہے اور دوسرے بابر اب اس گھر کا سربراہ ہے، ممکن نہیں کہ ایک گھر میں آنا سامنا نہ ہو۔ کہانیاں جو پسند آئیں اور جو نہیں پسند آئیں ان کے بارے میں اپنی رائے سے آگاہ کرنے کا بے حد شکریہ۔

صدرہ بٹول..... ملتان

اس ماہ (اکتوبر) کے کرن میں اپنا خط دیکھ کر یقین کریں دل نوٹے نوٹے ہو گیا۔ یوں لگا جیسے بھری بس یا گاڑی میں کسی کو زبردستی بٹھا دیا جاتا ہے اور اجتماعی طور پر فیصلہ کیا جاتا ہے کہ بس نہ اس سے کوئی بات کرے، نہ اس کی بات کا جواب دے، اس سے اچھا آپ میرا خط شامل نہ کرتے تو مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا، جتنا ادھر اور نور پورانی والا خط دیکھ کر ہوا۔ خط کا جواب ضرور دیجیے گا، یہ ہی حال دوبارہ مت کیجیے گا۔ ورنہ بچا کچھ دل سرے کی طرح ہو جائے گا۔

ج:- پیاری صدرہ! ہمیں آپ کے دکھ کا اندازہ ہے، لیکن یقین کیجیے کہ یہ قصور ہرگز ہم سے سرزد نہیں ہوا۔ ہوتا یہ ہے کہ صفات کی کمی کی وجہ سے ہمارا پیٹنگ کا شعبہ ہمیں بتائے بغیر آخری خط میں سے ایڈیٹنگ کر دیتے ہیں۔ جس کا علم ہمیں بعد میں ہوتا ہے۔ اس کے لیے ہم آپ سے معذرت خواہ ہیں۔ ناؤٹر کے بارے میں جو آپ نے ہم سے پوچھا ہے تو 0212735021 پر فون کر کے معلوم کر لیجیے۔

حتا نور..... ایبٹ آباد

سب سے پہلے افسانے پڑھے۔ ”ایک تمنا“

اور الودوں اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ان کے جانے کے بعد اگر میں مضبوط بنی ہوں تو کرن کی کہانیاں پڑھ کر، اس لیے یہ اب میری زندگی کا حصہ ہے۔ اب آتی ہوں اس ماہ کے ڈائجسٹ کی طرف، تو ناؤل بہت پیاری لگ رہی تھی۔ جی سب سے پہلے چھلانگ لگائی مصباح علی سید کے ناؤل پر، شکر ہے جنبل جرمی سے واپس آ رہا ہے اور جب روانہ ہوئے اسے نیا سر پرائز دے گی تو سوچ کر بڑی خوشی ہو رہی ہے۔ پلیز مصباح جی ان دونوں کو جدا نہ کرنا، باقی کی کہانیاں ابھی نہیں پڑھیں اور ایک بات آپ سے کرنی تھی کہ جولائی 2017ء کا شمارہ میں نے نہیں پڑھا اور اب مجھے مل بھی نہیں رہا۔ پلیز! مجھے بتادیں کہ میں جولائی کا شمارہ کہاں سے لے سکوں۔ پلیز! میرا خط ضرور شائع کریں۔

ج:- پیاری عائشہ! ہماری طرف سے بھی آپ کو شادی کی بہت بہت مبارک ہو۔ ان شاء اللہ سہ ماہ میں بھی آپ اور کرن کا ساتھ رہے گا۔ کرن کی پسندیدگی کا شکریہ اور جولائی 2017ء کا کرن آپ اپنا ایڈریس اور 100 روپے کا منی آرڈر بھیجو اگر منگوا سکتی ہیں۔

ارم بشر..... اسلام آباد

اس ماہ کا کرن ٹائٹل اچھا تھا۔ عزت علی میرا سیٹھی کا انٹرویو اچھا تھا۔ ”کچن اور آپ“ میں فائزہ بھیجی کی باتیں بہت مزے کی لگیں۔ تھوڑی سی کمی یہی لگی کہ اگر انٹرویو کے ساتھ تصویر کا آپشن بھی ہوتا تو ہم فائزہ کی پیاری باتوں کے ساتھ اس کی پیاری صورت بھی دیکھ لیتے، خیر..... ”من مورکھ“ اس دفعہ اچھا تھا۔ ایک بات کہوں۔ آسیہ جی! بابر نے حور یہ کو یقین دلایا کہ وہ اس کے سامنے نہیں آئے گا، مگر پوری قسط میں بار بار دونوں سامنے آئے۔ اب یہ تو ہمیں پتا ہے کہ اسٹوری ہے ہی ان دونوں کی، مگر پھر بھی ایک قسط تک تو بابر اپنی بات قائم رہتا۔ خیر..... ”روشن چہرہ“ بہت زیادہ اچھی تو نہیں تھی، بس اچھی تھی، پہلی قسط سے ہی اسٹوری پتا چل گئی کہ موصد ہی مریم کا ہیرو ہے۔ ”ایک سویرا تین رنگ“ عمارہ خان نے بہت اچھا لکھا۔ ”ایک تمنا لا حاصل“ بھی بس

لاحاصل“ سادہ حسین نے لکھا اور وہ ہی جانتی ہوں گی کہ لکھا کیا، مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی، اگر کسی قاری کو آئی ہے تو پلیز ہمیں بھی بتادے۔ مریم کا آخر کیا قصہ تھا۔ باقی دو بھی پڑھے، بہت عام سے، مگر اچھے لگے، پھر باری آئی اپنے ”من مورکھ“ کی تو وہ پڑھی، بے شک آسیہ اپنے پرانے رنگ میں پرانا ہی پلاٹ لکھ رہی ہیں، مگر پھر بھی مزادے رہا ہے، ”رہنزل“ پلٹے پلٹتے بھی وقت لے رہی ہے اور دل کی بات کہوں گی میں تو چاہتی ہی نہیں یہ لپٹ کر دے، اس قدر پسند ہے، اس کے بعد ہم کریں گے کیا۔ ”زری کی باتیں“ بہت ہی دل دکھاتی ہیں، کس طرح ماں کے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ ”مجبور نشین“ میں مصباح علی نے ساتویں قسط میں بھی گرفت نہیں چھوڑی، جس سین میں روانیہ خلیل کا فون بارش میں بیٹھ کر سنتی ہے، ایک وہ سین اور ایک خلیل اور اس کی ٹیلی فونک گفتگو مجھے بہت زیادہ پسند آئی۔ بہت ہی خوب صورت جملے اور بے قراری تھی، کئی جگہ رونا آیا، پلیز مصباح خلیل کو مار کر اتنا ظلم ہم اسٹوڈنٹس پر مت کرنا۔ باقی سلسلے بہت اچھے تھے۔ کچھ تو ابھی خط لکھنے کے چکر میں پڑھے نہیں۔

ج :- پیاری حنا! کرن کی محفل میں شریک ہوئیں۔ اچھا لگا، امید ہے کہ آئندہ بھی اس سے زیادہ اچھے تبصرہ کے ساتھ شریک ہوں گی۔

صغریٰ خاتون..... جڑاں والا

آج سے پہلے کبھی اتفاق نہیں ہوا خط وغیرہ کسی ادارے میں لکھنے کا۔ اب ایسا بھی نہیں بہن کہ کبھی خط لکھا ہی نہیں، جوانی میں بہت لکھے اپنے مایاں کو شادی سے پہلے بھی کرن تھے۔ کچھ دن پہلے میری بیٹی آئی ہوئی تھی پیہر زدے کر، ڈرامے، رسالے سب دھو ڈالے۔ اسی کے اکسانے پر تو ہم نے خط لکھا، ایک وجہ یہ جو بچی لکھ رہی ہے ”مجبور نشین“، مصباح علی بہن اسے تو میرا بہت ہی پیارا کہتا اور یہ بھی پوچھو یہ بچی رائٹر ہے؟ پروڈیوسر ہے؟ یا اداکارہ، ایسے لکھ رہی ہے قسم سے جیسے کوئی بڑی سی ایل سی ڈی سامنے لگا کر چلا دی ہو، پتا ہی نہیں چلتا صفحہ پڑھتے آنکھ تب جھپکتے ہیں جب پڑھو باقی آئندہ جو غصہ اس وقت

چڑھتا ہے بیان کے قابل نہیں، اگر یہ ہوئی میری اولاد پھر اس میں اسے اتنا کھانے کا بتاتی نیچے جلدی پورا کر دو، شدید انتظار رہتا ہے، یہ تو ہو گیا ”مجبور نشین“ کا رونا، اب باری آگئی ”رہنزل“ اف..... اف..... تیز پلے میری بہن مجھے ملو گی کہاں، کوئین تو دل میں ایسے ٹھاٹھا لگی ہے بیان کے قابل نہیں، رونے والے جملے تھے بھی نہیں، میں پھر بھی روتی رہی، ایسے ہی تو وہ فریضہ نہیں ہے اس بچی ایمین پر، ایک نئی رہنزل کو بننے سے روکنا چاہ رہی ہے۔ ”من مورکھ“ کی بات ناسینو بہت ہی معذرت کے ساتھ آسیہ بیچ میں بہن میں تمہارے عنوان پر چند اقساط کے بعد ہی پوری طرح کار بند رہی، نہ سنا، نہ پڑھا، نہ دیکھنے کو جی چاہا، وجہ یہی نے سنادی، جناب ویلن ہیرو بن گیا، چلو جی اچھا کیا، افسانے پڑھے، بہن چاروں ہی اور لکھتی کہوں گی اس ماہ کے کسی افسانے متاثر تو کیا تو جب تک نہیں چنچنی نہ لفظ، نہ کہانی، بے سرو پا لکھ کر صفحے گھیرے۔ ناولٹ غبرین ولی کا روشن چہرے پر کیا خوب صورتی سے لکھا گیا، پڑھ کر دل بھی اجلا اجلا سا لگنے لگا۔ قرۃ العین بھی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ کہانی اور بیان اچھا شاباش مکمل ناول ”رمز حب“ نرم جہانگیر نام سے بالکل نئی رائٹر لگی۔ چند صفحے، مگر بے جا طوالت کا تاثر ملا پڑھا نہیں گیا۔ آج مکمل پڑھوں، پھر اس پر بھی رائے دوں گی، بہن خط لکھنا اتنا مسئلہ نہیں جتنا پوسٹ کرنا، جان جو کھا ہے بس پوسٹ کی سہولت مل گئی تو پھر نہ لکھیں، تب سستی کھلائے۔

ج :- پیاری بہن! آپ نے خط لکھا، خوشی ہوئی، لیکن لگتا ہے خط لکھنے کی جلدی میں کہانیوں پر توجہ نہ دی، جب ہی ایک بھی افسانہ اچھا نہ لگا آپ کو۔ مصباح تک آپ کا پیار پر پھنچا دیا گیا ہے۔

ام مریم..... پشاور

اس بار کا کرن 13 تاریخ کو موصول ہوا اور میٹھے میٹھے تاثر والی مائل نے پھر پھر توجہ نہینی کرن کا سرورق دل میں گھر کر جاتا ہے، رسالہ اپنی تمام تر دلکشی کے ساتھ پڑھا اور داد دی آپ کی اور رائٹر کی محنت کو۔ افسانے میں ایک ہی نشست میں پڑھتی ہوں، ناز پہ کنول نازی کا پرکھ

مصباح علی سید تک آپ کی خواہشات پہنچا دی گئی ہیں۔

سعدیہ..... قائد اعظم یونیورسٹی

حقیقت یہ ہے میں تو کرن پڑھ ہی ”رہنزل“ اور ”مہجور نشین“ کی وجہ سے رہی ہوں۔ مصباح اور تنزیلہ جی کی ہیرنٹوں اور ہیرنٹ نے باندھ رکھا ہے۔ ایک طرف کونین، دوسری طرف روانیہ، میں جاؤں تو کہاں ایک طرف صبل، دوسری جانب سمیع پلین جلدی سے سمیع کے دل میں نینا کی بے تحاشا محبت کا بوتلا گادیں اور صبل کو بھیج کر واپس پاکستان، بہت زیادہ مصروفیت کے باوجود کرن ہاتھ میں آتے ساتھ ہی لسٹ سے صفحہ نمبر پڑھا اور غراب ان کے کتابی شکل میں آنے کو بک ریک بے قرار ہے اور دل اداس، دونوں لگتا ہے آگے پیچھے ساتھ چھوٹنے لگے ہیں۔ تنزیلہ مصباح کو بہت بہت سلام۔

ج: پیاری سعدیہ! ”رہنزل“ اور ”مہجور نشین“ کی پسندیدگی کا شکریہ۔ آپ کا سلام تنزیلہ ریاض اور مصباح علی سید تک پہنچ گیا ہے۔

ندا احمد..... ہری پور

اس ماہ کا کرن ہمشہ کی طرح جھمکتا رہا۔ ”رہنزل“ ٹاپ آف لسٹ اور مزے کی بات کے ”مہجور نشین“ کی نئی رائٹر مصباح علی سید نے بہت جلد پرانی رائٹرز میں اپنی پہچان بنالی۔ اللہ زور قلم زیادہ کرے۔ افسانوں میں ”ایک سویرا“ پسند آیا۔ ”رمز حب“ مریم جہانگیر کا بہت زبردست لگا۔ میں نے خاص طور پر خط اس لیے لکھا ہے میرے لیے خاص دعا کروائیں، اپنی فیملی سے تین رشتے ہیں، بہت مشکل سلیکشن ہے میرے حق میں، اچھا فیصلہ ہوتا۔ یا ماموں اور خالہ کوئی ناراض نہ ہو۔

ج: پیاری ندا! آپ نے نشین کی وجہ سے تبصرہ بھی پس تموز اس کیا۔ ان شاء اللہ۔ اللہ آپ کے حق میں جو بہتر سمجھے گا وہی ہوگا۔ ہماری دعا ہے کہ آپ آئندہ خوشی خوشی کرن کی محفل میں شریک ہوں۔

ماہا کائنات خان..... شاہ سوار

بہت ہی حساس موضوع تھا۔ خاندانی رسم و رواج کی بھینٹ اولاد کو چڑھانا کہاں کی شریعت یا اونچی بات ہے، بوڑھے کر کے رشتے کرتے رہتا کہ نہ ان کا پناہ دل رہے، نہ ہی اولاد کی خوشی دیکھ سکیں۔ افسانوں میں یہ ہی کمال کا تھا، باقی سوسو، ناولٹ عزیزین دلی کا روشن چہرہ، ایسا کون ہوگا جسے صبح کی روشنی پسند نہ ہو، کیسے کالی سیاہ رات کے اندھیرے کو مٹا کر رکھ دیتی ہے۔ بہت اچھا لگا۔ مکمل ناول مریم جہانگیر ”رمز حب“ واہ واہ لفظ مناظر تسلسل ہر چیز پر پوری طرح چھائی ایک محبت کی لیلیٰ بنجوں جیسی کہانی اور مکمل۔ کئی جگہ آنکھ نمھ آئی کئی جگہ اشک کیا جس طرح سے کہانی نے کر چلیں بہت سے موڑ بہت سے توڑ مجھے ہمیشہ سے ایسی ہی کہانیاں پسند آتی ہیں، جن میں کہانی ہی کہانی ہو ویلڈن۔ ”مہجور نشین“ مصباح علی سید اب تعریف والفاظ کی محتاج نہیں رہیں، اگر سب اس ناول کو بے پناہ سراہ رہے ہیں تو اس میں ان کی سالوں کی محنت ہر ہر پہرے میں جھلک رہی ہے، ان تک میری دوفرہائش پہنچا دیں، پلیز ایک تو خدا را کہانی میں ایک ایئر کر لیں بہت نہیں؟ صبل کا دکھ روانیہ تو کیا ہم سب قارئین بھی سہار نہیں پائیں گے۔ دوسرا ان کے بارے میں جاننے کا بہت شوق ہے۔ پلیز پلیز پلیز ان کا چھوٹا سا ہی سمجھ، مگر ایک انٹرویو ناول کے اختتام پر ضرور لگائیں، بہت کچھ پوچھنا ہے ان سے۔ ”رہنزل“ دلوں میں گھر کرنے کے بعد جگہ کر جدا ہوتی تحریر، تنزیلہ جی کا شاہکار کونین اپنی پرانی تمام لڑائی جھگڑا عادات کے ساتھ دل کے بہت قریب رہی اور اب تو وہ بالکل سانس کے قریب ہو گئی۔ معذور سلیم ابھی یاد آتا ہے۔ زری تو مجھے پہلی قسط سے ہی چلنے لگی تھی۔ خاور..... آہ اور سمیع کی محبت واہ کاش شہرین ٹھیک ہو سکتی۔ کاش نینا، خاور کی ہوتی۔ کاش امین سمیع کی توجہ پائی، کتنے کاش رہ جاتے ہیں اس کہانی میں۔ کرن کتاب اور باقی سلسلے آپ کی طرف سے ہمیں محبت کے بونس میں قبول ہوتے ہیں جن کا دل سے شکریہ۔

ج: ام مریم! کرن کی پسندیدگی کا شکریہ۔

”شہر درد میں ڈولی تھپائی“ زہرہ نے درانی سے اچھا نہیں کیا۔ صرف دولت کی خاطر درانی کو ٹھکرا کر شعیب سے شادی کی۔ ”روشن چہرہ“ بھی اچھی اسٹوری تھی۔ معذرت کے ساتھ اس دفعہ مسکراتی کرنیں پسند نہیں آئیں۔ ”نامے میرے نام“ میں ارم کمال کی واپسی اچھی لگی۔ کرن کتاب میں صباحت بخاری کو پڑھا فائزہ بھٹی کے جوابات بھی کرارے لگائے۔

ج:- پیاری اقراء ممتاز!! اب کی دفعہ بھی آپ نے کرن کی کہانیوں پر تبصرہ بہت خوب کیا۔ ہمیں افسوس ہے کہ آپ کو اس دفعہ ”مسکراتی کرنیں“ پسند نہیں آئیں۔ اقراء یہ آپ بہنوں کا ہی سلسلہ ہے اور آپ بہنوں کی سبھی گئیں۔ ”مسکراتی کرنیں“ ہی شائع کی جاتی ہیں۔ کیونکہ بہنوں کی خوشی کا خیال رکھا جاتا ہے۔

تبسم بشیر عروسی..... شاہ سوار ڈنگہ ٹائٹل بس سو سولگا، حمد و نعت سے ایمان کو غسل دیا اس کے بعد ”کچھ لوگ جا کر بھی جیا کرتے ہیں“ پڑھا واقعی کچھ لوگ نہ ہونے کے باوجود بھی ہمارے دلوں میں ہمیشہ رہتے ہیں۔ کیا خوب لکھا مصباح نے۔ انٹرویوز پر ایک نگاہ دورانی۔

”میرے نام“ یہ پہنچ تو یہ کیا ہم وہاں تھے ہی نہیں ایک پل کو سوچا کہ میں نے تو وقت یہ خط پوسٹ کر دیا تھا تو پھر کرن ہمیں رنجیکٹ کرے ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا، اور پھر بہت سوچنے سمجھنے کے بعد ڈاک والوں کو خوب ساری دعائیں دیں۔ ”رہنزل“ پلیر ختم کریں اور کسی اچھی سی رائٹر کا سلسلہ وار شروع کریں۔ جیسے نگہت عبداللہ یا راحت جیوں؟ مکمل ناول ”رمز حب“ کا مطلب کیا ہے؟ ویسے ناول اے دن تھا امیرنگ۔ ”روشن چہرہ“ دو اقساط کا ناول نہ زیادہ لمبا کھینچا نہ زیادہ انتظار کروایا حزا آ گیا۔ عزیزین دلی آتی رہا کریں۔ ”انوکھے رنگ“ بس ٹھیک ہی لگا۔ ”شہر درد میں“ ویل ڈن قرۃ العین جی۔ بہت اچھا لکھا آپ نے، افسانے اس دفعہ چار تھے، ٹاپ پہ عمارہ خان کا ”ایک سویرا تین رنگ“ ویل ڈن عمارہ واقعی ایسا ہی ہے ہر کوئی دوسروں کو دیکھ کر کہتا ہے کہ اس کی زندگی تو ہم

ہم 2015ء میں سے کرن پڑھ رہے ہیں۔ پہلی بار فائزہ افتخار کا ناول ”شاید“ پڑھا تھا بس کرن کے عاشق ہیں، اس ماہ ٹائٹل بس ٹھیک تھا فائل ٹائٹل دیا کریں۔ ”رہنزل“ پلیر ختم کریں ”من مورکھ کو بھی۔“ مقابل ہے آئینہ میں مجھے اتنی جلدی جگہ دینے کا بہت بہت شکریہ۔ ”رمز حب“ پسند نہیں آیا۔ ”زندگی کے انوکھے رنگ“ اور ”روشن چہرہ“ ٹاپ پہ رہے جبکہ قرۃ العین سکندر اس دفعہ متاثر نہیں کر سکیں۔ ”برکھ“ ”بہار نسرین“ بھی خوب رہے۔ شانہ آپنی ناول لکھ ڈالیں۔ ”محبت ہم سفر جیسا، عمارہ اور ساجدہ نے بھی اچھا لکھا۔ مستقل سلسلے اے دن تھے۔

ج:- پیاری ماہ! اللہ تعالیٰ آپ کی امی کو یوں ہی صحت یاب رکھے آئیں۔ کرن کی کہانیاں آپ کو پسند آئیں شکر یہ اور جو پسند نہیں آئیں ان کا بھی شکریہ۔

اقراء ممتاز..... سرگودھا ٹائٹل گرل کی مسکراہٹ نے دل مولیا۔ انشاء جی کی اہلیہ محترمہ شکیلہ انشاء کی وفات کا سن کر دکھ ہوا خدا ان کو جنت الفردوس میں جگہ نصیب فرمائیں (آمین) ”کچھ لوگ جا کر بھی جیا کرتے ہیں“ مصباح علی سید کو پڑھا۔ تمام انٹرویوز اچھے تھے۔

”من مورکھ کی بات نہ مانو“ میں حوریہ شکر ہے تھوڑی بہت راضی تو ہوئی۔ حوریہ کو چاہیے کہ بابر کا ہاتھ تھام لے۔

”زندگی کے انوکھے رنگ“ اچھی کاوش تھی۔ بلقیس بیگم تو چھو پھو کہلوانے کے قابل بھی نہیں تھیں۔ حریم نے اپنی زندگی کو داؤ پر لگا کر ثابت کر دیا کہ بہن سے بڑا کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ خدا نے اس کی قربانی را نگاں نہیں جانے دی۔ ”مہجور نشین“ کی یہ قسط کیا سپر ہٹ تھی۔ منبل ذکا شکر ہے خیر خیریت سے واپس پاکستان تو پہنچا۔ ”رمز حب“ اس کہانی کے بارے میں کیا کہوں۔ اس اسٹوری نے شروع سے ہی اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ زین کی باتیں ہمیں تو حیران پریشان کر دیتی تھیں کہ اتنی چھوٹی عمر میں اتنی بڑی بڑی باتیں۔

کے حد شکر یہ ہے آپ قارئین کی محبت اور رائے ہے جس کی روشنی میں ہم کرن کو بہتر سے بہتر کرنے کی کوشش میں کوشاں ہیں۔ ”بھورنشین“ میں روانیہ پہلے لڑکی تھی شادی لڑکی میں تھوڑی بہت تو تبدیلی لاتی ہی ہے یہ ایک قدرتی تبدیلی ہے۔

کرن مشتاق احمد، مہوش مشتاق احمد..... ساہیوال
ایک لمبے عرصہ سے ہم کرن میں حاضر ہونے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن شاید ابھی قسمت میں منظور نہیں ہے۔ ایک سال مسلسل اتنے خطوط بھیجے ہیں کہ اب تو خود یاد دہیں ہے، پوسٹ آفس گئے۔ TCS کے لیے لیکن جب طویل انتظار کے بعد کرن ہاتھ میں آتا تو وہاں دنیا جہاں کے نام ہوئے سوائے ہمارے۔ لیکن اب ایک بار پھر ہم کوشش کر رہے۔ شاید اس بار کرن کو رحم آ جائے۔ کرن کو آٹھ، نو سالوں سے پڑھ رہے ہیں گھر میں کرن کی ایک کثیر تعداد موجود ہے (ہاہا) آپ کی کہتی ہیں اتنی تو گھر میں اینٹیں نہیں ہیں جتنے تم لوگوں کے میگزین ہیں۔ اب کیا کریں کرن سے محبت ہی بہت ہے۔ اب اگر آپ نے ہمیں جواب نہ دیا تو ہم نے خفا ہو جانا ہے۔ سچی، اب ضرور جواب دیجیے گا۔

ج:۔ پیاری کرن اور مہوش! ہمیں حیرت ہے کہ آپ لوگوں نے اتنے خطوط بھیجے اور ہمیں ایک بھی نہیں ملا۔ حد ہے۔ ٹی سی ایس کے ذریعے بھیجے جانے والے خطوط بھی ہمیں نہ مل سکے۔ آپ لوگوں کا یہ پہلا خط موصول ہوا ہے جو شائع کیا جا رہا ہے۔ کرن سے محبت اور پسندیدگی کا شکریہ۔ ایک شکایت ہمیں بھی ہے کہ کہانیوں پر تبصرہ آپ نے نہیں کیا جو اس محفل کو سجانے کا مقصد ہے۔ نور فاطمہ عابد..... میلی

میرے ماما، پاپا بالکل بھی ایسے نہیں کہ رسالے پڑھنے پر پابندی عائد کریں، بس اتنا کہتے ہیں، جب گھر آؤ، تب پڑھو اور پہلے تعلیم۔ اسی لیے میں بھی انہیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دیتی، تاکہ پابندیاں نہ لگیں۔ اس بار کا شمار بہت اچھا تھا۔ ویسے کرن نے گزشتہ تین سال میں اپنا معیار بہت اچھا کیا ہے، اس کی اہم وجہ بہترین

سے بہتر ہی ہے۔
نازیہ کنول نازی نے بھی بہت خوب لکھا، جبکہ شانہ شوکت اس دفعہ کچھ رنگ نہ جاسکیں، سادہ نہ بھی اچھی تحریر لکھی، ”مستقل سلسلے مجھے“ ”کرن کرن خوشبو“ بہت پسند ہیں۔

ج:۔ پیاری تبسم! ہم خطوط رنجشکٹ نہیں کیا کرتے کیونکہ آپ بہنوں کے خطوط سے ہی تو آپ لوگوں کی آراء سے آگاہی ہوتی ہے۔ بس شرط ہے وقت پر ملنا چاہیے دیر سے ملنے پر خطوط پڑھنے ضرور جاتے ہیں بس شائع ہونے سے رہ جاتے ہیں۔ ”رمز جب“ کا مطلب ہے ”محبت کا راز“۔

ارم کمال..... فیصل آباد

کرن کا جاذب نظر ٹائٹل نے دل موہ لیا۔ سب سے پہلے ”من مو رکھ کی بات نہ مانو“ میں باہر کا تبادلہ جانا کہ وہ باہر نہ ہو حازم ہو حیرت زدہ کر گیا اے محبت بلاشبہ یہ تیری کرشمہ سازیاں ہیں تو جس پر آتی ہے نازل ہوتی ہے اسے الٹ پلٹ کر رکھ دیتی ہے کہ وہ خود کو بھی پہچان نہیں پاتا۔ مصباح علی سید کا ”بھورنشین“ میں روانیہ کی معصومیت کا ختم ہونا اچھا نہیں لگ رہا۔ محفل کے ساتھ نے اسے چنچل لڑکی سے سو برعورت میں تبدیل کر دیا ہے جبکہ ”رلنزل“ میں نینا کی بے جا چارگی پر ردنا آتا ہے نینا کی زندگی میں خوشی کی کوئی کرن تو ہوئی چاہیے نا! زندگی کے انوکھے رنگ“ نے حریم کی خاموشی اور صبر نے اس کی زندگی ہی بدل ڈالی جبکہ بلقیس بیگم جیسی عورتیں ہمیشہ نقصان اٹھانے کے بعد ہی کیوں سیدھی راہ پر آتی ہیں ”بہارنسن“ میں فضا کے پچانے فضا کو تعلیم کی دولت سے کندن بنادیا اور سلمان والد کی سختی سے کندن بن گیا۔ مریم جہاںگیر کا ”رمز جب“ مسمرانز کر گیا، محبت میں یقین در یقین کا سفر راہگاہیں نہیں گیا زبردست مریم جی، خیرین ولی کا ”روشن چہرہ“ کا آخری حصہ روح کو سرشار کر گیا، مستقل سلسلے کرن میں چار چاند لگاتے ہیں اور مجھے جی جان سے پسند ہیں۔

ج:۔ ارم کمال جی! کرن کی کہانیوں کو پسند کرنے

کو پڑھا۔ یہ تو بہت اچھا کام کیا رائٹز نے۔ لگتا ہے یہ بابر کو حور یہ کا حازم بنا کے چھوڑیں گی رائٹز جی ویسے ہم بھی راضی بہ رضا ہیں۔ دوسرا ناول ”رائٹز“ چلیں لاسٹ قسط آئی گئی۔ مجھے لگتا ہے یہ شہرین کے بغیر سمجھ بھی نہیں رہے گا اور نینا خاور کی جوڑی بنے گی۔ نینا، امین اور مہر دونوں کو پالے گی۔

مکمل ناول ”رحم حب“ سپر ہیٹ یہ ناول لگا۔ کافی عرصہ کے بعد دل سے کاش نکلا کہ زین اسی دنیا کا باسی ہو۔ شروع میں تو لگا یہ نینا اتج کی محبت ہے، پر جیسے جیسے تحریر کو پڑھا۔ سحر سٹاری ہونے لگا۔ مریم جی آپ نے تو کمال کر دیا۔ ”مہجور نشین“ اس باری قسط سوسورہ۔

ناول ”شہر در میں ڈوبی“ ایک سادہ سی تحریر۔ جیسے کہانے کے ٹیکس پر پرانی بغیر سلا دہیڑی کے پڑی ہو۔ ”پرکھ“ حقیقت کے قریب تھا ہمارے معاشرہ کا الیہ ہے۔ ”روشن چہرہ“ دوسرا اور آخری حصہ پڑھا۔ ویسے اپنے دل کی بات کروں، کیا کہہ رہا ہے، تو جناب ایسے تو کہیں نہیں ہوتا۔ حقیقت میں کہاں ایسا ہوتا ہے، موجد کا جو ہیٹ تھا۔ اس کے لیے پھر یو سنی سن چاہیے ہوتا۔ یا پھر یہ کہہ لیں کہ مریم قسمت کی جمنی نکلی جو موجد جیسا بہرا مل گیا۔ موجد اور مریم کا ملاپ اچھا لگا۔ دونوں ”م“ کی جوڑی موجد مریم۔ افسانے سب سے لاسٹ والا ”ایک سویرا، تین رنگ“ سمندر کو کوزے میں بند کرنے والی بات تھی۔ بہت اچھا سبق۔

ج:۔ فوزیہ جی! حسب معمول آپ نے کرن کی تمام کہانیوں کے بارے میں اپنی رائے سے آگاہ کیا ہے، اس سے ہمیں بے حد خوشی ہوئی ہے کہ آپ نے دل سے کرن کو پڑھا ہے۔ فوزیہ ”من مورکھ“ میں فضا کیونکہ اپنے گھر میں سیٹ ہو گئی ہے اور خوش ہے، اس لیے اس نے تمام پچھلے دکھ بھلا دیے ہیں اور جب انسان خوش ہو تو سب کو معاف کر دیتا ہے۔ ”رہی بات“ ”مہجور نشین“ کی تو رائٹز اپنی اسٹوری میں کوئی واقعہ بے وجہ نہیں ڈالتے، آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا اور ”روشن چہرہ“ تو فوزیہ جی محبت اندھی ہوتی ہے، جب ہو جائے تو وہ ہی سب سے

رائٹز اور آپ لوگوں کی محنت شامل ہے۔ افسانے پڑھے، بے تحاشا اچھے تو نہیں کہہ سکتی، مگر اچھے تھے، خاص طور پر ”ایک سویرا، تین رنگ“ مکمل ناول میں تو ”مصباح علی سید“ ایسے چھپ چکی ہیں کے کسی کی باری آنے نہیں دے رہیں۔ ان کے سین ایک ماحول بنا دیتے ہیں جو آگے پیچھے ہونے نہیں دیتا۔ پسندیدگی کے باوجود مجھے مصباح سے ایک شدید اختلاف ہے، ان سے نہیں کہانی ایسی جگہ تو ختم کریں، مہینہ آرام سے تو گزر دے۔ ویٹ بہت جاں گسل ہے آپ۔ ”رائٹز“ کا ہر کردار انگوشی میں تھپکنے کی مانند ہے۔

”من مورکھ کی بات نہ مانو“ میں حور یہ کا کردار بہت مضبوط دکھایا ہے اور نصیب پھو پھو جیسے لکس حور یہ کے ساتھ سب اچھا اچھا ہونا چاہیے۔ ”ایقین کا سفر“ کے بہرہ کا انٹرویو ضرور لگائیں۔ میری ماما آپ سب کو سلام کے ساتھ تنزیل، آسہ مرزا، مصباح علی سید، صاحبہ اکرم کو بہت زیادہ دعائیں دے رہی ہیں۔ ان کی کہانیاں بہت پسند ہیں۔ میری ماما کا نام اینالا ہے۔

ج:۔ نور فاطمہ جی! ”ناے میرے نام“ کی محفل میں ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ ہوسٹل کی تکلیف وہ زندگی کا ہمیں اندازہ ہے، لیکن کچھ پانے کے لیے کچھ کھوتا بھی پڑتا ہے۔ پھر تعلیم تو بہت ضروری ہے اور ہمارا تو کہنا بھی یہی ہے کہ جب آپ جیسی اسٹوڈنٹ کا ذہن کا فتنہ پڑھتے پڑھتے تھکاوٹ کا شکار ہو جائے تو ذہن کو پرسکون کرنے کے لیے ”کرن“ بہترین ذریعہ ہے۔ مصباح سے آپ کو اختلاف ہے، لیکن یہ بات بھی مد نظر رکھیں کہ سلسلہ وار کہانیوں کا حسن اسی بات میں ہے کہ قسط ایسے موڑ پر ختم کی جائے کہ قارئین تجسس کا شکار رہیں اور اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار کریں۔ آپ کی ماما کی دعائیں تمام رائٹز کو پہنچادی گئی ہیں اور آپ کی فرمائش شاہین رشید کو پہنچا دی گئی ہے۔

فوزیہ شمر بٹ، ہانیہ عمران، آمنہ رشیں..... ہجرات اکتوبر کا شمارہ بارہ کولما۔

سب سے پہلے کرن کا پہلا مکمل ناول ”من مورکھ“ ریکارڈ ہوتا ہے۔